مکالماتِ افلاطون

(جلد دوم)

مترجم

عبدالحمید اعظمی

مقتدرہ قومی زبان ★ پاکستان

مکالماتِ افلاطون

(جلد دوم)

مترجم

عبدالحمید اعظمی

مقتدرہ قومی زبان ☆ پاکستان

۲۰۰۷ء

پیش لفظ

وطنِ عزیز میں علم وحکمت اور عقل ودانش کی روایات کو فروغ دینے کی خاطر مقتدرہ قومی زبان کے شعبۂ درسیات نے اپنے نئے ترقیاتی منصوبے ''سائنسی، تکنیکی وجدید عمومی موادِ خواندگی کی قومی زبان (اُردو) میں تیاری'' میں فلسفہ ونفسیات کے بنیادی تصورات پر مبنی دائمی اہمیت کی کتابوں کے اُردو تراجم کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ ''مکالماتِ افلاطون (چھ جلدیں)'' اِس سلسلۂ کتب کی پہلی کڑی ہیں۔ ''مکالمات افلاطون'' ایک اعتبار سے دُنیائے انسانیت کو مسلمانوں کی عطا ہے۔ یہ مسلمان اہلِ علم ہی تھے جنھوں نے پہلے پہل یونانی دانش کو عربی زبان میں منتقل کیا، اُسے ردوقبول کی چھلنی سے گزارا اور اُس پر تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی کتابیں لکھیں۔ مسلمانوں کے یہ علمی کمالات پہلے پہل لاطینی زبان میں اور پھر لاطینی سے مختلف مغربی زبانوں میں منتقل ہو کر مغربی علم ودانش کا سب سے بڑا سرچشمہ بن گئے۔

افلاطون (۳۴۷-۴۲۷ قبل از مسیح) ایتھنز کی اشرافیہ کا ایک نامور فرد تھا۔ اِس کا دورِ حیات معاشرتی اور سیاسی بے چینی کا دور تھا۔ افلاطون اوّل اوّل سیاسی عزائم کا حامل تھا مگر جب سن ۳۹۹ قبل از مسیح میں عہد کے عظیم ترین مفکر اور اُستاد ارسطو کو سزائے موت دی گئی تو افلاطون ایتھنز کو خیرباد کہہ کر مدت تک یہاں وہاں پناہ کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ وہ یونان، مصر، اٹلی اور سسلی وغیرہ میں مارا مارا پھرتا رہا اور بالآخر ۳۸۷ قبل از مسیح میں اُس نے واپس ایتھنز آکر سائنس اور فلسفہ میں ریسرچ کی خاطر اکادمی قائم کی۔ ''مکالماتِ افلاطون'' اِسی دور کی یادگار ہے۔ ترقیاتی منصوبے کے تحت مقتدرہ قومی زبان یونانی دانش کے اِس عظیم شاہکار کی چھ کی چھ جلدوں کو پہلی بار اُردو دُنیا کی نذر کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ اُمید ہے کہ اِن مکالمات کی اشاعت ہمارے ہاں عقل ودانش کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرے گی۔

—— پروفیسر فتح محمد ملک

فہرست

☆☆☆

یون

(Ion)

شرکائے گفتگو:

سقراط (Socrates) اور یون (Ion)

سقراط: یون خوش آمدید! کیا تم اپنے شہر ایفیسس (Ephesus) سے آ رہے ہو؟

یون: جی نہیں! سقراط میں اپی ڈارس (Epidourus) سے آ رہا ہوں جہاں میں اسکلی پیئس (Asclepius) کے میلے میں شریک تھا۔

سقراط: کیا اُس میلے میں رَزمیہ نظم خوانی کا مقابلہ بھی ہوتا ہے؟

یون: جی ہاں! اس میلے میں ہر طرح کی موسیقی کے مقابلے ہوتے ہیں۔

سقراط: کیا تم نے بھی ان مقابلوں میں حصہ لیا ہے، اور کیا تمھیں کامیابی ملی یا نہیں؟

یون: سقراط! مجھے اول انعام ملا۔

سقراط: شاباش! امید ہے کہ تم ہمارے لیے پینا تھینیا (Panathenaea) میں بھی ایسی ہی عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرو گے۔

یون: خدا نے چاہا تو ضرور کامیابی حاصل ہوگی۔

سقراط: مجھے اکثر رزمیہ نظم خوا دں پر رشک آتا ہے، یون کیونکہ نظم خواں نہایت عمدہ لباس پہنتے ہیں۔ اس فن میں دلکش نظر آنا بھی بہت ضروری ہے۔ آپ کو بڑے بڑے شعرا کی صحبت بھی نصیب ہوتی ہے۔ ان شعرا میں ہومر (Homer) جیسا صاحب کمال شاعر بھی شامل ہے جو عمدہ ترین خداداد صلاحیتوں کا مالک ہے۔ شاعری کے لیے صرف الفاظ کو طوطے کی طرح رٹنے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ ان کے مطالب کی سمجھ بوجھ بھی بہت ضروری ہے۔ ایک اچھا نظم خواں وہی ہوتا ہے جو

شاعر کا مفہوم بھی اچھی طرح سمجھتا ہو۔ نظم خواں کا یہ فرض ہے کہ وہ شاعر کے مفہوم کی تفسیر اپنے سامعین کے سامنے جوش وخروش سے بیان کرے، کیا اس پر دسترس ضروری نہیں؟

یون: آپ نے درست کہا ہے سقراط کہ اشعار کی تفسیر اور تشریح ہی میرے فن کا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ کیا آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ میں ہومر کی خوبیاں دوسروں سے بہتر طور پر بیان کر سکتا ہوں۔ ہومر سے متعلق جو فہم وادراک مجھے حاصل ہے وہ نہ تو لیمپساکس(Lampsacus) کے میٹروڈورس(Metrodorus) کے پاس ہے اور نہ ہی تھاسوس(Thasos) کے سٹیسی ام بروٹس (Stesimbrotus) اور گلوکون(Glaucon) کے پاس اور نہ ہی اور کسی کے پاس۔

سقراط: یون! تمھاری باتیں سن کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم مجھے اس بارے میں مزید معلومات فراہم کرو گے۔

یون: یقیناً سقراط! آپ سنیے کہ میں ہومر کی نظموں کی ادائیگی کتنی خوبصورتی سے کرتا ہوں۔ ہومر کے چاہنے والوں(Homeridae) کو چاہیے کہ وہ مجھے سونے کا تاج پہنائیں۔

سقراط: اچھا ہے، میں کسی روز فرصت سے تمھاری نظم خوانی سنوں گا۔ تاہم مجھے ابھی تو تم سے ایک سوال پوچھنا ہے۔ کیا تمھارا فن صرف ہومر تک ہی محدود ہے یا اس کے علاوہ تم ہیزیوڈ(Hesiod) اور آرکی لوکس(Archilochus) کی نظمیں بھی پڑھتے ہو؟

یون: میری نظم خوانی صرف ہومر تک ہی محدود ہے کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کی گنجایش کہاں۔

سقراط: کیا ہومر اور ہیزیوڈ میں کوئی قدر مشترک ہے؟

یون: میرے خیال میں دونوں میں چند باتیں مشترک ہیں۔

سقراط: اچھا یہ بتاؤ کیا تم ہومر اور ہیزیوڈ کے ان خیالات کی تشریح کر سکتے ہو جو دونوں میں مشترک ہیں؟

یون: جی ہاں! میں ان دونوں میں موجود مشترک باتوں کی نہایت عمدہ تشریح کر سکتا ہوں۔

سقراط: لیکن جن باتوں پر دونوں میں اختلاف ہے ان کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ مثلاً علم غیب کے بارے میں جس پر دونوں نے اپنی اپنی الگ رائے کا اظہار کیا ہے۔

یون: بات تو درست ہے۔

سقراط: کیا تم یا تمھارے جیسے دوسرے نظم خواں ان دونوں کے علم غیب سے متعلق ان خیالات کی جن پر دونوں کی رائے ایک جیسی ہے یا ایک دوسرے سے مختلف، تشریح کر سکتے ہو؟

یون: اس کے لیے تو غیب داں ہونا ضروری ہے۔

سقراط: اگر تم غیب داں ہوتو کیا تم ان کے ہونے اور نہ ہونے دونوں صورتوں کی بہتر تشریح کر سکتے ہو۔

یون: صاف صاف۔

سقراط: اچھا تم یہ بتاؤ کہ تمھیں ہومر کے خیالات کی تشریح ہی کا ملکہ کیسے حاصل ہوا اور ہیزیوڈ اور دوسرے شعرا کا کیوں نہیں؟ کیا ہومر بھی انہی موضوعات کو نہیں چھیڑتا جو دیگر شعرا کے یہاں موجود ہیں؟ کیا اس کے یہاں بھی جنگ ایک مضبوط دلیل نہیں ہے؟ کیا وہ بھی دیگر شعرا کی طرح انسانی معاشرے، اچھے برے، ہنر منداور غیر ہنر مندافراد کے میل ملاپ کا ذکر نہیں کرتا؟ کیا وہ دیوتاؤں کے باہمی تعلقات اور انسانوں کے روابط کی بات نہیں کرتا۔ کیا وہ اس سے واقف نہیں کہ عالم بالا اور ہماری دنیا میں کیا ہوتا ہے؟ کیا اسے دیوتاؤں اور سورماؤں کی نسلوں کا علم نہیں ہے؟ کیا یہی موضوعات ہومر کی نظموں میں موجود نہیں ہیں؟

یون: سقراط آپ درست فرما رہے ہیں۔

سقراط: کیا دوسرے شعرا ان ہی افکار کو موضوعِ سخن نہیں بناتے؟

یون: جی ہاں بناتے ہیں لیکن ہومر کے سے انداز میں نہیں۔

سقراط: کیا ان کا انداز بُرا ہوتا ہے؟

یون: جی ہاں! وہ ایسا انتہائی برے انداز میں کرتے ہیں۔

سقراط: کیا ہومر کا انداز بہتر ہوتا ہے؟

یون: جی ہاں! اس کا انداز بے مثال ہے۔

سقراط: میرے دوست یون، تمھاری بات درست ہے لیکن یہ بتاؤ کہ ایک محفل میں جہاں علم ریاضی زیرِ بحث ہو اور اس بحث میں بہت سے افراد شریک ہوں تو وہاں کوئی ایسا فرد ضرور ہونا چاہیے جو یہ طے کرے کہ ان میں کون بہتر گفتگو کر رہا تھا۔

یون: بجا ارشاد۔

سقراط: یعنی جو بہتر ہونے کا فیصلہ کرتا ہے وہی بدتر ہونے کا فیصلہ بھی کرتا ہے؟

یون: جی ہاں، ایک ہی فرد دونوں فیصلے کرتا ہے۔

سقراط: اور وہ کوئی ریاضی داں ہی ہوگا؟

یون: جی ہاں۔

سقراط: ٹھیک ہے! اچھا یہ بتاؤ کہ اگر کسی محفل میں صحت مند غذا کے موضوع پر گفتگو ہو رہی ہو اور بہت سے لوگوں میں سے ایک شخص دوسروں سے بہتر باتیں کر رہا ہو تو کیا جو شخص بہتر باتیں کرنے والے کا انتخاب کرتا ہے وہی بری گفتگو کرنے والے کا بھی فیصلہ کرے گا؟

یون: یقیناً وہی کرے گا۔

سقراط: وہ کون ہوسکتا ہے۔ اس کا نام کیا ہوگا؟

یون: وہ طبیب ہوگا۔

سقراط: عمومی مباحثوں میں جب ایک ہی موضوع پر متعدد افراد اظہار رائے کرتے ہیں تو جس فرد کو بہترین کا علم ہوتا ہے وہی بدترین کو بھی پہچانتا ہے۔ کیونکہ اگر اسے بدترین کا علم نہیں ہوگا تو اس موضوع پر بحث کے دوران وہ بہترین سے بھی ناواقف ہوگا؟

یون: بجا ارشاد۔

سقراط: کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ ایک ہی فرد دونوں پہلوؤں سے واقفیت رکھتا ہے؟

یون: جی ہاں رکھتا ہے۔

سقراط: چلیے مان لیا آپ کہتے ہیں کہ ہومر، ہیز یوڈ اور آرکی لوکس (Archilochus) جیسے شعرا نے ایک ہی موضوع پر اظہار خیال کیا ہے لیکن ان کا انداز مختلف ہے۔ ایک کا انداز بہتر ہے جبکہ دوسرے کا ویسا نہیں ہے؟

یون: جی ہاں، میں نے ٹھیک کہا ہے۔

سقراط: میرے عزیز دوست، کیا میں یہ کہنے میں حق بجانب نہیں کہ یون کو دیگر شعرا پر بھی ویسا ہی عبور حاصل ہے جیسا اسے ہومر پر حاصل ہے؟ کیونکہ وہ تسلیم کرتا ہے کہ ایک ہی موضوع پر اظہار رائے کرنے والوں کے بارے میں ایک ہی فرد بہتر منصف ہوسکتا ہے اور یہ بھی کہ شعرا کا موضوع سخن عموماً ایک ہی ہوتا ہے۔

یون: سقراط اگر یہ بات درست ہے تو لوگ جب دوسرے شعرا کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو مجھے نیند کیوں آنے لگتی ہے لیکن جب ہومر کا ذکر آتا ہے تو میری نیند اڑ جاتی ہے اور میں اس کی تمام باتیں غور سے سنتا ہوں اور خود بھی اس پر تفصیلی اظہار رائے کرتا ہوں۔

سقراط: میرے عزیز دوست اس کی وجہ صاف ظاہر ہے، سب جان سکتے ہیں کہ تم ہومر کا ذکر جس طرح کرتے ہو اس میں نہ کوئی نفاست ہوتی ہے اور نہ اہم معلومات۔ اگر تم فن کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہومر کا ذکر کرو تو تم دوسرے شعرا کو نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ شاعری ایک کُل ہے جو جز و کی ضد ہے۔

یون: آپ درست کہہ رہے ہیں۔

سقراط: اور جب کوئی فرد کسی ہنر کو بطور کل اختیار کرتا ہے تو یہی بات اس پر بھی صادق آتی ہے۔ یون میں اس کی تشریح کر دوں؟

یون: ضرور سقراط ضرور، میں بھی یہی چاہتا ہوں کیونکہ میں تو داناؤں کی باتیں سننے کا آرزومند ہوں۔

سقراط: کاش میں دانا ہوتا اور یون، تم مجھے صحیح معنوں میں دانا سمجھتے۔ دانا تو رزمیہ نظم خواں، فنکار اور وہ شعرا ہیں جن کی نظمیں آپ لوگ گاتے ہیں۔ میں تو ایک معمولی سا آدمی ہوں، سچ بولتا ہوں اور بس۔ ذرا سوچو میں نے جو باتیں کی ہیں کیا وہ نہایت معمولی اور پیش پا سی نہیں۔ ایسی باتیں تو بے شمار لوگ کہتے ہی رہتے ہیں کہ جب کوئی فرد کسی فن کا مجموعی علم حاصل کرتا ہے تو اس کے لیے اس کی خوبیوں اور خامیوں کی پرکھ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اس بات پر ذرا غور کریں کہ مصوری کا فن بھی ایک ''کُل'' ہے۔ کیوں ہے ناں۔

یون: جی ہاں۔

سقراط: اچھا یہ بتاؤ کہ تم کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جو پولی گنوٹس (Polygnotus) ولد اگلاؤفون (Aglaophon) کی مصوری کی خوبیاں تو بیان کر سکتا ہو لیکن دوسرے مصوروں پر تنقید کرنے سے قاصر ہو؟ اور جب اسے کسی دوسرے مصور کی تصاویر دکھائی جائیں تو وہ خراٹے لینے لگتا ہو، اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا ہو اور وہ کچھ نہ کہہ سکتا ہو لیکن جوں ہی پولی گنوٹس ولد اگلاؤفون یا کسی دوسرے مصور کے بارے میں رائے زنی کے لیے کہو تو اس کی آنکھیں کھل جاتی ہوں اور پوری طرح متوجہ ہو کر بے تکان بولنے لگتا ہو؟

یون: جی نہیں۔ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا۔

سقراط: اچھا یہ بتاؤ کہ تم کسی ایسے ماہر مجسمہ ساز کو جانتے ہو جو فن مجسمہ سازی کا تو ماہر ہو اور ڈاڈالس (Daedalus) ولد میٹین (Metion) یا اپیئس (Epeius) ولد پینوپیس (Panopeus) یا سامیہ کے

(Samian) تھیوڈورس(Theodorus) یا کسی دوسرے مجسمہ ساز کی خوبیاں بیان کرنے پر تو قادر ہو لیکن جب عام مجسمہ سازوں کے کارنامے پیش کیے جائیں تو اس کی سمجھ میں یہ نہ آئے کہ وہ کیا کہے اور کیا نہ کہے، اسے نیند آ جائے اور چپ سی لگ جائے۔

یون: جی نہیں بالکل نہیں۔ میں ایسے کسی مجسمہ ساز کو نہیں جانتا۔

سقراط: اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو مجھے یقین ہے کہ تمھاری کسی ایسے شخص سے بھی ملاقات نہیں ہوئی ہوگی جو بانسری نواز یا بربط نواز ہو یا بربط کی سنگت میں رزمیہ نظمیں گاتا ہو، وہ اولمپس (Olympus) یا تھامیرس (Thamyras) یا اورفیس (Orpheus) یا ایتھا کا(Ithaca) کے رزمیہ نظم خواں فیمنس (Phemins) کے بارے میں خوب معلومات رکھتا ہو۔ لیکن وہ ایفیسس کے یون کی خوبیوں اور خامیوں پر بات نہ کر سکتا ہو کیونکہ وہ اسے جانتا ہی نہ ہو۔

یون: سقراط مجھے آپ کی باتوں سے اتفاق ہے۔ تاہم مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ میں جب یہ کہتا ہوں کہ مجھے ہومر کے بارے میں زیادہ علم ہے اور میں اس پر بہتر گفتگو کر سکتا ہوں لیکن دوسروں کے بارے میں اس طرح بات کرنا میرے بس میں نہیں ہے تو اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے کیا آپ بتا سکتے ہیں؟

سقراط: یون میں سمجھ رہا ہوں۔ میں اس وجہ کو تفصیلاً بیان کرنے والا ہوں۔ تمھیں ہومر کے بارے میں عمدہ طریقے سے رائے زنی کا جو ملکہ حاصل ہے وہ کوئی فن نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ میں ابھی کہہ رہا تھا کہ یہ ایک وجدانی کیفیت ہے۔ کیونکہ قدرت انسان کو جذبہ عطا کرتی ہے، بالکل اس پتھر کی طرح جسے یوری پائڈز (Euripides) مقناطیس کا نام دیتا ہے لیکن جسے عوام سنگ ہراکلی (Heraclea) کہتے ہیں۔ یہ پتھر نہ صرف لوہے کے حلقوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے بلکہ ان حلقوں کو اسی طرح کے دیگر حلقوں کو اپنی طرف کھینچنے کی طاقت بھی عطا کرتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوہے کے حلقے اور دوسرے ٹکڑے اسی باہمی کشش کے سبب ایک لمبی زنجیر میں معلق ہو جاتے ہیں۔ ان تمام ٹکڑوں کو کشش کی قوت اسی پہلے مقناطیس سے حاصل ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح نظم پہلے ایک فرد میں وجدانی کیفیت پیدا کرتی ہے، اور اس کے بعد یہی کیفیت دوسروں کو منتقل ہو جاتی ہے اور وجدان کا یہ سلسلہ دور تک چلا جاتا ہے۔ تمام اچھے نظم خواں یا غزل گو شعرا اپنی تخلیقات ہنرمندی کے زور پر تخلیق نہیں کرتے بلکہ ان کے تخلیقی جذبے کو پروان چڑھانے والا وجدان ہوتا ہے اور وہ مسحور ہو کر

شعر کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کوری بینٹ کے رنگ رلیاں منانے والے لوگ (Corybantian) ہوش وخرد سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ گویا غزل گو شعرا تخلیقی عمل کے دوران اپنے ہوش میں نہیں ہوتے، لیکن غنائیت اور اوزان کے جذبے سے سرشار ہوتے وقت ان کا وجدان انھیں مسحور کر دیتا ہے۔ ان کی حالت بک چک (Bacchic) دوشیزاؤں جیسی ہوتی ہے کہ جب ان پر ڈائیونائیسس (Dionysus) کا سایہ ہوتا ہے تو وہ دریاؤں سے دودھ اور شہد نچوڑتی ہیں لیکن جب اپنے ہوش میں ہوتی ہیں تو ان سے ایسا کوئی کام سرزد نہیں ہوتا۔ غزل گو شاعر کی روح بھی ان کے اپنے قول کے مطابق اسی مرحلے سے گزرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے نغمے شہد کے فواروں سے پھوٹتے ہیں۔ وہ ان پھولوں کو میوسس (Muses) (موسیقی کی دیوتی) کے باغوں اور وادیوں سے چنتے ہیں۔ وہ شہد کی مکھیوں کی طرح پھولوں سے شہد کے قطرے جمع کرتے ہیں۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کیونکہ شاعر ہلکا پھلکا ہوتا ہے اور اڑنے کے لیے اس کے بال و پر ہوتے ہیں۔ اس میں تقدیس بھی ہوتی ہے۔ اس میں اس وقت تک جدت طرازی پیدا نہیں ہوتی جب تک اس پر وجدانی کیفیت طاری نہیں ہوتی، وہ اپنے ہوش نہیں کھوتا اور خود سے عاری نہیں ہو جاتا۔ جب تک وہ اس سحر انگیز حال سے نہیں گزرتا اس کی قوتِ تخلیق خفتہ ہوتی ہے۔ شعر اس کے لبوں سے نہیں پھوٹتے۔ شعرا نے انسانی اعمال کو کتنے خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنایا ہے لیکن ہماری طرح ہومر کے بارے رائے زنی کرتے ہوئے وہ فنی اصولوں کی پروا نہیں کرتے۔ ان کے لبوں سے صرف وہی الفاظ نکلتے ہیں جو نغمات کی دیوی کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وجدان ہی ان کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ اسی الہامی جذبے کے تحت کوئی مسرت انگیز نظمیں، کوئی مناجات، مختلف آوازوں میں گائے جانے والے گیت، کوئی طویل رزمیہ نظم اور کوئی بدلی ہوئی بحر میں نظمیں تخلیق کرتا ہے۔ جو ایک صنف کا ماہر ہوتا ہے وہ دوسری کا نہیں۔ کیونکہ شاعر فن عروض کے بل بوتے پر نہیں بلکہ الہامی کیفیت کے تحت شعر کہتا ہے۔ اگر وہ محض فن عروض ہی میں مہارت رکھتا تو وہ ہر صنف میں ید طولیٰ رکھتا۔ اسی لیے خالق کائنات، شاعر کے منشا و مقصد کو خود متعین کرتا ہے۔ وہ انھیں مخبر غیب اور پیغمبروں کی طرح اپنا ایک قسم کا کارکن مقرر کرتا ہے تاکہ سامعین کو یہ احساس ہو کہ یہ کسی انسان کے الفاظ نہیں بلکہ الوہی اور ملکوتی پیغام ہے جسے وہ عالم جذب و کیف میں ادا کرتے ہیں۔ یہ اس کے نہیں بلکہ الوہی الفاظ ہوتے ہیں۔ اور وہ شعرا کو مخلوق سے رابطے کا وسیلہ بناتا ہے۔ گویا خود خدا انسان کے پردے میں بولتا ہے۔ میرے ان

خیالات کا ثبوت کالسیڈیا کا (Chalcidian) شاعر ٹینی کس (Tynnichus) ہے۔ اس نے سوائے ایک نظم کے جو زبان زد خاص و عام ہے اور کچھ ایسا تحریر نہیں کیا ہے جو لوگوں کے حافظے میں محفوظ ہو۔ یہ شاعری کی دیوی کا مخصوص عطیہ ہے جسے وہ خود تسلیم کرتا ہے۔ گویا اس طرح خدا یہ ظاہر کرتا ہے (تاکہ ہمیں شک نہ رہے) کہ یہ خوبصورت نظمیں، انسانی کوششوں کا ثمر نہیں ہیں بلکہ الوہی اور خدا کی قدرت کا نمونہ ہیں۔ شعرا محض دیوتاؤں کے ترجمان ہوتے ہیں جن پر ان کا سایہ ہوتا ہے۔ کیا یہی وہ سبق نہیں ہے جو خدا ہمیں اس صورت میں سکھاتا ہے کہ اکثر بدترین شاعر کسی بہترین نظم کا خالق بن جاتا ہے۔ یون کیا میں سچ نہیں کہہ رہا ہوں؟

یون: جی ہاں آپ سچ ہی کہہ رہے ہیں۔ آپ کے الفاظ میرے دل میں اتر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اچھا شاعر خدا کی قدرت کا اظہار ایسے اشعار میں کرتا ہے جو الہامی ہوتے ہیں۔

سقراط: کیا تم جیسے نظم خواں شعرا کے ترجمان نہیں ہوتے؟

یون: آپ کی یہ بات بھی درست ہے۔

سقراط: گویا آپ لوگ ترجمانوں کے ترجمان ہوتے ہیں۔

یون: آپ نے درست فرمایا۔

سقراط: یون میں آپ سے جو سوال اب کروں گا مجھے اس کا صاف صاف یعنی واضح جواب چاہیے۔ جب کسی نظم کے اثر انگیز بند کو آپ لوگ عوام کے سامنے پیش کر کے متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو کیا اس وقت آپ اپنے ہوش و حواس میں ہوتے ہیں۔ ایسے اثر انگیز مقامات میں ایسے مناظر شامل ہیں جیسے اوڈیسس (Odysseus) کا بھوت اچانک اچھل کر فرش پر آ جاتا ہے۔ اور تیر اپنے پیروں کے پاس ڈھیر کر لیتا ہے یا وہ منظر جب اکیلس (Achilles) بڑی قوت سے ہیکٹر (Hector) پر حملہ آور ہوتا ہے یا اینڈرومیکی (Andromache)، ہکوبا (Hecuba)، یا پریام (Priam) کے الم انگیز مکالمے وغیرہ پر۔ اس صورت میں کیا آپ بے قابو نہیں ہو جاتے؟ کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ آپ روحانی طور پر ان ہی لوگوں کے درمیان، اتھا کا (Ithaca) یا ٹرائے (Troy) یا نظموں میں بیان کردہ مناظر میں موجود ہیں؟

یون: سقراط آپ کی بات دل کو لگتی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ جب میں ترحم انگیز اشعار پر پہنچتا ہوں تو میری آنکھیں تر ہو جاتی ہیں اور جب خوفناک مناظر بیان کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو

جاتے ہیں اور دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔

سقراط: اگر یہ بات درست ہے تو یہ بتاؤ کہ قربانی یا جشن کے موقع پر بہترین لباس پہنے، سر پر سنہرے تاج سجائے، کوئی ایسا شخص جسے کبھی کسی نے لوٹا بھی نہیں، دس بیس ہزار کے مجمع کے سامنے دھاڑیں مار کر روتا یا خوف سے کانپتا ہے، حالانکہ وہ نہ تو خود کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے اور نہ کسی ظلم وستم کا شکار ہوتا ہے۔ بھلا میں ایسے شخص کے بارے میں کیا کہوں۔ وہ اپنے ہوش وحواس میں ہوتا ہے یا نہیں؟

یون: وہ نہیں ہوتا۔ سقراط میں صحیح صحیح بتاتا ہوں ایسا شخص اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہوتا۔

سقراط: تم تو جانتے ہی ہو گے کہ بالکل ایسا ہی تاثر بیشتر سامعین میں بھی پیدا ہوتا ہے۔

یون: بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ میں جب سٹیج سے نیچے ان پر نظر ڈالتا ہوں تو نظم خوانی کے دوران ان کے چہروں پر ترحم، حیرت اور جرأت کے تاثرات صاف نظر آتے ہیں اور میں ان کو مزید متاثر کرنے کے لیے جان لڑا دیتا ہوں کیونکہ اگر میں انھیں رلاؤں گا تو معاوضہ وصول کرتے وقت میری باچھیں کھلی ہوں گی۔ اگر صرف سناؤں گا تو اُس وقت میری آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوں گی۔

سقراط: ہمیں یہ علم ہے کہ وہ سامعین دور آخری صفوں میں ہوتے ہیں، ان تک یہ تاثر مقناطیس کی طرح دوسرے سامعین کے توسط سے پہنچتا ہے اور تمھارے جیسے نظم خواں اور فنکار درمیانی وسیلے کا کام دیتے ہیں۔ لیکن اصل متاثر کن کمال شاعر کا ہوتا ہے۔ ان ہی ذرائع سے خدا اپنی مرضی کے مطابق انسان کے دل کو اِدھر اُدھر رجوع کرواتا ہے اور ایک انسان کو دوسرے سے معلق کر دیتا ہے۔ اس طرح رقاصوں، ماہرین فن، سفینوں کے گروہوں کی ایک زنجیر وجود میں آ جاتی ہے جو ایک ہی مقناطیس کے وسیلے سے ان حلقوں کے طفیل جو موسیقی کی دیوی کا عطیہ ہیں ایک دوسرے سے چسپاں رہتے ہیں۔ ہر شاعر کی کوئی نہ کوئی دیوی ہوتی ہے جس سے وہ متعلق رہتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ اسی کے زیر اثر ہوتا ہے۔ گویا اس میں اور دیوی میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اس زنجیر کا بنیادی حلقہ دراصل شعرا ہی ہوتے ہیں جس سے دوسرے متاثر ہوتے ہیں، مثلاً کچھ اورفیس (Orpheus) اور کچھ میوسائیس (Musaeus) کے زیر اثر ہوتے ہیں لیکن بیشتر کے دل و دماغ پر ہومر چھایا رہتا ہے اور جب کوئی فرد کسی اور شاعر کے اشعار پڑھتا ہے تو تمھیں نیند آ جاتی ہے اور

ان کے بارے میں رائے زنی تمھارے بس میں نہیں ہوتی۔ لیکن جب کوئی شخص ہومر کا کوئی بند سناتا ہے تو تم فوراً متوجہ ہو جاتے ہو، آنکھیں کھل جاتی ہیں اور تمھاری روح میں اہتزاز پیدا ہو جاتا ہے تو تم اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے ہو۔ ہومر کے بارے میں تمھاری رائے کسی فن یا عروض پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک مسحور کن الہامی جذبہ ہوتا ہے جیسے کوری بینٹ کے رقاص اپنے دیوتا کی روح کے زیرِ اثر ہوتے ہیں۔ ایسے اشعار خود بخود ان کے لب پر آ جاتے ہیں جو اسی دیوتا سے متعلق معنون ہوتے ہیں۔ وہ جوش وجذبے میں محو ہو جاتے ہیں انھیں کسی اور کا دھیان نہیں آتا۔ یوں تم خود دیکھ لو جب ہومر کا نام آتا ہے تو تمھارے لبوں سے الفاظ کا دھارا پھوٹ پڑتا ہے لیکن دوسروں کے بارے میں ایک لفظ بھی ادا نہیں ہوتا۔ تمھارا سوال ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ تم اس کی ہنرمندی کو نہیں سراہتے بلکہ ایک الوہی جذبہ تمھیں سرمست کر دیتا ہے۔

یون: سقراط آپ کی بات درست ہے لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ اپنی بلاغت کو استعمال کر کے مجھے یہ بات تسلیم کرنے پر قائل کر لیں گے کہ میں ہومر کو صرف اسی وقت سراہتا ہوں جب ہوش وخرد سے بیگانہ ہو جاتا ہوں یا ایک طرح سے مجھ پر اس کا بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر آپ ہومر سے متعلق میری رائے زنی کا مظاہرہ بنفسِ نفیس دیکھیں گے تو یقیناً آپ کی یہ رائے بدل جائے گی۔

سقراط: مجھے تمھاری رزمیہ خوانی کا مظاہرہ دیکھنے کا بہت شوق ہے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے تم میرے ایک سوال کا جواب دو۔ ہومر کی نظم کا وہ کون سا حصہ ہے جسے تم بہت خوبصورتی اور مہارت سے ادا کر سکتے ہو؟ یقیناً پوری نظم پر تو تمھیں اتنا عبور نہیں ہوگا۔

یون: سقراط! نظم کا کوئی ایسا حصہ نہیں ہے جس پر مجھے مکمل عبور نہ ہو۔ آپ یقین کریں۔

سقراط: لیکن ہومر کی ان باتوں پر تو عبور نہیں ہوگا جن کے بارے میں تمھیں سرے سے کوئی آگاہی نہیں ہے۔

یون: ہومر کی نظم میں وہ کون سی باتیں ہیں جن سے میں واقف نہیں ہوں؟

سقراط: دیکھو نا! کیا ہومر کے چند بند ایسے نہیں ہیں جن میں وہ فنون کا ذکر کرتا ہے، مثلاً گھڑسواری کا فن۔ اگر مجھے اس سے متعلق چند سطریں یاد ہوتیں تو میں تمھیں اسی وقت سنا دیتا۔

یون: مجھے یاد ہیں۔ میں سنا سکتا ہوں۔

سقراط: اچھا ذرا یہ بتاؤ کہ پیڑوکلس (Patroclus) کی یاد میں جو گھڑ دوڑ ہوتی ہے اس ضمن میں نیسٹر (Nestor) اپنے بیٹے اینٹی لوکس (Antilochus) کو کس قسم کی ہدایتیں دیتا ہے تا کہ وہ میدان کے موڑوں سے واقف ہو جائے۔

یون: سن لیجیے، وہ کہتا ہے:

"اپنی چمکتی ہوئی چھوٹی بگھی میں ان سب کے بائیں جانب جھکو اور داہنی جانب والے گھوڑے کو آواز دے کر اور چابک مار کر آگے بڑھاؤ۔ لگام ڈھیلی چھوڑ دو اور جب منزل پر پہنچو تو بائیں جانب والے گھوڑے کو قریب آنے دو تاہم احتیاط رکھو کہ خوبصورت پہیے کا دُھرا آخری سرے کو مس نہ کرے اور پتھر سے بچے۔"

سقراط: یون بس اتنا ہی کافی ہے۔ ذرا یہ بتاؤ کہ ان سطروں کی موزونیت کا صحیح منصف کوئی کوچوان ہوگا یا کوئی طبیب؟

یون: ظاہر ہے کہ کوچوان ہی ہوگا۔

سقراط: اس کا سبب یہی ہے کہ وہ اس ہنر میں طاق ہے۔ اس کے علاوہ بھی کوئی سبب ہو سکتا ہے؟

یون: یہی ایک سبب ہے۔

سقراط: ہر ہنر خدا نے کسی نہ کسی کام کے لیے عطا کیا ہے کیونکہ جو کام کوچوان کے ہنر سے متعلق ہے اس کا علم ہمیں طب کا ہنر حاصل کرنے سے نہیں ملے گا۔

یون: بالکل نہیں۔

سقراط: جی ہاں ہمیں طب کی باتیں بڑھئی کا کام سیکھ کر حاصل نہیں ہوں گی؟

یون: سچ ہے کہ نہیں حاصل ہوں گی۔

سقراط: یہ بات ہر ہنر پر صادق آتی ہے۔ ایک ہنر کا علم دوسرے پیشوں سے حاصل نہیں ہوگا۔ ذرا میں پہلے ایک سوال پوچھ لوں۔ کیا تمھیں یہ تسلیم ہے کہ ہر ہنر میں فرق ہوتا ہے؟

یون: بجا ارشاد۔

سقراط: میری طرح تمھاری بھی یہی دلیل ہوگی کہ ایک ہنر کسی ایک علم سے متعلق ہے اور دوسرا کسی دوسرے علم سے تو ظاہر ہے کہ دونوں میں فرق موجود ہے۔

ایون: جی ہاں۔

سقراط: یقیناً اگر میرے ہر ہنر میں ایک ہی علم ہو تو ان میں کوئی فرق نہیں ہوگا، مثلاً میں جانتا ہوں کہ انگلیوں کی تعداد پانچ ہوتی ہے۔ تم بھی یہ جانتے ہو اور اگر میں پوچھوں کہ ہم دونوں کو اس بات کا علم ایک ہی فن یعنی ریاضی سے حاصل ہوا ہے تو کیا تمھیں یہ تسلیم ہوگا؟

ایون: کیوں نہیں۔

سقراط: اب یہ بتاؤ کہ یہ بات ہر ہنر پر صادق آئے گی۔ میں یہ سوال پوچھنا چاہتا تھا۔ ایک ہی فن سے متعلق معلومات ہمیشہ ایک سی ہوتی ہیں اور دوسرے فنون کی معلومات مختلف ہوتی ہیں؟

ایون: سقراط میری بھی یہی رائے ہے۔

سقراط: گویا جسے کسی خاص فن سے واقفیت نہیں ہوگی وہ اس فن کے متعلق علم اور کاموں پر رائے زنی نہیں کر سکے گا؟

ایون: بجا ارشاد۔

سقراط: اچھا یہ بتاؤ کہ ہومر کی نظم کے جو حصے آپ نے سنائے اس کا بہترین منصف کون ہو سکتا ہے تم یا کوئی کوچوان؟

ایون: کوچوان۔

سقراط: اسی لیے کہ تم نظم خواں ہو، کوچوان نہیں؟

ایون: جی ہاں۔

سقراط: مزید یہ کہ نظم خوانی کا فن کوچوانی سے مختلف ہے؟

ایون: جی ہاں۔

سقراط: اگر یہ علم مختلف ہے تو اس کا موضوع مختلف ہوگا؟

ایون: درست ہے۔

سقراط: تمھیں وہ بند تو یاد ہوگا جس میں نیسٹر (Nestor) کی داشتہ ہیکامیڈ (Hecamede) زخمی میکاؤن (Machaon) کو ایک مشروب دیتی ہے اور وہ کہتا ہے:

"مشروب کی تیاری میں پرامنی کی شراب شامل ہے جس میں اس نے
پرامنی کے (Pramnian) کدوکش پر بکری کے دودھ سے تیار کردہ پنیر

کدوکش کر کے ملائی ہے اور اس کے پہلو میں ایک پیاز بھی رکھ دی جس
سے مشروب مزیدار بن گیا"۔

ان سطور کی موزونیت کا اندازہ بحیثیت نظم خواں تمھیں بہتر طور پر ہوسکتا ہے یا فن طب کے ماہر کو؟

یون: فن طب کے ماہر کو۔

سقراط: مزید برآں جب ہومر کہتا ہے کہ:

"وہ سیسہ کے بھاری عمق پیما کی طرح گہرائیوں میں اترتی چلی گئی اس
بیل کے سینگ میں سما کر، جو چراگاہ میں اینڈتا پھرتا ہے اور بھوکی مچھلیوں
پر ٹوٹ پڑتا ہے۔"

ذرا سوچو ان سطور کو نظم خواں بہتر طور پر ادا کرسکتا ہے یا مچھلی پکڑنے والا؟

یون: سقراط صاف ظاہر ہے کہ یہ کام مچھلی پکڑنے والے ہی کے لیے مناسب ہے۔

سقراط: اچھا یہ بتاؤ کہ اگر تم مجھ سے یہ کہنا چاہو کہ سقراط، آپ ہومر کے مختلف اشعار کو مختلف ہنرمندوں سے متعلق کر لیتے ہیں تو مجھے یہ بھی بتائیں گے کہ وہ کون سے بند ہیں جن کا تعلق غیب دانوں یا غیب دانی سے ہے؟ پھر آپ دیکھیں گے کہ میں کتنی تیزی اور خوشی سے اس کا جواب دیتا ہوں کیونکہ خاص طور پر اوڈیسی (Odyssey) میں ایسے متعدد بند ہیں، مثلاً وہ بند جس میں تھیوکلی مینس (Theoclymenus) میلامپس (Melampus) خاندان کا نجومی ہے۔ شادی کے امیدواروں سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

"بد بخت انسانو! تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تمھارے سر، تمھارے
چہرے اور تمھارے دھڑ رات کی طرح سیاہ ہیں۔ تمھارے گریہ و ماتم کی
آواز ہر طرف گونج رہی ہے۔ تمھارے گال آنسوؤں سے تر ہیں۔
ڈیوڑھی میں ہجوم جمع ہے۔ آنگن ان بھوتوں سے بھرا ہوا ہے جو سطح زمین
اور تحت الثریٰ کے درمیان کی تاریکیوں میں اتر رہے ہیں۔ سورج آسمان
سے غائب ہو چکا ہے اور ایک شر انگیز دھند چاروں طرف چھا گئی ہے۔"

اور ایلیڈ (Iliad) میں بھی اس طرح کے متعدد بند ہیں، مثلاً شہر پناہ کے قریب ہونے والی جنگ کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے:

''وہ خندق پار کرنا چاہتے تھے کہ انھیں ایک شگون سے سابقہ پڑ گیا۔ ایک شاہین اپنے پنجوں میں ایک خون آلود اژدھے کو لیے مجمع کے بائیں جانب محو پرواز تھا۔ اژدھا موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ پلٹ پلٹ کر شاہین کے سینے اور گردن پر دانت جما رہا تھا۔ آخرکار وہ شاہین کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو کر مجمع کے درمیان آ گرا۔ شاہین چیخ مار کر ہوا کے دوش پر دور ہوتا گیا۔''

میرا خیال ہے یہی وہ باتیں ہیں جن پر غیب دان کو توجہ دینی چاہیے؟

یون: سقراط آپ کی یہ بات بالکل درست ہے۔

سقراط: ہاں میں بھی ٹھیک کہہ رہا ہوں اور تم بھی۔ میں نے تمھارے لیے اوڈیسی (Odyssey) اور ایلیڈ (Iliad) سے ایسے بند منتخب کیے ہیں جن میں غیب دان، ماہر طب اور مچھیروں کے فرائض بیان کیے گئے ہیں۔ یون تم مجھ سے کہیں زیادہ ایلیڈ سے واقف ہو۔ ذرا چند ایسے بند چُن دو جو نظم خوانی اور نظم خوانوں کے لیے موزوں اور مناسب ہوں اور وہ جنھیں نظم خواں دیگر افراد سے بہتر طریقے سے ادا کر سکتے ہوں۔

یون: میں سمجھتا ہوں تمام ہی بند نظم خوانی کے لیے موزوں ہیں۔

سقراط: تمام کے تمام نہیں، یون تم بھول گئے ہو کہ تم نے کیا کہا تھا نظم خواں کا حافظہ بہتر ہونا چاہیے۔

یون: میں کیا بھول گیا ہوں؟

سقراط: کیا تمھیں یاد نہیں کہ تم نے کہا تھا کہ نظم خوانی کا فن، کوچوانی کے فن سے مختلف ہے۔

یون: ہاں مجھے یاد ہے۔

سقراط: تم نے یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ مختلف ہونے کی وجہ سے ان کے موضوعات بھی مختلف ہوں گے۔

یون: جی جناب۔

سقراط: اس لیے تمھارے اپنے ہی قول کے مطابق، نہ تو نظم خواں کو ہر بات کا علم ہوگا اور نہ ہی نظم خوانی کا فن ہر علم پر محیط ہوگا؟

یون: سقراط! میں ان میں سے چند مستثنیات کا بھی ذکر کروں گا۔

سقراط: یعنی تمھارا مطلب یہ ہے کہ تم دوسرے فنون کی بہت سی باتوں سے دامن بچا لو گے۔ چلو تمھیں تمام باتوں کا علم نہیں ہے تو پھر کن باتوں کا علم ہوگا؟

یون: اسے علم ہوگا کہ مرد کیا ہیں اور عورتیں کیا۔ اسی طرح آزاد افراد کی گفتگو کیسی ہوگی اور غلام کس طرح کی باتیں کریں گے۔ آقا کیسے الفاظ ادا کریں گے اور غلام کیسے؟

سقراط: گویا تمھارا مطلب یہ ہے کہ نظم خواں کو بہتر پتا ہوگا کہ سمندر میں ہچکولے کھانے والے جہاز کے کپتان کی گفتگو کیسی ہوگی؟

یون: جی نہیں اس بارے میں جہاز راں ہی بہتر جان سکتا ہے۔

سقراط: یا اسی طرح نظم خواں کو طبیب سے بہتر معلوم ہوگا کہ مریض سے معالج کو کیا کہنا چاہیے۔

یون: اسے معلوم نہیں ہوگا۔

سقراط: کیا اسے یہ معلوم ہوگا کہ غلام کیا کہے گا۔

یون: جی ہاں۔

سقراط: فرض کیجیے، ایک غلام مال مویشیوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ کیا نظم خواں کو اس غلام چرواہے سے بہتر معلومات ہوں گی کہ وہ گلہ کی بے چینی کو ختم کرنے کے لیے کیسی آواز نکالے؟

یون: جی نہیں۔

سقراط: کیا اُسے پتا ہوگا کہ اون کاتنے والی خاتون کو کیا کہنا چاہیے؟

یون: جی نہیں۔

سقراط: بہر حال کیا اسے یہ معلوم ہوگا کہ ایک سپہ سالار فوجیوں کی حوصلہ افزائی کس طرح کرے گا؟

یون: جی ہاں، یہ وہ بات ہے، جس پر نظم خواں کو مکمل عبور ہوگا۔

سقراط: اچھا۔ اچھا کیا نظم خوانی کا فن وہی ہے جو سپہ سالار کا ہوتا ہے؟

یون: سپہ سالار جو کچھ کہے گا اس کا مجھے یقیناً علم ہے۔

سقراط: جی ہاں کیوں نہیں۔ بات یہ ہے یون کہ تمھیں نظم خوانی بھی آتی ہے اور تم سپہ سالاری کے فن سے بھی واقف ہو۔ اسی طرح تمھیں شہسواری پر بھی عبور ہے اور بربط نوازی پر بھی۔ تمھیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ گھوڑے کب قابو میں تھے اور کب بے قابو ہو گئے۔ ذرا یہ بتاؤ کہ تمھیں یہ کس طرح معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑے قابو میں ہیں یا بے قابو، شہسوار کی حیثیت سے یا بربط نواز کی حیثیت سے۔ تمھارا جواب کیا ہے، بتاؤ۔

یون: میں تو کہوں گا شہسوار کی حیثیت سے۔

سقراط: اور جب کسی کی بربط نوازی پر رائے زنی کرو گے تو اس کے بربط نواز ہونے کی حیثیت سے فیصلہ کرو گے، شہسوار کی حیثیت سے نہیں؟

یون: جی ہاں۔

سقراط: اسی طرح سپہ سالار کی ہنرمندی پر فیصلہ نظم خوانی کی بنا پر کرو گے یا فن سپاہ گری کی روشنی میں؟

یون: میں سمجھتا ہوں ان دونوں میں شاید ہی کوئی فرق ہو۔

سقراط: کیا مطلب۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو کہ فن نظم خوانی اور فن سپہ گری دونوں ایک ہی ہیں؟

یون: جی ہاں۔ ان دونوں میں کچھ فرق نہیں۔

سقراط: گویا جو اچھا نظم خواں ہے وہ عمدہ سپہ سالار بھی ہوگا؟

یون: یقیناً سقراط یقیناً۔

سقراط: یعنی اچھا سپہ سالار اچھا نظم خواں ہوگا؟

یون: جی نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا۔

سقراط: لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ اچھا نظم خواں، عمدہ سپہ سالار بھی ہوتا ہے؟

یون: درست ہے۔

سقراط: تم تو ہیلینا کے بہترین نظم خواں ہو؟

یون: جی ہاں، میں بہترین نظم خواں ہوں۔

سقراط: تو کیا یون تم بہترین سپہ سالار بھی ہو؟

یون: یقیناً۔ سقراط میرا استاد ہومر ہے۔

سقراط: چلو ذرا اس کی مزید وضاحت کر لیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ تم بہترین سپہ سالار ہوتے ہوئے بھی محض ایک نظم خواں ہو۔ رزمیہ نظمیں سناتے ہو اور بس۔ تمھارا خیال ہے کہ اہل ہیلینا (Hellenes) کو کسی سپہ سالار کی نہیں، نظم خواں کی ضرورت ہے؟

یون: سقراط! اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے ہم وطن ایفیسیا کے لوگ (Ephesians) ایتھنز (Athenes) کے ملازم اور سپاہی ہیں اور انھیں سپہ سالار کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کو اور سپارٹا (Sparta) کے باشندوں کو میری ضرورت نہ ہو۔ کیونکہ آپ کے یہاں اپنے متعدد سپہ سالار موجود ہیں۔

سقراط: عزیزم! کیا تم نے سائی زیکس (Cyzicus) کے اپالوڈورس (Apollodorus) کا نام نہیں سنا ہے؟

یون: وہ کون ہے؟

سقراط: وہ ایسا شخص ہے جسے وہاں کا شہری نہ ہونے کے باوجود ایتھنز والوں نے اپنا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ اسی طرح اس نے صرف لیاقت اور صلاحیت کی بنا پر اینڈروس(Andros) کے فینوس تھینس (Phanosthenes) اور کلیز ومینیا(Clazomenae) کے ہراکلیڈ س(Heraclides) کو اپنا سپہ سالار بھی مقرر کیا اور دیگر عہدوں پر بھی فائز کیا۔ حالانکہ وہ باہر سے آئے ہوئے تھے۔ تو کیا وہ ایفیسیا کے(Ephesian) یون کو اگر وہ اپنی صلاحیت کا لوہا منوالے تو اپنا سپہ سالار مقرر نہیں کریں گے۔ کیا ایفیسیا کے باشندے دراصل ایتھنز کے باشندے نہیں تھے؟ لیکن اگر تمھاری بات سچ ہے کہ تم اپنے فن اور معلومات کی وجہ سے ہومر کو سراہتے ہو تو تم میری بات سمجھ نہیں رہے ہو۔ جہاں تک ہومر سے متعلق متعدد عمدہ باتیں جاننے اور ان کے موثر بیان کا وعدہ کرنے کا تعلق ہے یہ محض تمھاری فریب کاری ہے کیونکہ جس فن کے تم ماہر ہو اس کی پیشکش کی ماہیت بتانے سے قاصر ہو۔ میں کئی بار درخواست بھی کر چکا ہوں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ متلون مزاج پروٹیئس (Proteus) کی طرح تمھارے متعدد پہلو ہیں اور تم پہلو بدل بدل کر طرح طرح کے انداز اختیار کرتے رہتے ہو اور پروٹیئس کی طرح ہر فرد کا بھیس بدل لیتے ہو۔ اور بالآخر سپہ سالار کی وردی پہن کر میرے ہاتھ سے نکل جاتے ہو۔ تاکہ تم ہومر کی داستان طرازی میں گم ہو جاؤ۔ اگر تم واقعی اس فن کے ماہر ہو تو جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں تم ہومر کی پر جوش ترجمانی کی تکذیب کرتے ہوئے میرے ساتھ انصاف نہیں برت رہے ہو۔ لیکن جیسا کہ مجھے یقین ہے کہ تم فن سے نابلد ہو اور ہومر کے حوالے سے تمھارے خوبصورت جملوں کی ادائیگی تمھاری لاشعوری کوشش کا ثمر ہے۔ یہ ہومر کے جوش و جذبے کا اثر ہے۔ اگر اصل صورت حال ایسی ہے تو میں تمھیں بددیانتی کے الزام سے مبرا قرار دیتا ہوں۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ تم جذب و کیف کے عالم میں رہتے ہو۔ تمھیں، کیا پسند ہے کہ تم بددیانت ہو یا جذب و کیف کے متوالے؟

یون: سقراط ان دونوں میں بہت نمایاں فرق ہے تاہم جذب و کیف کہیں بہتر ہے۔

سقراط: چلو یوں میں بہتر صورت کو تسلیم کر لیتا ہوں اور یہ سمجھ لیتا ہوں کہ ہومر کی تمھاری تعریف و توصیف جذب و مستی ہے، فنکاری نہیں۔

☆☆☆

سمپوزیم

(Symposium)

شرکائے گفتگو:

اپالوڈورس(Apollodorus)(جو اپنے ساتھیوں کے لیے ان باتوں کو دہراتا ہے جو اس نے ارسٹوڈیمس(Aristodemus) سے سنی تھیں اور اس سے پہلے وہ گلوکون (Glaucon) کو سنا چکا ہے)، فیڈرس(Phaedrus)، پاسانیئس(Pausanias)، اِریکسی میکس(Eryximachus)، ارسٹوفینس(Eristophanes)، آگاتھان (Agathon)، سقراط(Socrates)، السی بیاڈس(Alcibiades) اور رنگ رلیاں منانے والوں کا مجمع۔

مقام: آگاتھان کا مکان

جن باتوں کے بارے میں آپ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کے بارے میں میری معلومات ناقص نہیں ہیں اور میں ان کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔ پرسوں میں فلیرم(Phalerum) میں اپنے گھر سے شہر آ رہا تھا تو میرے ایک ملاقاتی نے جس نے مجھے پیچھے سے دیکھ لیا تھا کھلنڈرے لہجے میں مجھے آواز دی، ارے او فلیرم کے باسی اپالوڈورس، ذرا رک جاؤ، میں آواز سن کر ٹھہر گیا پھر اس نے کہا مجھے اس وقت آپ ہی کی تلاش تھی۔ سقراط، السی بیاڈس وغیرہ نے آگاتھان کی ضیافت میں محبت کے بارے میں جو عمدہ باتیں کہی ہیں، میں آپ سے ان کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ فونیکس(Phoenix) ولد فلپ(Philip) نے یہ بات اس سے کہی تھی جس نے مجھے بھی بتایا ہے۔ اس کا بیان واضح نہیں تھا۔ اسی نے بتایا کہ آپ بھی اس محفل میں موجود تھے۔ میں چاہتا ہوں آپ وہ باتیں مجھے بھی بتانے کی زحمت گوارا کریں۔ آپ کے علاوہ اور

کون ہے جو اپنے دوست کی باتوں کو صحیح بیان کر سکتا ہو۔ پہلے یہ بتائیے کہ کیا آپ اس محفل میں موجود تھے؟

میں نے کہا آپ کو یہ اطلاع گلوکون نے دی ہے۔ اس کی باتیں واضح نہیں ہوں گی۔ آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ محفل کب سجی تھی۔ حال ہی میں یا کچھ وقت پیشتر یا یہ کہ میں وہاں موجود تھا بھی یا نہیں۔

ہاں ہاں کیوں نہیں میرا بھی یہی خیال ہے" اس نے جواب دیا"۔

میں نے کہا بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ کو اتنی بھی خبر نہیں کہ عرصہ دراز سے آگاتھان نے ایتھنز میں قیام ہی نہیں کیا۔ سقراط سے میری جان پہچان کو تین برس بھی نہیں ہوئے ہیں اور یہ میرا معمول رہا ہے کہ میں روزانہ معلوم کروں کہ انھوں نے کیا کہا اور کیا کام کیا۔ ایک وقت تھا کہ میں ملازمت کے سلسلے میں زمین کا گز بنا ہوا تھا۔ میری حالت قابلِ رحم تھی۔ اس وقت آپ کا جو حال ہے اس سے کسی طرح بہتر نہیں، مذاق برطرف، میں نے سوچا، متفکر اور فلسفی ہونے سے بہتر ہے کہ کوئی ڈھنگ کا کام کیا جائے۔

اچھا یہ بتائیے کہ محفل کب منعقد ہوئی؟

اس نے جواب دیا، ہمارے بچپن میں آگاتھان کو المیہ (ٹریجیڈی) بیان کرنے پر پہلی بار انعام ملا تھا۔ اس کے ایک دن بعد اس نے اپنے ہمنواؤں کے ساتھ فتح کی خوشی میں قربانی دی تھی۔

پھر تو یہ بہت ہی پرانی بات ہوگی؟ اس نے پوچھا یہ باتیں آپ کو کس نے بتائیں۔ خود سقراط نے؟

میں نے جواب دیا، جی نہیں اسی شخص نے جس نے اس کا ذکر فونکس (Phoenix) سے کیا تھا۔ وہ ٹھگنا تھا اور ہمیشہ ننگے پاؤں رہتا تھا۔ یہ تھا ارسٹوڈیمس جو موضع سائی ڈے تھیلیم (Cydathenacum) کا رہنے والا تھا۔ وہ آگاتھان کی ضیافت میں شریک تھا۔ میرا خیال ہے اُس دور میں اس سے زیادہ کوئی اور شخص سقراط کا مداح نہیں تھا۔ مزید برآں میں نے تقریر کے کچھ حصوں کی توثیق خود سقراط سے کرائی تھی۔ پھر اس نے کہا گلوکون ان باتوں کا اعادہ کر لیں۔ کیا ایتھنز کا راستہ ایسی ہی باتوں سے نہیں کٹے گا؟ بس پھر کیا تھا ہم لوگ چلتے چلتے محبت کے بارے میں ان کی باتوں کا ذکر کرتے رہے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تمھاری خواہش کی تکمیل کے لیے میری تیاری ناقص نہیں ہے۔ اگر چاہو تو ہم اس کی ایک اور مشق کر لیں۔ فلسفے کی باتیں کرنا اور دوسروں سے سننا دونوں مجھے بہت پسند ہیں۔ کیونکہ اس سے فائدے کے علاوہ لطف بہت آتا ہے۔ لیکن جب میں آپ جیسے اُمرا اور تجار کی کسی اور انداز کی باتیں سنتا ہوں تو میری طبیعت بگڑ جاتی ہے اور مجھے آپ جیسے دوستوں پر رحم آنے لگتا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کوئی کارنامہ انجام دے رہے ہیں حالانکہ کام کی کوئی بات

نہیں ہوتی۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ آپ مجھے قابلِ رحم شمار کرتے ہوں گے۔ ممکن ہے آپ کی بات درست ہو لیکن مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کی میرے بارے میں کیا رائے ہے۔ بس یہی فرق ہے۔

ہم سفر: بہت خوب، اپالوڈورس تم ذرا سا بھی تبدیل نہیں ہوئے ہو۔ ہمیشہ خود کو بھی برا بھلا کہتے ہو اور دوسروں کو بھی۔ مجھے یقین ہے کہ تمھیں سوائے سقراط کے باقی تمام انسانوں پر ترس آتا ہے۔ بلکہ پہلے اپنی ذات پر تاسف کرتے ہوں گے۔ یہ تمھارے پرانے نام کے عین مطابق ہے جو کتنا ہی موزوں کیوں نہ ہو لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ وہ نام کس طرح رکھا گیا یعنی دیوانہ اپالوڈورس۔ یہ صحیح ہے کہ ہمیں سوائے سقراط کے خود پر بھی اور دوسروں پر بھی سخت غصہ آتا ہے۔

اپالوڈورس: دوست یہ بات بالکل درست ہے۔ مجھے لوگ دیوانہ اور خرد سے بیگانہ کہتے ہیں۔ اس کی وجہ خود اپنے اور آپ کے بارے میں میرے اسی طرح کے خیالات ہیں۔ اس کے لیے مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔

ہم سفر: اپالوڈورس اس بات کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ میں پھر درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس گفتگو کا اعادہ کریں۔

اپالو: اچھا پھر سنو۔ محبت کی داستان اس طرح جاری رہی۔ لیکن بہتر ہے کہ میں ابتدا ہی سے شروع کروں۔ اور کوشش کرکے ارسٹوڈیمس کے اصل الفاظ ہی دہراؤں۔

اس نے کہا کہ وہ سقراط سے اس وقت ملا تھا جب وہ حمام سے لوٹ رہے تھے وہ سینڈل پہنے ہوئے تھے۔ جو عجیب سا لگ رہا تھا کیونکہ یہ ان کا معمول نہیں تھا۔ اس نے پوچھا کہ اس طرح بن ٹھن کر کہاں جا رہے ہو؟

انھوں نے جواب دیا آگاتھان کے یہاں ایک ضیافت میں۔ کل انھوں نے فتح کے موقع پر قربانی کا جشن منایا تھا۔ انھوں نے مجھے مدعو کیا تھا مگر اس نے اس خوف سے انکار کر دیا کہ وہاں بھانت بھانت کے لوگ جمع ہوں گے۔ لیکن میں نے آج کی تقریب میں شرکت کا وعدہ کر لیا تھا۔ اسی لیے اعلیٰ لباس پہنے ہوئے ہوں۔ کیونکہ میں اتنے نفیس آدمی کے پاس جو جا رہا ہوں۔ اگر میں تمھیں بن بلائے مہمان کی طرح ساتھ لے جاؤں تو تمھیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟

میں نے کہا آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔

انھوں نے کہا آؤ ساتھ چلو' ہم پرانی ضرب المثل کو غلط ثابت کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ:

''ادنیٰ لوگوں کی دعوت میں عمدہ لوگ بن بلائے جاتے ہیں''۔

اس کی بجائے ہماری ضرب المثل یوں ہوگی:

''نفیس لوگوں کی ضیافت میں نفیس لوگ بن بلائے جاتے ہیں''۔

اس تبدیلی کی سند خود ہومر کے یہاں موجود ہے جو نہ صرف اس ضرب المثل کو ختم کرتا ہے بلکہ اسے پامال کر دیتا ہے۔ وہ آ گامیمنون (Agamemnon) کو شجاع ترین شخصیت قرار دے کر، ایک معمولی دل گردے والے مینیلاس (Menelaus) کو آ گامیمنون کی ضیافت میں بن بلائے شرکت کراتا ہے۔ یہ قربانی کی تقریب ہوتی ہے۔ یہ انداز بہتر کو بدترین نہیں بلکہ بدتر کو بہتر بناتا ہے۔

ارسٹوڈیمس نے کہا، سقراط مجھے ڈر ہے کہ میرا ابھی یہی حال نہ ہو اور میں ہومر کی نظم میں مینیلاس کی طرح ادنیٰ بن جاؤں جو ''داناؤں کی ضیافت میں بن بلائے جاتا ہے۔'' لیکن میں یہ بھی تو کہہ سکتا ہوں کہ آپ مجھے ہمراہ لائے ہیں۔ پھر آپ کوئی نہ کوئی بہانہ تراشیں گے۔ اس نے کہا:۔

''کیا کریں دونوں ساتھ تھے''۔

ہومر کے رنگ میں کوئی نہ کوئی عمدہ بہانہ تراش لیں گے۔

راستے میں وہ اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ سقراط اپنے آپ میں گم سب سے پیچھے چل رہا تھا۔ ارسٹوڈیمس اس کے انتظار میں کھڑا ہو گیا تھا۔ سقراط نے کہا تم آگے چلو۔ جب وہ آ گاتھان کے مکان پر پہنچا تو دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اس دوران ایک نہایت پرلطف واقعہ رونما ہوا۔ ملازم نے ہمیں فوراً ہی ضیافت کے بڑے کمرے میں پہنچا دیا جہاں لوگ ضیافت کے انتظار میں آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔ آ گاتھان نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔ اگر کسی کام سے آئے ہو تو اسے بھول جاؤ اور ضیافت میں شریک ہو جاؤ۔ میں تو کل سے تمھیں تلاش کر رہا تھا۔ اگر مل جاتے تو ضرور مدعو کرتا۔ لیکن تم نے سقراط کو کہاں بھیج دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو سقراط کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ میں نے کہا حیرت ہے ابھی ابھی وہ میرے ہمراہ تھا۔ میں تو اس ہی کے کہنے پر یہاں آیا ہوں۔

آ گاتھان نے کہا تم نے یہاں خود آ کر بہت اچھا کیا لیکن وہ حضرت خود کہاں ہیں؟

میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ میرے ساتھ تھے۔ اس نے کہا پتا نہیں انھیں کیا ہو گیا۔

آ گاتھان نے ملازم سے کہا جاؤ انھیں تلاش کر کے لاؤ اور اس دوران ارسٹوڈیمس، آپ اریکسی میکس (Eryximachus) کے ساتھ تشریف رکھیں۔

ملازم نے اس کا ہاتھ منہ دھلایا اور وہ آرام سے لیٹ گیا۔ اسی لمحے دوسرا نوکر آیا اور اس نے بتایا کہ سقراط تو برابر والی کوٹھی کے برآمدے میں آرام فرما ہیں۔ بلکہ وہاں سو رہے ہیں۔ انھیں آواز دی لیکن انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

آگاتھان نے کہا۔ عجیب بات ہے جاؤ انھیں بار بار پکارتے رہو۔

خبر لانے والے نے کہا جناب انھیں اسی طرح تنہا چھوڑ دیں۔ وہ راہ میں جہاں جی چاہتا ہے رک جاتے ہیں اور کسی وجہ کے بغیر ذہنی طور پر گم ہو جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔ لہٰذا انھیں پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔

آگاتھان نے کہا اچھا اگر تمھارا یہی خیال ہے تو انھیں مت چھیڑو۔ اتنا کہہ کر اس نے نوکر کو حکم دیا کہ کسی تاخیر کے بغیر کھانا لگا دیا جائے اور اپنی مرضی کے مطابق کھانا پیش کیا جائے۔ تمھیں کوئی حکم دینے والا نہیں ہے۔ میں نے کبھی تم لوگوں کو کھلی چھٹی نہیں دی تھی۔ آج یوں سمجھ لو کہ تم لوگ ہی میزبان ہو جبکہ میں اور میرے یہ تمام ساتھی تمھارے مہمان ہیں۔ خدمت اور پیشکش عمدہ ہوگی تو سب تمھاری تعریف کریں گے۔ اس کے بعد بہترین کھانا تناول کیا گیا لیکن سقراط کا کہیں نام ونشان نظر نہ آیا۔ کھانے کے دوران آگاتھان نے بارہا اسے بلانے کا قصد کیا لیکن اسے ہر بار ارسٹوڈیمس نے منع کر دیا اور جب ضیافت نصف کے قریب ختم ہوئی تو سقراط کمرے میں داخل ہوا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دورہ زیادہ طویل نہیں تھا۔ آگاتھان میز کے ایک سرے پر تشریف فرما تھا۔ اس نے سقراط سے درخواست کی کہ وہ اس کے برابر والی کرسی پر تشریف رکھیں تاکہ میں آپ کے لمس سے ان خیالات سے مستفیض ہوں جو ہمسایہ کے برآمدہ میں آپ کے ذہن میں آئے ہوں اور اب وہ آپ کے حافظے میں موجود ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی جستجو میں کامیاب ہونے کے بعد ہی یہاں تشریف لائے ہیں۔

سقراط حسب منشا برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ کاش دانائی صرف لمس کے ذریعے ہی بھرے ہوئے انسانوں سے خالی انسانوں تک منتقل کی جا سکتی۔ بالکل اسی طرح جس طرح پانی بھرے برتن سے اون سے گزر کر خالی برتن میں چلا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ کے ساتھ مل کر بیٹھنا میرے لیے کتنا قابل قدر ہوتا۔ آپ مجھے اپنی کثیر اور نفیس دانائی کی دھاروں سے لبالب کر دیتے جبکہ میری دانائی بہت ہی گھٹیا اور قابل اعتراض ہے۔ وہ کسی خواب سے بہتر نہیں ہے۔ آپ کی دانائی روشن اور نہایت امید افزا ہے جس کا مظاہرہ آپ نے پرسوں جوانی کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ہیلینا کے تیس ہزار

باشندوں کے سامنے کیا تھا۔

آگاتھان نے کہا، سقراط آپ تو میری ہنسی اڑا رہے ہیں۔ وہ وقت جلد آئے گا جب ہم دونوں یہ طے کرلیں گے کہ دانائی کا تاج کس کے سر پر زیب دیتا ہے۔ یہی مجمع اس امر کا فیصلہ کرے گا۔ بہتر ہے کہ آپ کھانے پر توجہ دیں۔

سقراط کرسی پر بیٹھ گیا اور سب کے ساتھ کھانے میں شریک ہوگیا۔ دیوتاؤں کی نذر نیاز پیش کی گئی۔ حمد یہ گیت سنایا گیا۔ معمول کی رسومات ادا کی گئیں۔ محفل ناؤنوش گرم ہونے ہی والی تھی کہ پاسانیئس (Pausanias) نے کہا دوستو ہم شراب نوشی کس طرح کریں کہ ہمیں ذرہ برابر بھی نقصان نہ پہنچے۔ میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ گزشتہ روز کی شرابوں نے میری حالت خراب کر رکھی ہے۔ افاقہ کے لیے مجھے وقت چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے بیشتر احباب کی ایسی ہی خراب حالت ہے کیونکہ آپ بھی تو کل کی محفل میں شریک تھے۔ ذرا سوچیے شراب نوشی کو کس طرح آسان ترین بنایا جاسکتا ہے۔

ارسٹوفینس (Aristophanes) نے کہا مجھے آپ سے کلی اتفاق ہے۔ ہمیں کثرت مے نوشی سے دور ہی رہنا چاہیے۔ کل جو دوست غرق ہونے سے تائب ہوئے ان میں میں بھی شامل تھا۔

اکیومینس (Acumenus) کے بیٹے اریکسی میکس (Eryximachies) سے کسی نے کہا، میرا خیال ہے تم ٹھیک ہی کہتے ہو لیکن میں چاہتا ہوں کوئی شخص اپنی رائے کا اظہار کرے۔ کیا آگاتھان کثرت سے شراب پی سکتے ہیں؟

آگاتھان نے کہا یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اریکسی میکس سے کس نے کہا ارسٹوڈیمس، فیڈرس، وغیرہ اور میرے جیسے کم عقل کبھی شراب نوشی کے قریب نہیں پھٹکے، آج وہ کتنے خوش نصیب ہیں کہ انھیں معلوم ہو رہا ہے کہ بڑے بڑے دانا بھی شراب نوشی کے لیے تیار نہیں ہیں۔ (میں اس زمرے میں سقراط کو شامل نہیں کرتا جو شراب پی بھی سکتا ہے اور اس سے اجتناب بھی برت سکتا ہے۔ اور اسے اس بات کی بھی پروا نہیں ہوتی کہ ہم سب کیا کر رہے ہیں)۔ دیکھیے محفل میں کوئی بھی زیادہ شراب خوری پر آمادہ نظر نہیں آتا۔ معذرت خواہ ہوں کہ مجھے ایک طبیب کی حیثیت سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ کثرت شراب نوشی بری عادت ہے۔ اگر ہوسکے تو میں خود بھی اس پر عمل کرتا ہوں اور دوسروں کو بھی اسے پینے کی سفارش نہیں کرتا خاص طور ان لوگوں کو تو شراب نوشی کا بالکل ہی مشورہ نہیں دوں گا جن پر کل کی مے نوشی کا گہرا اثر ہے۔ مائیری نیوسی کے رہنے (Myrrhinusian) والے فیڈرس نے رائے زنی کی ہے کہ ہمیشہ بطور طبیب آپ جو مشورے دیتے ہیں میں

ہمیشہ ان پر عمل کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ دیگر شرکائے محفل بھی اسی مشورے پر عمل پیرا ہوں گے۔ طے یہ ہوا کہ شراب نوشی اجتماعی سطح پر نہیں ہوگی لیکن انفرادی طور پر احباب حسب منشا شراب پی سکتے ہیں۔

اس کے بعد اریکسی میکس نے کہا آپ سب نے اتفاق کیا ہے کہ مے کشی رضا کارانہ طور پر ہوگی کسی پر کوئی جبر نہیں ہوگا۔ اگلے قدم کے طور پر میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ نے نواز لڑکی جو ابھی ابھی اس محفل میں شامل ہوئی ہے اسے یہاں سے رخصت کر دیا جائے اور وہ باہر جا کر بانسری بجائے یا خواتین کے حصے میں جا کر اپنا ہنر پیش کرے۔ آج ہم صرف باتیں کریں گے اور اگر آپ اجازت دیں تو میں موضوع طے کر دوں۔ جب محفل نے یہ تجویز منظور کر لی تو اریکسی میکس نے بتایا کہ "میں بات کا آغاز اسی انداز میں کروں گا جس کا ذکر میلانپ (Melanippe) نے یوری پائڈز (Euripides) میں یوں کیا ہے:

"الفاظ میرے نہیں ہوں گے"۔

میں فیڈرس کے برخلاف اسی کی طرح بات کرنے والا ہوں۔ کیوں کہ وہ اکثر مجھے غصے میں اسی لہجے میں کہتا ہے۔ اریکسی میکس یہ کتنی عجیب بات ہے۔ دیوتاؤں کی شان میں نظمیں اور مذہبی گیت تو لکھے گئے ہیں لیکن شعرا نے جوان گنت ہیں محبت کی مدح خوانی بالکل نہیں کی ہے۔ پروڈیکس (Prodicus) جیسے نالائق سوفسطائی بھی ہیں۔ جنھوں نے نثر میں ہراکلس اور دیگر سورماؤں کی خوبیاں زور و شور سے بیان کی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ مجھے ایک فلسفیانہ تصنیف ملی جس میں نمک کی افادیت کے بارے میں بڑی دلکش بحث کی گئی ہے۔ اس طرح کی متعدد باتیں ہیں جن پر اسی طرح کے انعامات دیئے گئے ہیں۔ قابل غور امر یہ ہے کہ بے شمار ایسی دلچسپیاں ہیں جن کو موضوع بنایا گیا ہے لیکن اگر موضوع نہیں بنایا گیا تو "محبت" کو۔ اس معاملے میں فیڈرس صحیح کہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی معلومات میں اضافہ کروں۔ علاوہ ازیں میرا یہ بھی خیال ہے کہ حاضرین مجلس کے لیے بہتر ہوگا کہ ہم اس وقت "محبت" کو موضوع گفتگو بنائیں اور محبت کے دیوتا کے حضور ہدیہ عقیدت پیش کریں۔ اگر آپ مجھ سے متفق ہوں تو باتوں کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر فرد محبت کے بارے میں عقیدت کے کلمات ادا کرے۔ گفتگو بائیں سے دائیں جانب چلے گی۔ ہر فرد اپنی رائے بہترین طریقے سے پیش کرے گا۔ گفتگو کا آغاز فیڈرس سے ہوگا کیونکہ اولاً وہ بائیں سرے پر بیٹھا ہے اور ثانیاً وہی اس خیال کو جنم دینے والا بھی ہے۔

سقراط نے کہا اریکسی میکس جب تمھاری رائے کی کوئی مخالفت نہیں کرے گا تو میں تمھاری تجویز کو کس طرح رد کر سکتا ہوں۔ میں تو صرف محبت کا داعی ہوں۔ اسی کی تفہیم کا قائل ہوں میرے خیال میں

آ گاتھان اور پاسانیئس بھی میرے ہم خیال ہیں اور ارسٹوفینس کے بارے میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے۔ جو مکمل طور پر ڈائیونائیسس (Dionysus) اور ایفروڈائٹ (Aphrodite) ہی سے متعلق ہیں۔ میرے اردگرد اس وقت جو لوگ جمع ہیں ان میں سے کوئی بھی اس کا مخالف نہیں ہے۔ میں سوچتا ہوں یہ تجویز ہم سب کے لیے مشکل ہے کیونکہ ہم سب سے آخر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر ہمیں پہلے چند پُرسحر تقاریر سننے کو مل جائیں تو یہ امر بہت ہی اطمینان بخش ہوگا۔ چلیے محبت کو سراہنے کے کام کا آغاز فیڈرس خود کریں۔ ہم ان کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔ حاضرین نے اپنی متفقہ رائے کا اظہار کیا۔ اور ان سے سقراط کی تجویز پر عمل کرنے کو کہا۔

ارسٹوڈیمس کو تقریر کے تمام نکات یاد نہیں تھے اور نہ ہی انھوں نے جو باتیں مجھے بتائی تھیں وہ مکمل طور پر حافظے میں محفوظ تھیں تاہم چند نکات کو میں نے اہم سمجھ کر یاد رکھا ہے اور میں وہ باتیں بھی دہرا سکتا ہوں جو بڑے بڑے مقررین نے کی تھیں۔

فیڈرس نے آغاز میں کہا کہ محبت ایک عظیم دیوتا ہے جو دیگر دیوتاؤں اور انسانوں سے مختلف ہے۔ اس کی پیدائش حیران کن طریقے سے ہوئی ہے۔ وہ قدیم ترین دیوتا ہے۔ یہ اس کا اعزاز ہے۔ اس امتیاز کے لیے اس کے دعوے کا ثبوت یہ امر ہے کہ اس کے والدین کی کوئی یادگار باقی نہیں۔ نہ کسی شاعر اور نہ ہی کسی نثر نگار نے اس کے والدین کا کبھی ذکر کیا۔ جیسا کہ ہیزیوڈ (Hesiod) نے کہا ہے:

> ''پہلے انتشار نمودار ہوا۔ اس کے بعد وسیع و عریض زمین تشکیل پائی جو تمام
> موجودات کا ازلی مرکز ہے اور ساتھ ہی محبت کا وجود ہوا۔''

بالفاظ دیگر انتشار کے بعد زمین اور محبت کی تشکیل ہوئی۔

ہیزیوڈ کی اس بات سے اکیوزیلاس (Acusilaus) کو بھی اتفاق ہے۔ ان گنت افراد اس حقیقت کے شاہد ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ محبت قدیم ترین دیوتا ہے۔ وہ صرف قدیم ترین ہی نہیں بلکہ ہمارے لیے بہت زیادہ مفید بھی ہے، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ ان نوجوانوں کے لیے جو عملی زندگی میں قدم رکھ رہے ہیں، پاکیزہ محبت میں عاشق کے لیے نوجوان محبوب سے بڑھ کر کوئی اور نعمت نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ایسے افراد کے لیے دوسرا کوئی اصول نہیں ہے جو شریفانہ زندگی گزارنے کے خواہش مند ہیں۔ میں کہتا ہوں ایسا اصول نہ تو قرابت داری ہے، نہ عزت و آبرو ہے، نہ دولت ہے اور نہ ہی کوئی اور ترغیب و تحریص جو محبت کی جگہ لے سکے۔ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ میں ذکر کر رہا ہوں تکریم و تذلیل کے احساس کا جس کے بغیر نہ کوئی ریاست اور نہ کوئی فرد کار نمایاں انجام دے سکتا ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں

کہ اگر کسی عاشق کو اس کا معشوق کوئی غلط اور ذلیل حرکت کرتا دیکھ لے تو اسے اتنی تکلیف ہوگی جتنی اس کے والدین یا ساتھی یا کسی اور کو دیکھنے سے نہیں ہوگی۔ اسی طرح محبوب کا بھی یہی حال ہوگا اگر اسے بھی کسی ذلیل حرکت کا مرتکب دیکھ لیا جائے۔ اگر کوئی ایسا طریقہ ہاتھ آ جائے جس کے تحت حکومت اور فوج صرف محب اور محبوب پر ہی مشتمل ہو تو وہ ریاست بڑی بہترین ہوگی۔ وہاں کوئی ایسا کام نہیں ہوگا جو ذلت وخواری کا باعث بنے اور بصورت جنگ ان کی مٹھی بھر تعداد دُنیا کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گی اور اسے نیچا دکھائے گی۔ محب کبھی یہ پسند نہیں کرے گا کہ دنیا دیکھتی ہے تو دیکھے لیکن اس کا محبوب اسے اپنا مورچا چھوڑتے یا ہتھیار ڈالتے ہوئے نہ دیکھے۔ وہ ہزار بار موت کو گلے لگائے گا لیکن ایسی ذلت برداشت نہیں کرے گا۔ یا ایسا کون سا محب ہو گا جو اپنے محبوب کو مصیبت میں ڈال کر کھسک جائے۔ ایسے موقع پر بزدل سے بزدل انسان بھی شجاعت کا پیکر بن جائے گا۔ محبت کی وجہ سے اس کا دل جوش وجذبے کا مرکز بنے گا۔ وہ حوصلہ جو ہومر کے قول کے مطابق دیوتا چند سورماؤں کے دل میں جاگزیں کر دیتا ہے وہی جذبہ محبت کے طفیل محب کے دل میں خود بخود موجزن ہو جاتا ہے۔

صرف محبت ہی محبوب کے لیے جان دینے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ اس میں مرد یا عورت کی کوئی قید نہیں۔ ہیلاز کے باشندوں کے لیے پلیاس (Pelias) کی بیٹی الکسٹس (Alcestis) ایک لازوال مثال ہے۔ وہ اپنے شوہر کے عوض اپنی جان دینے پر تیار ہوگئی حالانکہ اس کے ماں، باپ یا کوئی اور اس کام کے لیے تیار نہ تھا۔ یعنی اس کی محبت کی نزاکت سب پر اس طرح بازی لے گئی کہ وہ سب خونی تعلق ہونے کے باوجود خود اپنے ہی بیٹے کے لیے اجنبی نظر آنے لگے۔ رشتہ برائے نام رہ گیا۔ یہ عمل دیوتاؤں اور انسانوں کی نظر میں اتنا وقیع تھا کہ متعدد نیک کردار افراد کا شمار ان معدودے چند میں ہوتا ہے جنھیں دیوتاؤں کی خوشنودی کے سبب دوبارہ دنیا میں زندہ ہونا نصیب ہوا۔ دیوتاؤں نے اسے اپنی عزت صرف محبت کی وجہ سے عطا کی جو اس کی عقیدت کی بنیاد بنی۔ لیکن انھوں نے اویگرس (Oeagrus) کے بیٹے، بربط نواز اورفیئس (Orpheus) کو خالی ہاتھ اس طرح بھیج دیا کہ اسے صرف الکسٹس کا ہیولا عطا کیا جو اس کی محبوبہ تھی لیکن اس کی محبوبہ کو اس کے حوالے نہیں کیا کیونکہ اس کا جذبہ صادق نہ تھا۔

اسے صرف بربط نوازی سے سروکار تھا وہ الکسٹس کی طرح محبت کے لیے اپنی جان قربان نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ وہ ہمہ وقت اسی کوشش میں لگا رہتا کہ وہ عالم تحت الارض میں کس طرح زندہ داخل ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں دیوتاؤں نے اسے عورتوں کے ہاتھوں قتل کروا دیا۔ یہ اس کی بزدلی کی سزا تھی۔ اپنے محب نہیں بلکہ

محبوب پیٹروکلس کے لیے اکیلس کی محبت اس سے بالکل مختلف تھی۔ (یہ خیال کہ پیٹروکلس محبوب تھا نہایت احمقانہ ہے، جس میں ایسکی لس (Aeschylus) خواہ مخواہ کے لیے گرفتار ہوگیا۔ کیونکہ اکیلس دونوں میں سے حسین تر بلکہ تمام سورماؤں سے حسین تھا۔ اور ہومر کے الفاظ میں ابھی وہ بے ریش اور کہیں نوعمر تھا) اور دیوتا محبت کی خوبی کو بہت پسند کرتے ہیں تاہم محبوب کی طرف سے محبت کا جواب محبت سے دیا جائے تو تمام دیوتا اس کی قدر و منزلت کرتے ہیں انعام دیتے ہیں، کیونکہ محب پر ان کی کرم نوازیاں بہت ہوتی ہیں۔

اسے خدا نے خود یہ جذبہ عطا فرمایا ہے۔ اکیلس (Achilles) کی والدہ نے اسے بتا دیا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ اسے موت نہ آئے اور وہ زندہ ہی گھر لوٹ جائے اور پکی عمر تک پہنچے بشرطیکہ وہ ہیکٹر کو قتل نہ کرے۔ تاہم اس نے اپنے دوست کا انتقام لینے کے لیے اپنی زندگی قربان کردی اور اس نے اپنے دفاع میں نہیں بلکہ موت کے بعد بھی حوصلے سے جان دی۔ اسی وجہ سے دیوتاؤں نے اسے الکسٹس سے بڑھ کر اعزاز دیا اور اسے بلیسٹ (Blest) کے جزائر میں بھیج دیا۔ اسی بنیاد پر میں کہتا ہوں کہ محبت بزرگ ترین، اشرف ترین اور طاقتور ترین دیوتا ہے۔ یہی جذبہ اسے حیات میں نیکیاں اور موت کے بعد خوشیاں عطا کرتا ہے۔

فیڈرس نے یہی یا ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔ اس کے بعد چند دیگر حضرات نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا جنھیں ارسٹوڈیمس نے فراموش کردیا۔ اس نے بآسانی اس کی تقریر بیان کی۔ اس نے کہا فیڈرس آپ نے کوئی بہتر دلیل پیش نہیں کی ہے۔ ہمیں محبت کی اس طرح کی بے ربط تعریف زیب نہیں دیتی۔ اگر محبت کا ایک دیوتا ہو تو تمھاری بات مناسب ہے لیکن چونکہ محبت کے متعدد دیوتا ہیں اس لیے پہلے آپ کو یہ بتا دینا چاہیے تھا کہ آپ محبت کے کس دیوتا کی تعریف کررہے ہیں۔ میں اس نقص کی اصلاح کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے میں یہ بتاؤں گا کہ محبت کے کس دیوتا کی تعریف ہونا چاہیے۔ اس کے بعد اس کے حضور عقیدت بھری نظم اس طرح پیش کروں گا جو اس کے شایانِ شان ہو گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ محبت کو جنسی جذبوں کی دیوی ایفروڈائٹ سے جدا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اگر جنسی محبت کی ایک ہی دیوی ہے تو محبت کا دیوتا بھی ایک ہوگا لیکن چونکہ یہ دیویاں دو ہیں اس لیے دیوتا بھی دو ہوں گے۔

کیا میں غلط کہہ رہا ہوں کہ ایفروڈائٹ ایک نہیں دو ہیں۔ بڑی کی کوئی ماں نہیں ہے اس لیے اس ملکوتی ایفروڈائٹ کہا جاتا ہے۔ وہ یورانس (Uranus) کی بیٹی ہے جو عالم ملکوت کی تجسیم ہے۔ چھوٹی ایفروڈائٹ اولمپس کے دیوتاؤں کے سردار زیوس اور ڈائیون (Dione) کی بیٹی ہے، اسے ہم غیر مقدس کہتے

ہیں اور جو محبت کا دیوتا شریک کار ہے وہ بھی غیر مقدس ہے دوسرا دیوتا ملکوتی محبت کہلاتا ہے۔ تمام دیوتاؤں کی تعریف وتوصیف ضروری ہے لیکن ان کے مدارج کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس لیے میں محبت کے دونوں دیوتاؤں کی خصوصیات کو علیحدہ علیحدہ بیان کروں گا۔ ان کی کارکردگی کے انداز کے مطابق اعمال میں تبدیلی نظر آتی ہے۔ مثلاً مے نوشی، گانا بجانا، اور گفتگو جو کچھ اس وقت ہم کر رہے ہیں بذاتِ خود یہ نہ تو اچھی ہیں نہ بری۔ ان کی نوعیت ان کے کرنے کے انداز پر منحصر ہے۔ یہی کام جب اچھی طرح کیے جائیں تو وہ نیکی ہوتے ہیں اور جب بری طرح انجام دیے جائیں تو بدی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر قسم کی محبت نہیں بلکہ صرف وہ محبت اعلیٰ اور قابلِ ستایش ہوتی ہے جس کا مقصد اعلیٰ ہو۔ جو محبت مبتذل الفروڈائٹ کی اولاد ہوتی ہے وہ یقیناً مبتذل ہوتی ہے اور اس میں کوئی خوبی نہیں ہوتی۔ اس سے صرف گھٹیا مرد ہی متاثر ہوتے ہیں۔ یہ صرف عورتوں اور نوجوانوں میں مقبول ہوتی ہے۔ یہ صرف جسمانی ہوتی ہے روحانی نہیں اور اس محبت کو برتنے والے احمق افراد ہی ہوتے ہیں جن کا مقصد صرف مطلب براری ہوتا ہے لیکن حصول مطلب کے لیے عمدہ طریق کار اختیار کرنے کا انھیں خیال ہی نہیں آتا۔ اس لیے نہ نیکی کرنے کی تمیز ہوتی ہے اور نہ بدی میں ملوث ہونے کی۔ جو دیوی اس کی ماں ہے وہ دوسروں سے کہیں جواں ہے اور وہ مرد اور عورت کے ملاپ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے اس میں دونوں کی خصوصیات موجود ہیں۔

لیکن ملکوتی الفروڈائٹ کی اولاد ایسی ماں سے پیدا ہوئی ہے جس کی پیدائش میں کسی عورت کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ وہ صرف مرد سے پیدا ہوئی ہے۔ یہی محبت نوجوانوں میں مقبول ہے۔ جبکہ دیوی عمر رسیدہ ہے اس لیے اس میں کوئی لاابالی پن نہیں ہے۔ اس محبت سے متاثر فرد مرد سے رجوع کرتے ہیں اور اس کی محبت سے لطف اندوز ہوتے ہیں کیونکہ اس کا شیوہ مردانگی ہے اور وہ تیز فہم ہوتا ہے۔ ان کے تعلقات کی گرم جوشی سے ان خالص محبت والوں کی شناخت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ لڑکوں سے محبت نہیں کرتے بلکہ ایسی ہستی سے محبت کرتے ہیں جو تیز فہم ہوتے ہیں اور جن کی منطقی صلاحیت کے ابھرنے کا آغاز ہو رہا ہوتا ہے یہ وہی وقت ہوتا ہے جب ان کے چہرے پر خط نمودار ہونے لگتے ہیں اور وہ جب اپنے نوجوان ساتھی کا انتخاب کرتے ہیں تو وہ ان سے وفا نباہتے ہیں اور تمام زندگی ان کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔ وہ انھیں نہ تو اپنی ناتجربہ کاری کا شکار بناتے ہیں اور نہ ہی ان کو فریب دیتے ہیں۔ نہ ہی انھیں بیوقوف بناتے ہیں یا ایک کو چھوڑ کر دوسرے کی جانب پلٹتے ہیں۔ لیکن نوخیزوں کی محبت پر قانوناً پابندی لگا دینا چاہیے کیونکہ ان کا مستقبل غیر یقینی ہوتا ہے۔ وہ جسمانی اور روحانی لحاظ سے نیک بھی ہو سکتے ہیں اور بدی کی جانب مائل بھی اور شرافت کا بیشتر جذبہ ان

باتوں پر ضائع ہوسکتا ہے۔ اس ضمن میں نیکی بذات خود قانون بن جاتی ہے اور گھٹیا قسم کے عشاق کو بھی پابند بنانا چاہیے یا پابند بنانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ وہ بداخلاق عورتوں کی طرف مائل نہ ہوسکیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو محبت کو بدنام کرتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جنھیں اس قسم کے تعلقات کے قانونی جواز سے محروم کر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اس کی بیہودگی اور خرابی سے واقف ہوتے ہیں کیونکہ وہ بات کبھی لائق زجر و توبیخ نہیں ہوگی جو شائستہ اور جائز ہو۔

جہاں تک اصل محبت سے متعلق قوانین کا تعلق ہے۔ یہاں بھی اور لیسی ڈیمون (Lacedaemon) میں بھی وہ الجھے ہوئے ہیں لیکن بیشتر شہری ریاستوں میں وہ آسان اور عام فہم ہیں۔ ایلس (Elis) اور بوطیقا (Boeotica) جیسی دیگر ایسی ریاستیں ہیں جہاں فصیح گفتاری کا رواج عام نہیں ہے۔ یہ ضابطے نہایت سیدھے سادے ہیں۔ قانون ایسے تعلقات کی حمایت کرتا ہے۔ وہاں کے لوگ خواہ بوڑھے ہوں یا نوجوان کوئی بھی اس میں کیڑے نہیں نکالتا۔ میرے خیال میں اس کی وجہ ہے کہ وہ لوگ بولتے کم ہیں۔ اس لیے محبت کرنے والوں کو اپنا مقدمہ پیش نہیں کرنا پڑتا ہے۔ یونیا (Ionia) اور دوسری ایسی ریاستوں میں جہاں وحشی قبائل کا دور دورہ ہے وہاں کی رسوم کو لائق احترام تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔ جوانوں سے محبت کو فلسفہ اور تن سازی کے لیے ورزشوں کی طرح بدنامی کا باعث شمار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ظلم وستم کے خلاف ہے۔ حکمرانوں کا مفاد اسی سے وابستہ ہے کہ ان کی رعایا کا حوصلہ ہمیشہ کمزور رہے۔ ان میں یا ان کے معاشرے میں گہرے تعلقات قائم نہ ہونے پائیں۔ ایسے تعلقات کی نشوونما میں دیگر محرکات کے علاوہ محبت بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ایتھنز کے ہمارے مطلق العنان حکمران (Tyrants) اپنے تجربے کے تحت اس حقیقت سے واقف ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ارسٹوجیٹن (Aristogeiton) کی محبت اور ہارموڈیس (Harmodius) کی وفاکیشی نے ان کی حکومت کے منصوبے خاک میں ملا دیے۔ اس لیے ان جذبات وتعلقات کو بدنامی کے جس غار میں دھکیل دیا گیا ہے وہ دراصل بدنام کرانے والوں کی خود اپنی بدحالی کا نتیجہ ہے۔ یہ انجام ہے حاکموں کی خود غرضی اور محکوموں کی بزدلی کا۔ اس کے برخلاف چند ممالک میں محبت کو جو بلا امتیاز سراہا جاتا ہے اس کی بنیاد ایسا خیال رکھنے والوں کی سستی اور کاہلی ہے۔ خود ہماری ریاست کے اصول ان سے کہیں بہتر ہیں لیکن جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اس کی توضیح الجھن میں اضافے کا باعث بن سکتی ہے کیونکہ علانیہ محبت اس محبت سے زیادہ باوقار سمجھی جاتی ہے جو چھپ کر کی جائے۔ جو محبت افضل ترین اور اشرف ترین ہوتی ہے خواہ محبت کرنے والے معمولی شکل و صورت ہی کے کیوں نہ ہوں اسے خاص طور مستحسن گردانا جاتا ہے۔

ذرا سوچیے! کہ دنیا محبت کرنے والے کی کتنی زیادہ حوصلہ افزائی کرتی ہے کسی کو یہ اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ کوئی ایسا کام کرے گا جو ذلت آمیز ہو اور کامیابی کی صورت میں اسے سراہا جاتا ہے اور ناکام ہونے پر قصوروار گردانا جاتا ہے۔ محبت کے عمل کے دوران لوگ اسے ایسی حرکتیں کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں جسے اگر وہ کسی غرض یا عہدے اور حکمرانی کے لیے کہی جائیں تو فلسفے کی نظر میں وہ لائق معذرت ہوں گی، مثلاً اگر وہ التجائیں کرے، التماس کرے، لجاحت کرے، قسمیں کھائے، آستان یار پر سجدہ ریز ہو اور ذلیل ترین غلامی کا مرتکب ہو تو اس کے دوست اور دشمن دونوں اسے روکیں گے لیکن محبت کے معاملے میں ان پر کوئی بھی اظہار شرمندگی نہیں کرے گا۔ دشمن اس پر گھٹیا پن اور خوشامدی ہونے کا الزام نہیں لگائے گا۔ محبت کرنے والے کے ہر عمل میں ایسی خوبی ہوتی ہے جس سے اس کی شرافت نمایاں ہوتی ہے۔ روایت کے تحت وہ انتہائی لائق تحسین ہوتے ہیں اور اس سے اخلاق و کردار یکسر متاثر نہیں ہوتے۔ عجیب ترین بات یہ ہے کہ وہ لاکھ قسمیں کھائے یا حلف اٹھائے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ دیوتا اسے گناہ تسلیم نہیں کرتے، الٹا اسے معاف کر دیتے ہیں کیونکہ محبت کرنے والوں کی قسمیں ہمیشہ بے بنیاد ہوتی ہیں۔ ہمارے علاقے کی روایات کے مطابق دیوتاؤں اور آدمیوں نے محبت کرنے والوں کو اتنی زیادہ چھوٹ دے رکھی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ بڑی آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ ایتھنز میں محبّ اور محبوب دونوں ہی بڑے باعزت تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن جب والدین اپنے بچوں کو محبت کرنے والے سے راہ و رسم پیدا کرنے سے روکتے ہیں اور انھیں ایسے استاد کے سپرد کر دیتے ہیں جو ان کی ایسی باتوں پر نظر رکھتا ہے اور اس کے دوست اور ہم عمر اس قسم کی باتیں دیکھتے ہیں تو فوراً اس پر گرفت کرتے ہیں اور ان کے بزرگ ان مذمت کرنے والوں پر کوئی پابندی نہیں لگاتے۔ اس کے برعکس ان باتوں پر غور کرنے والا تو یہی سمجھے گا کہ ہم ان باتوں کو شرمناک تسلیم کرتے ہیں لیکن جیسا کہ میں آغاز میں کہہ چکا ہوں کہ میری نظر میں سچ تو یہ ہے کہ یہ حرکتیں خواہ باعزت ہوں یا باعث ذلت، ان کا فیصلہ کرنا آسان نہیں۔ یہ اس کے لیے باعث عزت ہے میں جو انھیں عزت و توقیر سے نبھاتا ہے اور اس فرد کے لیے ذلت کا باعث ہیں جو انھیں شرمناک طریقے سے انجام دیتا ہے۔ تذلیل کسی برائی کے آگے سر جھکا دینے یا کسی کام کو بُرے طریقے سے انجام دینے ہی کا نام ہے۔ عزت کسی نیکی کو تسلیم کرنے یا کسی کام کو سلیقے سے انجام دینے ہی کو کہتے ہیں۔

بدی وہ عامیانہ عاشق ہے جو صرف جسم سے محبت کرتا ہے، روح سے نہیں۔ وہ مستقل مزاج نہیں ہوتا ہے۔ اسی لیے جب جوانی کا جوش وہ، جس کا رسیا تھا ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو اس شاخ سے پرواز کر جاتا

ہے۔ وعدے وعید سب پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ جبکہ شریف النفس محبّ کی محبت دائمی ہوتی ہے۔ وہ ایک لازوال ہستی سے جڑ کر اسی کا حصہ بن جاتی ہے۔ ہمارے ملک کی روایت میں دونوں طرح کی محبتوں کے ثبوت موجود ہیں اور ہم کسی ایک قسم کی محبت اختیار کرنے کے اور دوسرے قسم کو چھوڑ دینے کے اہل بن جاتے ہیں۔ اسی لیے کسی کو محبت جاری رکھنے اور کسی کو اسے چھوڑ دینے کی تحریک دیتے رہتے ہیں۔ محبّ اور محبوب دونوں کی مقابلوں اور مصائب سے اس وقت تک آزمائش ہوتی رہتی ہے جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ محبت کی دونوں اقسام میں سے وہ کس کا اہل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو محبت اچانک ختم ہو جاتی ہے وہ مستحسن شمار نہیں کی جاتی۔ کیونکہ وقت ہی دیگر معاملوں کی طرح اس کا بھی بہترین فیصلہ کرتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ روپیہ پیسہ، دولت یا سیاسی اقتدار کی محبت میں گرفتار ہونا ذلت ہے۔ خواہ ان کی محرومی سے خوفزدہ ہو کر یا دولت اور سیاسی بد اعمالیوں سے مفاد حاصل کرنے کے جذبے سے مغلوب ہو کر یہ فیصلہ کیا جائے۔ کیوں کہ یہ چیزیں دیرپا نہیں ہوتیں یہ آنی جانی ہیں۔ ان کی بنیاد پر پُرخلوص تعلقات کبھی استوار نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے باعزت تعلق استوار کرنے کا واحد راستہ وہی ہے جسے ہماری روایات محبت کرنے والوں میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ ''نیکی'' ہے ہم پہلے ہی یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ محبت کرنے والا جو بھی خدمت انجام دیتا ہے۔ اسے نہ بے جا چاپلوسی کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی تذلیل کا سبب۔ اسی لیے محبوب کی رضا کارانہ خدمت کا ایک ہی راستہ ہے یعنی غیر شرافتمندانہ خدمت، اور وہ ہے نیکی کے کام۔

کیونکہ ہماری ایک روایت ہے جس کی رو سے جب کوئی شخص کسی دوسرے کی خدمت، اس خیال سے کرتا ہے کہ اس کی عقل و دانش کی نشوونما ہو گی یا اس میں کوئی خوبی پروان چڑھے گی تو میں کہتا ہوں ایسی رضا کارانہ خدمت کو کبھی ذلت تصور نہیں کرنا چاہیے۔ اسے چاپلوسی بھی نہیں کہا جائے گا۔ جوانی سے محبت اور فلسفے اور نیکی پر عمل درآمد ان دونوں روایات کو کسی جگہ یکجا ہونا چاہیے۔ تاکہ محبّ اور محبوب میں گہرے روابط استوار ہوں کیونکہ جب محبّ اور محبوب ملتے ہیں اور دونوں کے اپنے ضوابط ہوتے ہیں اور محبّ یہ سوچتا ہے کہ وہ اپنے دلفریب محبوب کی خدمت کر کے ایک شریفانہ کام کر رہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس شخص نے عقل و دانائی اور نیکی کی راہ دکھلا کر اس پر کرم کیا ہے اس پر مہربانی کرنا نیکی کا کام ہے ایک، دانائی اور نیکی کی ترغیب دینے کا اہل ہے اور دوسرا تربیت اور دانائی کے حصول کا شوق رکھتا ہے۔ جب محبت کے یہ دونوں پہلو ایک ہی فرد میں جمع ہو جائیں تو اسی صورت میں محبوب باعزت طریقے سے محبّ کا مطیع بن سکتا ہے۔ جب محبت کے کاروبار میں کوئی دلچسپی لی جائے تو کیا اس طرح فریب کھانا شرمندگی کی بات نہیں ہو گی۔ لیکن دیگر تمام صورتوں

میں فریب کھانا اور نہ کھانا دونوں ہی شرمندگی کا باعث بن سکتے ہیں۔ کیونکہ جو اپنے محبوب پر اس کی دولت کے سبب مہربان ہوتا ہے اور اس کی غربت کی وجہ سے مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے، دونوں صورتیں شرمناک ہیں کیونکہ اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ دولت کے لیے نیچے گر سکتا ہے لیکن یہ امر باعثِ اعزاز نہیں ہے۔ اسی اصول پر اگر کوئی فرد محبّ کا اس لیے مطیع ہو جاتا ہے کہ وہ نیک ہے اور اسے امید ہو کہ اس کے ساتھ رہ کر وہ اخلاقی ترقی کرے گا، وہ خود کو نیکی کا مجسمہ ثابت کرتا ہے، خواہ اس کا محبوب کتنا ہی بدقماش کیوں نہ ہو اور اس کا نیکی سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو اور اگر اس نے فریب کھایا ہے تو یہ اس نے ایک شریفانہ غلطی کی ہے کیونکہ اس نے یہ دکھا دیا ہے کہ جہاں تک خود اس کا تعلق ہے وہ نیکی اور اخلاقی ترقی کے لیے سب کچھ کر گزر سکتا ہے اس سے اشرف تر اور کیا بات ہو سکتی ہے اس لیے نیکی کے خیال سے دوسروں کو برداشت کرنا ہر معاملے میں شرافت کی علامت ہے۔ یہی وہ محبت ہے جو آسمانی دیوی سے کی جاتی ہے اور جو مقدس بھی ہوتی ہے اور فرد اور پورے شہر کے لیے بابرکت اور قیمتی بھی۔ یہی جذبہ محبّ اور محبوب دونوں کو اخلاقی، روحانی ترقی پر مائل کرتا ہے لیکن محبت کی دیگر تمام اقسام دوسری محبت کی شاخیں ہوتی ہیں جس کی دیوی بھی عام سی ہوتی ہے۔ محبت کی تعریف میں فیڈرس میری طرف سے تمھارے لیے یہ تحفہ ہے جو جیسا تیسا ارتجالاً تیار کیا گیا ہے۔ پاسانیس نے دم لیتے ہوئے کہا داناؤں نے مجھے اپنے خیال کے اظہار کا یہی متوازن طریقہ سکھلایا ہے۔ ارسٹوڈیمس نے کہا کہ باری تو ارسٹوفینس (Aristophanes) کی تھی لیکن یا تو وہ زیادہ کھا گئے ہیں یا کسی اور وجہ سے انھیں سخت ہچکیاں آ رہی ہیں اس لیے مجبوراً اریکسی میکس کو زحمت کرنا ہوگی۔ جو طبیب ہیں اور اپنی نشست پر آرام سے نیم دراز ہیں۔ اس نے کہا اریکسی میکس یا تو تم میری جگہ تقریر کرو یا میری ہچکی کا علاج کرو۔

اریکسی میکس نے کہا میں دونوں کام کروں گا۔ میں تمھاری جگہ تقریر کروں گا اور تم میری جگہ بولو گے۔ اس دوران تم اپنی سانس روکے رکھو۔ تھوڑی دیر کے بعد افاقہ نہ ہو تو پانی سے غرارے کر لینا۔ پھر بھی ہچکی بند نہ ہو تو کسی شے سے اس طرح ناک میں کھجلی کرو کہ چھینک آ جائے۔ دو تین چھینکوں کے بعد تیز سے تیز ہچکی بھی بند ہو جائے گی۔ ارسٹوفینس نے کہا میں آپ کے نسخے پر عمل کروں گا آپ تقریر شروع کیجیے۔

اریکسی میکس نے یہ تقریر کی۔ میں نے دیکھا کہ پاسانیس نے آغاز تو عمدہ کیا لیکن تقریر کا خاتمہ بہت پھسپھسا تھا۔ میں کوشش کروں گا کہ ان کی تقریر کی اس خامی کو رفع کر دوں۔ میرے خیال میں انھوں نے محبت کو دو اقسام میں تقسیم کر کے کوئی غلطی نہیں کی ہے لیکن میرا علم مجھے بتاتا ہے کہ دوہری محبت عورت یا کسی اور شے سے صرف روح کی رغبت ہی ہے بلکہ یہ جذبہ تمام حیوانوں میں پایا جاتا ہے۔ دراصل یہ ارضی پیداوار

ہے۔ میں بلاخوف وتردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہی وہ نتیجہ ہے جو میں نے اپنی طب کی بدولت حاصل کیا ہے۔ اسی سے مجھے معلوم ہوا کہ محبت کی دیوی کتنی شاندار اور عالمگیر ہے جس کی قلمرو ارضی وسماوی تمام اشیا پر محیط ہے۔ میں تقریر کا آغاز علم طب سے کروں گا تاکہ اس علم کو اعزاز حاصل ہو۔ انسانی جسم میں یہ دونوں قسم کی محبت پائی جاتی ہے جو واقعتاً مختلف اور ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ مختلف ہونے کی بنا پر ان کی نوعیت اور خواہشات بھی مختلف ہوتی ہیں۔ صحت مند کی خواہشات کچھ اور ہوتی ہیں مریض کی کچھ اور۔ ابھی پاسانیس نے کہا ہے کہ نیک آدمیوں کا عمل عمدہ اور برے لوگوں کا شرمناک ہوتا ہے، بالکل اسی طرح ہمارے جسم میں اچھے اور بُرے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ اچھے عناصر کو کام کرنے دینا چاہیے جبکہ برے عناصر کو کام سے نہ صرف روکنا چاہیے بلکہ انھیں دبا دینا بھی ضروری ہے۔ طبیب کا یہی کام ہوتا ہے۔ علم طب کا دائرۂ عمل یہی ہے عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ علم طب جڑی بوٹیوں اور جسمانی خواہشات کے بارے میں معلومات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور علم یہ بھی بتاتا ہے کہ کس طرح انھیں پورا کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ بہترین طبیب وہ ہوتا ہے جو عمدہ محبت کو گندی محبت سے علیحدہ کرے یا حسب ضرورت ایک کو دوسرے میں تبدیل کردے اور ماہر طبیب کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ہماری جسمانی ساخت کے ایک دوسرے کے سخت مخالف عناصر کو ہم آہنگ کر کے ایک دوسرے کا دوست بنا دے۔ سب سے زیادہ مخالف عناصر سب سے زیادہ متضاد بھی ہوتے ہیں، مثلاً گرم وسرد، تلخ وشیریں، خشک وتر وغیرہ وغیرہ۔

یہاں کے شعرا کے قول کے مطابق جس پر مجھے اعتماد ہے اسکلی پیئس (Asclepius) نے (جو میرے اجداد میں سے تھا) اس فن شریف کی بنیاد رکھی کیونکہ انھیں مخالف عناصر کو متجانس بنانے کا ہنر آتا تھا وہ نہ صرف ہر طرح کی دواؤں بلکہ ورزشوں اور جسمانی نگہداشت کے بھی ماہر تھے۔

جو بھی اس موضوع پر تھوڑی سی توجہ دے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ فن موسیقی میں بھی مخالف سروں میں توازن وتناسب پیدا کیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہراکلیٹس (Heracleitus) کا مقصد بھی یہی رہا ہو گا ہر چند کہ اس نے الفاظ کا درست استعمال نہیں کیا ہے وہ کہتا ہے ذات واحد کو انتشار نے متحد کر رکھا ہے جس کی مثال بربط اور اس کے گز کے مابین ہم آہنگی ہے۔ لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ ہم آہنگی کا دوسرا نام بے آہنگی ہے یا یہ ان عناصر سے ترتیب پاتی ہے جو ہنوز عالمِ انتشار میں ہیں تو یہ بات بہت مضحکہ خیز ہو گی۔ غالباً وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ ہم آہنگی ان مختلف تیور اور کومل سُروں سے مل کر ترتیب پاتی ہے جو ایک دوسرے سے ملتے تو نہیں لیکن فن موسیقی کے طفیل باہم متجانس بن جاتے ہیں۔ کیونکہ اگر تیور اور کومل سر، اب بھی ایک دوسرے سے نہ ملیں تو ہم

آہنگی کبھی تشکیل نہیں پائے گی اور کیونکہ ہم آہنگی راگوں کی ترتیب ہے یعنی وہ ایک طرح کا ملاپ ہے۔ لیکن ایسا ملاپ کس طرح پیدا ہو سکتا ہے جس کے عناصر باہم مختلف ہوں؟ اختلاف کی موجودگی میں ہم آہنگی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ سُروں کی طرح تال بھی چھوٹے بڑے ایسے وقفوں سے ترتیب پاتا ہے جو پہلے مختلف ہوتے ہیں اور بعد میں مربوط ہو جاتے ہیں۔ طب اور موسیقی میں ہم آہنگی کی یہ مثالیں دوسرے شعبوں پر بھی صادق آتی ہیں جس سے ان میں محبت اور تال میل کو فروغ ملتا ہے۔ اس طرح جہاں تک سُروں کے ملاپ اور تال کا تعلق ہے فن موسیقی نے بھی محبت ہی کے اصول کو اپنایا ہے۔ اسی طرح سُر اور تال کو ہم آہنگی کی بنیادی ماہیت میں اُس محبت کا سراغ ملتا ہے جس کی ابھی دو اقسام کا احساس نہیں ہوا تھا لیکن جب ان کو عام زندگی میں استعمال کرنا چاہیں تو خواہ نئی موسیقی ترتیب دینا ہو یا پہلے سے مرتب گیتوں کو سر تال میں ڈھالنا ہو یہاں ایک مشکل مرحلے کا آغاز ہوتا ہے جس کے حل کے لیے اچھے فنکار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت اچھی اور ملکوتی محبت کی داستان دہرائی جاتی ہے جس میں حسین یورانیہ (Urania) اور موسیقی کی دیوی کی کہانی شامل ہے۔ اس طرح اعتدال پسندی کو قبول کرنے کے فرض کا یا ان کا جو ابھی اعتدال کے راستے پر چل نہیں رہے ہیں لیکن وہ اس طرف قدم بڑھانے والے ہیں، کا تذکرہ ہو جاتا ہے اور ان کی محبت اور لگن بھی دہرائی جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ذلیل پولی ہا ہمنیا (Polyhymnia) کا ذکر بھی کیا جاتا ہے تاکہ یہ جتلایا جائے کہ نشاط انگیز لمحات سے لطف ضرور اٹھانا چاہیے لیکن اسے عیاشی کا ذریعہ نہیں بنایا جانا چاہیے۔۔ میرے شعبے کی طرح جس میں ہم پرخوروں کو یہ بتاتے ہیں کہ کھانے پینے میں اتنی بے احتیاطی نہ کریں کہ بیمار پڑ جائیں۔ کیونکہ کھانے میں احتیاط ضروری اور اہم ہے۔ اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ طب ہو یا موسیقی یا کوئی دوسرا انسانی یا ملکوتی شعبہ سب میں دونوں محبتوں کا حتی الامکان لحاظ رکھنا چاہیے کیونکہ ان دونوں کا وجود مسلم ہے۔

موسموں کے تغیر و تبدل میں بھی یہی دونوں اصول کارفرما نظر آتے ہیں جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں جب سرد و گرم اور خشک و تر عناصر باہمی ربط اور محبت سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور اعتدال اور تال میل کی منزل پر پہنچ جاتے ہیں تو اس سے انسانوں کو مال مویشی، سبزی ترکاری، صحت و خوشحالی نصیب ہوتی ہے اور انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن جب لاأبالی محبت حاوی ہو جاتی ہے اور موسموں پر اثر انداز ہوتی ہے تو وہ تباہی پھیلاتی ہے، وباؤں کا سرچشمہ بن جاتی ہے اور مال مویشی، درخت اور پودوں میں طرح طرح کی بیماریوں کا باعث بنتی ہے۔ حقیقت ہے کہ کُہرا، ژالہ باری اور پھپھوندی جیسے پودوں کے امراض محبت کے ان ہی مناسبہ میں افراط و تفریط سے پیدا ہوتے ہیں۔ اجرام فلکی سے موسموں کے تغیر و تبدل میں روابط کا پتا چلانے کے

لیے علم فلکیات سے مدد حاصل کی جاتی ہے۔ مزید برآں دیوتاؤں کے حضور تمام قربانیاں اور غیب دانی کے تمام شعبے وہ فن ہیں جو انسانوں اور دیوتاؤں کے مابین ربط پیدا کرتے ہیں اور ان کا تعلق اس امر سے ہے کہ نیکی کو تحفظ فراہم کیا جائے اور گھٹیا قسم کی محبت کا مداوا کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی فرد متوازن محبت کو تسلیم کرے اور اس کی تکریم اور تحریم کی بجائے دوسری قسم کی محبت کی تعظیم کرے، خواہ اس کا جذباتی تعلق دیوتاؤں سے ہو، والدین سے ہو یا زندوں اور مردوں سے، تو یہ طرح طرح کی بدعقیدگی کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ غیب دانی کا کام یہ ہے کہ وہ محبت کی ان اقسام پر نظر رکھے اور ان کی خرابیاں دور کرتی رہے۔ غیب دانی دیوتاؤں کی طرف سے انسانوں کو سکون بخشنے کا ایک وسیلہ ہے جو انسان میں موجود مذہبی یا غیر مذہبی رجحانات کے علم کے مطابق عمل پذیر ہوتا ہے۔ عمومی طور پر محبت کی یہی عظیم اور قوی بلکہ ہر شے پر قادر قوت ہے۔ وہ محبت جو خاص طور پر نیکی سے مربوط ہو جو اعتدال اور انصاف کے ساتھ پروان چڑھی ہو۔ خواہ وہ انسانوں میں موجود ہو یا دیوتاؤں میں ہو، بہت ہی توانا ہوتی ہے۔ اور وہ تمام مسرتوں اور میل ملاپ کا سرچشمہ ہوتی ہے اور ہمیں ہم سے بالاتر دیوتاؤں کے قریب کر دیتی ہے اور ہمیں ان کا اور ایک دوسرے کا دوست بناتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ متعدد ایسی باتیں حذف ہو گئی ہیں جو محبت کی تعریف و توصیف میں کہی جا سکتی تھیں لیکن ایسا ارادتاً نہیں ہوا ہے اور ارسٹوفینس یہ آپ کا کام ہے کہ آپ حذف شدہ باتوں کا ذکر کریں یا سراہنے کا کوئی اور انداز اختیار کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی ہچکیاں بند ہو چکی ہیں۔ ارسٹوفینس نے کہا، جی ہاں ہچکی آپ کے مشورے کے مطابق چھینک آنے کے بعد ہی رکی۔ عجیب بات ہے کہ جسمانی تال میل کے لیے ایسی زور دار آواز ضروری ہوتی ہے۔۔ مجھے جیسے ہی چھینک آئی افاقہ ہو گیا۔

اریکسی میکس نے کہا عزیز دوست !ارسٹوفینس آپ تقریر کرنے جا رہے ہیں اور میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ میں بھی آپ کی تقریر کے دوران آپ کی ہنسی اڑانے کے موقع کے انتظار میں رہوں گا۔

ارسٹوفینس نے ہنستے ہوئے کہا۔ آپ کی بات درست ہے میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ کیا آپ میری باتوں پر توجہ نہیں دیں گے۔ کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ جو تقریر میں کرنے والا ہوں اس میں ہماری دیوی کے سکھائے ہوئے اور بہتر طریقے کے مطابق میرے ساتھ ہنسنے کی بجائے لوگ مجھ پر ہی ہنسیں گے۔

ارسٹوفینس کیا تمھیں یہ توقع ہے کہ تم تیر چلا کر خود بچ بھی جاؤ گے؟ ٹھیک ہے اگر تم بہت محتاط رہو اور یہ بات یاد رکھو کہ تمھیں جوابدہی کے لیے تیار رہنا پڑے گا تو میں تمھیں معاف کر سکتا ہوں۔

ارسٹوفینس نے بحث کا ایک اور دروازہ کھولنے کا دعویٰ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ محبت کی تعریف کے لیے

دوسرا انداز اختیار کرے جو پاسائنیس اورار یکسی میکس ہر دو سے مختلف ہو۔ انسان نے جس طرح اسے نظر انداز کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان نے محبت کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ کیونکہ اگر اسے احساس ہوتا تو اس کے لیے خصوصی مندر اور قربان گاہیں تعمیر ہوئی ہوتیں اور اس کے حضور عقیدت سے قربانیاں پیش ہوتیں۔ لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے حالانکہ ہونا چاہیے تھا کیونکہ تمام دیوتاؤں کے مقابلے میں محبت کا دیوتا انسان کا بہترین دوست ہے۔ ان بیماریوں کا معالج اور معاون ہے جو نسل انسانی کی خوشحالی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ اس قوت کو وضاحت سے آپ کے سامنے بیان کروں۔ جو کچھ میں آپ کو سکھا رہا ہوں امید ہے آپ اسے دوسروں کو بھی سکھائیں گے۔ آیئے پہلے انسانی فطرت کی بات کریں اور دیکھیں کہ اس میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ قدیم انسان کی جو فطرت تھی وہ آج کے انسان کی نہیں ہے۔ پہلے ذکور و اناث کی تقسیم نہیں تھی۔ جنسیں دو نہیں بلکہ تین تھیں۔ مرد، عورت اور ان کا اشتراک۔ اس کے لیے ایک ایک اصطلاح تھی جو دو مزاجی کی عکاس تھی اور ایک زمانے میں جس کا وجود باقی تھا لیکن اب وہ اصطلاح باقی نہیں ہے۔ دوجنسی کی اصطلاح ایک ملامت بن گئی ہے جو کبھی حقیقت تھی۔ اولین دور کا انسان مدور تھا۔ اس کی پیٹھ اور بازو گول حلقہ بناتے تھے۔ اس کے چار ہاتھ اور چار پاؤں تھے۔ سر ایک اور چہرے دو تھے۔ جو ایک دوسرے کے مخالف سمت میں تھے۔ یہ اعضا ایک گول سی گردن سے پیوست تھے۔ جو بالکل یکساں تھی۔ اس کے چار کان اور دوجنسی عضو تھے۔ اور باقی اعضا ان کے مطابق ہی تھے۔ وہ موجودہ انسان کی طرح سیدھا ہو کر چلتا تھا۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق آگے پیچھے چل سکتا تھا۔ اور وہ بڑی تیزی سے چاروں ہاتھ اور چاروں پاؤں یعنی آٹھوں اعضا پر کروٹیں بدل سکتا تھا، بالکل کرتب دکھانے والوں کی طرح۔ یہ حرکت وہ اس وقت کرتا تھا جب اسے تیزی سے کہیں جانا ہوتا تھا۔ اس وقت تین جنسیں تھیں جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ سورج، چاند اور زمین بھی تو تین ہیں۔ جس طرح چاند کی تشکیل سورج اور زمین سے ہوئی ہے اسی طرح چاند دوجنسی ہے اس میں مردانہ اور زنانہ عناصر دونوں شامل ہیں۔ یہ تینوں اپنے والدین کی طرح گول ہیں اور ایک دائرے میں گردش کرتے ہیں۔ ان کی قوت اور طاقت زبردست تھی۔ ان کے دل میں پیدا ہونے والے خیالات نہایت عظیم تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ دیوتاؤں پر بھی چڑھ دوڑتے ہیں۔ اوٹیس (Otys) اور ایفیالٹس (Ephialtes) کی داستان ان سے متعلق ہے۔ ہومر کا کہنا ہے کہ ان میں آسمان پر چڑھنے اور دیوتاؤں پر حملہ آور ہونے کا حوصلہ تھا۔ آسمانی مجالس مشاورت میں اندیشوں کا اظہار کیا جانے لگا۔ اس پوری نسل کو بجلی کے ذریعے اس طرح نیست و نابود کر دیں جیسے دیوؤں، جنوں کو کیا تھا؟ اس طرح انسان کی پوجا پاٹ

اور قربانیاں اور چڑھاوے بھی ختم ہو جائیں گے لیکن دیوتاؤں کے لیے انسان کی بے محابا گستاخیاں بھی ناقابلِ برداشت تھیں۔

آخر کار اچھے خاصے غور و خوض کے بعد کوہ اولمپس کے دیوتاؤں کے سردار زیوس نے ایک راہ نکال لی۔ اس نے کہا میرے دماغ میں ایک ایسی تجویز ہے جس سے انسان کا غرور بھی کم ہو جائے گا اور ان کا سلوک بھی بہتر ہو جائے گا۔ میں ان کو دو حصوں میں تقسیم کر دوں گا۔ اس طرح ان کی قوت میں کمی آ جائے گی لیکن ان کی تعداد میں خوب اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس اضافے کا نتیجہ ہمارے حق میں مفید ثابت ہوگا۔ یوں وہ دو ٹانگوں پر سیدھا چلنے لگے گا۔ اگر اس طرح بھی ان کی گستاخی میں کمی نہ آئی اور خاموش نہ ہوئے تو انھیں مزید تقسیم کر دیا جائے گا۔ اور وہ ایک ٹانگ پر اچھل اچھل کر چلے گا۔ یہ کہہ کر اس نے انسان کو اچار بنانے والے سیب کی طرح ،بال سے کٹنے والے ابلے ہوئے انڈے کی طرح دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ وہ انسان کو دو حصوں میں کاٹتا رہا اور اپالو سے کہا کہ وہ ان کا چہرہ اور آدھی گردن اس طرح گھما دے کہ انسان یاد رکھے کہ اسے کبھی تقسیم کیا گیا تھا۔ اور ہمیشہ ادب و احترام قائم رکھے۔ اپالو کو اس کا زخم مندمل کرانے اور ان کی صورت باقاعدہ بنانے کا حکم بھی دیا۔ اس نے چہرہ موڑ کر سامنے کر دیا جسم کے اس حصے کو پوری طرح جلد سے بند ہو جانے والی تھیلی کی طرح ڈھانپ دیا جسے ہم شکم کہتے ہیں۔

اس کے درمیان میں منہ کا سوراخ بنا کر ایک گرہ لگا دی جسے ہم ناف کہتے ہیں۔ اس نے سینہ بھی بنایا اور اس سے تمام شکنیں دور کر دیں تقریباً اسی طرح جس طرح موچی چمڑے کو ہموار کرتا ہے۔ تاہم شکم اور ناف کے پاس چند شکنیں چھوڑ دیں۔ جو انسان کی ابتدائی حالت کی باقیات ہیں۔ انسان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا لیکن دونوں حصے ایک دوسرے سے ملنے کے لیے تڑپتے رہے۔ دونوں ملے اور ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ لپٹ کر ہم آغوش ہو گئے تاکہ وہ دوبارہ ایک ہو جائیں۔ وہ بھوک اور اپنی ذات سے بے توجہی کے سبب قریب المرگ ہو گئے۔ وہ علیحدہ علیحدہ کوئی کام کرنا نہیں چاہتے تھے اور جب ایک حصہ فوت ہو جاتا اور دوسرا زندہ رہتا تو وہ اپنے لیے حسب ضرورت ایسے مرد یا عورت کو بطور ساتھی تلاش کر لیتا، تو جو یکجا مرد عورت کے حصے تھے وہ تباہ ہو جانے والے ہی تھے کہ زیوس نے ان پر رحم کھا کر ایک نیا منصوبہ تیار کیا۔ اس نے پوری نسل کے جسمانی حصوں کو گھما کر سامنے کر دیا۔ اس طرح وہ اصل نہیں تھے وہ ٹڈیوں کی طرح زمین میں تخم کاری کرنے کے لیے ایک دوسرے کے جسم میں گرنے لگے۔ اس بدلی ہوئی ترتیب کے بعد مرد اور عورت کی باہمی ہم آغوشی کے نتیجے میں مرد نے عورت میں مادہ داخل کیا تاکہ بچے کی پیدائش ہو

اور نسل باقی رہے یا اگر مرد اور عورت کے درمیان یہ رشتہ قائم ہو تو انھیں اطمینان اور آرام نصیب ہو اور
کاروبارِ زندگی جاری رکھیں۔ دیکھیے ایک دوسرے کی قربت کے حصول کی خواہش کتنی قدیم ہے۔ ہماری قدیم
فطرت کا اتصال اسی طرح ممکن ہے۔ دونوں ایک ہو جاتے ہیں اس طرح انسان کی باہمی جدائی کا زخم مندمل
ہو جاتا ہے۔

جدائی کے بعد ہم میں سے ہر شخص کا چپٹی مچھلی کی طرح ایک ہی پہلو ہوتا ہے اور ابتدا ہی سے
اتصال کے عہد کا پابند ہے۔ اسی لیے اسے ہمیشہ اپنے جدا ہوتے ہوئے نصف کی تلاش رہتی ہے۔ جو اس
جنسی فطرت کا ایک جزو ہیں اور عورت کی محبت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ عیاش طبع مرد عموماً اسی نسل کے ہوتے
ہیں۔ عیاشی کی متلاشی عورتیں بھی مردوں پر رال ٹپکاتی ہیں جو عورتیں عورتوں کا جزو تھیں انھیں مردوں کی پروا
نہیں ہوتی لیکن انھیں عورتوں سے تعلقات مرغوب ہوتے ہیں۔ عورتوں کی ساتھی اسی قبیل کی ہوتی ہیں لیکن جو
مردوں کے جسم کا حصہ تھیں وہ جوانی میں مردوں ہی کے پاس جاتی ہیں کیونکہ کسی زمانے میں وہ اسی کے جسم کا
حصہ تھیں۔ وہ مردوں کے گرد گھومتی ہیں ان سے ہم آغوش ہوتی ہیں جو بہترین قسم کے لڑکے اور نوجوان ہوتے
ہیں اور ان میں مردانگی کا جوہر ہوتا ہے۔ چند ایسے بھی ہوتے ہیں جو انتہائی بے حیائی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن
یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ ان کی یہ حرکات حیا کی کمی کے سبب رونما نہیں ہوتیں بلکہ اس لیے کہ وہ بھرپور
مردانگی اور شجاعت کے حامل ہوتے ہیں۔ مردانگی ان کے چہرے مہرے سے ٹپکتی ہے۔ وہ اسی سے ہم آغوش
ہوتے ہیں جوان کے مثل ہوتا ہے۔ یہی وہ افراد ہیں جو مکمل نشوونما کے بعد ہمارے حکمران اور سیاست کے
ماہر بنتے ہیں جو میری باتوں کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ جب وہ مکمل طور پر جوان ہو جاتے ہیں تو انھیں
جوانوں سے محبت ہوتی ہے اور فطری طور پر مقابل زندگی اور اولاد کے خواہش مند نہیں ہوتے۔ لیکن وہ شادی
کرتے ہیں تاکہ قانون کا تقاضا پورا ہو لیکن وہ اس صورت میں بھی مطمئن زندگی گزاریں گے اگر وہ شادی کے
بندھن کے بغیر ہی ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔ ایسے مزاج والے محبت کا رجحان رکھتے ہیں اور محبت کا جواب
محبت سے دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ وصل اس سے کرتے ہیں جو ان کے جیسا ہی ہو۔ وہ دراصل
اپنے نصف وجود سے مل کر خواہ وہ دوسرا جوان ہو یا کوئی دوسری ہستی، دونوں ہی محبت، دوستی اور گہرے یارانے
کی حیرت انگیز فضا میں ڈوب جاتے ہیں اور ایک لمحے کے لیے بھی ایک دوسرے کی آنکھوں سے اوجھل نہیں
ہوتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو تمام عمر ساتھ ساتھ گزار دیتے ہیں تاہم وہ تصریح نہیں کر سکتے ہیں کہ وہ ایک
دوسرے سے کیا چاہتے ہیں۔ ان کے باہمی اشتیاق کی شدت، دو محبت کرنے والوں کے جنسی تعلق کی خواہش

کی ترجمان نہیں ہوتی بلکہ یہ کوئی ایسا جذبہ ہوتا ہے جو دونوں کی روحانی پیاس بجھاتا ہے لیکن وہ اسے بیان نہیں کر سکتے اور جس کا خاتون کو ایک دھندلا اور مشکوک قسم کا پیشگی احساس ہو جاتا ہے۔ فرض کیجیے محبّ اور محبوب پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے ہیں ایسے میں ہی ہیفسٹس (Hephaestus) اپنا بربط لیے وہاں آ نکلتا ہے اور کہتا ہے۔ ''تم دونوں آخر ایک دوسرے سے کیا چاہتے ہو۔ ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ وہ جواب میں کیا کہیں۔ مزید یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ وہ ان کی پریشانی دیکھ کر کہتا ہے کیا تمھیں آرزو ہے کہ تم دونوں کا وجود ایک ہو جائے؟ شب و روز ایک دوسرے کے ساتھ رہو۔ اگر تمھاری یہی آرزو ہے تو میں تم دونوں کو ایک دوسرے میں ضم کر سکتا ہوں۔ تم دونوں ایک ہی وجود کی طرح نشوونما پاؤ۔ تم دونوں اپنی جسمانی دوئی کے باوجود ایک واحد وجود کی طرح زندگی گزارو گے اور اس جہان میں موت کے بعد روحانی طور سے بھی ایک ہی رہو گے۔ بتاؤ کیا تمھاری یہی پیاری پیاری سی آرزو ہے۔ اس حالت کے حصول سے تم مطمئن ہو جاؤ گے۔ کوئی انسان ایسا نہیں ہوگا جو اس تجویز کو سن کر منفی جواب دے گا یا اسے تسلیم نہیں کرے گا کہ ایک دوسرے میں گھل مل جائے اور دو کی بجائے باہم ایک ہو جانے کی شدید خواہش اس کی قدیم ترین ضرورت کی تکمیل ہے۔'' اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدا میں انسانی فطرت ایک ہی تھی۔ اور ہم ایک وجودِ واحد تھے۔ اس مکمل وجود کی خواہشوں اور اعمال کو محبت کہا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایسا بھی زمانہ تھا جب ہم سب کا ایک ہی وجود تھا لیکن انسان کی بداعمالیوں کی وجہ سے، خدا نے ہمیں اسی طرح اِدھر اُدھر منتشر کر دیا جس طرح لیسی ڈیمون والوں (Lacedaemonians) نے آرکیڈیا کے باشندوں (Arcadians) کو گاؤں گاؤں بھیج دیا تھا اور اگر ہم دیوتاؤں کا حکم نہیں مانیں گے تو یہ خطرہ ہے کہ ہمارے بھی مزید حصے بخرے کر دیے جائیں گے۔ اور ہم اس ابھری ہوئی تصویر کی طرح نظر آئیں جو صرف پہلو سے تیار کی گئی ہو اور اس کی صرف آدھی ناک نظر آتی ہے۔ ایسی تصویریں آپ نے پتھر کی یادگاروں پر دیکھی ہوں گی اور ہم اسی کی نقل نظر آئیں گے۔

ہمیں چاہیے کہ ہم انسانوں کو نیک چلنی پر آمادہ کریں تاکہ ہم گناہوں سے دور ہوں اور نیکی اختیار کریں، محبت جس کا حاکم اور وزیر ہے، کسی کو اس کی مخالفت کی اجازت نہ دی جائے۔ جو مخالفت کرے وہ دیوتاؤں کا دشمن شمار ہوگا۔ کیونکہ اگر ہم خدا کی دوستی کا دم بھرتے ہیں، اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرتے تو ہمیں بے غرض محبت ملے گی جو آج کل دنیا میں مشکل ہی سے دستیاب ہوتی ہے۔ میں ان باتوں میں سنجیدہ ہوں اس لیے اریکسی میکس سے میری درخواست ہے کہ وہ مذاق نہ اڑائیں اور نہ ہی ان باتوں میں کوئی اشارہ کنایہ تلاش کریں جو میں ابھی پاسانیس اور آگاتھان کے بارے میں کہنے والا ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ دونوں کی فطرت

میں مردانگی کا جوہر موجود ہے اوران کا شمار اسی زمرے میں ہوتا ہے جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔لیکن میرے الفاظ کا مفہوم وسیع تر ہے۔ان میں ہر جگہ کے مرد اور عورتیں شامل ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہماری محبت کی تکمیل اچھی طرح ہو اور ہر فرد اپنی قدیم فطرت کی طرف لوٹ کر اصل محبت حاصل کر لے۔تو ہماری نسل کا دامن خوشیوں سے بھر جائے اور یہ بہتر اور یہ بہترین سے قدرے کمتر عمل ہو۔تب بھی موجودہ صورت حال میں ایسے اتصال کا کسی حد تک عمدہ طریقہ ہوسکتا ہے اور یہی خوشگوار محبت کا حصول ہوگا۔اسی طرح جب ہم ایسے شخص کو سراہتے ہیں جس نے ہمیں فائدہ پہنچایا ہوتو ہمیں محبت کے دیوتا کو سراہنا چاہیے جو ہمارا سب سے بڑا کرم فرما ہے۔اس طرح اس زندگی میں وہ ہمیں ہماری اصل فطرت کی طرف لوٹاتا ہے اور مستقبل کے لیے شاندار توقعات عطا فرماتا ہے کیونکہ اس نے وعدہ کیا ہے کہ اگر ہم پاکیزہ زندگی گزاریں گے وہ ہم کو ہماری اصل صورت میں واپس لا دے گا۔ہمارے امراض دور کرے گا اور ہمیں ابدی مسرتوں سے نوازے گا۔ اریکسی میکس محبت کے بارے میں میرے یہی خیالات ہیں جو اگرچہ آپ سے مختلف ہیں تاہم میری خواہش ہے کہ آپ اسے اپنے طنز کے تیروں کا نشانہ نہ بنائیں تاکہ ہر فرد کو اس بحث میں شرکت کا موقع ملے جو مقررین باقی بچے ہیں ان میں آگاتھان اور سقراط شامل ہیں۔

اریکسی میکس نے کہا میں آپ کو تنقید کا نشانہ نہیں بناؤں گا کیوں کہ میرے خیال میں آپ کی تقریر بہت دلکش تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ آگاتھان اور سقراط محبت کے فن کے ماہر ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ محبت کے باب میں لوگوں نے اب تک جو نکات اٹھائے ہیں ان کے سبب انھیں کہنے کے لیے کچھ نہ بچا ہو لیکن میں ان سے مایوس نہیں ہوں۔سقراط نے کہا اریکسی میکس تم نے اپنا کردار بطریق احسن ادا کیا ہے لیکن اگر تمھاری بھی وہی حالت ہو جو اس وقت میری ہے یا آگاتھان کی تقریر کے بعد ہوگی تو تم عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

آگاتھان نے کہا سقراط آپ مجھے مسحور کرنا چاہتے ہیں تاکہ میری تقریر کے بارے میں سامعین کی توقع کے سبب میں بدحواسی کا شکار ہو جاؤں۔

سقراط کو جواب دیتے ہوئے آگاتھان نے کہا عجیب بات ہے کہ میں یہ کیسے فراموش کرسکتا ہوں کہ اپنی تخلیقات کو پیش کرنے کے لیے جب آپ لمبے چوڑے سٹیج پر اداکاروں کے جھرمٹ میں تشریف لائے تو آپ نے کتنے زبردست حوصلے اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا۔اس صورت میں دوستوں کی اس چھوٹی سی محفل میں آپ کے اعصاب کس طرح جواب دے سکتے ہیں۔

آگاتھان نے کہا سقراط آپ یہ کیوں سوچتے ہیں کہ تھیٹر مجھ پر اس طرح سے مسلط ہے کہ میں یہ

بھول گیا ہوں کہ کسی باہوش انسان کے لیے چند داناؤں کی رائے، متعدد نادانوں کی رائے پر حاوی ہوتی ہے۔

سقراط نے کہا آگاتھان میں آپ پر ایسا یا کسی بھی طرح کی ناشائستگی کا الزام نہیں لگا سکتا۔ میں اچھی طرح واقف ہوں کہ اگر آپ کی ملاقات کسی ایسے شخص سے ہو جائے جسے آپ دانا قرار دیتے ہوں تو آپ دوسرے لوگوں کی رائے کے مقابلے میں اس کے خیالات کو کہیں زیادہ لائق اعتنا سمجھیں گے۔ لیکن ہم لوگ جو تھیٹر کے بہت سے نادان تماشائیوں میں شامل ہوتے ہیں منتخب داناؤں کے زمرے میں بھلا کس طرح شمار ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ اگر آپ کو ہم سے نہیں بلکہ کسی حقیقی دانا سے ملاقات کا اتفاقی موقع ملے تو آپ خود کو اس کے سامنے بے عزت کرنے میں شرمندگی محسوس کریں گے۔ کریں گے نا؟

آگاتھان نے کہا، آپ نے ٹھیک فرمایا۔ لیکن متعدد افراد کے سامنے کیا آپ کو اس خیال سے شرمندگی نہیں ہوگی کہ آپ ان کے سامنے کسی گھٹیا حرکت کے مرتکب ہو رہے ہیں؟

اس مرحلے پر فیڈرس نے دونوں کی بات کاٹتے ہوئے کہا! عزیز آگاتھان آپ ان کی باتوں کا جواب نہ دیں۔ کیونکہ اگر انھیں بات کرنے کے لیے کوئی ساتھی مل جائے اور وہ خوبصورت بھی ہو تو ہمارے اس منصوبے کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔ میں ان کی باتیں سننے کے لیے بیتاب ہوں لیکن مجھے یاد ہے کہ میں محبت پر ان کے اور دوسروں کے قیمتی خیالات سننا چاہتا ہوں۔ آپ اور وہ دونوں پہلے دیوتاؤں کو خراجِ عقیدت پیش کریں اور اس کے بعد تقریر کریں۔

آگاتھان نے کہا فیڈرس، بہت اچھے، تقریر شروع کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ سچ ہے مجھے سقراط سے تبادلہ خیالات کے مواقع ملتے رہیں گے تقریر کرنے سے پہلے میں یہ بتاؤں گا کہ مجھے اظہارِ خیالات کا کیا طریقہ اپنانا ہوگا۔ مجھ سے پہلے مقرر نے محبت کے دیوتا کی تعریف کرنے یا اس کی فطرت کے راز کھولنے کی بجائے عالمِ انسانیت کو اس امر پر خراجِ تحسین پیش کیا کہ اس پر اس دیوتا کی کرم نوازیاں جاری رہتی ہیں۔ لیکن میں پہلے دیوتا کو خراجِ عقیدت پیش کروں گا۔ اس کے بعد اس کی نعمتوں کا ذکر کروں گا۔ کسی شے کو سراہنے کا یہی بہتر طریقہ ہے۔ میں بلا کسی بدعقیدگی اور احساس گناہ کے کہہ سکتا ہوں کہ تمام مقدس دیوتاؤں میں محبت کے دیوتا کی تقدیس سب سے زیادہ ہے کیونکہ وہ حسین ترین اور بہترین ہے۔ وہ حسین ترین ہے کیونکہ اول تو وہ عمر میں سب سے چھوٹا ہے وہ اپنی جوانی کا خود شاہد ہے، وہ عمر کے اثرات سے دور رہتا ہے۔ وہ پھرتیلا ہی نہیں بلکہ ہم سب سے کہیں زیادہ پھرتیلا ہے۔ محبت کو اس سے نفرت ہے اس کے قریب نہیں آتی لیکن جوانی اور محبت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ محاورے کی رو سے مثل مثل کے ساتھ رہتا ہے۔ فیڈرس

نے محبت کے بارے میں بہت سی باتیں کہی ہیں جن سے میں متفق ہوں لیکن میں کبھی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ آیا لیپٹیس (Lapetus) ور کرونوس (Kronos) سے وہ عمر میں زیادہ ہے۔ حقیقت حال یہ نہیں ہے۔ میں اسے دیوتاؤں میں سب سے کم عمر مانتا ہوں جو ہمیشہ جوان رہتا ہے۔ ہیزیوڈ (Hesiod) اور پارمینڈیز (Parmenides) کی اطلاع کے مطابق اگر روایات درست ہیں تو دیوتاؤں کی قدیم حرکات ضرورت کا نتیجہ تھیں، محبت کی نہیں۔ اگر اس دور میں محبت کا وجود ہوتا تو دیوتاؤں میں نہ تبدیلی آتی نہ ان کی شکل بگڑتی یا دیگر قسم کے فسادات رونما ہوتے اور محبت کے وجود میں آنے کے بعد عالم ملکوت میں آج کل کی طرح اُس زمانے میں بھی امن وامان کا دور دورہ ہوتا۔

محبت نوجوان بھی ہے اور نازک بھی۔ اس نزاکت کو بیان کرنے کے لیے ہومر جیسے شاعر کی ضرورت تھی جس نے ایٹ (Ate) کے بارے میں کہا ہے کہ:

’وہ دیوی ہے اور نازک بھی اُس کے پاؤں نرم ونازک ہیں جو اس کی چال سے ظاہر ہے اور اس کا ہر قدم زمین پر نہیں بلکہ لوگوں کے سروں پر پڑتا ہے۔‘‘

دیکھیے! اس کی نزاکت کا یہ کتنا مضبوط ثبوت ہے کہ سخت سطح پر نہیں بلکہ نرم سطح اس کے زیرِ قدم ہوتی ہے۔

آیئے! محبت کے نرم ونازک ہونے کا ایسا ہی کوئی ثبوت فراہم کریں۔ کیونکہ وہ نہ زمین پر اور نہ ہی انسانی کھوپڑی پر قدم رکھتی جو بذاتِ خود کچھ نہ کچھ تو سخت ہے۔ وہ تو دیوتاؤں اور انسانوں کے دلوں اور روح میں چلتی پھرتی ہے جس سے زیادہ کسی نرم ونازک چیز کا تصور ممکن نہیں۔ انہی مقامات پر اس کی آمد ورفت اور قیام ہے۔ یہی اس کا گھر ہے۔ وہ بلا امتیاز ہر روح میں گھر نہیں کرتی۔ جہاں سختی ہوتی ہے وہاں سے وہ رخصت ہو جاتی ہے جہاں نرمی ہوتی ہے وہیں وہ ڈیرہ ڈال دیتی ہے۔ وہ جو نہایت ہی نرم سے نرم ونازک مقامات پر ہر طرح بہ سمت قدم رنجہ فرماتی ہے خود نرم ونازک ہونے کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نازک ترین اور لطیف ترین ہے اور اس میں لچک بھی بہت ہے کیونکہ اگر اس میں سختی ہوتی اور لچک نہ ہوتی تو تمام اشیا پر حاوی نہ ہوتی اور لوگوں کی روح میں اس کی آمد ورفت دبے پاؤں نہ ہوتی۔ اس کی آن اور شان ہی اس کی لچک اور ہیئت کے توازن کا ثبوت ہے جسے عالمگیر سطح پر ایک مخصوص انداز میں محبت کی ایک خوبی تسلیم کیا جاتا ہے۔ بدسلیقگی اور محبت میں ہمیشہ باہمی جنگ رہی ہے۔ اس کا حسن پھولوں کی رنگینی میں جھلکتا ہے۔ وہ مرجھائی ہوئی اور بے آب ورنگ یا جسم میں مقیم نہیں ہوتی بلکہ وہ پھولوں اور خوشبو میں رہتی ہے۔ وہیں اس کا قیام ہوتا ہے۔

خدا کے حسن کے بارے میں میں نے بہت کچھ کہا ہے۔لیکن ابھی کہنے کو بہت کچھ باقی ہے۔ مجھے اس خوبی کے بارے میں کہنا ہے۔محبت کی عظیم ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان یا دیوتاؤں کے خلاف نہ کوئی غلط کام کرتی ہے اور نہ اس کے خلاف کوئی غلط کام کیا جاتا ہے۔اس کو صدمہ پہنچتا ہے تو زبردستی نہیں پہنچتا۔جبر اس کے قریب نہیں پھٹکتا۔اسی لیے اس کے کسی عمل میں جبر کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔محبت کے ضمن میں ہر انسان، ہر معاملے میں اپنی رضامندی سے عمل کرتا ہے اور قانون جس کی سب پر حکمرانی ہے کہتا ہے کہ جہاں رضا ہوتی ہے وہاں عدل ہوتا۔وہ صرف عدل پسند ہی نہیں ہوتا بلکہ اعتدال پسند بھی ہوتا ہے۔ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسرتوں اور خواہشوں کی لگام اعتدال ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے لیکن اعتدال کی لگام کبھی مسرت کے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔

محبت ہی آقا ہے اور باقی سب اس کے خادم اور اگر وہ ان پر قابض ہوتی ہے تو اسے اعتدال سے کام لینا ہی پڑتا ہے۔ جہاں تک ہمت اور حوصلے کی بات ہے۔ جنگ کا دیوتا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔اس کے مقابلے میں وہ قیدی ہے اور محبت آقا ہے۔ داستان کے مطابق محبت کو صرف الفروڈائٹ جیسی جنسی محبت ہی زیر کرسکتی ہے۔ آقا اپنے خادم سے زیادہ قوی ہوتا ہے اور اگر وہ قوی ترین کو مغلوب کر لیتا ہے تو یقیناً وہ سب سے زیادہ قوی ہوگا۔

میں نے محبت کے حوصلے، انصاف اور اعتدال ذات کا ذکر کیا ہے لیکن ابھی اس کی دانائی کا تذکرہ باقی ہے۔ میں اپنی قابلیت کے مطابق اس موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کروں گا۔اول وہ خود شاعر ہے یہاں میں اریکسی میکس کی طرح اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کروں گا جو کہ دوسروں میں شعریت کا خالق بھی ہے۔وہ ایسا نہ کرسکتا اگر وہ خود شاعر نہ ہوتا یہی وجہ ہے کہ جو بھی اس کے قریب آتا ہے شاعر بن جاتا ہے۔ خواہ اس سے قبل اس میں نام کو غنائیت موجود نہ ہو۔ یہ بھی اس حقیقت پر دال ہے کہ محبت عمدہ شاعر بھی ہے اور دیگر فنون لطیفہ میں ماہر بھی۔ کیوں کہ کوئی وہ ہنر کسی کو بخش نہیں سکتا جو خود اس کے پاس نہ ہو یا وہ علوم سکھا نہیں سکتا جن سے وہ واقف ہی نہ ہو۔کون انکار کرسکتا ہے کہ جانداروں کی تخلیق اسی کا کارنامہ ہے؟ کیا یہ سب کچھ اسی کی فہم کا کرشمہ نہیں ہے۔اسی نے بنایا اور پیدا کیا ہے۔ جہاں تک فنکاروں کا تعلق ہے کیا ہم نہیں جانتے کہ صرف وہی شہرت کی روشنی میں آتے ہیں جن میں محبت تخلیقی جذبہ بیدار کرتی ہے؟ محبت جس پر مہربان ہو وہ ظلمت میں نہیں روشنی میں رواں دواں رہتا ہے۔محبت کے دیوتا اپالو (Apollo) ہی نے طب، تیراندازی اور الوہی علوم دریافت کیے تھے۔ کیا یہ سب محبت ہی کے کارنامے نہ تھے، گویا وہ بھی محبت کا شاگرد ہے۔اسی طرح موسیقی کی دیوی کی غنائیت، ہیفسٹس (Hephaestus) کا خام دھات صاف کرنے کا فن، اےتھین (Athene)

کا پارچہ بافی کا ہنر، دیوتاؤں اور انسانوں پر زیوس (Zeus) کا تسلط یہ سب کچھ محبت ہی کا کرشمہ ہے جو ان تمام امور کی موجد ہے۔ اس طرح محبت ہی نے دیوتاؤں کی سلطنت کو مرتب کر کے حسن بخشا۔ بدصورتی سے محبت کا کوئی رشتہ نہیں۔

ازمنۂ قدیم کے، جس دور کا ذکر میں نے ابتدا میں کیا تھا۔ اس میں دیوتاؤں سے نہایت ہی خوفناک حرکات سرزد ہوئیں کیونکہ ان پر ضرورت کی حکمرانی تھی۔ لیکن محبت کے وجود میں آنے کے بعد سے اور حسن سے محبت جذباتی لگاؤ کے سبب زمین اور آسمان کی ہر نیکی پروان چڑھی ہے۔ فیڈرس اسی لیے میں کہتا ہوں کہ محبت نہ صرف اپنی ذات میں حسین ترین اور بہترین ہے بلکہ دوسروں میں بھی حسین ترین اور بہترین خوبیوں کی خالق ہے۔ یہاں مجھے کسی نظم کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ جس میں محبت کو ایسا دیوتا کہا گیا ہے جو ''زمین کو امن عطا کرتا ہے اور سمندر کی گہرائیوں کے طوفانوں کو سکون بخشتا ہے۔ جو آندھیوں کو خاموش کرتا ہے اور متاثرین کو نیند کی نعمت سے نوازتا ہے۔''

یہی وہ شے ہے جو انسان کے دل کو بے اطمینانی سے خالی کر کے اسے محبت و شفقت سے لبریز کر دیتی ہے۔ جو انھیں آج جیسی ضیافت میں میل ملاپ کا مواقع فراہم کرتی ہے۔ قربانیوں، ضیافتوں اور رقص کی محفلوں میں اسی کی حکمرانی ہوتی ہے، وہی متانت کو راہ دیتی ہے اور غیر سنجیدگی کو دیس نکالا۔ جو نرم دلی کا تحفہ عطا کرتی ہے اور سنگدلی کو ہاتھ نہیں لگاتی۔ وہ نیکی کی دوست، دانائی کا معجزہ اور دیوتاؤں کی کرامت ہے۔ وہ ان کی آرزو ہے جو اس سے محروم ہیں اور ان کی دولت ہے جو اس سے بہرہ مند ہیں۔ یہ پالن ہار ہے نزاکت، عیش و عشرت، رغبت، پیار، نرمی و دلربائی کی۔ نیکی پر نظر رکھتی ہے اور بدی کو نظر انداز کرتی ہے۔ یہ ہر لفظ، ہر عمل، ہر تمنا، ہر خوف میں ہماری نگہبان، رہنما، ساتھی اور معاون ہے۔ یہ دیوتاؤں اور انسانوں کی عظمت ہے۔ یہ عمدہ ترین اور روشن ترین رہنما ہے جس کے نقش قدم پر سب کو اس طرح چلنا چاہیے کہ لبوں پر اس کی شان میں نغمے ہوں اور اسی میٹھی دھن میں شامل ہو جائیں جس سے محبت دیوتاؤں اور انسانوں کے دل موہ لیتی ہے۔

فیڈرس یہی میری تقریر ہے اگرچہ اس میں تفریحی رنگ پایا جاتا ہے۔ مگر اس میں سنجیدگی کا عنصر بھی موجود ہے جسے میں اپنی صلاحیت کے مطابق دیوتا کی نذر کرتا ہوں۔

جب آگاتھان نے اپنی تقریر ختم کر لی تو ارسٹوڈیمس نے کہا کہ لوگوں نے پسندیدگی کے نعرے لگائے۔ عام رائے یہی تھی کہ نوجوان نے اپنے اور دیوتاؤں کے شایان شان اظہار خیال کیا۔ سقراط نے

اریکسی میکس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اکیومینس (Acumenus) کے بیٹے اب بتاؤ کہ کیا میرا اندیشہ بے بنیاد تھا؟ کیا میں نے درست پیش گوئی نہیں کی تھی کہ آ گاتھان کی تقریر نہایت عمدہ ہوگی، اور میں مصیبت میں پھنس جاؤں گا؟

اریکسی میکس نے جواب دیا کہ آپ نے آ گاتھان کے بارے میں جس رائے کا پیشگی اظہار کیا تھا وہ بالکل درست تھا۔ لیکن آپ مصیبت میں پھنس جائیں گے؟! اس بات سے میں متفق نہیں ہوں۔

سقراط نے کہا عزیز دوست آخر کیوں۔ دیکھوناں اتنی پر مغز اور عمدہ تقریر کے بعد میں کیا جو بھی بولنے کے لیے اٹھے گا وہ مشکل میں تو پڑے گا۔ میں تقریر کے آخری جملوں سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ کون ہے جو انھیں سن کر حیران نہ ہوگا؟ جب میں نے اپنی صلاحیتوں کی لامتناہی کمزوریوں پر نظر ڈالی تو شرمندگی سے فرار ہو جانے ہی میں عافیت جانی۔ فرار ہو جاتا اگر راستہ مل جاتا۔ مجھے اس کی تقریر کے خاتمے پر جارجیاز (Gorgias) کی یاد آئی۔ مجھے یوں لگا جیسے آ گاتھان نے میرے سامنے خطابت کے عظیم ماہر جارجیاز کے لوگوں (Gorginan) یا جارجیاز (Gorgias) کو میرے مقابل لا کھڑا کیا۔ جسے دیکھ کر میں بھی اور میری تقریر بھی بقول ہومر پتھر کی طرح بے جان ہوگئی اور میں گونگا ہو گیا ہوں۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ تمھارے بعد محبت کی تعریف میں تقریر پر راضی ہو کر اور یہ دعویٰ کر کے کہ میں بھی اس فن کا ماہر ہوں کتنی بڑی حماقت کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں کسی کی مدح سرائی سے بالکل ہی واقف نہیں ہوں۔ اپنی سادگی کے سبب میں نے سوچا کہ تعریف کا موضوع حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد کہ بہترین مقرر سچ باتوں میں سے صرف بہترین ہی کا انتخاب کرے گا اور انھیں مناسب ترین انداز میں پیش کرے گا۔ یہ سوچ کر میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا کہ مجھے اصلی توصیف و تعریف کے رموز سے آ گاہی ہے۔ اس لیے اچھی تقریر کرلوں گا۔ اس کے برخلاف اب مجھے پتا چلا کہ نیت تو یہ تھی کہ محبت کی ہر خوبی کو اعلیٰ ترین اور عظیم ترین بیان کیا جائے۔ خواہ وہ فی الحقیقت اس پر صادق آتی ہو یا نہیں۔ نہ سچ کا خیال رکھا جائے اور نہ جھوٹ کا۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے یوں لگتا ہے کہ اصل تجویز کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہم میں سے ہر شخص واقعی دل سے محبت کو سراہے یا نہ سراہے لیکن یہ محسوس ہو کہ وہ تعریف کر رہا ہے۔

اسی لیے آپ محبت کو ان تمام ممکنہ خوبیوں سے متصف کر رہے ہیں جو ادھر اُدھر سے جمع کی جا سکتی ہیں اور اعلان کر رہے ہیں کہ محبت اسی کا نام ہے اور وہی ہر شے کی اصل ہے۔ اس طرح جو اس سے واقف نہیں ہیں انھیں یہ باور کرایا جائے کہ محبت ہی حسین ترین اور بہترین ہے لیکن واقف کاروں پر یہ خیالات ٹھونسے نہیں

جا سکتے۔ آپ نے محبت کی مدح میں ایک عمدہ اور مقدس گیت کی مشق کی ہے لیکن تقریر کرنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کرتے وقت میں نے محبت کے رموز کو غلط سمجھا تھا۔ اس لیے مجھے اس وعدے سے آزاد کر دیا جائے جو میں نے لاعلمی میں کیا تھا۔ اسے (جیسا کہ یوری پائڈز کہتے ہیں) ایسا وعدہ سمجھا جائے جو زبان سے کیا گیا، دل سے نہیں۔ ایسے انداز کو میرا دور ہی سے سلام۔ تعریف کا یہ طریقہ میرا نہیں ہے۔ واقعی میں معذور ہوں تاہم اگر آپ محبت کے موضوع پر کھری کھری باتیں سننا چاہتے ہیں تو میں اپنی مرضی کے مطابق اظہارِ خیال کے لیے تیار ہوں۔ آپ یاد رکھیے میں آپ کا مقابلہ کر کے اپنے لیے جگ ہنسائی کا سامان فراہم نہیں کرنا چاہتا۔ فیڈرس اب آپ بتائیے کہ کیا آپ محبت کی حقیقت کے بیان میں بروقت یاد آئے ہوئے الفاظ میرے انداز میں سننا گوارا کریں گے؟

ارسٹوڈیمس نے کہا کہ فیڈرس اور اس کے ساتھیوں کی یہی رائے ہے کہ وہ اپنے بہترین انداز میں تقریر کریں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا اب ذرا مجھے اجازت دیجیے کہ میں آگاتھان سے چند سوالات پوچھوں تا کہ میں اس کی تسلیم شدہ باتوں کو اپنی تقریر کے مباحث میں شریک کرلوں۔

فیڈرس نے کہا۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ سوالات پوچھیے۔

پھر سقراط نے مندرجہ ذیل گفتگو کی:

میرے عزیز آگاتھان آپ نے ابھی ابھی جو زورِ خطابت دکھایا ہے اس میں آپ کی یہ بات درست تھی جس میں آپ نے یہ تجویز دی کہ پہلے محبت کے رموز سلجھائے جائیں اس کے بعد اس کی عملی اہمیت اجاگر کی جائے۔ آغاز کا یہ ایسا طریقہ ہے جس کی میں توثیق کرتا ہوں۔ آپ نے محبت کی ماہیت پر بڑی خوبصورت باتیں کی ہیں میں آپ سے مزید وضاحت طلب ہوں کہ کیا محبت کسی وجود سے ہے یا کسی عدمِ وجود سے؟ میں اپنی اس بات کی وضاحت کروں گا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ کہہ دیں کہ محبت والد یا والدہ کی محبت کا نام ہے۔ یہ بات مضحکہ خیز ہوگی۔ اگر میں آپ سے دریافت کروں کہ کیا والد کسی کا والد ہوتا ہے تو آپ اس کا جواب بڑی آسانی سے دے دیں گے کہ وہ کسی بیٹے یا بیٹی کا باپ ہوگا۔ یہ جواب یقیناً درست ہے۔

''جی ہاں اس میں کیا شک ہے''؟ آگاتھان نے کہا۔

'' یا یہی بات آپ ماں کے بارے میں بھی نہیں کہیں گے؟''

''جی ہاں، کیوں نہیں''۔

بھائی اور بہن کے بارے میں بھی؟

اس نے کہا، جی ہاں۔

سقراط نے کہا، اب میں یہ سوال پوچھوں گا کہ محبت کسی وجود سے ہوتی ہے یا عدم وجود سے؟

اس نے جواب دیا کہ کسی بھی وجود سے۔

ذرا یاد رکھیے گا کہ آپ نے کیا کہا ہے اور میں کیا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتایئے کہ کیا محبت کو اس شے کی آرزو ہوتی ہے جس سے وہ تشکیل پاتی ہے؟

''جی ہاں یقیناً۔

''ذرا یہ بتایئے کہ جس کی اسے آرزو ہے اور جس سے اسے لگاؤ ہے وہ اسے دستیاب ہے یا نہیں؟''

''میرا جواب ہوگا غالباً''۔

سقراط نے کہا، جی نہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بات پر غور کریں کہ اس کے لیے لفظ ''ضرورتاً'' ہے یا نہیں؟

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خواہش اسی کے لیے ہوتی ہے جس کی ضرورت ہو اور جس کی کوئی خواہش نہیں ہوتی اسے کسی شے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آگاتھان کی رائے میں یہ بات کلی طور پر یقیناً درست ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟

آگاتھان نے کہا مجھے آپ سے پورا پورا اتفاق ہے۔

بہت خوب۔ جو خود عظیم ہو، کیا وہ عظیم ہونے کی آرزو کرے گا یا جو قوی ہو وہ قوی ہونے کا خواہشمند ہوگا؟

یہ امران باتوں سے مطابقت نہیں رکھتے جسے ہم پہلے تسلیم کر چکے ہیں۔

درست ہے جس کی کوئی حیثیت ہے وہ اس کی آرزو کیوں کرے گا جو اس کے پاس موجود ہے؟

بجا ارشاد۔

سقراط نے مزید کہا، تاہم کوئی شخص قوی ہونے کے باوجود اگر قوی ہونے کی آرزو کرے یا پھرتیلا ہو ...بھی پھرتیلا ہونے کا آرزومند ہو یا صحت مند ہونے پر بھی صحت کی خواہش رکھتا ہو تو کیا یہ نہیں سمجھا جائے گا ...وہ ایسی شے کی خواہش کرتا ہے جو اس کے پاس موجود ہے؟ کسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے میں اپنی بات ...ایک مثال سے وضاحت کروں گا۔ آگاتھان جو ان خوبیوں کے مالک ہیں انھیں اس وقت اس کے فوائد خدانخواستہ حاصل ہی ہوں گے، پھر موجود خوبیوں کی تمنا کیوں کی جائے گی؟ اس لیے جب کوئی فرد یہ کہتا ہے

کہ میں بخیر ہوں اور بخیر رہنا چاہتا ہوں یا دولتمند ہوں مگر دولت کی آرزو ہے۔ مجھے اسی کی خواہش ہے جو میرے پاس پہلے سے موجود ہے تو ہم اسے کیا جواب دیں گے۔ میرے دوست، کیا تم یہی چاہتے ہو کہ دولت، صحت اور قوت جس کے تم مالک ہو آیندہ بھی تمھارے پاس رہے۔ کیونکہ اس وقت خواہ تم مانو یا نہ مانو یہ تمام چیزیں تمھیں میسر ہیں۔ جب تم یہ کہتے ہو کہ جو چیزیں میرے پاس ہیں مجھے اسی کی تمنا ہے۔ کسی اور شے کی نہیں تو کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ اس لمحے تمھارے پاس ہے تم چاہتے ہو وہ آیندہ بھی تمھارے پاس ہی رہے۔

''اتفاق کرنا ہوگا۔ کرنا ہوگا ناں۔''

آگاتھان نے کہا اتفاق کرنا ہوگا۔

سقراط نے کہا پھر تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے ایک ایسی شے کی خواہش ہے جس کا وہ فی الوقت مالک ہے اور جسے وہ چاہتا ہے کہ مستقبل میں اسے دستیاب رہے۔ گویا وہ ایسی شے کا آرزومند جو اس کے لیے معدوم ہے اور جو ابھی تک اسے حاصل نہیں ہے۔

بالکل درست ہے۔ پھر تو وہ اور دوسرے جو آرزومند ہیں۔ اس شے کی تمنا کرتے ہیں جو پہلے سے ان کے پاس نہیں ہے۔ وہ تو ان کے لیے مستقبل ہے حال نہیں۔ جس کے وہ مالک نہیں اور جیسے وہ نہیں ہیں۔ یہی وہ اشیا ہیں جن کی محبت اور تمنا دونوں ہی متلاشی ہیں؟

اس نے کہا درست ہے۔

پھر سقراط نے کہا آیئے ہم دلیلوں کا اعادہ کریں۔ اول یہ ہے کہ کیا کسی شے کی محبت اور ایسی شے کی محبت جس سے کوئی محروم ہو ایک حقیقت نہیں ہے؟

اس نے جواب دیا جی ہاں۔

مزید برآں یہ بھی یاد کیجیے کہ آپ نے اپنی تقریر میں کیا کہا تھا، اور اگر آپ کو یاد نہیں ہے تو میں آپ کو یاد دلاؤں۔ آپ نے کہا تھا کہ حسین شے کی محبت ہی نے دیوتاؤں کی حکومت کو ترتیب دیا۔ کیونکہ بدنما شے کا محبت سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی قسم کی باتیں آپ نے کہیں تھیں نا؟

جی ہاں آگاتھان نے کہا۔

میرے دوست آپ کا تجزیہ درست تھا اور اگر یہ بات صحیح ہے تو محبت حسن کی محبت ہے، بدصورتی کی نہیں؟

اس نے اتفاق ظاہر کیا۔

اور یہ بات پہلے تسلیم کر لی گئی ہے کہ محبت اس شے سے ہوتی ہے جس کی انسان کو حاجت ہوتی ہے اور جس سے وہ محروم ہے۔

اس نے کہا یہ درست ہے۔

گویا محبت حسن سے محروم ہے مگر اس کی آرزومند ہے۔

اس نے جواب دیا یقیناً۔

اچھا یہ بتاؤ کیا تم اسے بھی حسین کہو گے جو حسن کا خواہشمند ہے مگر اس سے محروم ہے؟

بالکل نہیں!

تم پھر بھی کہو گے کہ محبت حسین ہوتی ہے۔

آگاتھان نے جواب دیا کہ میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ بلا سمجھے بوجھے تھا۔

سقراط نے کہا آگاتھان تمھاری تقریر بہت عمدہ تھی۔ تاہم ایک چھوٹا سا سوال ہے جسے میں بادلِ نخواستہ پوچھ رہا ہوں۔ کیا نیکی میں بھی حسن نہیں ہے؟

جی ہاں۔

محبت جب حسن کی آرزو کرتی ہے تو اسے نیکی کی آرزو بھی ہوتی ہے؟

آگاتھان نے کہا کہ سقراط میں آپ کی بات کی تردید نہیں کروں گا۔ مان لیتے ہیں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سچ ہے۔

میرے عزیز آگاتھان۔ تم یہ کہو کہ سقراط کی تردید آسان ہے لیکن حقائق کی نہیں۔

آپ سے اجازت لینے سے قبل میں محبت کی ایک داستان دہراؤں گا جسے مجھے مانٹینیا (Mantineia) کے ڈائیوٹیما (Diotima) نے سنایا تھا۔ جو اس فن اور چند دیگر فنون کی ماہر خاتون تھی اور جس نے قدیم زمانے میں جب طاعون کی وبا پھیلنے سے قبل ایتھنز والوں نے قربانیاں دے کر اسے دس سال کے لیے ٹالے رکھا تھا۔ وہ محبت کے فن میں میری استانی تھی۔ میں آپ کے لیے ان باتوں کو دہراؤں گا جو اس نے مجھے بتائی تھیں۔ میں اس کا آغاز ان باتوں سے کروں گا۔ جنھیں آگاتھان نے تسلیم کیا ہے اور تقریباً وہی ہیں جو میں نے اپنی استانی کے سوال کے جواب میں کہی تھیں۔ میرے خیال میں یہ آسان ترین طریقہ ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنا اور استانی کا کردار حسبِ توفیق خوبی سے ادا کروں۔ آگاتھان جیسا کہ آپ نے بتایا تھا۔ میں پہلے محبت کے وجود اور اس کے رموز کا ذکر کروں گا۔ اور پھر اس کے عملی پہلو پر روشنی ڈالوں گا۔ میں نے شروع شروع میں

استانی سے انھیں الفاظ میں بات کی جیسا کہ آگا تھان نے کیا تھا کہ محبت ایک عظیم دیوتا ہے اور اسی طرح عادل بھی اور اس خاتون نے بھی اسی طرح یہ ثابت کیا جس طرح میں نے ابھی ثابت کیا ہے کہ میری دلیلوں کے مطابق محبت کا دیوتا نہ ہی حسین تھا اور نہ ہی نیک۔ میں نے کہا ڈائیوٹیما آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو کیا محبت بری اور گندی ہے۔ اس نے کہا کیا جو خوبصورت نہ ہو اس کا گندہ ہونا ضروری ہے؟ میں نے کہا یقیناً کیوں نہیں۔ کیا جو دانا نہ ہو وہ لاعلم ہوتا ہے۔ کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ دانائی اور لاعلمی کے درمیان ایک اوسط علم بھی ہے؟ اور وہ کیا ہو سکتا ہے؟ اس نے جواب دیا صحیح رائے۔ اور جیسا کہ تم جانتے ہو کہ جو صرف اس لیے علم نہیں ہے کہ وہ دلیل دینے سے قاصر ہے۔ کیونکہ علم بلا دلیل ممکن نہیں اور نہ ہی لاعلمی کیونکہ وہ حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی لیکن علم اور لاعلمی کے درمیان کوئی شے تو ہے۔ میں نے جواب دیا بالکل درست ہے۔ اس نے کہا اس لیے اس بات پر اصرار نہ کرو کہ جو حسین نہیں ہے وہ یقیناً بدصورت ہے۔ یا جو اچھا نہیں وہ یقیناً برا ہے۔ یا یہ نتیجہ نکالنا کہ چونکہ محبت حسین اور نیک نہیں ہے اس لیے وہ بدصورت اور بُری ہے کیونکہ یہ ان کے درمیان ایک اوسط کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے کہا لیکن لوگ محبت کو ایک عظیم دیوتا مانتے ہیں۔ وہ جو علم رکھتے ہیں یا وہ جو کچھ نہیں جانتے؟ تمام کے تمام، اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سقراط بھلا یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ کیا وہ لوگ بھی محبت کو ایک عظیم دیوتا تسلیم کریں گے جو یہ کہتے نہیں تھکتے کہ محبت دیوتا نہیں ہے؟ میں نے پوچھا وہ کون لوگ ہیں۔ اس نے جواب دیا ہم اور تم دونوں ایسے ہی ہیں۔ میں نے کہا یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ اس نے جواب دیا بات بالکل واضح ہے کیونکہ تم خود تسلیم کرو گے کہ دیوتا خوش وخرم اور حسین ہوتے ہیں۔ تسلیم کرتے ہو یا نہیں؟ کیا تم یہ کہنے کا حوصلہ رکھتے ہو کہ دیوتا نہ حسین ہیں اور نہ خوش؟

میں نے جواب دیا یقیناً نہیں۔ خوش وخرم سے تمھاری مراد ان لوگوں سے ہے نا، جو عمدہ اور خوبصورت اشیا کے مالک ہیں۔ جی ہاں۔ تم نے یہ تسلیم کیا ہے کہ محبت چونکہ حاجت مند ہے اس لیے اسے ان عمدہ اور حسین اشیا کی آرزو ہوتی ہے جن سے وہ محروم ہے۔ جی ہاں میں نے کہا تھا لیکن وہ نیک اور حسین کس طرح ہو سکتا ہے جسے نیکی اور حسن کا ایک ٹکڑا بھی نہ ملا ہو۔ یہ ناممکن ہے، دیکھو اس طرح تم محبت کے دیوتا کے ہونے سے انکار کر رہے ہو۔

میں نے دریافت کیا کہ پھر محبت کیا ہے؟ کیا وہ فانی ہے؟ نہیں پھر وہ کیا ہے، سابقہ مثالوں کی طرح وہ نہ تو فانی ہے اور نہ ہی لافانی۔ لیکن دونوں کے وسط میں ہے۔ ڈائیوٹیما آخر محبت کا دیوتا کیا ہے۔ وہ ایک عظیم روح ہے اور تمام ارواح کی طرح وہ الوہی اور فانی صفات کے درمیان کی شے ہے۔ میں نے پوچھا پھر اس کی

قدرت کیا ہے؟

وہ خدا کے اور بندے کے درمیان پیغامات کی تشریح کرتی ہے۔ وہ بندوں کی التجائیں اور قربانیاں دیوتاؤں کے حضور پہنچاتی ہے اور دیوتاؤں کے احکامات اور جوابات سے انسانوں کو آگاہ کرتی ہے۔ وہ اس خلیج کو پُر کرتی ہے جو دونوں کے درمیان حائل ہے۔ وہ ان دونوں کے لیے رابطہ اور وسیلہ ہے۔ گویا اس سے سارے ہی مربوط ہیں۔ وہ اسی کے ذریعے پیغمبروں اور پجاریوں کے فرائض، قربانیاں اور اسرار، سحرانگیزیاں، پیش گوئیاں، اور غیب دانیوں کے ایک رشتے میں بندھے ہوئے اپنا راستہ تلاش کرتی ہے۔ خدا انسانوں میں براہ راست گھل مل نہیں جاتا۔ محبت ہی کے ذریعے وہ انسانوں سے عالم بیداری اور خواب میں رابطہ قائم کرتا ہے، باتیں کرتا ہے اور جو عقل ان باتوں کو سمجھتی ہے وہ روحانی ہوتی ہے۔ دوسری تمام عقول جو مثلاً فن اور دستکاری وغیرہ سے متعلق ہیں، نہایت کم درجے کی ہوتی ہیں۔ یہ ارواح یا درمیان کی قوتیں متعدد اور گوناگوں ہیں۔ ان ہی میں سے ایک محبت بھی ہے۔ میں نے کہا۔ اس کا باپ کون ہے؟ اس کی ماں کون ہے؟ اس کی ایک داستان ہے، جس کے بیان کے لیے وقت درکار ہوگا۔ تاہم میں یہ آپ کے گوش گزار ضرور کروں گی کہ ایفروڈائٹ (Aphrodite) کی پیدائش پر دیوتاؤں کے لیے ایک عظیم الشان ضیافت کا اہتمام کیا گیا جس میں پوروس (Poros) یا افراط (Planty) کے دیوتا نے بھی شرکت کی جو میٹس (Metis) یا احتیاط و دور اندیشی کے دیوتا کا بیٹا ہے۔ جب ضیافت ختم ہوگئی تو حسب رواج غربت کی دیوی پینیا (Penia) دروازے پر کشکول لے کر کھڑی ہوگئی۔ افراط کا دیوتا پیلنٹی جو پھولوں کا عرق (ابھی شراب کشید نہیں ہوئی تھی) پی کر اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ زیوس (Zeus) کے باغ میں گیا اور بے خبر سو گیا۔ غربت کی دیوی نے اپنی مالی پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے اسی سے اولاد حاصل کرنے کی سازش کی۔ وہ اس کے پہلو میں جا لیٹی اس طرح محبت کی پیدائش ہوئی۔ وہ چونکہ حسن کا کسی نہ کسی حد تک رسیا ہے۔ چونکہ ایفروڈائٹ بذاتِ خود حسین ہے۔ مزید برآں چونکہ وہ اس کے یوم پیدائش پر پیدا ہوا تھا اس لیے اس کا شاگرد اور خدمت گار تھا۔ جیسی اس کی ولدیت ہے ویسی ہی اس کی قسمت۔ اول تو یہ کہ وہ ہمیشہ مفلس رہتی ہے۔ وہ عام خیال کے برخلاف نہ تو نازک ہے اور نہ ہی حسین۔ وہ سخت کرخت اور خستہ حال ہے نہ تو پاؤں میں جوتے ہیں اور نہ ہی سر چھپانے کو مکان۔ وہ زمین پر برہنہ اور کھلے آسمان کے نیچے سڑکوں، گلیوں میں، لوگوں کے دروازے پر، گھڑی دو گھڑی ستا لیتا ہے اور ماں کی طرح ہمیشہ مصیبت کا مارا ہی رہتا ہے۔ اپنے والد کی طرح جو اسے کچھ کچھ یاد ہے ہمہ وقت حسین اور نیک لوگوں کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا ہے۔ وہ بہادر، خطر پسند، قوی، اور زبردست شکاری ہے۔

ہمیشہ کسی نہ کسی سازش کے تانے بانے بُنتا رہتا ہے۔ دانائی کے حصول میں مستعد اور بے اندازہ وسائل کا مالک ہے۔ ہمیشہ فلسفیانہ غور وفکر میں غرق مسحور کن جادوگرانہ غلط استدلال کا ماہر ہوتا ہے۔ وہ فطری طور پر نہ فانی ہے نہ لافانی۔ خوشحالی میں زندہ اور آسودہ حال رہتا ہے، ورنہ موت سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ اپنے والد ہی کی فطرت کے مطابق پھر زندہ ہو جاتا ہے۔ جو کچھ اسے ملتا ہے اسے وہ کھوتا رہتا ہے اسی لیے نہ وہ غریب ہے نہ ہی دولتمند۔ اس کے علاوہ وہ علم اور لاعلمی کے درمیان ہی رہتا ہے۔ اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ کوئی دیوتا نہ فلسفی ہے اور نہ ہی دانائی کا متلاشی، کیونکہ وہ پہلے بھی دانا ہوتا ہے جو دانا ہوتا وہ دانائی کا متلاشی کیوں بنے گا۔ نادان کو علم کی پیاس کیوں ہوگی۔ کیونکہ اس مقام پر جہالت کی لعنت ہے جو نہ تو نیک ہے اور نہ ہی عاقل۔ وہ خود سے مطمئن ہے وہ غیر ضروری خواہشات سے معرا ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ ڈائیوٹیما (Diotima) پھر یہ بتائیے کہ دانائی کے چاہنے والے کون ہیں۔ اگر وہ نہ عاقل ہیں نہ بے عقل۔ اس نے جواب دیا کہ اس کا جواب تو ایک بچہ بھی دے سکتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دونوں کے درمیان کے ہیں۔ اس میں محبت کا شمار بھی ہوتا ہے کیونکہ دانائی حسین ترین ہے۔

محبت حسن سے ہوتی ہے اسی لیے محبت بھی ایک فلسفی یا عقل کی چاہنے والی ہوتی ہے۔ اور عقل سے محبت کرنے والا دانائی اور نادانی کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کی وجہ بھی اس کی پیدائش ہے۔ اس کا والد دولت مند اور عقل مند ہے اور اس کی ماں غریب اور نادان ہے۔ میرے عزیز سقراط محبت کی روح کی یہی ہیئت ہے۔ آپ نے اس کے بارے میں جو اندازہ لگایا ہے وہ غلط مگر فطری ہے۔ آپ کی باتوں کو سن کر میں سمجھتی ہوں کہ یہ غلطی محبت اور محبوب کے بارے میں الجھن کا نتیجہ ہے۔ جس سے آپ نے یہ سمجھ لیا کہ محبت کلی طور پر حسین ہوتی ہے حسین تو محبوب ہوتا ہے وہ نازک، مکمل اور مقدس ہوتا ہے۔ لیکن محبت کے اصول کے رموز اس سے مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح کے ہوتے ہیں جیسا کہ میں نے بتایا ہے۔

میں نے کہا اے اجنبی خاتون آپ بڑی اچھی باتیں کرتی ہیں۔ چلیے مان لیتے ہیں کہ محبت ویسی ہی ہوتی ہے جیسا آپ نے بتایا ہے تو مردوں کو اس کا کیا فائدہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ سقراط میں اس گرہ کو بھی حل رہی ہوں۔ میں نے محبت کی پیدائش اور اس کی فطرت کے بارے میں معلومات فراہم کر دی ہیں اور آپ تسلیم کرتے ہیں کہ حسن ہی سے محبت کی جاتی ہے لیکن کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ کہاں کا اور کس کا حسن، سقراط کا یا ڈائیوٹیما کا۔ چلیے میں اس سوال کو مزید آسان بنائے دیتی ہوں۔ اب پوچھتی ہوں کہ جب ایک مرد حسن سے محبت کرتا ہے تو وہ چاہتا کیا ہے؟ میں نے جواب دیا۔ وہ چاہتا ہے حسن اس کے ہاتھ لگ جائے۔ اس نے

کہا آپ کے اس جواب سے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ حسین شے کا مالک ہونے کی قیمت کیا ہے؟ میں نے کہا آپ کے سوال کا میرے پاس کوئی فوری جواب نہیں ہے۔ اس نے کہا چلیے میں حسین کی جگہ نیک کا لفظ استعمال کیے دیتی ہوں اور اسی سوال کو دہراتی ہوں۔ جو محبت کرتا ہے وہ دراصل نیکی سے محبت کرتا ہے۔ اب بتایئے کہ اسے کس سے محبت ہے؟ میں نے کہا نیکی کے حصول سے کیونکہ یوں نیکی اس کے تصرف میں آجاتی ہے۔ نیکی پر تصرف حاصل کر کے اسے کیا مل جاتا ہے؟ میں نے کہا مسرت۔ اس سوال کا جواب نسبتاً آسان ہے۔ اس نے کہا جی ہاں خوش وخرم لوگوں کو نیکی کے حصول سے مزید مسرت حاصل ہوتی ہے۔

اس سوال کے پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ مرد مسرت کی تمنا کیوں کرتا ہے؟ اس کا حتمی جواب پہلے ہی مل چکا ہے۔ میں نے کہا آپ درست فرماتی ہیں۔ کیا یہ خواہش، یہ تمنا سب میں پائی جاتی ہے؟ کیا ہر مرد اپنا فائدہ چاہتا ہے یا صرف چند؟ تمھیں کیا کہنا ہے میں نے جواب دیا۔ تمام لوگ۔ یہ خواہش سب میں مشترک ہے۔ اس نے فوراً جواب میں کہا کیوں نہیں۔ سقراط! کہا جاتا ہے کہ ہر مرد محبت کا خواستگار نہیں ہوتا۔ صرف چند ہی متمنی ہوتے ہیں؟ لیکن آپ کہتے ہیں کہ ہر مرد۔ ہمیشہ ایک ہی شے سے محبت کرتے ہیں۔ میں نے کہا میں خود حیران ہوں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس نے جواب دیا اس میں حیرانی کی بھلا کیا بات ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت کا ایک جزو جدا ہو گیا جسے کل کہا جاتا ہے۔ باقی اجزا کے مختلف نام ہیں۔ میں نے کہا ذرا مثال دے کر سمجھایئے۔ اس نے مجھے جواب دیا وہ درج ذیل ہے۔ آپ جانتے ہیں شاعری جو پیچ در پیچ اور متنوع ہوتی ہے۔ تخلیق یا ''عدم'' کا ''وجود'' کی صورت میں تشکیل پانا شاعری ہے۔ فن کا نام ہی تخلیق ہے۔ فنون کے ماہر تمام کے تمام شاعر یا تخلیق کار ہوتے ہیں۔ اس نے کہا بہت خوب۔ تاہم آپ جانتے ہیں انھیں کوئی شاعر نہیں کہتا۔ ان کے نام کچھ اور ہوتے ہیں۔ فنون لطیفہ میں سے علیحدہ ہونے والے صرف وہی فنون شاعری کہلاتے ہیں جن کا تعلق بحور، اوزان اور موسیقی سے ہے۔ جو لوگ اس مفہوم میں شاعری پر قدرت رکھتے ہیں وہ شاعر کہلاتے ہیں۔ میں نے کہا بالکل صحیح ہے۔ یہی بات محبت پر بھی صادق آتی ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ عموماً نیکی اور مسرت کی تمام خواہشیں دراصل محبت ہی کی عظیم اور لطیف قوت کا کرشمہ ہیں۔ لیکن جو لوگ اس کے حصول کے لیے دولت یا جسمانی قوت یا فلسفے کا راستہ اختیار کرتے ہیں انھیں محبت کرنے والا نہیں کہا جاتا۔ اس کل کے نام کا اطلاق صرف ان پر ہوتا ہے جن کی چاہت کی صرف ایک ہی صورت ہوتی ہے۔ وہی محبت کرتے ہیں یا محب کہلاتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ آپ درست فرما رہی ہیں۔

اس نے کہا جی ہاں۔ آپ لوگوں سے یہ سنتے ہیں کہ محبت کرنے والے اپنے دوسرے نصف کے

متلاشی ہوتے ہیں۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ وہ نہ اپنے نصف کو اور نہ ہی کل کو اس وقت تک تلاش کرتے ہیں جب تک نصف یا کل، نیکی اور خوبی کا حامل نہ ہو۔ اگر وہ برے ہوں گے تو وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں خود ہی کاٹ کر پرے پھینک دیں گے کیونکہ انھیں اپنے کسی حصے سے محبت نہیں ہوتی جب تک کہ انھیں کوئی یہ نہ بتائے کہ وہ اچھے ہیں۔ اور جو دوسروں کے ہیں وہ برے ہیں۔ کیوں کہ انسان سوائے اس کے اور کسی سے محبت نہیں کرتا جو نیک اور اچھا ہو۔ اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے؟ میں کہوں گا کہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ پھر تو سیدھی سادی حقیقت یہ ہے کہ انسان کو نیکی عزیز ہوتی ہے۔ میں نے کہا جی ہاں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ وہ نیکی کے حصول کو بھی پسند کرتے ہیں۔ اس نے کہا یہ اضافہ ضروری تھا۔ نیکی کا صرف حصول ہی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے اس پر تصرف۔ اس نے کہا جی ہاں اس میں اس صورت میں محبت کو نیکی کے دائمی تصرف میں سمجھا جائے گا۔ یہی بات سب سے زیادہ درست ہے۔

اس نے کہا کہ اگر محبت کی یہی خصوصیات ہیں تو کیا آپ مزید بتائیں گے اس کا طریق کار کیا ہے۔ آخر وہ لوگ کیا کام کرتے ہیں جو اس جوش و جذبے کا اظہار کرتے ہیں جسے محبت کہا جاتا ہے؟ ان کی نظر میں اس کا مقصد کیا ہے؟ بتاؤ تو۔ میں نے کہا ڈائیوٹیما ایسا نہیں ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں نہ تو آپ کی دانش مندی پر حیران ہوتا اور نہ ہی آپ سے سیکھنے کے لیے آپ کے پاس آتا۔ اس نے کہا بہت خوب میں تمھیں سکھاتی ہوں ان کا مقصد حسن کی پیدائش ہے خواہ وہ روحانی ہو یا جسمانی۔ میں نے کہا آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ تصریح طلب ہے۔ اس نے کہا میں اپنی بات کی مزید وضاحت کرتی ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے جسم اور روح میں اپنی پیدائشی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ ایک عمر آتی ہے جب فطرتِ انسانی تولید کی طرف مائل ہوتی ہے۔ تولید جو حسین ہو، بدصورت نہ ہو اور یہ تولید مرد اور عورت کے ملاپ ہی سے ممکن ہے۔ اور یہ عمل، الوہی عمل ہے۔ کیونکہ فانی مخلوق میں استقرار حمل اور تولید ایک دوامی اصول ہے۔ جو غیر متناسب اشیا میں عمل پذیر نہیں ہوتا، لیکن بدصورتی ہمیشہ غیر مناسب ہوتی ہے اور حسین ہمیشہ متناسب ہوتا ہے۔ اس طرح حسن وضع حمل کی دیوی یا تقدیر ہوتی ہے۔ پیدائش کے وقت جس کا حکم چلتا ہے۔ اسی لیے حسن سے قربت کے وقت استقرار حمل کی صلاحیت سازگار ہوتی ہے۔ طولانی اور مفید ہوتی ہے اور شگفتہ ہوتی ہے۔ بدصورتی کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں۔ سکڑ جاتی ہے اور درد کے احساس میں ڈوب جاتی ہے۔ منھ موڑ لیتی ہے، مرجھا جاتی ہے اور بلا تکلف تولید سے اجتناب کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استقرار حمل کے لمحے میں پرجوش فطرت مادہ تولید سے لبریز ہوتی ہے تو حسن سے متعلق ایسا ہیجان اور انبساط

پیدا ہوتا ہے جو کرب تخلیق کو سکون بخشتا ہے۔ سقراط یاد رکھو محبت صرف حسن کی چاہت ہی کا نام نہیں ہے۔ تو پھر کیا ہے؟ تولید کی محبت اور حسن کی پیدائش۔ میں نے کہا جی ہاں درست ہے۔ اس نے کہا یہ واقعی درست ہے لیکن تولید کا کیوں؟ اس نے جواباً کہا کیونکہ فانی مخلوق کے لیے تولید ایک طرح کی ابدیت اور دوام ہے اور اگر جیسا کہ پہلے ہی تسلیم کیا جا چکا ہے محبت نیکی کا لازوال تصرف ہے تو تمام لوگ نیکی کے ساتھ ہی دوام کے طلب گار ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ محبت دائمی ہوتی ہے۔

یہ تمام باتیں مجھے اس نے اس وقت سکھائیں جب وہ محبت کا ذکر کرتی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار اس نے مجھ سے کہا سقراط آخر محبت اور اس سے متوقع خواہش کا سبب کیا ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ چرند، پرند اور درندے تولید کے شدید جذبے کے تحت آتے ہی محبت میں گرفتار ہو کر ایک کرب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جس کا آغاز آرزوئے وصل سے ہوتا ہے۔ اسی عمل میں بچوں کی نگہداشت بھی شامل ہے۔ جس کے لیے کمزور سے کمزور بھی قوی ترین دشمن سے سخت مقابلے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ ان کے لیے مرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اور بچوں کی پرورش کے لیے خود بھوک برداشت کرتا ہے، سختیاں جھیلتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بیشتر حرکات وہ کسی نہ کسی بنیاد پر کرتے ہوں تاہم جانوروں میں ایسے شدید جذبات کیوں پیدا ہوتے ہیں۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں، ایسا کیوں ہوتا ہے۔ میں نے پھر کہا مجھے معلوم نہیں۔ اس نے کہا تمھیں علم نہیں پھر بھی تم محبت کے موضوع پر مہارت حاصل کرنا چاہتے ہو؟ میں نے کہا ڈائیوٹیما میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں اپنی لاعلمی کو دور کرنے کے لیے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا کوئی استاد ہو۔ آپ مجھے اس کے علاوہ محبت کی دیگر رموز سے بھی آگاہ کریں۔ اس نے کہا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تمھارا یقین ہے کہ محبت ابدی اور دائمی ہے تو میں اس کو بارہا تسلیم کر چکی ہوں۔ اس معاملے میں بھی اسی اصول پر کاربند ہوتے ہوئے فنا پذیر فطرت جہاں تک ممکن ہو، ابدیت اور دوام کی متلاشی ہے۔ اس کا حصول صرف توالد اور تناسل ہی سے ممکن ہے۔ توالد کے ذریعے ہمیشہ پرانی نسل ایک نئی نسل کے لیے جگہ چھوڑ دیتی ہے خود فرد کی زندگی میں توارث ہوتا ہے۔ حتمی وحدت نہیں رہتی۔ اگرچہ فرد وہی ہوتا لیکن جوانی اور بڑھاپے کے مختصر سے وقفے میں، جس میں کہا جاتا ہے کہ ہر ذی روح کی اپنی زندگی اور شناخت ہوتی ہے۔ اس میں تغیر و تبدل کا عمل جاری رہتا ہے۔ اتلاف بھی ہوتا ہے اور اس کی تلافی بھی ہوتی رہتی ہے۔ بال، عضلات ہڈیاں، خون بلکہ پورا جسم تبدیلی کے عمل سے گزرتا ہے۔ یہی بات صرف جسم پر نہیں بلکہ روح پر بھی صادق آتی ہے۔ جس کی عادت، اطوار، مزاج، خیالات، خواہشات، انبساط، مشکلات اور اندیشے ہمیشہ آتے جاتے رہتے

ہیں۔ اس کا اطلاق علم پر بھی ہوتا ہے۔ ہم فانی لوگوں کے لیے اس سے بھی زیادہ حیران کن امر یہ ہے کہ نہ صرف علوم میں عروج وزوال پایا جاتا ہے بلکہ اسی نسبت سے ہم بھی متغیر ہیں۔ ان میں ہر ایک تبدیلی کے مرحلے سے گزرتا ہے۔ لفظ ''یادداشت'' اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ علم منتقل ہوتا رہتا ہے وہ کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی تجدید اور تحفظ اسی یادداشت کے وسیلے ہی سے ممکن ہے۔ وہ بظاہر پہلی صورت ہی میں نظر آتی ہے لیکن دراصل وہ نئی شکل میں ہوتے ہیں۔ یہ عمل ہے قانونِ توارث کا جس کے وسیلے سے تمام فانی چیزوں کا تحفظ ممکن ہوتا ہے لیکن اصل صورت باقی نہیں رہتی۔ اس کا متبادل اس طرح مل جاتا ہے کہ قدیم گھسی پٹی فانی ہستی اپنے پیچھے بالکل نیا وجود چھوڑ جاتی ہے۔ برخلاف الوہی وجود کے جو اسی صورت میں ہمیشہ قائم و دائم رہتا ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر وتبدل رونما نہیں ہوتا۔ سقراط یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے ایک فانی وجود لافانی بن جاتا ہے۔ اس لیے اولاد سے محبت پر حیران نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ عالمگیر محبت اور چاہت دراصل دوام کے حصول کے لیے ہے۔

مجھے اس کے الفاظ سن کر حیرت ہوئی اور میں نے کہا دانا، ڈائیوٹیما کیا یہ واقعی سچ ہے؟ اس نے ایک ماہر منطقی کی طرح جواب دیا کہ سقراط اس بات پر شک نہ کرو یقین رکھو۔ صرف انسان کے مدعا پر غور کرو۔ تمھیں ان کے مہمل طور طریقوں پر اس وقت تک حیرت ہوگی جب تک یہ نہ تصور کرو کہ وہ دائمی نیک نامی کی محبت میں ایسا کرتے ہیں۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے بڑے سے بڑے خطرات مول لینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اپنی اولاد کے لیے نہیں۔ وہ اپنے بعد اپنا نام چھوڑ جانے کی خاطر نہ دولت کی پروا کرتے ہیں نہ مشقت سے منھ موڑتے ہیں۔ اس کے لیے تو وہ جان بھی دے سکتے ہیں۔ تمھارا کیا خیال ہے کہ الکسٹس (Alcestis) نے ایڈمیٹس (Admetus) کی جان بچانے کے لیے یا ایکلیس (Achilles) نے پیٹروکلس (Patroclus) کا انتقام لینے کی خاطر یا خود تمھارے حکمران کوڈرس (Codrus) نے اپنے بیٹے کے لیے سلطنت محفوظ رکھنے کی خاطر یوں ہی جان دے دی تھی۔ ہرگز نہیں بلکہ وہ چاہتے تھے کہ ان کا یہ نیک کام ہمیشہ زندہ رہے۔ اس نے کہا جی نہیں ہر آدمی طرح طرح کے کام کرتا ہے جتنے بہتر ہوتے ہیں اتنا ہی زیادہ کام کرتے ہیں اور لافانی نیکی کی شہرت کی آرزو میں وہ زیادہ محنت کرتے ہیں۔ اس طرح انھیں ابدیت کی تمنا ہوتی ہے۔

جو صرف جسمانی لحاظ سے بارآور ہوتے ہیں وہ خواتین سے رجوع کرتے ہیں اور بچے پیدا کرتے ہیں۔ ان کی محبت کی یہی خوبی ہوتی ہے۔ انھیں توقع ہوتی ہے کہ ان کی اولاد ان کی یادگار بن جائے گی اور مستقبل میں جس ابدیت کی انھیں تلاش ہے وہ اور اس کی نعمتیں انھیں حاصل ہوں گی۔ لیکن روحیں بھی بارآور

ہوتی ہیں یقیناً ایسے لوگ موجود ہیں۔ جن کی روح ان کے جسم سے زیادہ ثمر بار ہوتی ہے، زیادہ تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ ایسی باتوں کو تخلیق کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں جو تخلیق کے لایق ہوتی ہیں اور یہ ثمرات کیا ہیں؟ عموماً دانائی اور نیکی۔ اس کے تخلیق کار عموماً شاعر اور وہ فن کار ہوتے ہیں جن کو موجد کا لقب زیب دیتا ہے۔ لیکن عظیم ترین اور عمدہ ترین دانائی وہ ہوتی ہے جس کا تعلق ملکوں اور خاندانوں کے معاملات مرتب کرنے سے ہوتا ہے اور جسے اعتدال اور انصاف سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور جس کے وجود میں جوانی ہی میں اس کا تخم بو دیا جاتا ہے اور اس میں اسے فروغ دینے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ وہ بالغ ہو کر بار آور ہونے اور تولید کا متمنی ہوتا ہے۔ وہ اس حسن کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے جو اس کے لیے اولاد فراہم کرے۔ کیونکہ بدصورتی میں وہ کچھ پیدا نہیں کر سکے گا۔ اسی لیے وہ خوبصورت جسم سے ہم آغوش ہوتا ہے بدوضع جسم سے نہیں۔ مزید برآں جب اسے حسین، خوش اطوار اور تربیت یافتہ روح مل جاتی ہے تو اس کا وصال دو ہستیوں کو ایک بنا دیتا ہے۔ اور وہ نیک آدمی کی خوبیوں، فطرت اور مشاغل کے بارے میں رطب اللسان ہو جاتا ہے۔ وہ اسے سکھانے کی سعی میں مصروف ہو جاتا ہے اور حسن کے اس لمس سے جو اس کے ذہن میں ہمہ وقت تازہ رہتا ہے۔ اگرچہ بظاہر یاد نہیں رہتا تو وہ اسی کو ظہور میں لاتا ہے جسے اس نے طویل عرصے قبل سوچا تھا اور پھر اس کے ہمراہ اپنی تخلیق شدہ ہستی کی پرورش کرتا ہے۔ وہ ایسے رشتے میں بندھ جاتے ہیں جو ان سے بہت ہی زیادہ قریب ہوتا ہے جو فانی اولاد پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ جن بچوں کو وہ پیدا کرتا ہے وہ اس سے حسین تر اور کہیں زیادہ لازوال ہوتے ہیں۔ ایسا کون ہے جو ہومر اور دیگر عظیم شعرا کو یاد کرے مگر اس کے بچے عام بچوں جیسے ہوں۔ کون ہے جو ان جیسی اولاد پیدا کرنے میں ہمسری کی کوشش نہ کرے۔ جس نے ان کی یاد باقی رکھی اور ان کے لیے ابدی عظمت کا سامان فراہم کیا یا کون ہے جو نہیں چاہے گا کہ وہ ایسی ہی اولاد چھوڑ جائے جیسے لائی کرگس (Lycurgus) نے چھوڑی تھی جو نہ صرف لیسی ڈیمون ہی کے لیے بلکہ ہیلاز اور وحشیوں کے لیے نجات دہندہ بنی۔ ایتھنز کے محترم بابائے قانون سازی سولون (Solon) کا انہی میں شمار ہوتا ہے۔ مزید برآں بے شمار اسی طرح کی ہستیاں دیگر مقامات پر بھی گزری ہوں گی۔ جنھوں نے دنیا کو اپنے عمدہ کارناموں سے نوازا ہو گا اور ہر طرح کی نیک کرداری کا سرچشمہ بنے ہوں گے۔ ان جیسے بچوں کے اعزاز کے لیے کئی عبادت گاہیں ان کی یادگاری طور پر قائم کی گئی ہوں گی لیکن کوئی زندہ جاوید کارنامہ انجام نہ دینے والی اولاد کی کوئی یادگار تعمیر نہیں ہوتی۔

محبت کے یہ کمتر درجے کے اسرار ہیں جن میں سقراط تم بھی الجھ سکتے ہو۔ لیکن برتر اور پوشیدہ اسرار

جوسب کا تاج ہیں اور اگر اس سے درست انداز سے رجوع کیا جائے تو یہ تمھاری دسترس میں آ جائیں گے۔ مجھے معلوم نہیں کہ تم اسے حاصل کر سکتے ہو یا نہیں۔ تاہم میں تمھیں مطلع کرنے کی پوری کوشش کروں گی اور اگر ممکن ہو تو اس بات پر عمل کرنا۔ کیونکہ جو اس راہ پر سنجیدگی سے آگے بڑھتا ہے اسے نوجوانی ہی میں حسین پیکروں سے رابطے کا آغاز کرنا چاہیے۔ اور اولاً تو اگر اس کا استاد اس کی اس طرح رہنمائی کرے کہ وہ صرف ایک ہی ایسے پیکر سے محبت کرے۔ اور اس تعلق کے وسیلے سے وہ حسین تصورات کی تخلیق کرے گا۔ اور جلد ہی اسے خود یہ احساس ہو جائے گا جو حسن ایک پیکر میں ہوتا ہے ویسا ہی دوسرے پیکروں میں بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔ پھر اگر خوبصورتی ہی کی اسے تلاش ہو تو یہ اس کی بڑی نادانی ہوگی کہ اسے اس حقیقت کا ادراک نہ ہو کہ ہر پیکر میں محبت کا روپ اور اس کی ماہیت درحقیقت یکساں ہی ہوتی ہے اور جب یہ حقیقت اُس پر منکشف ہو جائے گی کہ صرف ایک ہی سے اس کی والہانہ محبت میں کمی آ جائے گی۔ تو اس سے اسے نفرت ہو جائے گی اور اسے وہ حقیر سمجھنے لگے گا۔ اور پھر وہ ہر حسین شے سے لو لگائے گا۔ اگلے مرحلے میں اس میں یہ احساس جاگزیں ہو جائے کہ ذہن کی خوبصورتی ظاہری حسن سے کہیں زیادہ ذی وقار اور باوقعت ہوتی ہے۔ اس طرح اگر ایک نیک روح تھوڑی بہت قبول صورت پیکر میں موجود ہو تو اس سے وہ نہایت اطمینان سے محبت کرے گا اور اس کی حرص کم ہوگی۔ وہ ایسے خیالات کی تلاش اور تحقیق میں مصروف ہو جائے گا جو نوجوان کی اصلاح کریں گے۔ یہ تلاش اس وقت تک جاری رہے گا جب تک وہ پابند نہیں ہو جاتا کہ اداروں اور ضابطوں کے حسن پر غور کرے اور ان کا مشاہدہ کرے اور سمجھ جائے کہ ان کے حسن کا ماخذ ایک ہی ہے اور یہ بھی کہ ذاتی حسن کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ضابطوں اور اداروں کے بعد وہ علوم تک پہنچے گا اور ان کا حسن اس پر منکشف ہوگا۔ اس عالم میں اس کی حیثیت ایک نوجوان فرد یا ادارے کے ملازم کی نہیں ہوگی کہ وہ خود کو ان کا ایک کمترین اور تنگ نظر غلام تصور کرے۔ وہ محسوس کرے گا کہ حسن کا بحر ناپید کنارہ اسے اپنے طرف کھینچ رہا ہے۔ وہ اسے اپنی فکر کا محور بنا دے گا۔ وہ حکمت کی بے پایاں وسعتوں میں اس وقت تک اعلیٰ تصورات اور خیالات تخلیق کرتا رہے گا جب تک وہ اس سے ماس پر نشوونما پا کر توانا نہیں ہو جاتا۔ بالآخر وہ مرحلہ بھی آ جاتا ہے کہ جب اس پر ایک علم کی اہمیت منکشف ہو جاتی ہے جو کہ آفاقی حسن کا علم ہے۔ اب میں اسی موضوع پر گفتگو کروں گی۔ ذرا توجہ سے سنیے۔

جس فرد کی محبت نے رموز سے اس حد تک تربیت ہو چکی ہو اور خوبصورتی کی مناسب ترتیب اور تسلسل سے آگاہی رکھتا اور سیکھ چکا ہو۔ جب اس مرحلے کے اختتام پر پہنچے گا تو حیران کن حسن کی ماہیت کا

است نہ کرے گا۔ سقراط یہی ہماری تمام گزشتہ عرق ریزیوں کی بنیاد ہے) ایسی ماہیت جو دوامی ہے جو نہ بڑھتی ہے نہ کم ہوتی ہے۔ نہ کھلتی ہے نہ مرجھاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ کسی معاملے میں خوبصورت اور کسی میں بدصورت نہیں ہوتی، یا کسی، وقت کسی حوالے سے یا کسی مقام پر اچھی اور دوسرے وقت، دوسرے حوالے سے یا کسی دوسرے مقام پر بری ہوتی ہے۔ یا کسی کے لیے نیک اور کسی اور کے لیے بد ہوتی ہے۔ یا چہرے یا ہاتھ یا جسم کے کسی حصے کی مماثلت میں یا تقریر کے کسی انداز میں یا علم میں یا جانوروں، آسمان یا زمین یا مقام جیسی دیگر موجودات میں اس کا وجود ہوتا ہے لیکن ایسا حسن مطلق، منفرد، سادہ اور لازوال ہوتا ہے، جس میں نہ نمو ہوتا ہے نہ کمی آتی ہے نہ ہی کوئی تغیر ہوتا ہے۔ اسے ان اشیا میں سمو دیا جاتا ہے جن کا حسن نمو پذیر بھی ہوتا ہے اور فنا پذیر بھی۔ اصلی محبت کے زیر اثر بلندی کی طرف مائل فرد کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ حسن انتہا سے زیادہ دور نہیں ہوتا اور محبت کے معاملات تک خود یا دوسرے کی مدد سے پہنچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کا آغاز زمین کی خوبصورتی سے کریں اور پھر دوسری خوبصورتیوں کے حصول کے لیے بلند تر ہوتے جائیں۔ انھیں مدارج کے طور پر استعمال کریں۔ وہ ایک سے دو اور دو سے تمام حسین اشکال تک۔ حسن اشکال سے حسین اشتغال تک، حسن اشتغال سے حسین خیال تک چلتے رہیں اور اس وقت تک چلتے رہیں جب تک حسن مطلق تک اس کی رسائی نہیں ہو جاتی۔ اور آخر کار وہ سمجھ جاتا ہے کہ حسن کی روح کیا ہوتی ہے۔ مانٹینیا (Mantineiah) کے مہمان نے کہا۔ عزیزم سقراط، یہ وہ اعلیٰ زندگی ہے جسے حسن مطلق کے تصور کے لیے سب کو بسر کرنا چاہیے۔ اگر کسی حسن کو آپ صرف ایک ہی بار دیکھ لیں تو آپ اسے سونے اور زرق برق لباس والے مسحور کن لڑکوں اور نوجوانوں کے معیار سے کبھی نہ پرکھیں گے۔ آپ اور بہت سے دیگر افراد ان سے بلا شراب و کباب صرف ملاقات اور گفتگو کر کے آسودہ خاطر ہو جائیں گے۔ اگر ایسا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ صرف ان کا دیدار کرنا اور ان کا ساتھ دینا چاہتے تھے۔ لیکن وہ کیا عالم ہوگا جب کسی کی نظریں اصل حسن کو شناخت کر لیں۔ ایسا حسن جو الوہی ہو یعنی جو خالص اور شفاف ہو اور ملاوٹ سے پاک ہو۔ اس میں فنا پذیری اور انسانی زندگی کی رنگینیوں اور خود پسندی کی آلودگی مزاحم نہ ہو۔ نگاہ اسی جانب ہو اور خالص اور الوہی حسن مطلق سے گفتگو ہو؟ یاد رکھو، وہ اس طرح صرف اس رفاقت اور ذہن کی آنکھوں سے حسن کے نظارہ سے حسن کے نقوش کو ہی نہیں بلکہ حقائق کو بھی وجود میں لائے گا۔ (کیونکہ اس کا صرف تصور ہی نہیں بلکہ حقیقت بھی اس کے تصرف میں ہو گی۔) اور وہ حقیقی نیکی کو پیدا کر کے اسے پروان چڑھائے گا تا کہ اگر فانی انسان کے بس میں ہو تو وہ خدا کا دوست اور لافانی ہو جائے۔ کیا یہ زندگی حقیر ہوگی؟

فیڈرس میرا خطاب صرف آپ سے نہیں بلکہ سب سے پہلے ڈائیوٹیما کے ایسے ہی الفاظ تھے۔۔۔
مجھے اس کی صداقت تسلیم کرنے میں کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ خود قائل ہوا ہوں اس لیے میں دوسروں کو اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کروں گا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے انسانی فطرت کو محبت سے بہتر کوئی دوسرا معاون نہیں ملے گا۔ اسی لیے میں یہ بھی کہوں گا کہ ہر ایک کو چاہیے کہ اس کی عزت کرے۔ میں خود اس کی عزت کرتا ہوں اور اسی کی راہوں پر چل رہا ہوں۔ اور دوسروں کو بھی اسی پر آمادہ کر رہا ہوں۔ میں حتی المقدور محبت کی روح اور قدرت کو سراہتا ہوں اور ہمیشہ سراہوں گا۔

فیڈرس میں نے جو الفاظ ادا کیے ہیں، آپ چاہیں تو اسے محبت کی خامی، خوبی، محض رسمی تعریف یا جیسا جی میں آئے کہہ ڈالیں۔

جب سقراط کی تقریر ختم ہوگئی تو حاضرین محفل نے اظہارِ تحسین و آفرین کیا اور ارسٹوفینس (Aristophanes)، سقراط کے اپنے خطاب میں اس کی تقریر کے حوالے سے جو باتیں کی تھیں۔ اس کا جواب دینے ہی والا تھا کہ مکان کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور رنگ رلیاں منانے والوں اور نے نواز لڑکی کی آوازیں سنائی دیں۔ آگاتھان نے خادم سے کہا وہ جا کر دیکھے کہ دراندازکون ہیں۔ اگر وہ ہمارے دوست ہیں تو انھیں احترام سے اور اگر کوئی دوسرے ہیں تو کہہ دو کہ شراب نوشی کی محفل ختم ہو چکی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد السی بیاڈس (Alcibiades) کی آواز صحن میں گونجی وہ نشے میں دُھت تھا اور چیخ چلا رہا تھا۔ آگاتھان کہاں ہے مجھے اس کے پاس لے چلو۔ آخر کار وہ خود ہی نے نواز لڑکی اور چند دیگر رفیقوں کے ہمراہ آگاتھان تک پہنچ گیا۔ ''دوستو مرحبا''۔ وہ دروازے پر کھڑا تھا گلے میں عشق پیچاں اور بنفشے کے پھولوں کا موٹا سا ہار تھا۔ اس کے سر پر خوبصورت فیتوں کا تاج تھا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کی اس بزم رامشگری میں کسی بدمست سے رفاقت ہو؟ یا میں آگاتھان کو یہ اعزاز بخشوں۔ میں اسی نیت سے یہاں آیا ہوں۔ یہ کام کر کے میں چلا جاؤں گا۔ میں گزشتہ روز بوجوہ یہاں نہ آسکا۔ آج میں اسی لیے آیا ہوں کہ آپ کی اجازت سے یہ تاج اپنے سر سے اتار کر اس حسین ترین اور عاقل ترین شخص کو پہنا دوں جیسے آپ کہیں گے۔ میں نشے میں ہوں، اس لیے آپ مجھ پر ہنسیں گے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ ہے۔ آپ کتنی ہی ہنسی کیوں نہ اڑائیں لیکن پہلے یہ بتائیں کہ اگر میں داخل ہو جاؤں تو کیا وہ میری باتوں کا ادراک کریں گے؟ آپ میرے ساتھ مے خواری کریں گے یا نہیں؟

محفل نے بآوازِ بلند اسے نشست پیش کی۔ آگاتھان نے اسے مدعو کیا۔ اس کے ساتھ آنے والوں

نے اسے محفل میں آنے کے لیے اس کی رہنمائی کی۔ اسی دوران اس نے آگاتھان کو تاج پہنانے سے قبل خوبصورت فیتوں کا تاج اپنے سر سے اُتارا اور اسے بغور دیکھنے لگا۔ اس طرح اس کی نظر سقراط پر نہیں پڑی جس نے پرے ہٹ کر اسے راستہ دیا۔ اور السی بیاڈس نے سقراط اور آگاتھان کے درمیان والی خالی نشست سنبھال لی اور بیٹھنے سے قبل اس نے آگاتھان سے بغلگیر ہو کر اس کی تاج پوشی کر دی۔ آگاتھان نے کہا ان کے جوتے اُتار دو اور اسی صوفے پر تیسرے شخص کے لیے جگہ بناؤ۔

السی بیاڈس نے کہا۔ ضرور لیکن پہلے یہ تو پتا چلے کہ وہ تیسرا شخص ہے کون جو ہمارے بزم نشاط میں شریک ہو رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر محفل کی طرف دیکھا کہ اچانک اس کی نظر سقراط پر پڑی۔ اس نے کہا قسم ہے ہراکلس (Heracles) کی، یہ کیا ہے؟ ارے یہ تو سقراط ہے جو ہمیشہ میری تاک میں رہتا ہے اور اپنے انداز میں ہمیشہ کسی نہ کسی غیر متوقع مقام پر نمودار ہو جاتا ہے۔ اب بتاؤ تمھیں اپنی صفائی میں کیا کہنا ہے۔ یہاں کیوں لیٹے ہوئے ہو۔ میں سمجھتا ہوں تم نے اپنی یہ جگہ ہیرا پھیری سے بنائی ہے جو ارسٹوفینس جیسے کسی مسخرے یا لطیفہ باز کے پہلو میں نہیں ہے بلکہ حسین ترین رفیق کے ساتھ ہے۔

سقراط نے آگاتھان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: جناب میری درخواست ہے کہ آپ مجھے ان سے بچائیں کیونکہ اس شخص کا جذبہ میرے لیے خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ جب سے میں اس کا مداح ہوا ہوں وہ بالکل ہی نہیں چاہتا کہ میں کسی دیگر خوبصورت ہستی کی تعریف کروں، حتیٰ کہ اس کی طرف دیکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اگر میں ایسا کر بیٹھوں تو وہ رشک و حسد سے ہوش و حواس کھو دیتا ہے۔ نہ صرف مجھے گالیاں دیتا ہے بلکہ دست درازی سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس عالم میں وہ مجھے زخمی بھی کر سکتا ہے۔ برائے مہربانی اس کا خیال رکھیے یا ہماری صلح صفائی کرا دیجیے۔ اگر وہ تشدد پر اتر آئے تو پھر مجھے تحفظ فراہم کیجیے۔ کیونکہ مجھے اس کے مجنونانہ رویے اور پُرغیض حرکات سے جسمانی ضرب کا خدشہ ہے۔

السی بیاڈس نے کہا کہ ہم دونوں کے درمیان کبھی صلح صفائی نہیں ہو سکتی۔ چلو اس وقت میں تمھاری سرزنش ملتوی کرتا ہوں۔ آگاتھان آپ سے التماس ہے کہ چند فیتے مجھے عنایت کر دیں تاکہ میں اس عالمگیر مطلق العنان حکمران کے سر پر بھی تاج رکھ دوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے یہ شکایت ہو کہ میں نے آپ کی تاجپوشی کی مگر اسے نظر انداز کر دیا جو اپنی باتوں سے نوع انسانی کو زیر کر لیتا ہے۔ یہ بات ایک بار کی نہیں ہے جیسا کہ آپ نے پرسوں دیکھا تھا بلکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہتا ہے۔ اس کے بعد اس نے آگاتھان سے چند فیتے لے کر سقراط کے سر کو سجایا اور پھر آرام سے بیٹھ گیا۔

اس نے کہا، دوستو لگتا ہے آپ لوگ نشے میں نہیں ہیں یہ بات میرے لیے یہ ناقابلِ برداشت ہے۔ آپ کو شراب پینی چاہیے کیونکہ مجھے اس معاہدے کے تحت یہاں داخلے کی اجازت ملی ہے کہ جب تک آپ مدہوش نہیں ہو جاتے، اس بزم کا صدر نشین میں رہوں۔ ذرا وہ بڑا سا قدح میرے حوالے کیجیے۔ اس نے آگاتھون کے ملازم سے مخاطب ہوتے ہوئے، شراب کا وہ کاسہ لانے کا حکم دیا۔ جس پر اس کی نظر پڑی تھی اور جو دو چوتھائی سے زیادہ شراب سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے اسے بھر کر خالی کر دیا اور نوکر کو حکم دیا کہ وہ اسے دوبارہ بھر کر کے سقراط کو پیش کرے۔ السی بیاڈس نے کہا ذرا دیکھیے گا میری اس ترکیب کا سقراط پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ وہ بلانوش ہے، جتنا چاہو اسے پلا دو وہ مدہوش نہیں ہوگا۔ سقراط، نے نوکر کا دیا ہوا پیالہ پی لیا۔

اریکسی میکس نے کہا، السی بیاڈس! یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا شراب کے ساتھ نہ بات چیت ہوگی اور نہ کوئی گانا بجانا، بس پیتے ہی رہیں گے گویا سارے ہی پیاسے ہیں؟

السی بیاڈس نے کہا، عاقل ترین اور لائق باپ کے بیٹے مرحبا۔

اریکسی میکس (Eryximachus) نے کہا، آپ کو بھی خوش آمدید۔ لیکن اب ہمیں کیا کرنا ہے۔

السی بیاڈس نے کہا، یہ آپ پر منحصر ہے۔ ''دانا طبیب جو ہمارے زخموں کا معالج ہے۔'' دوا تجویز کرے ہم اس کا حکم مانیں گے۔ آپ کیا چاہتے ہیں۔

اریکسی میکس نے کہا، بہت خوب آپ کی آمد سے قبل ہم نے ایک قرارداد منظور کی تھی کہ ہم میں سے ہر فرد باری باری محبت کی تعریف کو حتی المقدور بہترین طریقے سے بیان کرے گا۔ باری بائیں سے دائیں جانب چلی تھی۔ ہر شخص تقریر کر چکا ہے۔ آپ غیر حاضر تھے۔ آپ نے تقریر تو نہیں کی لیکن شراب کے ساتھ پورا انصاف کیا۔ اب آپ کو تقریر کرنا ہوگی اور آپ اس دوران سقراط پر جو بار بھی ڈالنا چاہتے ہیں ڈال دیں اس کے بعد ان کے دائیں ہاتھ والے شخص کی باری ہوگی اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے چلتا جائے گا۔

السی بیاڈس نے کہا کہ اریکسی میکس بہت خوب۔ تاہم مدہوش انسان کی تقریر کا باہوش انسان کی تقریر سے موازنہ مبنی بر انصاف نہیں ہوگا۔ عزیز دوستو ذرا یہ تو بتاؤ کہ کیا آپ کو ان باتوں پر یقین ہے جو سقراط نے ابھی کی ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سچ وہی ہے جو اس کی ضد ہے۔ (یعنی جو کچھ سقراط نے کہا ہے وہ درست نہیں ہے) مزید برآں اگر میں اس کے علاوہ کسی اور دیوتا یا انسان کی تحسین کروں تو وہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے باز نہیں آئے گا۔

سقراط نے کہا۔ کتنی شرمناک بات ہے۔

السی بیاڈس نے کہا، زبان کو لگام دو۔ پوزیڈان (Poseidon) کی قسم جب تم کسی محفل میں شریک ہوتے ہو تو میں تمھارے سوا اور کسی کی تعریف نہیں کرتا۔

اریکسی میکس نے کہا، اچھا یہ بات ہے تو سقراط کی ضرور تعریف کیجیے۔

السی بیاڈس نے کہا، اریکسی میکس تمھارا کیا خیال ہے، میں اس پر حملہ آور ہو کر سب کے سامنے اسے سزا دوں گا؟

سقراط نے کہا، تم کیا چاہتے ہو۔ کیا تم میری ہنسی اڑوانا چاہتے ہو؟ کیا تمھاری تعریف کا یہی مفہوم ہے؟

اگر اجازت ہو تو میں حق گوئی سے کام لینا چاہوں گا؟

اجازت کا کیا سوال ہے میں تو سچ بولنے کی ترغیب دوں گا۔

السی بیاڈس نے کہا، اگر یہ بات ہے تو میں اظہار خیال میں دیر نہیں کروں گا۔ اور اگر میرے منھ سے کوئی ایسی بات نکلے جو سچ نہ ہو تو میری تقریر کے دوران ہی مجھے ٹوک کر کہنا کہ یہ جھوٹ ہے حالانکہ میری نیت سچ کہنے کی ہی ہوگی۔ تمھیں حیران ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ جو جو باتیں دماغ میں آتی رہیں گی، میں وہی کہتا جاؤں گا۔ تاکہ کسی ایسے شخص کے لیے جس کی حالت میری جیسی ہو تمھاری بوالعجبیوں پر سلسلہ وار گفتگو کرنا آسان نہیں ہوگا۔

میرے بچو! اب میں سقراط کی تعریف اس انداز سے کروں گا کہ بادی النظر میں یوں معلوم ہوگا کہ میں ان کا مذاق اڑا رہا ہوں تاہم ان کا مذاق اڑانا میرا مقصد ہرگز نہیں ہوگا۔ میں صرف حق بیان کروں گا۔ میں کہتا ہوں کہ وہ بالکل سائلی نس (Silenus) کے نیم مجسمے جیسا ہے جو بت تراشوں کی دکانوں میں سجائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے منھ میں شہنائی یا بانسری ہوتی ہے۔ ان کے سینے کھل سکتے ہیں جو دیوتاؤں کی تصاویر سے مزین ہوتے ہیں۔ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ وہ گھوڑے کی دم اور کان مگر انسانی شکل والے دیوتا مارسیاس (Marsyas) سے بھی مشابہ ہے۔ سقراط تم خود انکار نہیں کر سکتے کہ تمھارا چہرہ اسی دیوتا سے ملتا جلتا ہے۔ اوہو دوسرے معاملوں میں بھی تو مشابہت ہے مثلاً تم دھونس دینے والے ہو۔ اگر اعتراف نہیں کرو گے تو میں شہادتیں پیش کر سکتا ہوں۔ اور کیا تم نے نواز نہیں ہو؟ تم ہو! بلکہ اس فن میں دیوتا مارسیاس سے کہیں زیادہ مہارت رکھتے ہو۔ یہ درست ہے کہ اس کے سینے میں اتنا دم ہوتا تھا کہ وہ اپنی بانسری سے لوگوں کی روحوں کو مسحور کر لیتا تھا۔ اس کی دھنوں کو بجانے والے آج بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ اولمپس (Olympus) کی دھنیں

مارسیاس ہی کی دھنوں سے اخذ کی گئی ہیں جس کی اس نے انھیں تعلیم دی تھی۔ یہ دھنیں بڑی دلکش ہیں ان کا جواب نہیں۔ خواہ انھیں کوئی ماہر بجائے یا بانسری بجانے والی کوئی معمولی سی لڑکی۔ صرف وہی ایسی ہیں جو روح پر چھا جاتی ہیں اور ان کی حاجات کا اظہار کرتی ہیں جس کے لیے دیوتاؤں یا کسی پراسرار قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ملکوتی ہوتی ہیں۔ لیکن یہی تاثر تم اپنے الفاظ سے پیدا کر لیتے ہو۔ محبتیں بانسری کی حاجت نہیں ہوتی۔ تم میں اور اس میں یہی فرق ہے۔ ہم اچھے سے اچھے مقرر کو بھی سنتے ہیں تو وہ ہمیں یکسر بالکل متاثر نہیں کرتا یا اس کا اثر بہت ہی کم ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف تمھارے الفاظ بلکہ ان کے اجزا بھی اگر دوسرے کتنے ہی برے ٹوٹے پھوٹے انداز میں دہرائیں پھر بھی وہ سننے والے مردوں، عورتوں اور بچوں تک کو متحیر اور مسحور کر دیتے ہیں۔ اور اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہو کہ تم مجھے لاعلاج بدمست شرابی تصور کرو گے تو قسم کھا کر ان تاثرات کا ذکر کرتا۔ جو ہمیشہ مجھ پر وارد ہوتے ہیں بلکہ اب بھی مجھ پر طاری ہیں۔ کیونکہ جب میں انھیں سنتا ہوں تو میرا دل کوری بینٹ کے موج میلہ منانے والوں سے کہیں زیادہ بے قابو ہو جاتا ہے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ بہت سے دیگر افراد پر بھی یہی اثر مرتب ہوتا ہے۔ میں نے پیریکلس اور دیگر بہت سے عظیم خطیبوں کو سنا ہے۔ میری رائے میں وہ خوب بولتے تھے۔ لیکن میرے دل میں ویسا کوئی احساس بیدار نہیں ہوا۔ ان کے الفاظ نے میری روح میں ہلچل نہیں مچائی اور نہ ہی مجھے اپنی غلامانہ روش پر کوئی غصہ ہی آیا۔ لیکن اس مارسیاس نے مجھے کئی بار اس حالت سے دوچار کیا ہے کہ میں سوچنے لگتا کہ جو زندگی میں بسر کر رہا ہوں، وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ (سقراط تم اعتراف کرو گے) مجھے احساس ہے کہ اگر میں اپنے کان بند نہ کروں اور اڑ کر میں خوش آواز دیو... پرندے کی آواز سے دور بہت دور نہ چلا جاؤں تو میرا حال دوسروں جیسا ہی ہو جائے گا۔ وہ مجھے اس طرح مبہوت کر دے گا کہ میں اس کے قدموں میں بیٹھے بیٹھے بوڑھا ہو جاؤں گا۔ کیونکہ وہ مجھ سے اعتراف کرا لیتا ہے کہ مجھے اُس طرح زندگی نہیں بسر کرنا چاہیے جس طرح کہ میں بسر کر رہا ہوں۔ میں روح سے تو نہیں ونظر انداز کرتا ہوں۔ ایتھنز والوں کے مسائل میں الجھ جاتا ہوں اسی لیے میں اپنی سماعت اور بصارت اس سے چھپا کر ہی رکھتا ہوں۔ یہ واحد آدمی ہے جس نے مجھے ایک موقع پر شرمندہ کیا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ میں اس کا بالکل ہی عادی نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ کسی میں ایسا کرنے کا یارا نہیں ہے۔ مجھے علم ہے کہ میں اس کی باتوں کا نہ تو جواب دے سکتا ہوں اور نہ ہی اس کی حکم عدولی میرے بس میں ہے۔ لیکن جب میں اس کی بزم سے اٹھتا ہوں تو شہرت کی تمنا میرے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس سے دور بھاگتا ہوں جلد از جلد دور چلا جاتا ہوں اور جب اس پر نظر پڑتی ہے تو مجھے وہ باتیں جن کا میں نے اس کے

سامنے اعتراف کیا تھا، سوچ کر بہت شرمندگی ہوتی ہے۔ بارہا میں نے تمنا کی ہے کہ کاش اسے موت آ جائے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ اس کی موت پر مجھے غم ہوگا خوشی کبھی نہیں ہوگی۔ اس طرح میں عجب مخمصے میں گرفتار رہتا ہوں۔

اس گھوڑے کے کان اور دُم والے انسان کی نے نوازی کا میں اور میری طرح متعدد دوسرے افراد شکار ہوئے ہیں۔ تاہم میری بات ایک بار اور سنیں میں آپ کو بتاؤں گا کہ یہ مشابہت کتنی مکمل ہے اور اس کا اثر کتنا حیران کن ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ میں سے کوئی بھی اس سے اچھی طرح شناسا نہیں ہے۔ لیکن میں آپ کے لیے اس کے بارے میں انکشافات کروں گا جس کا آغاز میں نے کر دیا ہے۔ اس لیے اسے جاری ہی رکھنا پڑے گا۔ آپ دیکھیے وہ حسن کا کتنا شیفتہ ہے۔ وہ ہمیشہ ان ہی کی رفاقت میں رہتا ہے۔ ان کے ناز نخرے اٹھاتا ہے تاہم وہ اس معاملے میں بالکل ہی کورا ہے۔ اسے کسی کی کچھ خبر نہیں۔ اس نے یہی بہروپ دھار رکھا ہے۔ کیا وہ اس معاملے میں سائلی نس دیوتا جیسا بوڑھا شرابی، ماہر موسیقی نہیں ہے؟ یقیناً ویسا ہی ہے اس کا نمایاں نقاب کیا ہے، سائلی نس کا تراشا ہوا چہرہ۔ اے میرے بادہ نوش ساتھیوں! سقراط جب کھل کھیلتا ہے تو اعتدال کا کہیں دور دور تک پتا نہیں چلتا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ حسن، دولت اور قدر و منزلت جس کی بہت سوں کو آرزو ہوتی ہے اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ انھیں بنظر حقارت دیکھتا ہے۔ وہ ان نعمتوں سے سرفراز افراد کو لائق تکریم نہیں سمجھتا۔ بنی نوع انسان کی اس کے نزدیک کوئی قدر نہیں۔ اس کی تمام زندگی ان کی تضحیک و توہین میں ہی گزری ہے۔ لیکن میں نے جب اس کے باطن میں جھانکا اور اس کے سنجیدہ مقاصد کا جائزہ لیا تو مجھے اس کے دل میں ایسی دلفریب خوبصورتی کے مقدس اور منور پیکر نظر آئے کہ میں سقراط کے احکام کی فوری تعمیل پر مجبور ہو گیا۔ ہوسکتا ہے یہ مناظر دوسروں سے پوشیدہ رہے ہوں، لیکن میں نے ان کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ وہ سنجیدگی سے میرے حسن کا متوالا ہے اس لیے میں نے سوچا کہ اسے اس کے اعتراف اور اظہار کا کھل کر موقع دینا چاہیے۔ مجھے خود اپنی جوانی کی دلفریبی کا احساس تھا۔ اس منصوبے کی تکمیل کے سلسلے میں جب میں ان کے پاس حاضر ہوا تو میں نے ہمیشہ اپنے ساتھ رہنے والے ملازم کو رخصت کر دیا۔ میں حقیقت حال سچ سچ بیان کروں گا اور دست بستہ گزارش کروں گا کہ آپ توجہ سے سنیں اور سقراط اگر میں کوئی غلط بیانی کروں تو مجھے ٹوکنے سے مت چوکنا۔ اب ہم دونوں تنہا رہ گئے۔ میں یہ سوچ کر خوش تھا کہ اس تنہائی میں وہ مجھ سے ویسی ہی گفتگو کرے گا جیسی ایسے موقعوں پر محب اپنے محبوب سے کرتا ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس نے معمول کے مطابق باتیں کیں۔ دن بھر رہا اور پھر

رخصت ہو گیا بعد میں اسے میں نے کشتی کے مقابلے کے لیے اکھاڑے میں مدعو کیا۔ اس نے کشتی لڑی اور کئی بار مجھ سے تنہائی میں بغل گیر بھی ہوا۔ میں نے سوچا اس طرح میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا لیکن نتیجہ نہ ہوا، کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ بالآخر اپنی ان تراکیب کی ناکامی کے بعد میں نے سوچا کہ مجھے اس سے بدتر اقدام کرنا چاہیے۔ اس پر جسمانی حملہ کرنا چاہیے۔ میں نے اس کا آغاز کر دیا تھا۔ اب میں اسے درمیان میں ترک نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے تعلقات جوں کے توں تھے۔ میں نے اسے رات کے کھانے پر اس طرح مدعو کیا جیسے وہ کوئی حسین و جمیل نوجوان تھا۔ اور میں ایک سازباز کرنے والا عاشق۔ وہ آنے کے لیے بمشکل تمام رضا مند ہوا۔ کچھ عرصے بعد اس نے دعوت قبول کر لی جب وہ پہلی مرتبہ آیا تو وہ کھانے کے فوراً ہی بعد واپس ہونے چاہتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کس منہ سے اسے روکوں۔ دوسری بار بھی میری سازش کے نتیجے میں کھانا کھانے کے بعد رات میں دیر تک باتیں کرتا رہا۔ جب اس نے رخصت ہونے کی بات کی تو میں نے بہانہ بنایا کہ رات کافی گزر چکی ہے اس لیے اس کا یہاں ٹھہرنا ہی بہتر ہوگا۔ اس طرح وہ اسی نشست پر جس پر کھانا کھایا تھا میرے پہلو میں لیٹ گیا۔ اب کمرے میں صرف ہم دونوں ہی تھے۔ میں یہ ساری باتیں بلا جھجک دوسروں سے بیان کر سکتا ہوں لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اگر میں نشے میں نہ ہوتا تو اس کا ذکر کبھی لب پر نہ لاتا لیکن اس محاورے کے مطابق کہ شراب سچ بلواتی ہے۔ خواہ لڑکوں کے ساتھ پی جائے یا تنہا۔ اس لیے میں سچ کہوں گا۔ لیکن اس کی تعریف کے دوران میں سقراط کے عظیم کارناموں کو اخفا میں نہیں رکھوں گا۔ علاوہ ازیں میں نے سانپ کا زہر محسوس کیا ہے لیکن جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ جس سے تکلیف اٹھائی ہے وہ ان ہی سے اپنا درد بیان کر سکتا ہے جو اسی کی طرح زخم خوردہ ہوں۔ کسی دوسرے کو کیا خبر ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی اذیت کے بیان اور عمل میں کوئی مبالغہ نہیں کر سکتے۔ میں ایک اژدھے کا کاٹا ہوا ہوں میں نے اپنی روح یا اپنے دل [illegible] عضو میں شدید ٹیس محسوس کی جو کھرے نوجوان کے لیے ناگ کے زہر اور فلسفے کے رموز سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ اور اس کے زیر اثر انسان ہر قسم کی بات کہہ سکتا ہے، ہر طرح کے کام کر سکتا ہے۔ تم سب فیڈرس، آگاتھان، اریکسی میکس، پاسانیکس اور میں سقراط کا نام نہیں لیتا۔ جنھیں میں اپنے اردگرد دیکھ رہا ہوں اور جو اس دانائی کی خواہش کے اس جنون اور شدید جذبات کے تجربوں سے گزر چکے ہیں۔ آپ سب [illegible] اس وقت کی حرکتوں کو معاف کر دیں اور اس وقت جو میں کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنیں۔ [illegible] اس لیے ضروری ہے کہ ملازمین، خدام اور دیگر عامی اور غیر شایستہ افراد اپنی سماعت کے دروازے بند کر لیں۔

جب چراغ گل کر دیے گئے اور سارے خدام چلے گئے میں نے سوچا کہ اب اس سے کھری کھری باتیں کرنا چاہیے تا کہ کوئی ابہام باقی نہ رہے۔ میں نے اسے پکڑ کر زور سے ہلایا اور کہا، سقراط کیا تم سو رہے ہو۔ سقراط نے کہا، میں سو نہیں رہا ہوں۔ تمھیں پتا ہے میں کیا سوچ رہا ہوں۔ میں نے جواب دیا، میرا جتنے بھی عشاق سے سابقہ پڑا ہے صرف آپ ہیں جو میرے شایانِ شان تھے اور آپ میں اتنا زیادہ انکسار ہے کہ کوئی بات نہیں کرتے ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں اگر تمھاری اس یا کسی اور عنایت کا انکار کر دوں تو مجھ سے بڑھ کر احمق کوئی نہ ہوگا۔ اسی لیے میں اس توقع پر جو کچھ میرے اور میرے دوستوں کے پاس ہے سب کچھ آپ کے قدموں میں ڈال رہا ہوں کہ نیکی کی راہ میں جس کا میں انتہائی متمنی ہوں اور جس پر میرا ایمان ہے۔ آپ میری اوروں سے بہتر اعانت فرمائیں گے۔ آپ کی عطا کردہ عنایت کا اگر میں انکار کر دوں گا تو دانشمند جو رائے میرے بارے میں قائم کریں گے اس پر مجھے سخت ندامت ہوگی۔ مجھے دنیا والوں کی اپنے بارے میں کسی رائے کی پروا نہیں کیونکہ وہ عموماً احمق ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کا جواب اس نے طنزیہ انداز میں دیا جو اس کی خصوصیت ہے۔ السی بیاڈس میرے دوست اگر تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ سچ ہے تو تمھارے مقاصد جلیل ہیں اور مجھ میں واقعی ایسی صلاحیت ہے کہ تمھاری اصلاح کر سکوں تو تمھیں مجھ میں ایسا نایاب حسن نظر آئے گا جو اس سے کہیں اعلیٰ تر ہوگا جو مجھے تم میں دکھائی دے رہا ہے۔ اور اگر تمھارا مقصد یہ ہے کہ تم میرے ساتھ شریک ہونا اور حسن کا حسن سے تبادلہ کرنا چاہتے ہو تو تمھیں مجھ سے فائدہ اٹھانے کا بہتر موقع ملے گا۔ تمھیں اچھی شکل کے بدلے حسن حقیقی نصیب ہوگا۔ ڈائیومیڈی (Diomede) کی طرح پیتل کے بدلے سونا ملے گا۔ لیکن میرے عزیز دوستو: ایک بار پھر دیکھو کہ کہیں میں تمھیں فریب تو نہیں دے رہا ہوں۔ جب جسمانی آنکھ ناکام ہو جاتی ہے تو ذہن باریک بین ہو جاتا ہے۔ اور تمھارے معمر ہونے میں ایک عرصہ درکار ہوگا۔ یہ سن کر میں نے کہا کہ میں نے اپنا مقصد آپ کو بتا دیا ہے جو بہت اہم ہے۔ کیا تمھیں یہ خیال ہے کہ تمھارے اور میرے لیے بہترین کیا ہے؟ اس نے کہا یہ بہت ہی اچھا ہے۔ کسی اور موقع پر جب ہم غور و فکر کریں گے اس بات اور دوسری باتوں پر جو ہمارے لیے بہترین ہوگی اس پر عمل بھی کریں گے۔ اسی بات سے میں نے اندازہ لگا لیا وہ زخمی ہو چکا ہے اور مرے الفاظ تیر کی طرح اسے لگے ہیں۔ اس لیے مزید کچھ اور سننے کا انتظار کیے بغیر میں اٹھا۔ اس پر اپنا کوٹ ڈال کر اس کی تار تار عبا میں گھس گیا۔ سردیوں کا زمانہ تھا جہاں میں نے اس دیوہیکل فردِ آغوش میں لیے ساری رات گزار دی۔ سقراط اس بات سے بھی تم انکار نہیں کر سکتے۔ تاہم ان تمام باتوں کے باوجود کہ اسے میں نے ورغلایا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ میرے حسن کو خاطر میں نہ لایا اور اسے تضحیک کا

نشانہ بنایا۔ اس پر توجہ نہ دی۔ میرے منصفوں سنو، سقراط کی کبر واستغنا کی صفات سے متصف تم ہی لوگ ہو۔ مزید کچھ نہیں ہوا۔ لیکن صبح سویرے جب میری آنکھ کھلی (میں تمام دیوی اور دیوتاؤں کا گواہ بناتا ہوں) تو یوں محسوس ہو جیسے میں والد یا بڑے بھائی کے بستر سے اٹھ رہا ہوں۔

آپ ہی بتایئے اس طرح مسترد ہونے اور بے عزتی کے بعد مجھ پر کیا گزری ہو گی۔ لیکن پھر بھی میں اس کے فطری اعتدال ذات، ضبطِ نفس اور مردانگی کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں کسی ایسے شخص سے بھی ملوں گا جو عاقل بھی ہو اور اس میں ضبط وتحمل بھی ہو۔ اس لیے اس پر خفا نہیں ہوا اور نہ ہی اس کی رفاقت سے علیحدگی اختیار کی۔ میں اس کے دل میں گھر کرنے کے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ جنگ ٹروجن کا فاتح اجیکس (Ajax) کو رقم تو کیا ذکر فولاد سے بھی زخمی نہیں کیا جا سکتا تھا اور جسمانی دلفریبی سے اسے موہ لینے کے میرے تمام حربے ناکام ہو چکے تھے، میں سخت مخمصے میں گرفتار تھا۔ کوئی دوسرا اس طرح لاعلاج طریقے سے کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوا تھا۔ یہ تمام واقعات ہمارے پوٹیڈیا(Potidaea) کے دورے سے قبل کے ہیں وہاں ہم نے اکٹھے کھانا کھایا اور مجھے اس کی غیر معمولی قوتِ برداشت کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ اس کی قوتِ برداشت لاجواب تھی۔ جب ضروری سامان کی ترسیل کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو ہمیں بھوکا رہنا پڑا۔ ایسے حالات میں جو جنگ کے دوران اکثر پیش آتے ہیں وہ نہ صرف مجھ پر بلکہ سب پر بازی لے گیا۔ اس کا کوئی مدمقابل نہ تھا۔ تاہم ایک تہوار میں وہی تنہا ایسا تھا جسے پوری طرح لطف اندوز ہونے کا یارا تھا۔ اگرچہ وہ شراب نوشی کے لیے راضی نہیں ہوتا تاہم جب اسے اکسایا جائے تو وہ ہم سب سے بازی لے جاتا ہے۔ جس کا بیان لاجواب ہوتا ہے کسی انسان نے سقراط کو مدہوش نہیں دیکھا۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو اس کی اس صلاحیت کی آزمائش جلد ہی ہو گی۔ سردی برداشت کرنے کی اس کی قوت بھی حیران کن ہے۔ اس علاقے میں سردی کی وجہ سے سخت کہرا پڑا تھا سردی قیامت ڈھا رہی تھی۔ کوئی گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ باہر نکلنے والے ہر شخص نے کپڑوں پر کپڑے پہن رکھے تھے، جوتے پہن رکھے تھے اور پاؤں موٹے اونی کپڑوں میں لپیٹ رکھے تھے۔ ایسی سردی میں سقراط ننگے پاؤں معمولی چوغے پہن کر برف پر ان سپاہیوں سے کہیں بہتر چلتا تھا جو گرم کپڑوں میں ملبوس تھے اور ان کے پاؤں میں جوتے بھی تھے۔ وہ سقراط کو زہر آلود نظروں سے دیکھتے کیونکہ یوں محسوس ہوتا تھا سقراط انھیں کمتر سمجھ رہا ہے۔

میں نے آپ کو یہ ایک داستان سنائی ہے۔ اب میں آپ کو ایک اور کہانی سناؤں گا جو قابلِ سماعت

ہے۔ ذکر، صابر اور متحمل شخص کے کام اور مصائب کا جب کہ وہ ایک مہم پر گیا ہوا تھا۔ ایک صبح وہ کسی ایسے مسئلے پر غور کر رہا تھا جو وہ خود حل نہیں کر سکا تھا۔ اس نے مسئلہ پر غور ترک نہیں کیا بلکہ صبح سویرے سے دوپہر تک اس پر غور جاری رکھا۔ وہ توجہ جمائے گم سم کھڑا رہا۔ دوپہر کو لوگوں نے اسے اس حالت میں دیکھا تو یہ خبر پھیل گئی کہ سقراط صبح سویرے سے کھڑا کسی مسئلے پر غور کر رہا ہے۔ ہجوم حیران ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ آخر کار شام کے وقت کھانے کے بعد یونیا کے چند باشندوں (Ionians) نے (میں بتادوں کہ یہ گرمیوں کا موسم تھا) اپنے بستر نکال کر میدان میں یہ دیکھنے کے لیے لگائے کہ کیا سقراط ساری رات اسی طرح کھڑا رہے گا۔ وہ دوسرے روز صبح تک اسی ایک مقام پر کھڑا رہا۔ روشنی ہوئی تو اس نے سورج دیوتا کی پوجا کی اور اپنی راہ لی۔ اگر آپ چاہیں تو میں اب میدان جنگ میں اس کی شجاعت بیان کروں جو مجھے کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس نے میری جان بچائی تھی یہ وہی جنگ تھی جس میں مجھ کو شجاعت کا اعزاز ملا میں زخمی ہو گیا تھا اور وہ مجھے تنہا چھوڑنے پر راضی نہیں تھا۔ اس نے مجھے اور میرے اسلحہ کو دشمنوں سے بچایا۔ شجاعت کے اعزاز کا وہی حق دار تھا جسے افسران مجھے میرے عہدے کی وجہ سے دینا چاہتے تھے۔ میں نے اصل بات سے افسروں کو آگاہ بھی کر دیا تھا۔ اس بات پر بھی سقراط نہ میری سرزنش کرے گا اور نہ ہی اس سے انکار۔ لیکن افسروں سے زیادہ خود سقراط یہ چاہتا تھا کہ یہ اعزاز اسے نہیں بلکہ مجھے عطا کیا جائے۔ ایک دوسرے موقع پر بھی اس کا برتاؤ قابل ذکر تھا۔ ڈیلیم (Delium) کی جنگ میں فوج کی پسپائی کے بعد جہاں وہ بھاری اسلحہ چلانے پر مامور تھا۔ مجھے پوٹیڈیا (Potidaea) سے کہیں بہتر طور پر سقراط کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا میں گھوڑے پر سوار تھا۔ اس لیے نسبتاً خطرے سے باہر تھا۔ وہ اور لیشس (Laches) دونوں پسپا ہو رہے تھے کیونکہ فوجیں فرار ہو رہی تھیں۔ اس نے ان سے کہا کہ حوصلہ ہارنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں ان کے ہمراہ رہوں گا۔ ارسٹوفینس جیسا تم نے کہا ہے کہ تم نے ان کو اسی مقام پر اس طرح دیکھا گویا وہ ایتھنز کی سڑکوں پر بطخ کی طرح اطمینان کے ساتھ چل رہا ہو۔ وہ آنکھیں ادھر اُدھر گھما رہا تھا۔ اسے دوستوں کا بھی خیال اور دشمنوں کی بھی فکر تھی۔ اس کے انداز سے یہ صاف ظاہر تھا کہ جیسے وہ دشمنوں کو پیغام دے رہا تھا کہ اگر حملہ کیا گیا تو ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ اس طرح وہ اور اس کے ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ایسے لوگ جنگ میں حوصلہ نہیں ہارتے پیچھا ان ہی کا کیا جاتا ہے جو بگٹٹ بھاگ رہے ہوں۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ حاضر دماغی میں وہ لیشس (Laches) سے کہیں برتر تھا۔ سقراط کے ایسے کتنے ہی کارنامے ہیں جن کی میں توصیف کر سکتا ہوں۔ بیشتر خوبیاں اس کی ایسی ہیں جو دوسروں میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن وہ صفت جو دوسروں میں نہ تو موجود اور نہ کبھی پیدا ہو گی وہ نہایت حیران کن ہے۔ آپ

براسیڈاس(Brasidas) اور دوسروں کی اکیلس(Achilles) سے مماثلت کا تصور کر سکتے ہیں۔ یا آپ میسٹر(Nestor)اور اینٹی نار(Antenor) کو پیریکلس جیسا تصور کر سکتے ہیں۔ یہی بات دیگر مشاہیر پر بھی صادق آتی ہے لیکن اس عجوبہ روزگار شخصیت کی نظیر ملنا دشوار ہوگا۔ اس جیسا نہ تو پہلے کوئی گزرا ہے اور نہ ہی اس زمانے میں کوئی موجود ہے۔ ماسوائے اس کے جس کا حوالہ میں نے سائلی نس اور گھوڑے کے کان اور دم والے دیوتا کے بیان میں دیا تھا۔ ان کے مجسمے میں صرف اس کی ہی نہیں بلکہ اس کے الفاظ کی بھی نمایندگی ہوتی ہے۔ اگرچہ میں پہلے یہ ذکر آپ سے نہ کرسکا کہ اس کے الفاظ سائلی نس(Silenus) دیوتا کی طرح ہوتے ہیں جو مسائل حل کرتے ہیں۔ جب آپ پہلی بار انھیں سنیں تو وہ مضحک محسوس ہوتے ہیں۔ وہ ایسے الفاظ میں خود کو ملبوس کرتا ہے جو جنگل کی چنچل دیوی کی کھال کی طرح ہوتی ہے۔ اس کی باتیں بار بردار گدھوں، لوہاروں، اور قلیوں جیسی ہوتی ہیں جسے وہ ان ہی الفاظ میں بار بار دہراتا رہتا ہے تاکہ جہلا، اور ناتجربہ کار افراد اس پر ہنسیں۔ لیکن جو اس مجسمے کو کھولتا ہے اور اس کے اندر جو کچھ ہے اسے دیکھتا ہے تو صرف یہی الفاظ ایسے ہیں جو اپنے اندر جہانِ معنی سموئے ہوئے ہیں۔ وہ الوہی ہیں جو نیکیوں کے نقوش سے لبریز ہیں انھیں سب ہی سمجھتے ہیں۔ وہ شریف اور نیک فرد کے تمام فرائض پر محیط ہوتے ہیں۔

دوستو! میں سقراط کی تعریف میں یہی کچھ کہہ سکتا ہوں۔ اس دوران میں نے اس پر اپنے ساتھ بدسلوکی کا الزام بھی لگایا ہے۔ اس نے نہ صرف میرے ساتھ بلکہ کارمیڈس(Charmides) ولد گلوکون اور یوتھیڈیمس(Euthydemus) ولد ڈائیوکلس(Diocles) اور متعدد دیگر افراد کے ساتھ بھی بدسلوکی کی ہے۔ اس نے آغاز ان کے عاشق کی حیثیت سے کیا اور صرف راز و نیاز کی باتوں پر خاتمہ کر دیا۔ آگاتھان اسی لیے میں تم کو بتاتا ہوں کہ اس کی باتوں میں مت آنا۔ مجھ سے عبرت حاصل کرو۔ سبق حاصل کرو، سبق حاصل کرو، میری تنبیہ سے فائدہ اٹھاؤ۔ نادان نہ بنو اور محاورے کے مطابق تجربے کو استاد مانو۔

جب السی بیاڈس نے اپنی تقریر ختم کر لی تو حاضرین نے اس کی بے باکی پر زوردار قہقہہ لگایا کیوں کہ اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اب بھی سقراط سے محبت ہے۔ سقراط نے کہا السی بیاڈس تم نشے میں نہیں ہو۔ اگر ہوتے تو اپنی وحشیانہ تعریف کا مقصد چھپانے کے لیے اتنی دور نہ نکل جاتے کیونکہ تمھاری یہ طویل تقریر محض طباعی پر مبنی یاوہ گوئی تھی۔ جس کے اصل نکتے کا اظہار اختتامی حصے میں ہوا ہے۔ تم مجھ میں اور آگاتھان میں اختلاف پیدا کرنا چاہتے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ میں صرف تم سے محبت کروں کسی دوسرے سے نہیں۔ اور تم اور صرف تم ہی آگاتھان سے محبت کرنا چاہتے ہو۔ لیکن اس شہوانی ڈرامے یا جن نامے کی

سازش کا پتا چل چکا ہے۔ آ گا تھان تم اسے ہم دونوں کے درمیان کسی نزاع کے پیدا کرنے کی اجازت کبھی نہ دینا۔

آ گا تھان نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں۔ میں یہ سوچنے پر مائل ہوں کہ میرے اور آپ کے درمیان وہ آ کر ہمیں جدا کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ اپنی اس چال میں کامیاب نہیں ہوگا۔ میں کوچ پر جا کر آپ ہی ساتھ آرام کروں گا۔

سقراط نے کہا۔ بالکل بالکل یہاں آیئے اور فرش پر لیٹ جایئے۔

السی بیاڈس نے کہا حیف صد حیف۔ اس شخص نے مجھے خوب بیوقوف بنایا ہے۔ وہ ہر مرحلے پر مجھے نیچا دکھانا چاہتا ہے۔ میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ آپ میرے اور آ گا تھان کے درمیان آ کر لیٹ جایئے۔

سقراط نے کہا۔ جی نہیں بالکل نہیں۔ آپ نے میری تعریف کی ہے۔ اب میری باری ہے کہ میں اپنے دائیں جانب والے دوست کی تعریف کروں۔ اگر وہ دوبارہ میری تعریف کریں گے تو یہ باری والے متفقہ اصول کی خلاف ورزی ہوگی۔ اب اس اصول کے مطابق میں ان کی تعریف کروں گا۔ درخواست ہے کہ میری بات تسلیم کرلیں۔ رشک و رقابت میں مبتلا نہ ہوں۔

نوجوانوں کی تعریف کرنے کا میں بہت زیادہ شوقین ہوں۔

آ گا تھان نے کہا۔ شاباش۔ میں سقراط کی تعریف سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوں۔

السی بیاڈس نے کہا۔ سقراط جہاں موجود ہو وہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔ دوسرے کو انصاف کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

دیکھیے! اس نے آ گا تھان کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے کیسا زبردست بہانہ تراشا ہے۔

کوچ پر سقراط کے پہلو میں بیٹھنے کے لیے آ گا تھان اپنی جگہ سے اٹھا ہی تھا کہ رنگ رلیاں منانے والوں کا ایک ہجوم کمرے میں داخل ہوگیا اور ضیافت کا پر امن ماحول خراب کر دیا۔ ہوا یوں کہ کوئی صاحب کمرے سے نکلے مگر دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور ہجوم کو داخل ہونے کا راستہ مل گیا۔ اور وہ سب داخل ہوتے ہی بے تکلف ہوگئے۔ بڑی زبردست افراتفری مچی ہر شخص نے خوب خوب شراب پی۔ ارسٹوڈیمس (Aristodemus) نے کہا اریکسی میکس، فیڈرس اور دوسرے چلے گئے وہ خود بھی سو گیا۔ راتیں طویل تھیں اس لیے آرام کا اچھا خاصا وقت مل گیا۔ صبح سویرے مرغ کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔ جب وہ بیدار ہوا تو دوسرے یا تو سو رہے تھے یا رخصت ہو چکے تھے۔ وہ صرف سقراط، ارسٹوفینیس اور آ گا تھان رہ گئے تھے جو ایک بڑے سے قدح سے

شراب پی رہے تھے۔ ایک پیتا تو دوسرے کے حوالے کر دیتا اور سقراط ان سے گفتگو کر رہا تھا۔ ارسٹوڈیمس نیم بیدار تھا۔ اس نے گفتگو کا ابتدائی حصہ نہیں سنا تھا۔ جو خاص بات اس کے ذہن میں محفوظ رہ گئی وہ یہ تھی کہ سقراط ان دونوں کو قائل کر رہے تھے کہ طربیہ اور حزنیہ کے ماخذ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور حزنیہ ڈراموں کا ماہر اداکار طربیہ ڈراموں میں بھی یکساں مہارت رکھتا ہے۔ نکتے کو انھیں تسلیم کرنا پڑا کیونکہ وہ اونگھ رہے تھے۔ اور بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پہلے ارسٹوفینس سو گیا اس کے بعد آ گاتھان۔ دن طلوع ہو چکا تھا سقراط نے انھیں آرام سے سلایا اور جانے کے لیے اٹھا۔ ارسٹوڈیمس حسب معمول ان کے ہمراہ چل پڑا۔ لائیسیم جا کر انھوں نے غسل کیا اور معمول کے مطابق دن گزارا۔ شام ہوئی تو سونے کے لیے گھر کا راستہ لیا۔

مینو

(Meno)

شرکائے گفتگو:

مینو(Meno)، **سقراط**(Socrates)، **مینو کا ایک غلام**، **اینیٹس**(Anytus)

مینو: سقراط، کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ نیکی سکھانے سے آتی ہے یا عمل کرنے سے۔ یا اگر نہ سکھانے سے اور نہ ہی عمل سے تو کیا انسانوں میں جبلّی ہوتی ہے؟ یا کوئی اور طریقہ بھی ہے؟

سقراط: سنو مینو، ایک زمانہ تھا جب تھیسالی کے رہنے والے(Thessalians) اپنی دولت اور شہسواری کی بدولت دیگر ہیلیدیائی لوگوں(Hellenes) میں شہرت رکھتے تھے۔ لیکن اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو اب وہاں کے لوگ خصوصاً لاریسا(Larisa) میں اپنی دانش مندی کے سبب مشہور ہیں، جہاں سے تمھارے دوست ارسٹی پس (Aristippus) کا تعلق ہے۔ یہ کمال جارجیاز(Gorgias) کا ہے کیونکہ جب وہ اس علاقہ میں آیا تو ایلو آڈئی(Aleuadae) کے گلہائے سر سبد، جن میں آپ کے مداح ارسٹی پس (Aristippus) بھی شامل ہیں۔ اور تھیسالی کے(Thessalians) دیگر امرا کی دانش مندی کی محبت کے اسیر ہو گئے۔ اس نے آپ کو یہ سکھایا ہے کہ سوالوں کے جواب کس طرح شان اور ہمت سے دیے جائیں جو عالموں کے شایانِ شان ہو۔ اور اس کے جواب دینے کا بھی یہی انداز تھا۔ ہیلینی کا کوئی بھی باشندہ اس سے جو چاہے پوچھ سکتا تھا۔ عزیز مینو، دیکھیے ہماری تقدیر کتنی مختلف ہے۔ یہاں ایتھنز کے کسی باشندے سے پوچھیں کہ نیکی فطری ہے یا اکتسابی تو وہ آپ پر ہنسے گا کہ اے میرے مہمان، مجھے میرے بارے میں بڑی خوش فہمی ہے جو تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمھارے اس سوال کا جواب دے سکوں گا۔ بات یہ ہے کہ آپ کو تو یہی پتا نہیں کہ نیکی کیا ہوتی ہے۔ بھلا ایسی صورت میں یہ کیسے جانوں گا کہ آیا وہ سکھانے سے آ سکتی ہے یا نہیں؟ مینو، میں

جو غربت کے سبب اس علاقے میں مقیم ہوں خود دوسروں کی طرح مفلس ہوں۔ مجھے شرمندگی کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ نیکی کیا ہے۔ جب مجھے کسی شے کی ہیت ہی کا علم نہیں تو میں اس کی ماہیت کو کیا جانوں گا۔ دیکھیے نا جب میں مینو کو بالکل ہی نہیں جانتا تو میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ وہ خوبصورت ہے یا اس کی ضد ہے۔ رئیس اور شریف ہے یا اس کی ضد ہے۔ تمھارا خیال ہے کہ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟

مینو: جی نہیں! آپ ایسا نہیں کریں گے لیکن سقراط یہ بتائیے کیا آپ اس معاملے میں سنجیدہ ہیں کہ آپ بالکل ہی نہیں جانتے کہ نیکی کیا ہے؟ اور کیا آپ کے بارے میں یہ خبر میں تھیسالی (Thessaly) تک لے جا سکتا ہوں؟

سقراط: برخوردار، صرف یہی نہیں بلکہ تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ میری رائے کے مطابق کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے جو یہ جانتا ہو کہ نیکی کیا ہے۔

مینو: گویا آپ جارجیاز سے، جب وہ ایتھنز میں تھا کبھی نہیں ملے؟

سقراط: جی میں ملا ہوں۔

مینو: اور کیا آپ کے خیال میں وہ اس بارے میں نہیں جانتا تھا۔

سقراط: مینو، میرا حافظہ قوی نہیں ہے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اس وقت میں نے ان کے بارے میں کیا سوچا تھا۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ اسے علم تھا اور تم بھی جانتے ہو کہ اس نے کیا کہا تھا۔ اس لیے مہربانی کرو اور صرف میری یادداشت تازہ کرنے کے لیے اس نے جو کچھ کہا تھا اس کا اعادہ کر دو یا اپنی بھی رائے کا اظہار کرو کیونکہ میرا گمان ہے کہ تمھاری رائے اس کی رائے سے قریب تر ہوگی۔

مینو: بجا ارشاد۔

سقراط: چونکہ وہ اس وقت موجود نہیں ہے۔ اس لیے اس کی پروا نہ کرو بلکہ اس کی بات ضرور بتاؤ۔ مینو، تمھیں دیوتاؤں کی مہربانی ہی سے کام لینا اور بتانا کہ نیکی کیا ہے۔ یقین مانو مجھے اپنی غلطیوں کا علم ہوگا اور یہ جان کر بھی بہت مسرت ہوگی کہ تمھیں اور جارجیاز کو اس کا علم تھا۔ باوجود اس کے کہ میں نے ابھی ابھی کہا تھا، کوئی ایسا نہیں جو یہ بات جانتا ہو۔

مینو: سقراط تمھارے سوال کا جواب دینا میرے لیے بالکل مشکل نہیں ہے۔ پہلے ہم مرد کی نیکیاں لیتے ہیں۔ اسے جاننا چاہیے ریاست کا کاروبار کس طرح چلایا جائے۔ انتظامی امور میں دوستوں کو کس

طرح سے نوازا جائے اور دشمنوں کو کس طرح زک پہنچائی جائے۔ اسے یہ احتیاط بھی برتنی چاہیے کہ خود اسے کوئی ضرر نہ پہنچے۔ عورت کی نیکی جاننا بھی آسان ہے۔ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ گھر کو سلیقے سے رکھے۔ اس میں جو مال اسباب ہے اس کی نگرانی کرے اور شوہر کا حکم مانے۔ نوجوان ہو یا بوڑھا، عورت ہو یا مرد، غلام ہو یا آزاد غرض زندگی سے متعلق ہر دور اور ہر فرد کے لیے نیکی کا معیار مختلف ہوتا ہے۔ اس طرح نیکیاں بے حد وحساب ہیں اور ان کی ماہیت کے بیان کی کمی نہیں۔ کیونکہ نیکیاں ہمارے افعال اور عمر سے مشروط ہوتی ہیں، سقراط یہی بات گناہ یا بدی پر بھی صادق آتی ہے۔

سقراط: مینو! یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں نے تم سے ایک نیکی کے بارے میں پوچھا اور تم نے مجھے مکھیوں کے جم غفیر میں پھنسا دیا جو تمھارے حیطہ اختیار میں ہیں۔ فرض کرو میں اس جم غفیر میں شامل نیکیوں کا شمار کر کے تم سے یہ دریافت کروں کہ شہد کی مکھی کی فطرت کیا ہوتی ہے؟ اور تم جواب دو کہ شہد کی مکھیوں کی تو متعدد اقسام ہوتی ہیں اور میں جواب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا شہد کی مکھیوں کی اتنی اقسام ہونے کی وجہ سے ان میں بحیثیت مکھی کوئی فرق پایا جاتا ہے یا ان کی کسی اور خصوصیت کو معیار بنا کر ان کی شناخت کی جائے، مثلاً بلحاظ خوبصورتی، جسامت، شکل۔ تمھارا جواب کیا ہوگا؟

مینو: میں کہوں گا کہ شہد کی مکھیاں بحیثیت مکھیاں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتیں۔

سقراط: میں اپنی بات مسلسل جاری رکھوں گا کیونکہ میں اس بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ اچھا مینو، کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ مکھیوں کی وہ کون سی خصوصیات ہیں جن میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہونے کی بجائے آپس میں مماثلت رکھتی ہیں۔

مینو: ضرور۔

سقراط: مینو! نیکی کا بھی یہی معاملہ ہے۔ خواہ ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ اور مختلف کیوں نہ ہو۔ ان کی ایک ایسی مشترکہ فطرت ہے جس سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ نیکی کیا ہے کا جواب دینے والے کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ اسی بات پر اپنی نظر جمائے رکھے۔ تم سمجھ گئے ناں؟

مینو: مجھے اس بات کی تھوڑی بہت سمجھ میں آ رہی ہے لیکن میں ابھی تک اسے اُس طرح سمجھ نہیں پایا جیسے میں سمجھنا چاہتا ہوں۔

سقراط: مینو! جب تم یہ کہتے ہو کہ مردوں کی نیکی کچھ اور ہوتی ہے اور عورت کی کچھ اور بچوں کی کچھ اور وغیرہ

وغیرہ۔ تو کیا اس کا اطلاق صرف نیکی پر ہی ہوتا ہے یا صحت، جسامت اور قوت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے؟ اسی طرح کیا صحت خواہ وہ مرد کی ہو یا عورت کی ہمیشہ ایک ہی نہج پر ہوتی ہے۔

مینو: میرے خیال میں مرد اور عورت دونوں کی صحت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

سقراط: یہی بات جسامت اور قوت پر بھی صادق نہیں آتی۔ اگر عورت قوی ہے تو اس کی بنیاد بھی مردوں کی طرح اس کی جسامت اور قوت پر ہوگی۔ میرا یہ کہنے کا مطلب ہے کہ قوت خواہ مرد میں ہو یا عورت میں، یکساں ہی ہوتی ہے۔ کیا تمھارے خیال میں ان میں کوئی فرق ہے؟

مینو: جی نہیں۔

سقراط: تو کیا اسی طرح نیکی خواہ بچے میں ہو یا بالغ میں، مرد میں ہو یا عورت میں، ایک ہی جیسی نہیں ہوتی؟

مینو: سقراط! میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ یہ معاملہ دوسروں سے مختلف ہے۔

سقراط: لیکن کیوں؟ کیا تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ مرد کی نیکی یہ ہے کہ وہ ریاست کے انتظام و انصرام کے بارے میں جانے اور عورت کی نیکی یہ ہے کہ وہ گھر بار سنبھالے۔

مینو: جی! میں نے یہ کہا تھا۔

سقراط: کیا گھر بار یا ریاست وغیرہ کا انتظام بغیر ضبط نفس، اعتدال ذات اور انصاف کے ممکن ہے؟

مینو: یقیناً نہیں۔

سقراط: گویا اگر مرد اور عورت نیک ہوں تو دونوں میں اعتدال ذات اور انصاف کی خوبیاں ہوں گی۔

مینو: ٹھیک ہے۔

سقراط: تو کیا کوئی نوجوان یا معمر فرد جو غیر محتاط اور ناانصاف ہو، نیک ہو سکتا ہے؟

مینو: نہیں ہو سکتا۔

سقراط: یعنی انھیں اعتدال پسند اور منصف مزاج ہونا چاہیے؟

مینو: جی ہاں۔

سقراط: اسی طرح کیا تمام لوگ جو ایک ہی طرح کی خوبیوں کے حامل ہوں، نیک ہو سکتے ہیں۔

مینو: اس سے تو ایسا ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

سقراط: یقیناً وہ ایک ہی طرح سے نیک نہ ہوتے اگر ان میں ایک ہی طرح کی خصوصیات نہ ہوتیں۔

مینو: وہ نیک نہ ہوتے۔

سقراط: چونکہ اب تمام نیکیوں کی یکسانیت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے اس لیے تمھیں اور جارجیاز کو وہ باتیں یاد کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو تم دونوں نے نیکی کے ضمن میں پہلے کہی تھیں۔

مینو: کیا آپ سب نیکیوں کی ایک تعریف کے خواہاں ہیں۔

سقراط: مجھے تو اسی کی جستجو ہے۔

مینو: اگر آپ کو ایک ایسی تعریف چاہیے جو سب پر محیط ہو تو ایسی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی جو میں اس سلسلے میں کہوں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ نیکی نوع انسانی کے کاروبار چلانے کی قوت رکھتی ہے۔

سقراط: کیا نیکی کی یہ تعریف ہر قسم کی نیکیوں پر محیط ہے۔ مینو! کیا بچے اور غلام کی نیکی یکساں ہوتی ہے۔ کیا بچہ اپنے والد یا غلام اپنے آقا پر حکم چلا سکتا ہے، اور جس پر حکم چلایا جاتا ہے کیا اس کی حقیقت غلام جیسی ہوتی ہے؟

مینو: سقراط! میرے خیال میں ایسا نہیں ہوتا۔

سقراط: جی نہیں، اس کی ایک معمولی سی وجہ ہے۔ میرے خوبصورت دوست! میں پھر کہوں گا کہ جیسے تم نے کہا تھا کہ نیکی انتظامی امور چلانے کی قوت کا نام ہے۔ لیکن کیا تم اس میں یہ اضافہ نہیں کر سکتے تھے کہ انتظامی امور کا کام انصاف سے کیا جائے، ناانصافی سے نہیں؟

مینو: سقراط! میں اسے درست تسلیم کرتا ہوں کہ انصاف نیکی ہے۔

سقراط: مینو! تم اسے نیکی کہو گے یا ''ایک نیکی'' کہو گے۔

مینو: کیا مطلب؟

سقراط: میرا مطلب کوئی ایسا نتیجہ نکلے جو ہر معاملے پر صادق آتا ہو مثلاً دائرہ ایک شکل ہے نہ کہ تمام تر شکل۔ میں بات چیت کا یہ طریقہ اس لیے اختیار کر رہا ہوں کیونکہ دیگر شکلیں بھی ہوتی ہیں۔

مینو: بالکل درست۔ یہی بات میں بھی نیکی کے بارے میں کہہ رہا ہوں کیونکہ دوسری نیکیاں بھی ہیں اور عدل و انصاف بھی۔

سقراط: وہ کیا ہیں، ذرا ان کے نام تو بتاؤ، بالکل اسی طرح جس طرح میں پوچھنے پر شکلوں کے نام بتاؤں گا۔

مینو: حوصلہ مندی، ضبط نفس، دانشمندی، اعتدال ذات، عالی ظرفی کا شمار نیکیوں میں ہوتا ہے۔ اس کے

علاوہ بھی نیکیاں ہیں۔

سقراط: مینو! تم سچ کہہ رہے ہو۔ ہم پھر پھرا کر اسی مقام پر آ گئے ہیں۔ ایک نیکی تلاش کرتے کرتے ہمیں متعدد نیکیاں دستیاب ہو گئیں ہیں۔ گو انداز پہلے جیسا نہیں تھا لیکن ہمیں وہ نیکی نہ مل سکی جو ساری نیکیوں کی روح رواں ہے۔

مینو: سقراط! سچ تو یہ ہے کہ میں اب بھی آپ کی دوسری باتوں کی طرح نیکی کے ایک ہی تصور کی تلاش کی کوشش کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔

سقراط: کوئی بات نہیں، میں اس کے قریب تر آنے کی کوشش کروں گا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ ہر شے میں ایک مشترک خصوصیت ہوتی ہے۔ فرض کرو کوئی دوسرا شخص بھی تم سے وہی سوال کرتا ہے جو میں نے کیا تھا۔ مینو، وہ پوچھے گا کہ شکل کیا ہے اور اگر آپ جواب دیں ''گولائی'' تو وہ میری ہی طرح کہے گا کہ تم ''گولائی'' کو شکل کہو گے یا ایک شکل کہو گے؟ اور تمھارا جواب ہوگا ایک شکل۔

مینو: اس میں کیا شک ہے۔

سقراط: اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مزید شکلیں کیا ہوتی ہیں۔ تو تم اس کو بتا دیتے۔

مینو: جی ہاں میں بتا دیتا۔

سقراط: اسی طرح اگر وہ پوچھتا کہ رنگ کیا ہوتا ہے اور تم جواب دیتے ''سفید'' اور سوال کرنے والا فوراً پوچھ بیٹھتا کہ اچھا یہ بتاؤ سفید تمام تر رنگ ہے یا ایک رنگ ہے۔ تم جواب دو گے کہ ایک رنگ کیونکہ دوسرے رنگ بھی ہوتے ہیں۔

مینو: میں یہی جواب دوں گا۔

سقراط: اور اگر وہ تم سے پوچھتا کہ دوسرے رنگ کون کون سے ہیں؟ تو تم نے اسے دوسرے رنگ بھی بتائے ہوں گے۔ جو بحیثیت رنگ سفید ہی کی طرح ہیں۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: فرض کیجیے کہ وہ شخص اس بات کو میری طرح طول دیتے ہوئے کہے کہ کبھی کبھار ہمارا واسطہ سابقہ باتوں سے پڑتا ہے لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ تم انھیں ایک عمومی نام سے پکارتے ہو اور باوجودیکہ وہ ایک دوسرے سے متضاد ہیں تم انھیں ''اشکال'' ہی کہتے ہو۔ اس لیے بتاؤ کہ وہ ملتی جلتی خصوصیت کون سی ہے جس کی بنیاد پر تم انھیں شکل کا نام دیتے ہو۔ جو گول بھی ہوتی اور

چوکور بھی باوجود اس کے کہ وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، تمھاری گفتگو کا یہی انداز ہوگا؟

مینو: جی ہاں۔

سقراط: جب تم یہ کہتے ہو تو کیا تمھارا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ گول اسی طرح گول ہوتا ہے جس طرح چوکور چوکور ہے یا چوکور اسی طرح چوکور ہوتا ہے، جس طرح گول گول ہوتا ہے۔

مینو: بالکل ہی نہیں۔

سقراط: تمھارا دعویٰ یہی ہے کہ گول چوکور کی طرح کی شکل نہیں ہوتی یا چوکور گول کی طرح نہیں ہوتا۔

مینو: بجا ارشاد۔

سقراط: بتاؤ شکل کو ہم کیا نام دیں۔ کوشش کر کے بتاؤ۔ فرض کرو جب کوئی تم سے شکل یا رنگ کے بارے میں ایسا ہی کوئی سوال کرے اور تمھیں جواب دینا پڑے۔ صاحب! مجھے علم نہیں کہ تم کیا چاہتے ہو۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ وہ حیران ہو کر کہے گا کیا تم یہ نہیں سمجھے کہ مجھے کثرت میں یکسانیت کی تلاش ہے۔ وہ اسی سوال کو اس طرح بھی پوچھ سکتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ مینو! کثرت میں وہ کون سی یکسانیت ہے جسے تم شکل کہتے ہو۔ جس میں نہ صرف گول اور چوکور بلکہ ہر طرح کی شکلیں شامل ہیں؟ مینو، کیا تم اس کا جواب نہیں دے سکتے۔ میں چاہتا ہوں تم ذرا کوشش کر کے دیکھو۔ نیکی کی ماہیت کے بارے میں جواب دینے کے لیے یہ نہایت عمدہ مشق ہے۔

مینو: سقراط! لیکن میں چاہتا ہوں آپ اس کا جواب دیں۔

سقراط: میں تمھاری بات رکھ لوں؟

مینو: بسرو چشم۔

سقراط: اس کے بعد تم مجھے نیکی کے بارے میں بتاؤ گے۔

مینو: ضرور بتاؤں گا۔

سقراط: پھر تو میں جان لڑا دونگا۔ آخر انعام لینا جو ٹھہرا۔

مینو: بالکل، بالکل۔

سقراط: چلو میں تمھیں سمجھاتا ہوں کہ شکل کیا ہوتی ہے۔ اس جواب کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ شکل وہ شے ہے جو ہمیشہ رنگ کے بعد آتی ہے۔ اس بات سے تمھیں اطمینان ہو گیا یا نہیں؟ یقیناً مجھے تو ہو گیا ہے۔ اسی طرح میں بھی مطمئن ہو جاؤں گا اگر تم مجھے بھی نیکی کی ایسی ہی تعریف کر

کے دکھادو۔

مینو: سقراط، اس کا جواب تو بہت ہی سیدھا سادا ہے۔

سقراط: سیدھا سادہ کیوں؟

مینو: کیونکہ آپ ہی نے کہا ہے کہ شکل ہمیشہ رنگ کے بعد آتی ہے۔

سقراط: درست ہے۔

مینو: لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ شکل تو کیا مجھے یہ ہی معلوم نہیں کہ رنگ کیا ہوتا ہے۔اس کے لیے آپ کا کیا جواب ہوگا۔

سقراط: میں اسے سچ سچ بتادوں گا۔ اگر تو وہ مناظرہ پسند یا معاندانہ نظریے کا حامل فلسفی ہوگا تو میں اس سے کہوں گا کہ اگر میرا جواب غلط ہو تو تمھارا کام یہ ہے کہ دلائل کی مدد سے میری تردید کرو لیکن اگر ہم ایک دوسرے کے دوست ہوئے تو اس طرح باتیں کریں گے جس طرح اس وقت کر رہے ہیں۔ یعنی میں بڑی نرمی سے جواب دوں گا لیکن بیشتر انداز منطقیانہ ہوگا یعنی میں صرف سچی بات ہی نہیں کہوں گا بلکہ ایسے دلائل پر انحصار کروں گا جس سے وہ آدمی متفق ہوگا جس سے میں نے سوال پوچھا تھا۔ میں تم سے اسی طرح باتیں کرنے کی کوشش کروں گا کیا آپ یہ تسلیم کرتے ہیں یا نہیں کہ کسی بات کا اختتام اور سرا بھی ہوتا ہے اور انتہا بھی ہوتی ہے؟ میں یہ تمام الفاظ ایک ہی معنوں میں استعمال کر رہا ہوں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ پروڈیکس ان کے مفہوم میں امتیاز برتے گا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ تم کسی شے کے بارے میں کہو گے کہ وہ انتہا کو پہنچ چکی ہے یا ختم ہو چکی ہے۔ یہی بات میں بھی کہہ رہا ہوں۔ کوئی مشکل بات تو نہیں ہے۔

مینو: جی ہاں! آپ کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میں اس کا مفہوم سمجھتا ہوں۔

سقراط: مثلاً جیومیٹری میں آپ کسی شے کی سطح کی بات بھی کریں گے اور ٹھوس جسم کی بھی۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: چلیے اب آپ کی حالت ایسی ہے کہ شکل کی جو تعریف میں نے کی ہے آپ اسے سمجھ لیں گے، میں شکل کی تعریف یوں کروں گا کہ یہ وہ شے ہے جو ٹھوس جسم پر ختم ہو جاتی ہے۔ بلکہ اجمالاً یہ کہوں گا کہ شکل ٹھوس جسم کی انتہا ہے۔

مینو: اچھا سقراط! ذرا یہ بتایئے کہ رنگ کیا ہے۔

سقراط: مینو! یہ بڑی زیادتی ہے۔ بے چارے بوڑھے آدمی کو سوالات سے تنگ کر رہے ہو لیکن خود جارجیاز کی نیکی کی تعریف یاد کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کر رہے ہو۔

مینو: سقراط! جب آپ مجھے بتائیں گے کہ مجھے کیا دریافت کرنا ہے، پھر میں بتاؤں گا۔

سقراط: جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہو وہ صرف تمھاری آواز سنے گا اور معلوم کرے گا کہ تم خوبصورت ہو اور اب بھی آپ کے متعدد عشاق ہیں۔

مینو: آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔

سقراط: کیونکہ تم تمام حسینوں کی طرح، جب وہ پورے جوبن پر ہوتے ہیں، تم ہمیشہ تحکمانہ لہجے میں بات کرتے ہو، تم بہت ظالم ہو۔ مجھے یہ اندیشہ بھی ہے کہ تم جان گئے ہو گے کہ حُسن میری کمزوری ہے۔ اس لیے تمھیں خوش کرنے کے لیے میں جواب ضرور دوں گا۔

مینو: برائے مہربانی جواب ضرور دیجیے۔

سقراط: کیا تم چاہتے ہو کہ میں جارجیاز کی طرح جواب دوں، جس کی باتوں کے تم عادی ہو۔

مینو: میرے لیے اس سے بہتر اور کیا ہوگا۔

سقراط: کیا اس سے تم اور ایمپیڈوکلس (Empedocles) یہ نہیں کہتے کہ وجود کی ایک رو ہوتی ہے؟

مینو: یقیناً۔

سقراط: اس کے راستے ہوتے ہیں جن سے وہ گزرتی ہے۔

مینو: درست ہے۔

سقراط: اور کچھ روئیں اس راستے کے عین مطابق ہوتی ہیں جبکہ کچھ بڑی اور کچھ چھوٹی ہوتی ہیں۔

مینو: بالکل درست ہے۔

سقراط: ایک اور شے ہے جسے بصارت کہتے ہیں۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: بقول پنڈر (Pindar) ''مفہوم سمجھو'' رنگ، شکل ہی کی ایک رَو ہے۔ جو بصارت کے تناسب ہے اور لائق ادراک ہے۔

مینو: سقراط! میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک لائق ستائش تعریف ہے۔

سقراط: جی ہاں کیوں نہیں، تم ایسی ہی باتوں کے سننے کے عادی ہو۔ میرا اندازہ ہے کہ تمھاری فراست نے

یہ معلوم کرلیا ہے کہ آواز، خوشبو اور ایسی متعدد چیزوں کی ماہیت کی تصریح کی جاسکتی ہے۔

مینو: درست ہے۔

سقراط: مینو! میرا جواب روایتی اور متین انداز کا تھا۔ اسی لیے یہ اب تمھارے لیے شکل سے متعلق جواب سے کہیں زیادہ قابلِ فہم ہے۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: اے الیکسی ڈیمس (Alexidemus) کے فرزند، میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ پہلا حل اس سے کہیں بہتر تھا۔ اگر تم ذرا صبر سے کام لیتے اور معلوم کرنے کی کوشش کرتے اور جیسا کہ تم نے کل کہا تھا محرمِ راز بننے پر مجبور نہ ہوتے تو تمھاری بھی وہی رائے ہوتی جو میری ہے۔

مینو: سقراط! اگر تم اسی طرح کے جواب دیتے رہے تو میں صبر کروں گا۔

سقراط: ویسے بھی میں خود اپنے اور تمھارے خیال سے بھی پوری کوشش کروں گا۔ لیکن مجھے خدشہ ہے کہ میں تمھیں ایسا کوئی جواب نہیں دے سکوں جو تمھیں اچھا لگے۔ اب اپنی باری پر تمھیں اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا۔ اور مجھے بتانا ہوگا کہ عالمگیر نیکی کیا ہے اور تم واحد کو جمع میں تبدیل نہیں کرو گے۔ جیسا کہ مسخرے ان لوگوں کے بارے میں کہتے ہیں جو کسی شے کو توڑ دیتے ہیں بلکہ نیکی کو صحیح وسالم میرے حوالے کردو۔ جو ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوگی۔ میں نے نمونہ آپ کو دکھلا دیا ہے۔

مینو: سقراط! اچھا اگر یہ بات ہے تو میرے خیال میں نیکی وہ ہے کہ جب کوئی اعزاز کا متمنی ہوتا ہے اور اسے اپنے لیے فراہم کرلیتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے اور میں بھی کہتا ہوں۔
"نیکی معزز باتوں کی تمنا اور اس کے حصول کا نام ہے۔"

سقراط: اچھا جو معزز باتوں کی تمنا کرتا ہے کیا وہ نیکی کا بھی متمنی ہوتا ہے؟

مینو: یقیناً۔

سقراط: کیا کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بدی کے تمنائی ہوتے ہیں جبکہ کچھ دوسرے نیکی کے؟ میرے عزیز! کیا سب نیکی کے خواستگار نہیں ہوتے؟

مینو: میرے خیال میں نہیں۔

سقراط: گویا آپ کے خیال میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو بدی کے خواہاں ہوتے ہیں۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: تمھارا مطلب ہے کہ جس بدی کی وہ تمنا کرتے ہیں وہ نیکی ہوتی ہیں یا وہ انھیں بدی سمجھ کر اس کی تمنا کرتا ہے۔

مینو: میرے خیال میں دونوں باتیں درست ہیں۔

سقراط: مینو، کیا تمھیں یقین ہے کہ کوئی شخص بدی کو بدی سمجھتا ہے اور پھر بھی اس کی تمنا کرتا ہے؟

مینو: میرا تو یہی خیال ہے۔

سقراط: خواہش اس کے حصول کی ہے؟

مینو: جی ہاں، حصول کی۔

سقراط: کیا وہ یہ سوچتا ہے کہ بدی اس کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے جو اسے حاصل کر لیتا ہے یا وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ اسے اس سے ضرر پہنچے گا۔

مینو: میرے خیال میں ایسے افراد بھی ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ بدی ان کے لیے مفید ہوگی اور ایسے بھی موجود ہیں جو اسے ضرر رساں سمجھتے ہیں۔

سقراط: جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے لیے مفید ہوگی، کیا انھیں اس بات کا علم بھی ہے کہ وہ بدی ہے۔

مینو: بالکل نہیں۔

سقراط: ظاہر ہے کہ جو افراد اس کی ماہیت سے واقف نہیں ہیں وہ اس کی خواہش بھی نہیں کرتے۔ وہ صرف اسی کی تمنا کرتے ہیں جسے وہ نیکی سمجھتے ہیں حالانکہ فی الحقیقت وہ بدی ہوتی ہے اور اگر وہ غلطی سے بدی کو نیکی سمجھتے ہیں تو کیا وہ واقعی نیکی کے خواہش مند ہیں؟

مینو: اس طرح سے تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

سقراط: اچھا تو اس کا مطلب یہ ہوا نا کہ جو یہ جانتے ہوئے بدی کے حصول کی تمنا کرتے ہیں کہ یہ ان کے لیے نقصان دہ ہوگی تو کیا وہ یہ جانتے ہیں کہ اس سے انھیں ضرر بھی پہنچے گا؟

مینو: بالکل جانتے ہوں گے بلکہ انھیں یہ جاننا چاہیے۔

سقراط: جو بدی کا ضرر برداشت کرتے ہیں، کیا انھیں یہ نہیں جاننا چاہیے کہ اس کی مصیبت اتنی ہی ہوتی ہے جتنی بدی کی ضرر رسانی کی ہوتی ہے؟

مینو: ظاہر ہے وہ اس کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے۔

سقراط: لیکن کیا مصیبت زدہ بدنصیب نہیں ہوتے۔

مینو: کیوں نہیں، بالکل ہوتے ہیں۔

سقراط: کیا کوئی مصیبت زدہ اور بدنصیب ہونا چاہتا ہے؟

مینو: سقراط، میں تو کہوں گا نہیں۔

سقراط: لیکن مینو، اگر کوئی مصیبت زدہ نہیں ہونا چاہتا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسا کوئی نہیں ہے جو بدی کا خواہش مند ہو کیونکہ مصیبت بدی کی خواہش اور حصول کے سوا اور کیا ہے؟

مینو: سقراط! سچ تو یہی ہے اور اسی لیے میں تسلیم کر چکا ہوں کہ بدی کی تمنا کسی کو نہیں ہوتی۔

سقراط: کیا تم نے ابھی یہ نہیں کہا تھا کہ نیکی خوبی کے حصول اور خواہش کا نام ہے۔

مینو: جی ہاں، میں نے کہا تھا۔

سقراط: لیکن اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خوبی کے حصول کی خواہش سب میں پائی جاتی ہے اور اس معاملے میں کوئی کسی سے بہتر نہیں ہے؟

مینو: ٹھیک ہے۔

سقراط: اگر خوبی کی تمنا کرنے میں کوئی کسی دوسرے سے بہتر نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے حصول کی قوت میں دوسرے سے بہتر ہو۔

مینو: بالکل۔

سقراط: تو پھر تمھاری تعریف کے مطابق نیکی نام ہوگا خوبی کے حصول کی قوت کا؟

مینو: سقراط! تم اس معاملے کو جس نظر سے دیکھ رہے ہو میں کلی طور پر اس کی تصدیق کرتا ہوں۔

سقراط: چلیے ہم کسی اور نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ درست ہے یا نہیں۔ بہت ممکن ہے تم درست کہہ رہے ہو۔ اچھا اس کا مطلب ہے کہ تم خوبی کے حصول کی طاقت کو نیکی سمجھنے کی تصدیق کرتے ہو نا؟

مینو: جی ہاں، میں ان تمام کو خوبیوں میں شمار کرتا ہوں۔

سقراط: مینو کے خیال کے مطابق (آباؤ اجداد سے عظیم شہنشاہ کا دوست چلا آ رہا ہے۔) نیکی زر و سیم کے حصول کی قوت کا نام ہے اور کیا تم اس میں یہ اضافہ کرو گے کہ ان کے حصول میں پاکیزگی اور عدل کا لحاظ رکھا جانا چاہیے یا تمھارے خیال میں اس کی کوئی اہمیت نہیں اور کیا حصول کا ہر طریقہ خواہ وہ بے انصافی اور بد دیانتی پر مبنی ہو، نیکی شمار کیا جائے گا؟

مینو: سقراط! وہ نیکی نہیں بدی ہوگی۔

سقراط: پھر تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انصاف، اعتدال ذات، تقدس یا نیکی کے اسی طرح دوسرے اجزا کا زر وسیم کے حصول کے عمل میں شامل رہنا ضروری ہے اور ان کے بغیر کسی خوبی کا حصول نیکی نہیں ہوگا۔

مینو: کیوں۔ ان کے بغیر نیکی کیسے ممکن ہے۔

سقراط: خود اپنے لیے یا کسی دوسرے کے لیے بددیانتی سے سونے اور چاندی کا حصول یا بالفاظِ دیگر ان کی احتیاج اسی طرح کی نیکی ہوگی؟

مینو: جی ہاں۔

سقراط: پھر تو گویا ان اشیا کا حصول ان کے عدم حصول اور احتیاج ہی کی طرح نیکی نہیں ہے۔ یعنی جو کچھ بھی انصاف اور دیانت کے ساتھ حاصل کیا جائے، وہ نیکی ہے اور جو کچھ انصاف سے عاری ہو وہ بدی ہے۔

مینو: میری رائے میں اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

سقراط: کیا ہم ابھی یہ نہیں کہہ رہے تھے کہ انصاف، اعتدال ذات وغیرہ میں سے ہر ایک نیکی کا جزو ہے۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: مینو! اچھا، تو تم میرا مذاق اس طرح اڑاتے ہو۔

مینو: سقراط! یہ آپ کیوں کہہ رہے ہو؟

سقراط: کیوں نہیں، میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ تم مسلم اور مکمل نیکی کو میرے حوالے کر دو اور میں نے تمھیں وہ نمونہ بھی بتایا تھا جس نہج پر تمھیں جواب دینا چاہیے تھا۔ تم اسے کب کا بھول چکے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا نیکی کسی خوبی کے، انصاف سے یا ناانصافی سے حصول کا نام ہے؟ جبکہ تم مانتے ہو کہ انصاف نیکی کا جزو ہے۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: تمھارے ہی اعتراف سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ نیکی اس عمل کا نام ہے جس میں نیکی کا کوئی نہ کوئی جزو شامل ہوتا ہے۔ تم ہی نے تو کہا ہے کہ انصاف وغیرہ نیکی کا جزو ہیں۔

مینو: تو پھر کیا ہوا۔

سقراط: کیا ہوا، تم نے کیا یہ نہیں کہا تھا کہ تم مجھے مکمل نیکی کے بارے میں بتاؤ گے۔ لیکن تم اس بات سے بہت ہی دور ہو۔ صرف یہ کہتے ہو کہ جس کام میں نیکی کا کوئی جزو شامل ہو وہ نیکی ہے۔ گویا تم نے مجھے پہلے ہی بتا دیا ہے کہ مکمل نیکی کیا ہے۔ اور میں اسے سمجھ بھی گیا ہوں۔ وہ بھی اس صورت میں جب تم نے اسے پارہ پارہ کر کے بکھیر دیا ہے۔ میرے عزیز مینو! اسی لیے میں ہچکچاتے ہوئے یہی سوال دہراؤں گا کہ 'نیکی کیا ہے؟'' ورنہ میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ہر وہ کام جس کی تکمیل میں نیکی کا کوئی جزو شامل ہو، نیکی ہے۔ تم نے کہا ہے کہ جو کام بھی انصاف سے کیا جائے وہ نیکی ہے اس کا تو یہی مطلب نکلتا ہے اس کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ پھر کیا مجھے اپنا سوال دہرانا نہیں چاہیے۔ کیا کسی کو یہ جانے بغیر کہ نیکی کیا ہے، نیکی کے جزو کا علم ہو سکتا ہے؟

مینو: جی نہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ جان سکتا ہے۔

سقراط: تمھیں یاد ہو گا کہ شکل کی مثال دیتے ہوئے ہم نے ایسے جواب رد کر دیے تھے جو تشریح کے محتاج تھے یا انھیں تسلیم نہیں کیا گیا۔

مینو: سقراط! ہم نے یہ کام درست کیا تھا۔

سقراط: عزیزم! یہ نہ سمجھ کہ ہم نیکی کے کسی غیر تصریح شدہ جزو کے ذریعے نیکی یا کسی اور شے کی ماہیت کسی کو سمجھا سکتے ہیں؟ اس ضمن میں ہمیں پھر وہی پرانا سوال دہرانا پڑے گا کہ نیکی کیا ہے؟ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟

مینو: آپ درست کہہ رہے ہیں۔

سقراط: آیئے ابتدا ہی سے بات کا آغاز کریں۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ تمھارے اور تمھارے جار جیاز کے خیال میں نیکی کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔

مینو: سقراط! آپ سے شناسائی سے قبل مجھے یہ بتا دیا گیا تھا کہ آپ خود پر بھی شک کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی تشکیک میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اور اب آپ مجھ پر اپنا جادو چلا رہے ہیں، میں آپ کی باتوں سے مسحور ہو رہا ہوں۔ مجھ پر آپ کے جادو کا اثر ہو رہا ہے۔ میں حواس باختہ ہو رہا ہوں۔ میں مذاق کرتے آپ کی ہنسی اڑانا چاہوں بھی تو میں یہ نہیں کر سکتا کیوں کہ آپ اس چپٹی سی بجلی پیدا کرنے والی مچھلی کی طرح ہیں جو اپنے قریب آنے والی یا مس کرنے والی جاندار شے کو بے حس کر دیتی ہے جیسا کہ آپ نے مجھے کر دیا ہے۔ میری روح اور زبان دونوں بے حس ہو

چکے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں جواب کیسے دوں۔ میں اس سے قبل بھی اور اب بھی نیکی کے موضوع پر بہت سی تقریریں کر چکا ہوں۔ جسے بہت سے لوگوں نے عمدہ قرار دیا تھا اور وہ تھیں بھی عمدہ، لیکن اس وقت میں اس بارے میں ایک لفظ نہیں کہہ سکتا کہ نیکی کیا ہے۔ میں سوچتا ہوں آپ نے واقعی سمندر یا گھر سے دور جانے سے احتراز کر کے بڑی دانائی سے کام لیا ہے کیونکہ اگر کسی بھی دوسری جگہ آپ یہی کرتے جو ایتھنز میں کر رہے ہیں تو آپ کو جادوگر ہونے کے جرم میں قید کر دیا جاتا۔

سقراط: مینو! تم شرارت سے باز نہیں آؤ گے۔ تم نے مجھے تقریباً بیدست و پا کر دیا ہے۔

مینو: آپ کیا کہہ رہے ہیں۔

سقراط: میں بتاتا ہوں کہ تم نے مجھے بجلی والی مچھلی سے کیوں تشبیہ دی ہے۔

مینو: کیوں دی ہے۔

سقراط: میں تمھارے بارے میں ایک اور تشبیہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تمام خوبصورت نوجوان اپنے بارے میں حتی المقدور حسین تشبیہ تراشتے ہیں۔ لیکن میں ان کی عنایت کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ جہاں تک میرے برقی مچھلی ہونے کا تعلق ہے۔ اگر یہ مچھلی بے حس ہوتی ہے اور دوسروں کو بے حس کر دیتی ہے تو واقعی میں برقی مچھلی ہوں، بصورتِ دیگر بالکل ہی نہیں۔ میں دوسروں کو الجھن میں اس لیے نہیں ڈالتا کہ میں معاملے کو اچھی طرح سمجھتا ہوں بلکہ اس الجھن کا سبب یہ ہوتا ہے کہ میں خود الجھن کا شکار ہوتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ نیکی کیا ہے تم بھی اسی مخمصے میں گرفتار نظر آتے ہو۔ حالانکہ مجھ سے گفتگو سے قبل تمھیں اس کا علم ضرور تھا۔ تاہم مجھے اس تحقیق میں آپ کا ساتھ دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

مینو: سقراط! آپ اس کے بارے میں کس طرح تحقیق کریں گے جسے آپ جانتے ہی نہیں ہیں؟ آپ تحقیق کا موضوع کیسے بتائیں گے؟ اور اگر آپ پر وہ شے منکشف ہو جاتی ہے جس کی آپ کو تلاش تھی تو ایسی صورت میں آپ کو یہ کیسے پتا چلے گا کہ یہ وہی شے ہے جس کا آپ کو علم نہ تھا؟

سقراط: مینو! میں سمجھ گیا جو تم کہنا چاہتے ہو۔ لیکن ذرا سوچو تم کیسا تھکا دینے والا تنازع کھڑا کر رہے ہو۔ تمھارا کہنا یہ ہے کہ آدمی اس بارے میں تحقیق کرتا ہے جسے وہ جانتا ہے یا جسے وہ نہیں جانتا۔ اگر وہ جانتا ہے تو تحقیق غیر ضروری ہے اور اگر نہیں جانتا تو وہ جان ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ تو اس سے قطعاً

ناواقف ہے، جسے وہ جاننے کا خواہشمند ہے۔

مینو: ٹھیک ہے لیکن سقراط! آپ بتائیں کہ کیا یہ دلیل مضبوط نہیں ہے؟

سقراط: میرے خیال میں بالکل نہیں۔

مینو: کیوں نہیں۔

سقراط: بتاتا ہوں، کیوں نہیں۔ میں نے چند دانا مردوں اور عورتوں سے جو سماوی اور وجدانی موضوعات پر گفتگو کرتے تھے، سنا ہے کہ:

مینو: انھوں نے کیا کہا۔

سقراط: انھوں نے ایک جلیل القدر صداقت پر بات کی۔ میرا یہی خیال ہے۔

مینو: بات کیا تھی اور وہ لوگ کون تھے۔

سقراط: ان میں سے چند مذہبی عالم مرد اور خواتین تھے، جنھوں نے مطالعہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنے فرائض کے جواز کے لیے کس قسم کے دلائل دیں۔ ان میں پنڈر (Pindar) جیسے شعرا تھے جنھوں نے یہی باتیں اپنے وجدان کے زور پر بیان کیں۔ اسی طرح کے دوسرے بھی جن میں فطری اپج تھی۔ میں ان کے الفاظ بیان کرتا ہوں جن پر غور کرو اور دیکھو وہ سچ ہیں یا نہیں۔ وہ کہتے ہیں انسانی روح امر ہے اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا جسے موت کہا جاتا ہے۔ دوسرے وقت اس کا دوبارہ جنم ہوتا ہے لیکن وہ نیست و نابود نہیں ہوتی۔ اس کا اخلاقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو ہمیشہ پاکیزہ زندگی گزارنی چاہیے وہ ''کیونکہ پرسی فون (Persephone) دیوی نے ان روحوں کو جن سے اس نے گزشتہ گناہ کا کفارہ وصول کر لیا تھا اور جنھیں زمین کی گہرائیوں سے سورج کی روشنی میں لے آئی اور یہی وہ ہستیاں ہیں جو طاقتور حکمران، عظیم انسان اور زبردست دانا ہوتے ہیں اور جنھیں بعد میں بھی عرصے تک مقدس ہستیاں سمجھا جاتا ہے۔ روح جو لافانی ہوتی ہے بار بار جنم لے کر اور تمام موجودات کو دیکھ کر جو زمین پر ہیں یا زمین کے نچلے طبقے میں ہیں، ہر بات کا علم ہے اور حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ اگر وہ ان تمام باتوں کو اپنے حافظے میں تازہ کرے جو اسے نیکی کے بارے میں معلوم ہیں بلکہ اس کا یہ علم ہر شے پر محیط ہے کیونکہ اشیا ایک ہی جیسی ہوتی ہیں اور روح کو ہر شے کا علم ہوتا ہے کسی ایک شے سے تمام اشیا کے بارے میں معلومات اخذ کر لینا جیسا کہ لوگ کہتے ہیں یاد کرنا دشوار نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے لیے سخت محنت

اور ہوش وحواس کو قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہر تحقیق اور ہر علم کا دارومدار یادداشت پر ہے۔اس لیے ہمیں تحقیق کے ناممکن ہونے کے بارے میں تمام دلائل کورد کر دینا چاہیے۔اس سے ہم کاہلی کا شکار ہو جائیں گے اور یہ صرف مست افراد کو پسند ہے لیکن اگر ہم دوسری بات تسلیم کر لیں تو ہم مستعد اور تحقیق پسند ہوں گے۔اس بات کے پس منظر میں میں بخوشی نیکی کی ماہیت کی تحقیق کروں گا۔

مینو: سقراط! جب آپ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں کسی شے کا علم نہیں ہوتا اور جسے ہم علم کہتے ہیں وہ دراصل صرف یادداشت ہے۔آخر اس سے آپ کا مطلب کیا ہے۔کیا آپ سکھائیں گے کہ اس میں کیا رمز ہے۔

سقراط: مینو! میں ابھی تم سے کہہ چکا ہوں کہ تم بہت شرارتی ہو۔تم کہہ رہے ہو کہ کیا میں تمھیں سکھا سکتا ہوں جبکہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ بات سکھائی نہیں جا سکتی۔میں نے کہا ہے کہ سکھانا کیا ہے صرف یاد دلانا ہے۔اس طرح تم مجھے خود بات کی تردید کرنے کو کہہ رہے ہو۔

مینو: سقراط! میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔میں آپ سے احتجاج کرتا ہوں۔میں نے تو یہ سوال عادتاً دریافت کیا تھا۔آپ یہ ثابت کر دیں کہ آپ جو کہہ رہے ہیں سچ ہے۔میں چاہتا ہوں کہ آپ ایسا کر دیں۔

سقراط: یہ کوئی آسان معاملہ نہیں ہے لیکن میں حتی المقدور تمھیں خوش کرنے کی کوشش کروں گا۔تم اپنے بے شمار ملازمین میں سے کسی ایک کو بلاؤ، میں تمھیں مثال دے کر سمجھاؤں گا۔

مینو: بجا ارشاد، لڑکے یہاں آؤ۔

سقراط: یہ یونانی ہے، یونانی زبان بولتا ہے۔ٹھیک ہے نا؟

مینو: جی ہاں۔لیکن وہ اسی گھر میں پیدا ہوا ہے۔

سقراط: جو سوال میں اس سے پوچھوں گا اس پر دھیان دو۔پھر دیکھو وہ میرے بارے میں کچھ سیکھتا ہے یا محض باتیں یاد کرتا ہے۔

مینو: میں دیکھتا ہوں۔

سقراط: تم جانتے ہو کہ مربع شکل کے چاروں اضلاع یکساں ہوتے ہیں؟

ملازم: جی جناب۔

سقراط: اور اس مربع کے وسط سے جو لکیریں میں نے کھینچی ہیں وہ بھی باہم مساوی ہیں۔

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: اور مربع کا حجم کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

ملازم: یقیناً۔

سقراط: اور اگر شکل کا ایک ضلع دو فٹ کا ہو اور دوسرا بھی دو فٹ ہی کا ہو تو پوری شکل کتنی بڑی ہو گی۔ میں تمھیں سمجھاتا ہوں۔ اگر ایک طرف کی خالی جگہ دو فٹ کی اور دوسری ایک فٹ کی ہو تو پوری شکل دو فٹ کی ہو گی۔

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: لیکن چونکہ ضلع بھی دو فٹ کا ہے اس طرح دو فٹ دو بار ہے۔

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: گویا دو فٹ دو گنا یعنی اس کا مربع ہے۔

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: دو فٹ کا دو گنا کتنا ہوتا ہے ذرا حساب لگا کر بتاؤ۔

ملازم: سقراط، جناب چار فٹ۔

سقراط: اور کیا ایسا مربع نہیں ہو سکتا جو اس سے دو گنا ہو اور جس کے اضلاع اسی طرح سے یکساں ہوں۔

ملازم: جی ہاں ہو سکتا ہے۔

سقراط: اور وہ کتنے فٹ کا ہو گا۔

ملازم: آٹھ فٹ کا۔

سقراط: اب ذرا سوچ کر بتاؤ کہ اس دو گنے مربع کو تشکیل دینے والے خط کی لمبائی کیا ہو گی۔ یہ دو فٹ کی ہے وہ کتنی لمبی ہو گی۔

ملازم: آٹھ فٹ کی۔

سقراط: اب ذرا سوچ کر بتاؤ کہ دو گنے مربع کی تشکیل دینے والے ضلع کی لمبائی کیا ہو گی۔ یہ دو فٹ ہے۔ وہ کتنی ہو گی۔

ملازم: حضور! ظاہر ہے وہ دو گنی ہو گی۔

سقراط: مینو! تم دیکھ رہے ہو نا کہ میں ملازم کو کچھ سکھا نہیں رہا ہوں صرف پوچھ رہا ہوں۔ وہ ذہنی طور پر جانتا ہے کہ آٹھ مربع فٹ کی شکل بنانے کے لیے لمبے خط کی ضرورت ہوگی یا نہیں؟

مینو: جی ہاں۔

سقراط: کیا اسے واقعی اس کا علم ہے۔

مینو: جی نہیں۔

سقراط: اس نے صرف یہ اندازہ اس لیے لگایا ہے کہ مربع بھی دوگنا ہے اور خط بھی۔

مینو: درست۔

سقراط: اب ذرا دیکھو وہ ان مراحل کو بالترتیب کس طرح یاد کرتا ہے۔ (ملازم سے) بتاؤ کیا تم یہ کہتے ہو کہ دوگنی جگہ دوگنے خطوط سے پیدا ہوتی ہے۔ یاد رکھو کہ میں کسی مستطیل شکل کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ ایسی شکل کی جو ہر طرف سے برابر ہے اور حجم میں اس سے دوگنی ہے یعنی آٹھ فٹ کی ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تم اب بھی یہ کہو گے کہ دوگنا مربع دوگنے خط سے تشکیل پاتا ہے؟

ملازم: جی جناب۔

سقراط: کیا یہ خط اس صورت میں بھی دوگنا نہیں ہو جائے گا اگر ہم ایسے ایک خط کا اس میں اضافہ کر دیں؟

ملازم: بالکل۔

سقراط: دو چار ایسے خطوط سے ایسی جگہ وجود میں آ جائے گی جو آٹھ فٹ کی ہوگی۔

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: آؤ ایسی شکل کو بیان کریں۔ کیا تم یہ نہیں کہو گے کہ یہ شکل آٹھ فٹ کی ہے۔

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: اور کیا اس شکل کے ایسے چار حصے نہیں ہیں جو ہر ایک چار فٹ کی شکل کے برابر ہے۔

ملازم: جی ہاں ہے۔

سقراط: اور کیا وہ چار کا چار گنا نہیں ہے۔

ملازم: بالکل۔

سقراط: اور چار گنا، دوگنا نہیں ہے۔

ملازم: جی نہیں۔ بالکل نہیں۔

سقراط: لیکن کتنا ہے۔

ملازم: چار گنا کے برابر۔

سقراط: بیٹے! دگنے خط کی وجہ سے جو جگہ وجود میں آتی ہے وہ دگنی نہیں بلکہ چار گنا ہوتی ہے۔

ملازم: درست ہے۔

سقراط: چار گنا سولہ ہوتا ہے نا؟

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: کس خط سے آٹھ فٹ کی جگہ پیدا ہوگی جس طرح اس خط سے سولہ فٹ کی جگہ وجود میں آئی۔ سمجھ رہے ہو نا؟

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: اور چار فٹ کی جگہ اس خط سے نصف سے تشکیل پاتی ہے۔

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: بہت خوب تو کیا یہ آٹھ فٹ کی جگہ حجم میں اس سے دگنی اور دوسرے کی نصف نہیں ہے؟

ملازم: بالکل۔

سقراط: گویا اس طرح کی جگہ اس سے بڑے خط سے اور اس سے چھوٹے خط سے تشکیل پائے گی؟

ملازم: جی ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔

سقراط: بہت خوب! میں بھی وہی سننا چاہتا ہوں جو تمھارا خیال ہے۔ اچھا بتاؤ یہ خط دو فٹ کا اور وہ چار کا نہیں ہے؟

ملازم: جی ہے۔

سقراط: گویا جس خط سے آٹھ کا ضلع تشکیل پاتا ہے وہ اس دو فٹ کے خط سے زیادہ اور چار فٹ سے کم ہے۔

ملازم: ہونا تو یہی چاہیے۔

سقراط: ذرا سوچ کر بتاؤ کہ یہ کتنا ہوگا۔

ملازم: تین فٹ۔

سقراط: اگر تم دو فٹ کے خط میں اس کے نصف کا اضافہ کر دو تو وہ تین فٹ کا خط ہو جائے گا۔ ادھر ایک ؟

اور اُدھر دو۔ دوسری طرف بھی اس طرح دو اور ایک ہے۔ اسی طرح وہ شکل بنتی ہے جس کا تم ذکر کر رہے ہو۔

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: لیکن اگر اس جانب تین فٹ اور اُس جانب بھی تین فٹ ہو تو پوری شکل تین فٹ کا تین گنا ہو گی۔

ملازم: ظاہر ہے۔

سقراط: اور تین فٹ کا تین گنا کتنا ہوتا ہے۔

ملازم: نو۔

سقراط: اور چار گنا کا دو گنا کتنا ہوتا ہے۔

ملازم: آٹھ۔

سقراط: اس طرح تین فٹ کے خط سے آٹھ فٹ کی شکل پیدا نہیں ہوتی۔

ملازم: جی نہیں۔

سقراط: لیکن کسی خط سے، ٹھیک ٹھیک بتاؤ، اگر حساب نہ کر سکو تو مجھے وہ خط دکھا دو۔

ملازم: سقراط حضور! میں بالکل نہیں جانتا۔

سقراط: مینو! دیکھو یادداشت کی قوت میں اس نے کیسا اضافہ کیا ہے۔ اسے پہلے بھی پتا نہیں تھا۔ اب بھی اسے نہیں معلوم کہ آٹھ فٹ کی شکل کا ضلع کیا ہے اس کا خیال تھا کہ اسے معلوم تھا اور میرے سوالوں کے جواب اتنے اعتماد سے دیتا رہا۔ گویا اسے سب کچھ معلوم ہے۔ اس نے کوئی دِقت محسوس نہیں کی۔ اب مشکل میں پھنس گیا ہے۔ نہ تو وہ واقعی جانتا ہے اور نہ ہی اس کا خیال ہے کہ وہ جانتا ہے۔

مینو: درست ہے۔

سقراط: کیا اپنی لاعلمی کا علم ہو کر اسے اطمینان نہیں ہوا؟

مینو: میرے خیال میں ہوا ہے۔

سقراط: اگر ہم نے اسے شک میں مبتلا کر کے برقی مچھلی والا جھٹکا دیا ہے تو اس کو کوئی نقصان پہنچایا ہے۔

مینو: میرے خیال میں نہیں۔

سقراط: دیکھو اس طرح ہم نے حقیقت کے انکشاف میں اس کی کچھ نہ کچھ تو مدد کی ہے۔ اور اب وہ اپنی لاعلمی کے علاج کا ضرور سوچے گا۔ وہ اب اس قابل ہو گا کہ ساری دنیا کو بتائے بلکہ بار بار بتائے

کہ دگنی جگہ کے لیے دگنے اضلاع چاہییں۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: لیکن یہ تمھارا خیال نہیں ہے کہ وہ جس بات کو اپنے خیال میں نہیں جانتا تھا لیکن درحقیقت وہ اس سے اُس وقت تک قطعی نابلد تھا۔ جب اس کے ذہن میں اس خیال نے، الجھن نہیں پیدا کر دی کہ وہ اسے معلوم نہیں ہے۔ اور وہ اسے جاننا چاہتا ہے۔ اس بات کو جاننے اور تحقیق کے لیے وہ آمادہ ہو جاتا ہے؟

مینو: سقراط! میری رائے میں وہ ایسا نہیں کرتا۔

سقراط: پھر تو برقی مچھلی کا جھٹکا اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔

مینو: مناسب ہی تھا۔

سقراط: اب ذرا اس سے بھی دور کی پیش رفت پر غور کرو۔ میں صرف اس سے سوال پوچھوں گا کچھ سکھاؤں گا نہیں اور وہ تحقیق میں میرا شریک ہوگا۔ آپ ذرا غور سے دیکھتے رہیں کہ کہیں میں اس کی رائے معلوم کرنے کی بجائے اس کو کچھ بتا تو نہیں رہا ہوں یا کسی بات کی توضیح تو نہیں کر رہا ہوں۔ بیٹے! یہ بتاؤ کہ کیا یہ چار فٹ کا مربع نہیں ہے جسے میں نے کھینچا ہے۔

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: اب میں اس کے مساوی ایک اور مربع کا اضافہ کر رہا ہوں۔

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: اور یہ تیسرا مربع ہے جو ان دونوں کے برابر ہے۔

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: چلیے یہ خالی گوشہ پُر کر لیتے ہیں۔

ملازم: بہت خوب۔

سقراط: دیکھو اب چار مساوی جگہیں موجود ہیں۔

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: یہ جگہ دوسری سے کتنے گنا بڑی ہے۔

ملازم: چار گنا۔

کہ دگنی جگہ کے لیے دگنے اضلاع چاہییں۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: لیکن یہ تمھارا خیال نہیں ہے کہ وہ جس بات کو اپنے خیال میں نہیں جانتا تھا لیکن درحقیقت وہ اس سے اُس وقت تک قطعی نابلد تھا۔ جب اس کے ذہن میں اس خیال نے، الجھن نہیں پیدا کر دی کہ وہ اسے معلوم نہیں ہے۔ اور وہ اسے جاننا چاہتا ہے۔ اس بات کو جاننے اور تحقیق کے لیے وہ آمادہ ہو جاتا ہے؟

مینو: سقراط! میری رائے میں وہ ایسا نہیں کرتا۔

سقراط: پھر تو برقی مچھلی کا جھٹکا اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔

مینو: مناسب ہی تھا۔

سقراط: اب ذرا اس سے بھی دور کی پیش رفت پر غور کرو۔ میں صرف اس سے سوال پوچھوں گا کچھ سکھاؤں گا نہیں اور وہ تحقیق میں میرا شریک ہوگا۔ آپ ذرا غور سے دیکھتے رہیں کہ کہیں میں اس کی رائے معلوم کرنے کی بجائے اس کو کچھ بتا تو نہیں رہا ہوں یا کسی بات کی توضیح تو نہیں کر رہا ہوں۔ بیٹے! یہ بتاؤ کہ کیا یہ چارفٹ کا مربع نہیں ہے جسے میں نے کھینچا ہے۔

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: اب میں اس کے مساوی ایک اور مربع کا اضافہ کر رہا ہوں۔

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: اور یہ تیسرا مربع ہے جو ان دونوں کے برابر ہے۔

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: چلیے یہ خالی گوشہ پُر کر لیتے ہیں۔

ملازم: بہت خوب۔

سقراط: دیکھو اب چار مساوی جگہیں موجود ہیں۔

ملازم: جی ہاں۔

سقراط: یہ جگہ دوسری سے کتنے گنا بڑی ہے۔

ملازم: چار گنا۔

تمہیں یاد ہے نا۔ اسے تو دگنا ہونا چاہیے تھا۔

سقراط: بجا ارشاد۔

ملازم: یہ خط جو اس گوشے سے اُس گوشے تک جاتا ہے ہر مربع کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کرتا۔

سقراط: جی ہاں۔

ملازم: کیا چاروں مساوی خطوط ہی جگہ کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

سقراط: کیے ہوئے ہیں۔

ملازم: ذرا دیکھو کہ جگہ کتنی ہے۔

سقراط: میری سمجھ میں نہیں آیا۔

ملازم: کیا ہر داخلی خط چاروں جگہوں کی تنصیف نہیں کر رہا ہے۔

سقراط: جی کر رہا ہے۔

ملازم: اس حصے میں کتنی جگہیں ہیں۔

سقراط: چار۔

ملازم: اور اس میں کتنی ہیں۔

سقراط: دو۔

ملازم: چار دو کا کتنے گنا ہے۔

سقراط: دوگنا۔

ملازم: اور یہ جگہ کتنے فٹ کی ہے۔

سقراط: آٹھ فٹ کی۔

ملازم: اور یہ شکل کس خط سے بنتی ہے۔

سقراط: اس سے۔

ملازم: یعنی اس خط سے جو چار فٹ کی شکل کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتا ہے؟

سقراط: جی ہاں۔

ملازم: اس خط کو اس علم کے جاننے والے قطر کہتے ہیں اور یہ اسم معرفہ ہے۔ اچھا، مینو کے ملازم! یہ بتاؤ کہ کیا تم یہ تصدیق کرتے ہو کہ یہ دوہری جگہ وتر کا مربع ہے۔

ملازم: سقراط! حضور بالکل۔

سقراط: مینو! اب اس کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے۔ اس نے تمام جواب خود اپنے ذہن سے دیے نا؟

مینو: جی ہاں۔ جواب خود اس کے اپنے تھے۔

سقراط: جبکہ ہم ابھی کہہ رہے تھے اسے کچھ معلوم نہیں۔

مینو: سچ ہے۔

سقراط: تاہم اس کے ذہن میں یہ تصورات موجود تھے یا نہیں۔

مینو: جی تھے۔

سقراط: گویا جو نہیں جانتا اس کے ذہن میں بھی اس شے کے تصورات موجود ہوتے ہیں جسے وہ نہیں جانتا۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: اس وقت ان تصورات میں ہلکی سی جنبش پیدا کی گئی، بالکل خواب کی طرح لیکن اگر اس سے اکثر یہ سوال مختلف طریقوں سے پوچھے جائیں تو آخر وہ اتنا ہی جان جائے گا جتنا دوسرے جانتے ہیں۔

مینو: ایسا ہو سکتا ہے۔

سقراط: اگر اس سے سوال پوچھتے رہیں تو وہ بغیر کسی کے سکھائے پڑھائے خود اس موضوع کے بارے میں علم بازیاب کر لے گا؟

مینو: جی ہاں۔

سقراط: اس کے علم کی بلا ارادہ بازیافت یادداشت ہی تو ہے۔

مینو: درست ہے۔

سقراط: اور یہ علم جو اسے اب ملا ہے یا تو اس نے حاصل کیا ہوگا یا ہمیشہ سے اس کے پاس رہا ہے یا نہیں؟

مینو: جی ہاں۔

سقراط: اگر یہ علم ہمیشہ سے اس کے پاس تھا تو وہ اسے ہمیشہ سے جانتا تھا۔ اگر یہ علم اس نے حاصل کیا ہے تو اس نے اسے اس زندگی میں اس وقت تک حاصل نہیں کیا ہوگا، جب تک اسے اقلیدس کی تعلیم نہ دی ہو۔ اسے یہ طریقہ نہ صرف علم اقلیدس بلکہ دیگر علوم کے لیے بھی استعمال کرنا ہوگا۔ بتایئے اسے کسی نے یہ باتیں کبھی سکھائی تھیں؟ تمھیں تو اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوگا۔ تم نے کہا

تھا نا کہ وہ تمھارے ہی گھر میں پیدا ہوا اور پرورش پائی؟

میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اسے کسی نے کبھی نہیں پڑھایا۔

مینو: پھر بھی اسے علم ہے؟

سقراط: اس بات سے انکار ممکن نہیں۔

مینو: اگر اس نے یہ علم اس زندگی میں حاصل نہیں کیا تو کسی نہ کسی وقت ضرور حاصل کیا ہوگا؟

سقراط: ظاہر ہے اس نے حاصل کیا ہوگا۔

مینو: اور یہ وہ وقت ہوگا جب وہ انسان نہیں رہا ہوگا۔

سقراط: جی ہاں۔

مینو: اگر وہ ایسے حقیقی تصورات کا ہمیشہ سے حامل رہا ہے خواہ وہ انسان تھا یا نہیں تھا۔ جنہیں سوالات کے ذریعہ جنبش میں لایا جاسکتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی روح کو ہمیشہ سے علم حاصل رہا ہے۔ کیونکہ وہ ازل ہی سے یا تو آدمی تھا یا نہیں تھا؟

سقراط: بیشک۔

مینو: اگر ہر شے کی حقیقت روح میں ابتدا ہی سے موجود ہے تو روح امر ہے۔ لہٰذا ان باتوں کو یاد کرو جن کا تم کو علم نہیں ہے یا جنھیں تم یاد نہیں کر سکتے۔

سقراط: پتا نہیں کیوں آپ کی بات دل کو لگتی ہے۔

مینو: مینو! مجھے خود اپنی یہ بات اچھی معلوم ہو رہی ہے۔ میں نے کچھ ایسی باتیں بھی کہی ہیں جن پر مجھے یقین نہیں ہے لیکن ہم یہ سوچ لیں کہ ہمیں تحقیق کرنی ہے تو ہم خود بہتر، ہمت والے اور اپنے آپ کو کم بے یار و مددگار محسوس کریں گے۔ اگر یہ سوچ نہ ہو تو ہم ایک از کار رفتہ خوابیدہ حالت میں اس خیال سے پڑے رہیں گے کہ جو بات ہمیں معلوم نہیں ہے اسے ہم کبھی معلوم نہیں کر سکتے اور نہ ہی معلوم کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اس موضوع پر میں زبانی اور عملی طور پر باقاعدہ بھرپور مقابلے کے لیے تیار ہوں۔

سقراط: آپ کے یہ الفاظ بھی مجھے بہت ہی عمدہ معلوم ہو رہے ہیں۔

مینو: چلیے ہم اس امر پر متفق ہیں کہ آدمی کو اس بات کی تحقیق کرنی چاہیے جسے وہ نہیں جانتا۔ کیا ہم دونوں نیکی کی حقیقت کی تحقیق میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں گے؟

سقراط:

مینو: بسر و چشم۔ تاہم اپنے پہلے سوال کو پھر دہراؤں گا کہ نیکی کے حصول کی کوشش میں ہم اسے
مان لیں جسے سکھایا جا سکتا ہے یا یہ فطرت کا عطیہ ہے یا یہ انسانوں تک کسی اور طریقے سے پہنچتی ہے

سقراط: مینو! اگر مجھے خود اپنے آپ پر یا تم پر قابو ہوتا تو میں اس وقت تک یہ کبھی نہ پوچھتا کہ نیکی
سکھائی جا سکتی ہے یا نہیں، جب تک یہ طے نہ کر لیا جائے کہ "یہ ہے کیا" لیکن چونکہ تم مجھے
زرخرید سمجھ کر بجائے خود مجھے اپنے قابو میں رکھنا چاہتے ہو۔ آزادی کا تمھارے ہاں
میں تمھارے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں کیونکہ تم ناقابلِ مزاحمت ہو۔ اس لیے مجھے مجبوراً ان اشیا
خوبیوں کی تحقیق ہی پر قناعت کرنا ہوگی، جن کی ماہیت سے میں ابھی تک لاعلم ہوں۔ بہر حال مجھے
بھی تھوڑا بہت مان کر اس سوال کی اجازت دینا ہوگی کہ کیا نیکی ہدایت کے ذریعے حاصل ہوتی ہے
یا کسی اور طریقے سے۔ تاہم اجازت کے باوجود یہ بحث ایک مفروضے پر کی جائے گی۔
اقلیدس سے دریافت کیا جائے کہ کیا فلاں مثلث کو فلاں دائرے پر نقش کیا جا سکتا ہے تو وہ جواب
دے گا کہ میں اس کا فوری جواب نہیں دے سکتا لیکن میں ایک مفروضہ پیش کرتا ہوں جس کی مدد
سے ہم کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔ اگر شکل ایسی ہے کہ جب آپ نے اس کا ضلع تیار کیا
ہے اور مطلوبہ مثلث کا رقبہ اس حصے سے چھوٹا ہے جو شکل نے تشکیل دیا ہے تو اس سے ایک نتیجہ نکلتا
ہے اور اگر وہ ناممکن ہو تو دوسرے نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔ اس لیے میں بھی یہ بتانے سے قبل کہ
یہ مثلث اس قابل ہے کہ اسے دائرے میں نقش کیا جا سکے۔ ایک مفروضہ تیار کرنا چاہتا ہوں۔ یہ
ایک ہندسی مفروضہ ہے چونکہ ہمیں نیکی، اس کی ماہیت اور خصوصیات کا علم نہیں ہے اس لیے ہمیں
یہ سوال کرنا ہی ہوگا کہ کیا کسی مفروضے کے تحت نیکی کو سیکھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر نیکی ذہنی خوبی
ہے تو کیا اسے سکھایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ مان لیتے ہیں کہ پہلا مفروضہ یہ ہے کہ کیا نیکی علم ہے یا
نہیں۔ اس طرح اسے سکھایا جا سکتا ہے یا نہیں یا جیسا ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں اسے یاد کیا جا سکتا
ہے یا نہیں؟ نام پر بحث بے سود ہوگی لیکن سوال یہ ہے کہ نیکی سکھائی جا سکتی ہے یا نہیں۔ یا یوں بھی
کہہ سکتے ہیں کہ ہر فرد یہ جانتا ہے کہ صرف علم ہی سکھایا جاتا ہے۔

مینو: میں مانتا ہوں۔

سقراط: اگر نیکی علم ہے تو نیکی کو سکھایا جا سکتا ہے۔

مینو: بالکل۔

سقراط: چلیے ہم نے اس سوال کو جلد ہی لپیٹ لیا ہے اگر نیکی کی خوبی یہی ہے تو وہ سکھائی جا سکتی ہے اور اگر نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ سکھائی بھی نہیں جا سکتی؟

مینو: بالکل۔

سقراط: اگلا سوال یہ ہے کہ کیا نیکی علم ہے یا کوئی اور شے؟

مینو: جی ہاں اب تو اسی سوال کی باری ہے۔

سقراط: کیا ہم نے یہ کہا تھا کہ نیکی ایک خوبی ہے۔ یہ ایک مفروضہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مینو: بالکل۔

سقراط: اگر کوئی ایسی خوبی بھی ہے جو علم سے مختلف ہے تو نیکی وہی خوبی ہوگی لیکن علم تمام خوبیوں پر محیط ہے تو ہمارا یہ خیال صحیح ہوگا کہ نیکی علم ہے؟

مینو: درست ہے۔

سقراط: نیکی ہمیں اچھا بناتی ہے؟

مینو: جی ہاں۔

سقراط: اگر ہم اچھے ہیں تو ہم مفید ہیں کیونکہ ہر اچھی شے مفید ہوتی ہے۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: گویا نیکی بھی مفید ہے؟

مینو: یہ ایک قیاس ہے۔

سقراط: چلیے اب یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کیا چیزیں ہیں جو ہمارے لیے فرداً فرداً مفید ہیں مثلاً صحت، قوت، حسن، دولت وغیرہ۔ کیا انھیں مفید کہتے ہیں؟

مینو: جی ہاں۔

سقراط: بعینہ یہ چیزیں کسی وقت مضر بھی ہوتی ہیں۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: آخر وہ کون سا رہنما اصول ہے جو ان کے مفید یا مضر ہونے کا تعین کرتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ اگر انھیں صحیح طریقے سے برتا جائے تو وہ مفید ہوتی ہیں اور اگر غلط طریقے سے برتا جائے تو مضر؟

مینو: بالکل۔

سقراط: دوسری بات یہ کہ اگر ہم روح کی خوبیوں پر غور کریں، مثلاً تحمل، اعتدال ذات، عدل، حوصلہ، تیز فہمی، حافظہ، وسیع القلبی وغیرہ؟

مینو: بالکل۔

سقراط: ایسی خوبیاں علم نہیں ہیں بلکہ یہ دوسری نوع کی خوبیاں ہیں جو کبھی مفید اور کبھی مضر ہوتی ہیں، مثلاً بغیر احتیاط کے حوصلہ جو محض ایک قسم کا اعتماد ہے؟ اگر کسی میں دانشمندی نہ ہو تو حوصلہ اس کے لیے مضر ہوتا ہے لیکن بصورت دیگر اس کے لیے مفید ہوتا؟

مینو: درست ہے۔

سقراط: یہی بات تحمل اور زود فہمی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ جو باتیں دانش مندی سے سیکھی یا زیر عمل لائی جاتی ہیں، مفید ہوتی ہیں لیکن جب سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیا جاتا تو وہ مضر بن جاتی ہیں؟

مینو: بہت خوب۔

سقراط: عام طور پر کہا جا سکتا ہے کہ روح جو بھی کام کرتی ہے یا برداشت کرتی ہے اگر اسے دانائی کی رہنمائی حاصل ہو تو اس کا انجام پُر مسرت ہوتا ہے لیکن جب اسے نادانی کی راہنمائی ملتی ہے تو انجام اس کے برعکس ہوتا ہے؟

مینو: بات ٹھیک معلوم ہو رہی ہے۔

سقراط: اگر نیکی روح کی ایک خوبی ہے اور اسے مفید تسلیم کیا جاتا ہے تو وہ دانائی اور احتیاط ہی ہو سکتی ہے کیونکہ روح کی کوئی خوبی بذات خود نہ تو مفید ہے اور نہ ہی مضر۔ لیکن وہ دانائی اور نادانی کی شمولیت یا شرکت سے مفید یا مضر بن جاتی ہیں۔ اس لیے اگر نیکی مفید ہے تو دانائی اور احتیاط کی قسم کی ہو گی؟

مینو: میں تسلیم کرتا ہوں۔

سقراط: دولت وغیرہ جیسی دوسری خوبیاں جن کا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے وہ بھی کبھی مفید ہوتی ہیں اور کبھی مضر۔ کیا وہ روح کے صحیح یا غلط طریق استعمال کے سبب مفید اور مضر نہیں بن جاتیں۔ خود روح کی خوبیوں کی طرح وہ دانائی کی راہنمائی سے استفادہ کر کے مفید اور نادانی کے سبب مضر بن جاتی ہیں؟

مینو: بجا ارشاد۔

دانا روح ان کی صحیح راہنمائی کرتی ہے اور نادان روح غلط راستے پر ڈال دیتی ہے۔

سقراط: جی ہاں۔

مینو: کیا یہی بات عموماً انسانی فطرت پر صادق نہیں آتی کیونکہ دیگر تمام خوبیاں روح پر منحصر ہوتی ہیں

سقراط: جبکہ خود روح کی خوبی کا انحصار دانائی پر ہوتا ہے۔ جو ان کے اچھے ہونے کے لیے ضروری ہے۔ تو یوں نتیجہ یہ نکالا جا سکتا ہے کہ دانائی وہ شمع ہے جو مفید ہوتی ہے اور ہمارے خیال میں نیکی مفید ہوتی ہے۔

مینو: بالکل درست۔

سقراط: اس طرح ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ نیکی کُلی یا جزوی طور پر دانائی ہے؟

مینو: سقراط۔ میرے خیال میں آپ درست فرما رہے ہیں۔

سقراط: اگر یہ درست ہے تو خوبی فطری طور پر خوبی نہیں ہے؟

مینو: جی ہاں نہیں ہے۔

سقراط: کیونکہ اگر یوں ہوتا، تو یقیناً ہم میں کردار کی شناخت کرنے والے ایسے صاحبِ ادراک اشخاص ہوتے جنھیں آنے والے دور کے مشاہیر کا پتا ہوتا اور ان کی شناخت کرانے کے بعد ہم انھیں تسلیم کر لیتے اور انھیں حاصل کر لینے کے بعد قلعوں میں رکھتے جہاں ان کا بال بھی بیکا نہ ہوتا۔ ایسی مہر ثبت کر دیتے جو سونے پر لگانے والی مہر سے کہیں مضبوط ہوتی تاکہ کوئی فرد اس میں ردّ و بدل نہ کر سکے، اور وہ نشو و نما پا کر ریاست کے لئے مفید ثابت ہوں۔

مینو: سقراط! جی ہاں۔ یہ طریقہ نہایت عمدہ ہوتا۔

سقراط: لیکن اگر خوبی فطرتاً خوبی نہیں ہوتی تو کیا انھیں رہنمائی اور سکھانے کے عمل سے خوب اور اچھا بنا لیا جاتا ہے۔

مینو: سقراط! اس کے علاوہ کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ اس مفروضے پر کہ نیکی علم ہے لہٰذا بلاشبہ نیکی سکھائی جا سکتی ہے۔

سقراط: واقعی، لیکن اس وقت کیا ہوگا جب خود مفروضہ ہی غلط ہو؟

مینو: ابھی میں نے یہی سوچا تھا کہ کیا ہم لوگ غلطی پر تو نہیں ہیں؟

سقراط: مینو! یہ بات ٹھیک ہے لیکن جو اصول محکم ہوتے ہیں وہ صرف اسی لمحے کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ کے

لیے محکم ہوتے ہیں۔

مینو: اچھی بات ہے۔ آپ کے دل میں یہ بات دیر سے کیوں سمائی کہ نیکی علم ہے؟

سقراط: چلو میں تمھیں بتاتا ہوں۔ مینو! میں اپنی اس بات سے نہیں پھرتا کہ اگر نیکی علم ہے تو اسے سکھایا جا سکتا ہے تاہم مجھے ڈر بھی ہے کہ مجھے اس بات پر تھوڑا بہت شبہ ہے جو معقول بھی ہے کہ کیا نیکی علم ہے۔ اب ذرا سوچو کہ نیکی یا کسی اور خوبی کے لیے جسے سکھایا جا سکے استاد اور شاگرد ضروری نہیں ہیں؟

مینو: بالکل۔

سقراط: اس کے برعکس جس فن کے لیے نہ استاد مہیا ہوں نہ شاگرد دستیاب تو کیا یہ فرض کر لینا چاہیے کہ وہ فن سکھایا نہیں جا سکتا۔

مینو: درست ہے۔ لیکن آپ کا کیا خیال ہے کہ نیکی سکھانے والے استاد نہیں ہوتے؟

سقراط: میں نے بارہا یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیا ایسے استاد موجود ہیں۔ بڑی تگ و دو کے بعد بھی میں ان کی تلاش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس تلاش میں متعدد دوستوں نے میری مدد کی یہ وہ لوگ تھے جو میری رائے میں شناخت کرنے کا ملکہ رکھتے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اب جب ہمیں اس کی ضرورت ہے تو خوش قسمتی سے یہاں اینی ٹس (Anytus) موجود ہے۔ یہ وہی ہے جس کی ہمیں تلاش تھی آیئے، اس سے رجوع کریں۔ اولاً یہ ایک دولتمند اور عقلمند باپ انتھی میون (Anthemion) کا بیٹا ہے جسے دولت نہ تو اتفاقاً ملی اور نہ تھیبان (Theban) کے اسمینیاس (Ismenias) کی طرح کسی نے تحفے میں دی۔ (جو حال ہی میں پولی کریٹس (Polycrates) کی طرح دولت مند بن گیا ہے) بلکہ اس نے یہ دولت اپنی ذاتی ہنرمندی اور محنت سے حاصل کی ہے۔ وہ بہت خوشحال اور منکسر مزاج ہے / نہ گستاخ ہے نہ مغرور اور نہ ہی بے جا پریشان کرنے والا ہے۔ مزید برآں اس کے اس فرزند نے بہت ہی اچھی تعلیم حاصل کی ہے۔ ایتھنز کے لوگوں کی اس کے بارے میں یقیناً یہی رائے ہے۔ اسی لیے وہ اعلیٰ عہدوں کے لیے اس کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن سے آپ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ نیکی سکھانے والے استاد ہیں تو کہاں ہیں اور کون ہیں۔ عزیز اینی ٹس مجھے اور اپنے دوست مینو کے اس سوال کے جواب میں مدد دو کہ ایسے اساتذہ کون ہیں؟ اس کا جواب دیتے وقت اس بات پر ضرور غور کر لینا کہ اگر ہم مینو کو عمدہ طبیب بنانا

چاہیں تو اسے کس کے پاس بھیجیں گے۔ کیا ہم اسے کسی طبیب کی خدمت میں روانہ نہیں کریں گے؟

اینی: بالکل۔

سقراط: یا اگر ہم اسے عمدہ جفت ساز بنانا چاہتے ہیں تو کیا اسے جفت سازوں کے پاس نہیں بھیجیں گے؟

اینی: جی ہاں۔

سقراط: علیٰ ھذا القیاس دیگر معاملات بھی..........؟

اینی: جی ہاں۔

سقراط: چلو ایک سوال کی مزید زحمت برداشت کرو۔ جب ہم یہ کہتے ہیں۔ اسے طبیب کے پاس بھیجنا درست ہوگا کہ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر اسے ایسے افراد کے پاس بھیجیں جو اس فن کے جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ تو ہم کوئی غلطی نہیں کریں گے اور نہ ان کے پاس جو یہ دعویٰ نہیں کرتے یا ان کے پاس جو اس فن کے سکھانے کے لیے معاوضہ طلب کرتے ہیں اور جو بھی ان کے پاس آئے اسے یہ فن سکھانے کا دعویٰ کرتے ہیں؟ اور اگر ہماری بنیاد یہی ہو تو کیا اسے بھیجنے کا اقدام درست نہیں ہوگا۔

اینی: جی ہاں۔

سقراط: کیا یہی بات نے نوازی اور دیگر فنون کے بارے میں بھی نہیں کہی جا سکتی ہے؟ کیا ایک شخص جو کسی دوسرے کو نے نواز بنانا چاہتا ہے ان لوگوں کے پاس بھیجنے سے انکار کر دے گا جو معاوضہ لے کر یہ فن سکھاتے ہیں اور وہ فن سیکھنے کے لیے ایسے لوگوں کی جان عذاب میں ڈالے گا جو ماہر استاد نہیں ہیں اور اس فن میں کبھی کوئی شاگرد نہیں بنا سکے جسے وہ سکھانا چاہتا ہے۔ کیا ایسی حرکت حماقت کی انتہا نہیں ہوگی؟

اینی: جی ہاں، زیوس کی قسم، اور جہالت کی بھی۔

سقراط: بہت خوب۔ تم ایسے ہو کہ میرے ساتھ میرے دوست مینو کو صلاح دے سکتے ہو۔ اینی ٹس وہ مجھے کہے جا رہا ہے کہ وہ اس طرح کی دانائی اور نیکی حاصل کرنا چاہتا ہے جس کی مدد سے لوگ ریاست اور گھر کا کاروبار اور نظام چلاتے ہیں۔ والدین کا احترام کرتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ اچھے لوگوں کی طرح شہریوں اور اجنبیوں کو کب بلایا جائے اور کب رخصت کر دیا جائے۔ بتاؤ اس خوبی کے

حصول کے لیے اسے کسی کے پاس جانا ہوگا۔ کیا گزشتہ دلیل کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے ایسے لوگوں کے پاس بھیجا جائے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہیلاز کے عام اساتذہ میں سے ہیں اور اس شخص کو یہ فن سکھانے کے لیے تیار ہیں جو اس کا معاوضہ ادا کرنے کے قابل ہو؟

اینی: سقراط تمھارا اشارہ کس کی جانب ہے؟

سقراط: اینی ٹس یقیناً پتا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنھیں عوام سوفسطائی کہتے ہیں۔

اینی: سقراط! ہراکلس کی قسم ان سے بچ کر رہو۔ میری توقع ہے کہ شاید ہی میرا کوئی عزیز، کوئی دوست یا ملاقاتی، خواہ شہری ہو یا اجنبی، اتنا دیوانہ ہوگا کہ ان کے چکر میں پھنس کر زندگی خراب کرے۔ کیونکہ وہ ان لوگوں کے لیے عذاب جان اور خرابی کی جڑ ہیں جن کا ان سے سابقہ پڑ جاتا ہے۔

سقراط: اینی ٹس! یہ کیا کہہ رہے ہو۔ ان لوگوں میں سے جو اس بات کے مدعی ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ دوسروں کو کس طرح فائدہ پہنچایا جائے تو کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہی وہ لوگ ہیں جو نہ صرف یہ کہ انھیں بالکل فائدہ نہیں پہنچاتے بلکہ قطعی طور پر ان میں بگاڑ پیدا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں جو ان کے سپرد کیے جاتے ہیں اور اس نقصان رسانی کا معاوضہ وصول کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں! سچی بات تو یہ ہے کہ میں تمھاری اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں صرف پروتاغورس سے واقف ہوں جس نے اپنے اس پیشے سے نامور فیڈیاس سے کہیں زیادہ فائدہ اٹھایا جس نے عمدہ کارنامے دکھائے اور دیگر فن بت تراشی کے ادارے قائم کیے۔ یہ کام کیسے ہوئے؟ جوتوں کی مرمت کرنے والا موچی، کپڑوں کا رفوگر جو جوتے یا کپڑے کی مرمت کرکے انھیں بد سے بدتر بنا دیتا ہے۔ اسے ایک ماہ کی مدت میں بھی کوئی پہچان نہ سکا۔ اگر پہچان لیا جاتا تو فاقوں مر جاتا۔ دوسری جانب دیکھیے پروتاغورس کو کہ چالیس سال سے سارے ہیلاز میں خرابیاں پیدا کر رہا تھا جو شاگرد اس کے حوالے کیے جاتے وہ پہلے سے بدتر بن جاتے لیکن وہ کبھی پکڑا نہیں گیا کیونکہ اگر میں غلط نہیں سمجھا ہوں تو وہ موت کے وقت ستر سال کا تھا جس میں سے چالیس برس تک وہ اپنا کام کرتا رہا اور اس دوران نیک نام رہا اور اب بھی اچھی طرح یاد کیا جاتا ہے۔ نہ صرف پروتاغورس بلکہ متعدد دیگر افراد بھی نیک نام ہیں۔ ان میں کچھ کا اس سے قبل انتقال ہو چکا اور کچھ اب بھی زندہ ہیں۔ اور تم کہتے ہو کہ انھوں نے نوجوانوں کو دھوکا دیا انھیں خراب کیا۔ کیا انھوں نے یہ کام شعوری

طور پر کیا ہے یا غیر شعوری طور پر۔ وہ افراد جنھیں لوگ ہیلاز کے دانا ترین باشندوں میں شمار کرتے تھے دیوانے تھے؟

اینی: دیوانے! نہیں سقراط، دیوانے تو وہ تھے جنھوں نے رقم ادا کی۔ اور ان کے عزیز اور سرپرست جنھوں نے اپنے نوجوانوں کو ان کے حوالہ کیا۔ وہ ان سے بھی کہیں زیادہ فاتر العقل تھے۔ ان سب سے زیادہ عقل سے محروم وہ شہری تھے جنھوں نے ایسے لوگوں کو داخل ہونے دیا اور انھیں شہر بدر نہیں کیا خواہ وہ شہری تھے یا اجنبی۔

سقراط: اینی ٹس! یہ بتاؤ کیا کسی سوفسطائی نے تمھیں کوئی نقصان پہنچایا ہے جو تم ان کے خلاف اتنے شدید جذبات رکھتے ہو؟

اینی: سقراط! ایسا کچھ نہیں ہوا۔ نہ میرے ساتھ نہ ہی میرے کسی عزیز یا دوست کے ساتھ ایسا ہوا اور نہ ہی میں ان سے تعلقات کی تکلیف برداشت کروں گا یا ایسا ہونے دوں گا۔

سقراط: گویا تمھارا ان سے کوئی ربط وضبط نہیں ہے۔

اینی: جی ہاں میں ان سے کوئی رابطہ رکھنا بھی نہیں چاہتا۔

سقراط: میرے عزیز! پھر تم کسی شے کے بارے میں، اس کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ کس طرح کرو گے جبکہ اس کے بارے میں تمھیں کچھ بھی معلوم نہیں۔

اینی: بجا ارشاد، تاہم مجھے خوب معلوم ہے کہ وہ کس طرح کے انسان ہیں۔ جاننے یا نہ جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

سقراط: اچھا تمھیں علم غیب حاصل ہے۔ اینی ٹس! میری سمجھ میں تو نہیں آتا لیکن تمھارے ہی الفاظ سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ تمھاری ان سے جان پہچان نہیں ہے۔ پھر تم کس طرح ان کے بارے میں کچھ جان سکتے ہو؟ میں تم سے یہ نہیں پوچھ رہا ہوں کہ وہ استاد کون سے ہیں جو مینو میں بگاڑ پیدا کر سکتے ہیں (اگر آپ چاہیں تو انھیں سوفسطائی سمجھ لیں)۔ میں آپ سے صرف یہ دریافت کر رہا ہوں کہ اس عظیم شہر میں وہ کون ہیں جو اسے وہ خوبیاں سکھا سکتے ہیں جنھیں میں نے بیان کیا ہے۔ وہ تمھارا خاندانی دوست ہے اس کی رہنمائی کرو۔

اینی: آخر آپ خود اسے کیوں نہیں بتا دیتے۔

سقراط: میں نے اسے بتا دیا ہے کہ اس فن کے استاد کون بن سکتے ہیں لیکن تم نے تو بتایا ہے کہ میں سخت غلطی

پر ہوں۔ میں یہ کہنے میں شاید حق بجانب ہوں کہ تمھاری بات درست ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تم خود بتا دو کہ ایتھنز کے باشندوں میں سے وہ کس سے رجوع کرے؟ کسی کا نام تو بتاؤ۔

اینی: کسی ایک فرد کی نشاندہی کیوں؟ ایتھنز کے شرفا میں سے کسی ایک کا انتخاب یوں ہی کر لیا جائے۔ اور وہ اس کی تربیت کے لیے رضا مند ہو تو سوفسطائیوں سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

سقراط: کیا یہ لوگ خود بخود یہ کام کرنے کے اہل بنے ہیں اور انھیں کسی نے تعلیم نہیں دی ہے؟ کیا وہ اس قابل نہیں کہ ایسی باتیں دوسروں کو سکھائیں جسے انھوں نے کسی سے نہیں سیکھا ہے۔

اینی: میرا خیال ہے کہ یہ علم انھوں نے گزشتہ نسلوں سے سیکھا ہوگا۔ کیا شہر میں بہت سے لائق لوگ نہیں تھے؟

سقراط: جی ہاں، بالکل درست ہے اینی ٹس! ایتھنز شہر میں مدبر اور سیاست دان ہمیشہ سے موجود رہے ہیں اور اس وقت بھی موجود ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ اپنی خوبیاں دوسروں کو سکھانے کے اہل بھی تھے یا نہیں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ دنیا کے اس خطے میں اچھے لوگ تھے یا نہیں، سوال یہ ہے کہ نیکی سکھائی جا سکتی ہے یا نہیں؟ (یعنی آیا یہ قابل تعلیم و تعلم ہے)۔ اسی پر ہماری گفتگو ہو رہی ہے۔ کیا ہم اب یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں یا گزشتہ دور میں ایسے لائق لوگ موجود تھے جو ان خوبیوں کو دوسروں کو سکھا سکتے تھے جن سے وہ متصف تھے۔ یا نیکی ایک ایسی خوبی ہے جو نہ تو دوسروں تک منتقل کیے جانے کے قابل ہے اور نہ ہی یہ سکھائی جا سکتی ہے۔ یہی وہ سوال ہے جس پر میں اور مینو بحث کر رہے ہیں۔ تم ذرا اپنے حساب سے اس پر غور کرو کہ کیا تم تسلیم نہیں کرو گے کہ تھیمسٹوکلس (Themistocles) اچھا آدمی تھا؟

اینی: بالکل! اس سے بہتر کوئی انسان نہیں ہے۔

سقراط: وہ ایک اچھا استاد رہا ہوگا بشرطیکہ وہ اپنی خوبیاں دوسروں کو سکھانے کا اہل ہوتا۔

اینی: جی ہاں اگر وہ چاہتا تو ہو سکتا تھا۔

سقراط: لیکن کیا اس کی یہ خواہش نہیں رہی ہوگی؟ چلیے یوں کہہ لیجیے اسے یہ آرزو تو رہی ہوگی کہ کم از کم اس کا بیٹا ہی نیک، شریف اور معزز فرد بن جائے۔ اپنی خوبیاں سکھانے میں اسے نہ تو حسد ہوگا اور نہ ہی اس نے جان بوجھ کر اس سے اجتناب برتا ہوگا۔ کیا کبھی تم نے یہ سنا ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کلیوفینٹس (Cleophantus) کو نامور شہسوار بنایا اور اسے گھوڑے کی پشت پر سیدھا کھڑا رہنا، نیزہ

پھینکنا اور دیگر حیرت انگیز کرتب سکھائے اور وہ ہر اس کام میں ماہر تھا جسے کوئی استاد سکھا سکتا ہے۔

کیا تم نے بزرگوں سے کچھ نہیں سن رکھا؟

اینی: میں نے سنا ہے۔

سقراط: یعنی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بیٹے میں اہلیت اور قابلیت کی کمی تھی؟

اینی: ہرگز نہیں۔

سقراط: لیکن کیا کسی بوڑھے کو جوان سے تم نے سنا ہے کہ کلیوفینٹس ولد تھیمسٹوکلس اپنے والد کی طرح عاقل و نیک تھا؟

اینی: میں نے کسی کو ایسا کہتے ہوئے نہیں سنا۔

سقراط: اگر نیکی سکھائی جانے کے قابل ہوتی تو کیا کلیوفینٹس کا والد اپنے سگے بیٹے کو ان چھوٹی موٹی خوبیوں کی تعلیم نہ دیتا اور وہ اسے کم از کم ان خوبیوں میں، جس میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا، اپنے ہم عصروں کے برابر نہ بنا دیتا۔

اینی: واقعی میری یہ رائے نہیں ہے۔

سقراط: نیکی سکھانے والا ایک استاد تھا جسے تم ماضی کے بہترین آدمیوں میں شمار کرتے ہو۔ چلیے ارسٹیڈس (Aristides) ولد لائسی میکس (Lysimachus) کی مثال لیتے ہیں۔ کیا تم اسے اچھا آدمی نہیں سمجھتے؟

اینی: کیوں نہیں، میں سمجھتا ہوں۔

سقراط: اور کیا اس نے اپنے بیٹے لائسی میکس (Lysimachus) کو ایتھنز کے تمام دوسرے باشندوں سے کہیں بہتر طریقے سے ان تمام خوبیوں کی تعلیم نہیں دی جو کوئی استاد کسی کو دے سکتا تھا لیکن نتیجہ کیا نکلا۔ کیا وہ کسی دوسرے فانی انسان سے ذرا سا بھی بہتر ہوا؟ تم اسے جانتے ہو اور یہ بھی دیکھ رہے ہو کہ وہ کیسا ہے۔ چلیے اب پیریکلس کی بات کرتے ہیں جو دانائی میں عظیم ہے۔ تم جانتے ہی ہو کہ اس کے دو بیٹے پیرالس (Paralus) اور زینتھپس (Xanthippus) ہیں۔

اینی: میں جانتا ہوں۔

سقراط: تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس نے انھیں بے مثال شہسوار بنایا، موسیقی سکھائی، ورزش کا ماہر بنایا بلکہ تمام فنون میں طاق کر دیا۔ وہ ان امور میں کسی سے کمتر نہیں تھے لیکن کیا پیریکلس یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس

کے بیٹے اچھے آدمی بھی بنیں۔ لیکن نیکی، جیسا کہ مجھے شک ہے، سکھائی نہیں جاسکتی اور تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ صرف نالائق استاد ہی ایتھنز کے سب سے گھٹیا لوگوں میں شامل ہوتے ہیں اور ان کی تعداد بہت ہی مختصر ہوتی ہے۔ ذرا یاد کرو کہ تھیوسائیڈیڈس (Thucydides) کے دو بیٹے میلیسیاس (Melesias) اور اسٹیفینس (Stephanus) تھے۔ جنھیں دیگر امور میں اعلیٰ تعلیم دینے کے علاوہ انھیں کشتی بھی سکھائی گئی اور وہ ایتھنز کے بہترین پہلوان تھے۔ اس نے ان میں سے ایک کو زینتھیاس (Xanthias) کی اور دوسرے کو یوڈورس (Eudorus) کی سرپرستی میں دیا جو اپنے زمانے کے نامور ترین پہلوان ہوا کرتے تھے۔ کیا تمھیں یاد ہے نا!

اینی: ان کے بارے میں میں نے سن رکھا ہے۔

سقراط: کیا اس بات میں کوئی شک ہے کہ تھیوسائیڈیڈس نے جس کی اولاد کو ایسے ہنر سکھائے گئے اور جن کے لیے اسے رقم خرچ کرنا پڑی کیا وہ انھیں نیک اور اچھا نہیں بنا سکتا تھا۔ جس پر کوئی خرچ بھی نہیں آتا۔ بشرطیکہ کسی کو نیکی سکھانا ممکن ہوتا؟ کیا تم جواب میں یہ کہو گے کہ وہ گھٹیا آدمی تھا۔ اور کیا ایتھنز اور کسی دوسری جگہ اسے دوستوں کی کمی تھی۔ جی نہیں۔ اس کا تعلق ایک نامور خاندان سے تھا وہ تمام ہیلاز اور ایتھنز میں بہت ہی بااثر انسان تھا اور اگر نیکی سکھانا ممکن ہوتا تو وہ اس کام کے لیے اگر سرکاری مصروفیات سے وقت نہ نکال سکتا تو ایتھنز کا کوئی باشندہ یا کسی دوسرے غیر ملکی کو ضرور تلاش کر لیتا جو اس کے بیٹوں کو نیک بنا دیتا۔ میرے دوست اینی ٹس! مجھے پھر بھی شک ہے کہ نیکی سکھائی نہیں جاسکتی ہے۔

اینی: سقراط! میں سوچتا ہوں تم انسان کی برائیاں بیان کرنے میں جلد باز واقع ہوئے ہو۔ میری مانو اور اس معاملے میں احتیاط برتو۔ شاید ہی کوئی شہر ایسا ہو جہاں انسان کو نفع پہنچانے سے کہیں آسان انھیں نقصان پہنچانا ہوتا ہو۔ اور کہ تم جانتے ہو نا ایتھنز کا معاملہ اس سے مختلف نہیں۔

سقراط: مینو! میرا خیال ہے کہ اینی ٹس کو غصہ آ گیا ہے۔ اسے غصہ آنا ہی چاہیے تھا کیونکہ اول تو یہ سوچتا ہے کہ میں ان افراد کو بدنام کر رہا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ خود کو بھی ان افراد میں ہی شمار کر رہا ہے۔ لیکن ایک روز اسے بدنامی کے معنی معلوم ہو جائیں گے اور جب اصل بات معلوم ہو جائے گی تو وہ مجھے معاف کر دے گا۔ اس دوران، مینو! میں تم سے چند باتیں کروں گا۔ میرا خیال ہے تمھارے علاقے میں بھی اچھے لوگ ہوتے ہیں نا؟

کیوں نہیں ہوتے۔

مینو: کیا وہ لوگ نوجوانوں کو تعلیم دینا چاہتے ہیں؟ کیا وہ خود کو استاد کہتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ نیکی

سقراط: سکھائی جا سکتی ہے؟

مینو: جناب سقراط! ایسا نہیں ہے۔ وہ اس بات پر متفق نظر نہیں آتے۔ کبھی کہتے ہیں نیکی سکھائی جا سکتی ہے کبھی اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

سقراط: کیا ہم ایسے افراد کو استاد کہہ سکتے ہیں جنھیں خود اپنے کام کے امکانات کا علم نہ ہو۔

مینو: جی نہیں۔

سقراط: ان سوفسطائیوں کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے جن کا کام ہی تعلیم دینا ہے؟ کیا تم انھیں نیکی سکھانے یا اس کی تعلیم دینے والا استاد سمجھتے ہو۔

مینو: سقراط! مزے کی بات یہ ہے کہ میں نے جارجیاز کو کبھی یہ کہتے نہیں سنا کہ وہ نیکی سکھانے کا وعدہ کرتا ہے بلکہ جب وہ سنتا ہے کہ کسی نے ایسی بات کہی ہے تو ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ ایسے لوگوں کو پہلے گفتگو کرنا سیکھنا چاہیے۔

سقراط: اچھا یہ بتاؤ تم سوفسطائیوں کو استاد مانتے ہو۔

مینو: سقراط! میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دنیا کی طرح میں بھی تشکیک میں مبتلا ہوں، کبھی سوچتا ہوں وہ استاد ہیں کبھی سمجھتا ہوں وہ استاد نہیں ہیں۔

سقراط: کیا تمھیں احساس ہے کہ صرف تم اور دوسرے سیاستدان ہی اس شبہ میں مبتلا ہو کہ نیکی سکھائی جا سکتی ہے یا نہیں بلکہ شاعر تھیوگنس (Theognis) نے بھی یہی کہا ہے۔

مینو: اس نے یہ بات کہاں کہی ہے؟

سقراط: اس مرثیہ نما نظم میں:

"بڑے لوگوں کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ بنو۔ ان کی خوشنودی حاصل کرو۔
ان ہی کی نیکی سے تم سیکھو گے کہ نیکی کیا ہوتی ہے۔ لیکن برے لوگوں سے
میل جول رکھو گے تو تمھاری عقل و دانش ہاتھ سے نکل جائے گی۔"

اس سے تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ وہ نیکی کو سکھائے جانے کے لائق سمجھتا ہے؟

مینو: صاف ظاہر ہے۔

سقراط: لیکن اس کے ایسے بھی اشعار ہیں جن میں وہ اس رائے کو تبدیل کر دیتا ہے اور کہتا ہے:

"اگر فہم وادراک تیار کیے جاسکتے اور کسی فرد میں داخل کیے جاسکتے تو انھوں نے (جو کارنامے انجام دیتے ہیں) بڑے بڑے انعامات حاصل کیے ہوتے۔"

وہ مزید کہتا ہے:

"برا بیٹا اچھے باپ کے یہاں پیدا نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کے کانوں میں اچھی باتیں پڑتی ہیں لیکن صرف سکھا کر تم کسی بُرے آدمی کو نیک نہیں بنا سکتے ہو۔"

تو تم یہ کہو گے کہ یہ خود اپنی بات کی تردید ہے۔

مینو: بالکل۔

سقراط: کیا اس کے علاوہ بھی کچھ باتیں ایسی ہیں جس میں استادوں کا دعویٰ مصدقہ ہے۔ یہی نہیں کہ دوسروں کو سکھا نہیں سکتے بلکہ وہ خود بھی ان سے نابلد ہوتے ہیں اور جس بات کو پڑھانے کے مدعی ہیں اس کے لیے نااہل ہیں؟ یا کیا کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جن کے بارے میں مسلم الثبوت اساتذہ بھی اکثر یہ کہتے ہیں کہ یہ بات سکھائی جاسکتی ہے اور کبھی اس کے مخالف رائے دیتے ہیں؟ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ وہ صحیح معنوں میں استاد ہیں جب کہ خود ان کا ذہن الجھن کا شکار ہے۔

مینو: میں تو بالکل ہی نہیں کہوں گا۔

سقراط: لیکن اگر نہ تو سوفسطائی اور نہ ہی دوسرے افراد استاد ہیں تو ظاہر ہے اور کون ہوسکتا ہے؟

مینو: کوئی نہیں۔

سقراط: جب کوئی استاد نہیں ہے تو ظاہر ہے شاگرد بھی کوئی نہیں ہوگا۔

مینو: تسلیم ہے۔

سقراط: ہم نے یہ مان لیا ہے کہ کوئی بات اس صورت میں سکھائی نہیں جاسکتی جب کہ نہ تو اس کا کوئی استاد ہو اور نہ ہی کوئی شاگرد۔

مینو: میں تسلیم کرتا ہوں۔

سقراط: اسی طرح نیکی سکھانے والے استاد بھی کہیں نہیں ہیں۔

کہیں نہیں ہیں۔

مینو: جب اُستاد ہی نہیں تو طالب علم کہاں سے ہوں گے۔

سقراط: میرے خیال سے یہ بات درست ہے۔

مینو: گویا نیکی سکھائی نہیں جاسکتی۔

سقراط: اگر ہماری رائے درست ہے تو اس گفتگو سے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔لیکن سقراط! میں یہ

مینو: بات مان نہیں سکتا کہ نیک لوگ موجود نہیں ہیں اور اگر وہ ہیں تو کس طرح نیک بنے؟

سقراط: مینو! ہوسکتا ہے کہ میں اور تم دونوں زیادہ نیک نہ ہوں اور تمھارا استاد جار جیاز اتنا ہی نااہل ہو جتنا میرا استاد پروڈیکس تھا۔ ہمیں خود اس بات پر غور کرنا ہوگا اور ایسا آدمی تلاش کرنا ہوگا جو ہماری کسی نہ کسی طرح اصلاح کرے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں غور کرتا ہوں کہ گزشتہ باتوں میں ہم سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ آدمی درست اور نیک عمل دوسرے کی رہنمائی میں کرسکتا ہے لیکن اسے سکھایا نہیں جاسکتا اور اگر ہم واقعتاً اس سے انکار کردیں تو پھر یہ معلوم نہ ہوسکے گا کہ نیک آدمی کس طرح وجود میں آسکتے ہیں؟

مینو: سقراط! اس کا کیا مطلب ہے۔

سقراط: میرا مطلب یہ ہے کہ نیک آدمی یقیناً کارآمد اور مفید ہوتے ہیں۔ہم نے کیا اسے صحیح سمجھ کر تسلیم نہیں کیا؟ ایسا ہی ہونا چاہیے۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: اور یہ فرض کریں کہ وہ اسی صورت میں مفید ثابت ہوں گے جب وہ ہمارے عمل کے لیے حقیقی رہنما بنیں۔ہماری یہ بات بھی درست تھی۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کوئی آدمی اس وقت تک اچھا رہنما نہیں بن سکتا جب تک کہ اسے اس بات کا علم نہ ہو کہ ہماری یہ بات غلط تھی۔

مینو: ''درست'' سے آپ کی کیا مراد ہے۔

سقراط: میں سمجھاتا ہوں۔اگر کسی شخص کو لاریسا (Larisa) یا کسی اور مقام کا راستہ معلوم ہے اور وہ وہاں نہ صرف جاتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی وہاں لے جاتا ہے تو کیا اسے درست اور اچھا راہنما نہیں کہا

جائے گا؟

مینو: یقیناً۔

سقراط: اس راستہ کے بارے میں کسی کی سمجھ درست ہولیکن اسے اس بارے میں علم نہ ہواور نہ ہی وہ جانتا ہو تو کیا تب بھی وہ ایک اچھا راہنما ثابت ہوگا؟ یا نہیں؟

مینو: یقیناً۔

سقراط: اور اگر وہ اس کے بارے میں جس کی بابت دوسرا بھی علم رکھتا ہے، درست فہم اور تصور کا مالک ہے تو وہ بھی یقیناً دوسرے شخص کی طرح حقیقت کا علم رکھتا ہے اور اس طرح اچھا رہنما ثابت ہوسکتا ہے۔

مینو: بالکل صحیح۔

سقراط: گویا درست عمل کے لیے درست فہم بھی اسی قدر مفید ہے جتنا کہ اس کا علم۔ یہی وہ نکتہ تھا جسے ہم نیکی کی ماہیت کے تعین کے اندازے کے دوران فراموش کر گئے۔ ہم نے کہا کہ درست عمل کے لیے صرف علم ہی صحیح رہنما ہے حالانکہ صحیح رائے اور درست تصور بھی اس کے لیے مفید ہے۔

مینو: درست ہے۔

سقراط: گویا درست رائے علم سے کم مفید نہیں ہے؟

مینو: سقراط! فرق صرف اتنا ہے کہ علم کا حامل شخص تو ہمیشہ صحیح ہوگا لیکن جس کی رائے درست ہے وہ کبھی صحیح ہوگا کبھی غلط۔

سقراط: اس سے تمھارا مطلب کیا ہے۔ کیا وہ غلط ہوگا جس کی رائے درست ہے جبکہ وہ درست رائے کا حامل ہے۔

مینو: میں آپ کے دلائل کی معقولیت کو تسلیم کرتا ہوں۔ سقراط! بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ علم کو درست رائے پر فوقیت حاصل ہو۔ یا ان میں اختلاف کیوں کر ہو؟

سقراط: میں تمھیں اس بات کا تعجب انگیز ہونا سمجھاتا ہوں۔

مینو: جی ضرور سمجھایئے۔

سقراط: تمھیں حیرت قطعاً نہ ہوتی اگر تم نے ڈاڈالس (Daedalus) کا مجسمہ دیکھا ہوتا۔ غالباً وہ تمھاری ریاست میں دستیاب نہیں ہے۔

مینو: اس کا میرے سوال سے کیا تعلق ہے؟

کیونکہ وہ اگر رسی وغیرہ سے مضبوطی سے باندھے نہ جائیں تو وہ چکمہ دے کر فرار ہو جاتے ہیں۔

سقراط: چلیے پھر کیا ہوا۔

مینو: میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ آزاد رہیں تو قیمتی ہونے کے باوجود قبضے میں نہیں رہتے۔

سقراط: کیونکہ وہ مغرور غلام کی طرح رفو چکر ہو جائیں گے لیکن اگر بندھے ہوں تو بہت ہی قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں کیونکہ وہ فن کا نمونہ ہیں۔ درست آرا کی یہ ایک مثال ہے جب تک وہ ہمارے تابع ہیں۔ وہ حسین اور مفید ہوتی ہیں لیکن وہ انسانی روح کے تصرف سے فرار ہو جاتی ہیں۔ رہتی بھی ہیں تو نادر نہیں۔ اس لیے وہ اس وقت تک کسی کام کی نہیں ہوتیں جب تک انھیں علت کی گرہ نہ لگائی جائے۔ میرے عزیز دوست مینو! یہی گرہ ''یادداشت'' ہے جیسا کہ ہم دونوں پہلے متفق ہو چکے ہیں۔ لیکن جب انھیں باندھ دیا جاتا ہے تو اول وہ علم بن جاتی ہیں اور دوم ان کی نوعیت مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسی بنا پر علم زنجیر سے بندھ جانے کے بعد درست رائے کے مقابلے میں زیادہ ذی وقار اور شاندار ہو جاتا ہے۔

مینو: سقراط! جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں وہ سچ نظر آ رہا ہے۔

سقراط: میں بھی تو لاعلمی میں بول رہا ہوں۔ یہ سب میرا قیاس ہے۔ تاہم اس بات کو کہ علم درست رائے سے مختلف ہوتا ہے میں قیاس نہیں سمجھتا۔ جن چیزوں کو میں جاننے کا مدعی ہوں ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔

مینو: سقراط! بجا ہے اور آپ کا یہ دعویٰ درست ہے۔

سقراط: کیا میری یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ صحیح رائے جو راستے کی رہنمائی کرتی ہے کسی طرح علم سے کمتر نہیں ہوتی۔

مینو: سقراط! میرے خیال سے آپ کی یہ بات بھی صحیح ہے۔

سقراط: گویا درست اور صحیح رائے علم سے ماشہ برابر بھی کمتر یا عملی طور پر کم مفید نہیں ہے۔ اسی طرح جو شخص یہ صحیح رائے رکھتا ہو وہ علم رکھنے والے سے کم درجے پر نہیں ہو سکتا۔

مینو: درست ہے۔

سقراط: اور ہم نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ نیک لوگ کارآمد ہوتے ہیں۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: ہم نے یہ دیکھا ہے کہ لوگ ملک کے واسطے صرف اس لیے مفید نہیں ہوتے کہ وہ علم رکھتے ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ وہ درست رائے کے حامل ہوتے ہیں اور یہ بھی کہ نہ علم اور نہ ہی درست رائے فطرتاً ودیعت ہوتی ہے یعنی لوگ اس کا اکتساب کرتے ہیں۔ کیا تم دونوں ہی کو فطرت کا عطیہ سمجھتے ہو۔

مینو: جی نہیں۔

سقراط: جب فطرت انھیں ودیعت نہیں کرتی تو دونوں میں سے کوئی بھی نیکی فطری نیکی نہیں ہے۔

مینو: یقیناً نہیں۔

سقراط: جب فطرت بحث سے خارج ہوگئی تو یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا نیکی سیکھنے سے حاصل ہوتی ہے؟

مینو: جی ہاں۔

سقراط: اگر نیکی دانائی (یا علم) ہے تو پھر ہمارے خیال کے مطابق وہ سکھائی گئی ہے۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: اگر سکھائی گئی ہے تو وہ دانائی ہوئی۔

مینو: یقیناً۔

سقراط: اگر استاد ہوتے تو ضرور سکھائی جاتی اور اگر استاد نہیں تھے اور پھر سکھائی بھی نہیں گئی۔

مینو: درست ہے۔

سقراط: یاد ہے نا کہ ہم یہ بات تسلیم کر چکے ہیں کہ نیکی کا کوئی استاد نہیں۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ اگر سکھائی نہیں گئی تو پھر وہ دانائی نہیں ہو سکتی؟

مینو: بالکل۔

سقراط: بعینہٖ ہم نے یہ تسلیم کیا کہ وہ خوبی ہے؟

مینو: جی ہاں۔

سقراط: اور درست راہنما مفید اور نیک ہوتا ہے؟

مینو: یقیناً۔

سقراط: اور درست رہنما وہی ہوتے ہیں یعنی وہ لوگ جو علم اور صحیح رائے کے حامل ہوں۔ یہی انسان کو راستہ دکھلاتے ہیں کیونکہ جن کی باتیں اتفاقیہ ہوتی ہیں، وہ انسان ان کی رہنمائی نہیں کرتا۔ کیونکہ

انسانوں کے راہنما علم اور درست رائے والے ہوتے ہیں۔

مینو: میرا بھی یہی خیال ہے۔

سقراط: لیکن اگر نیکی سکھائی نہیں جاتی تو پھر نیکی علم بھی نہیں؟

مینو: ظاہر ہے نہیں۔

سقراط: گویا دو اچھی اور مفید باتوں میں سے ایک یعنی علم، اسے ایک طرف رکھ دیا گیا ہے۔ اور وہ سیاسی زندگی میں ہمارا راہنما کہلانے کا حق نہیں رکھتا۔

مینو: میں ایسا نہیں سوچتا۔

سقراط: اینی ٹس نے تھیمسٹوکلس اور جن دیگر افراد کا ذکر کیا تھا وہ سرکاری کام نہ تو اپنی دانائی کو کام میں لا کر انجام دیتے تھے اور نہ ہی اس لیے کہ وہ اس کی سمجھ رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ دوسروں کو اپنے جیسا نہ بنا سکے کیونکہ ان کی نیکی علم پر مبنی نہیں تھی۔

مینو: سقراط! یہ بات درست ہو سکتی ہے۔

سقراط: لیکن اگر علم سے کام نہیں لیا تو پھر جو دوسری صورت باقی رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ان سیاست دانوں نے سرکاری کام درست رائے سے چلائے ہوں گے۔ اور سیاست میں اس کی حیثیت وہی ہے جو مذہب میں غیب دانی یا الہام کی ہے۔ کیونکہ غیب دان اور ملہمِ غیب جو باتیں کہتے ہیں وہ اکثر و بیشتر سچ ہوتی ہیں لیکن انھیں خود بھی پتا نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

مینو: میری بھی یہی رائے ہے۔

سقراط: مینو! کیا ہم ایسے لوگوں کو، جو سمجھتے نہیں لیکن ان کے متعدد اعمال و الفاظ بہت زیادہ درست اور تیر بہ ہدف ہوتے ہیں، ملکوتی کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟

مینو: اس میں کوئی شک نہیں۔

سقراط: اس طرح ہم ان لوگوں کو بھی ملکوتی کہنے میں حق بجانب ہوں گے جنھیں ہم نے ابھی ابھی غیب دان اور ملہمِ غیب کہا ہے۔ ان میں شعرا کا پورا گروہ شامل ہے۔ جی ہاں ان کے علاوہ سیاست دانوں کو بھی الہامی اور صاحبِ بصیرت کہا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ الہامی اور الوہی اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ اس عالم میں وہ ایسی شاندار باتیں کر دیتے ہیں جس کا انھیں علم نہیں ہوتا۔

مینو: جی ہاں۔

سقراط: مینو! خواتین بھی مردوں کو ملکوتی کہتی ہیں۔ کہتی ہیں ناں! اور سپارٹا کے لوگ جب کسی نیک آدمی کی تعریف کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں "وہ ملکوتی ہے"؟

مینو: سقراط! میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے ہمارے دوست اینی ٹس کو اس لفظ پر اعتراض ہو۔

سقراط: مجھے اس کی پروانہیں ہے۔ اینی ٹس سے بات کرنے کا مزید کوئی موقع مل جائے گا۔ اب ہماری تحقیق کا خلاصہ جو تمام بحث سے نتیجے کے طور پر اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نیکی نہ تو فطری ہوتی ہے، اور نہ ہی اکتسابی۔ لیکن نیک لوگوں کو خدا کی طرف سے جبلی طور پر یہ ملکہ عطا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے ہماری یہ رائے درست ہو۔ جبلت اس وقت تک دلیل کے ہمراہ نہیں ہوتی جب تک یہ امکان نہ ہو کہ سیاست دانوں میں کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہے جو انھیں سکھانے کا اہل ہے۔ اور اگر ان میں کوئی ایسا ہے تو وہ زندوں میں بالکل ویسا ہی ہوگا جیسا کہ بقول ہومر ٹیریسیاس (Tiresias) مُردوں میں تھا۔ اس نے کہا تھا وہی فہم وادراک کا مالک تھا۔ دوسرے اس کا سر کٹا ہوا سایہ ہیں اور اسی طرح وہ اور اس کی نیکی سائے میں ایک حقیقت ہوگی۔

مینو: سقراط! یہ بڑی شاندار بات ہے۔

سقراط: گویا ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نیکی نیک لوگوں میں خدا کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے لیکن ہمیں اصل حقیقت کا پتا اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک یہ سوال کرنے سے قبل کہ نیکی کس طرح ودیعت ہوتی ہے یہ معلوم کریں کہ نیکی کی ماہیت کیا ہوتی ہے۔ دیکھو اب مجھے تم سے رخصت ہونا ہے لیکن اب چونکہ تم خود قائل ہو چکے ہو اس لیے کوشش کر کے آپ اپنے دوست اینی ٹس کو بھی قائل کرو۔ اسے برانگیختہ نہ کرنا، صلح صفائی سے کام لینا اگر تم نے ایسا کر لیا تو یہ اہل ایتھنز کے حق میں ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔

☆☆☆

یوتھی فرو

(Euthyphro)

شرکائے گفتگو:

سقراط(Socrates)، **یوتھی فرو**(Euthyphro)

مقام: **شاہ آرکون**(King Archon) **کا پورچ**

یوتھی: سقراط! تم نے لائیسیم کیوں چھوڑ دیا۔ اور تم یہاں شاہِ آرکون کے پورچ میں کیا کر رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمھیں میری طرح شاہ کے حضور کسی مقدمے میں پیش نہیں ہونا ہے۔

سقراط: یوتھی فرو۔ نہیں مجھے کسی مقدمے میں پیش نہیں ہونا ہے۔ اس موقع کے لیے اہل ایتھنز لفظ "مواخذہ" استعمال کرتے ہیں۔

یوتھی: تم کیا کہہ رہے ہو؟ شاید کسی نے تم پر مقدمہ کر دیا ہے۔ کیونکہ تم تو کسی پر مقدمہ کرنے سے رہے۔

سقراط: بالکل نہیں۔

یوتھی: تو کیا کسی نے تمھیں مقدمے میں ماخوذ کر دیا ہے؟

سقراط: جی ہاں۔

یوتھی: وہ ہے کون؟

سقراط: یوتھی فرو! ایک نامعلوم سا نوجوان جسے میں اچھی طرح جانتا بھی نہیں۔ اس کا نام میلیٹس (Meletus) ہے اور وہ پتھس (Pitthis) کے علاقے کا ہے۔ تمھیں شاید اس کا چہرہ یاد ہو، ناک طوطے جیسی، بال بالکل سیدھے اور ڈاڑھی چھدری۔

یوتھی: مجھے تو یاد نہیں لیکن تم پر الزام کیا لگایا ہے؟

سقراط: الزام کیا ہے؟ نہ پوچھو بہت ہی سنگین ہے۔ جس سے نوجوان کے کردار کا بہت کچھ اظہار ہوتا ہے

اور اسی لیے وہ کسی طرح بھی قابلِ نفرین نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے معلوم ہے کہ نوجوانوں کو کس طرح بگاڑا جا رہا ہے اور کون انھیں بگاڑ رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ کسی دانا کا کام ہے۔ اس نے میرا سراغ لگایا، کیونکہ وہ سمجھتا ہے میرا دانائی سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس لیے وہ مجھ پر اپنے نوجوان دوستوں کو بگاڑنے کا الزام لگا رہا ہے۔ جس کا فیصلہ ہماری ماں یعنی ریاست کرے گی۔ ہمارے تمام سیاست دانوں میں وہی ایسا ہے جو نوجوانوں میں نیکی کو فروغ دینے سے اپنے کام کا آغاز کر رہا ہے جو صحیح طریقہ ہے۔ ایک اچھے کاشت کار کی طرح وہ کئی نازک پودوں پر توجہ مرکوز کر رہا ہے اور کھیت کو ہم لوگوں سے صاف کر رہا ہے جو اسے برباد کر رہے ہیں۔ یہ پہلا قدم ہے۔ اس کے بعد وہ پرانی بڑی شاخوں پر متوجہ ہوگا اور اگر وہ اسی طرح آگے بڑھتا رہا جس طرح شروع ہوا ہے تو وہ ایک عظیم عوامی مفاد کا کام انجام دے گا۔

یوتھی: امید ہے وہ ایسا ہی کرے گا لیکن سقراط! مجھے خوف ہے کہ آخر کار نتیجہ اس کے خلاف نہ نکلے۔ میرا خیال یہ ہے کہ آپ پر الزام لگا کر وہ ریاست کی بنیاد کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ اچھا وہ کیا کہتا ہے کہ آپ کس طرح نوجوانوں کو بگاڑ رہے ہیں؟

سقراط: اس نے میرے خلاف عجیب وغریب الزام لگایا ہے جسے سن کر پہلے حیرت ہوتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میں شاعر ہوں یا دیوتاؤں کا خالق۔ میں تازہ دیوتا تراشتا ہوں اور پرانوں کے وجود سے انکار کرتا ہوں۔ اس کے مواخذے کی یہی بنیاد ہے۔

یوتھی: سقراط میں سمجھ گیا۔ وہ آپ کا مواخذہ ان جانی پہچانی نشانیوں کی بنا پر کر رہا ہے جو آپ ہی کے قول کے مطابق آپ کو کبھی کبھی نظر آتی ہیں۔ وہ آپ کو بدعتی سمجھتا ہے اور وہ آپ کو اس جرم میں عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ اسے پتا ہے کہ دنیا ایسے الزام کو بڑی آسانی سے قبول کر لیتی ہے۔ مجھے خود اس کا اچھا تجربہ ہے کیونکہ جب میں شہریوں کی مجلس میں الوہی باتوں کا ذکر کرتا ہوں یا ان کے بارے میں پیش گوئی کرتا ہوں تو وہ مجھ پر ہنستے ہیں اور مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں حالانکہ میرا ایک ایک لفظ سچ ہوتا ہے۔ لیکن وہ ہم سب سے حسد کرتے ہیں۔ ہمیں حوصلے سے ان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

سقراط: میرے دوست یوتھی فرو! ان کی ہنسی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ آپ کسی کو بھی عاقل و دانا تصور کر سکتے ہیں لیکن میرا اندازہ ہے کہ اہلِ ایتھنز اس پر اُس وقت تک توجہ نہیں دیتے جب تک وہ اپنی دانائی دوسروں کو سکھانا شروع نہیں کرتا۔ تو وہ کسی نہ کسی سبب یا جیسا کہ تم نے کہا ہے حسد کے

باعث اس سے ناراض ہو جاتے ہیں۔
میں اس طرح ان کے غصے کا امتحان لینا نہیں چاہتا۔

یوتھی: غالباً تم ایسا اس لیے نہیں کرتے کہ تم کم گو اور کم آمیز ہو اور شاذ و نادر ہی کسی کو دانائی سکھاتے ہو لیکن

سقراط: میری عادت خیر خواہی کی ہے اور میں ہر ایک سے اپنے دل کی بات کھول کر بیان کر ڈالتا ہوں اور کبھی کبھی سب سامع کی خاطر تواضع پر رقم بھی صرف کرتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اہل ایتھنز مجھے باتونی نہ سمجھ لیں۔ اگر وہ صرف میری ہنسی اڑائیں تو جس طرح تم پر ہنستے ہیں تو عدالت میں وقت بڑے مزے میں کٹ جائے گا۔ لیکن اگر وہ سنجیدہ ہو گئے تو تمھارے جیسے پیش گوئی کرنے والے بتائیں گے کہ کیا ہوگا۔

یوتھی: سقراط! میرا یہ یقین ہے کہ کچھ نہیں ہوگا۔ آپ اپنا مقدمہ جیت جائیں گے اور میں اپنا۔

سقراط: یوتھی فرو! تمھارا کیا مقدمہ ہے، تم مدعی ہو یا مدعا علیہ؟

یوتھی: میں مدعی ہوں۔

سقراط: مدعا علیہ کون ہے؟

یوتھی: جب میں یہ بتاؤں گا تو تم مجھے دیوانہ سمجھو گے۔

سقراط: کیا مغرور کے پر لگے ہیں۔

یوتھی: جی نہیں وہ عمر کے اس حصے میں ہے جس میں وہ بہت زیادہ چاق و چوبند نہیں ہے۔

سقراط: ہے کون وہ؟

یوتھی: میرے والد۔

سقراط: تمھارے والد!؟ کمال ہو گیا!!

یوتھی: جی ہاں۔

سقراط: ان پر الزام کیا ہے؟

یوتھی: سقراط! قتل کا۔

سقراط: یوتھی فرو! قسم ہے دیوتاؤں کی عوام الناس کو حق اور صداقت کا کتنا کم علم ہے۔ اس قسم کے عمل کی راہ پانے سے قبل انسان کو غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک اور دانائی میں بہت زیادہ بڑھا ہوا ہونا چاہیے۔

یوتھی: سقراط! واقعی اسے ایسا ہی ہونا چاہیے۔

سقراط: میرا خیال ہے کہ جس شخص کو تمھارے والد نے قتل کیا وہ تمھارا عزیز ہوگا۔ عزیز ہی ہوگا کیونکہ اگر رشتہ دار نہ ہوتا اور کوئی اجنبی ہوتا تو تم ان پر ہرگز مقدمہ نہ چلاتے۔

یوتھی: سقراط! مجھے حیرت ہے کہ آپ نے رشتہ دار اور اجنبی میں تمیز روا رکھی ہے حالانکہ دونوں معاملوں میں جرم کی نوعیت یکساں ہے۔ اگر آپ جان بوجھ کر قاتل کا اس طرح ساتھ دیں کہ آپ اس کے خلاف مقدمہ چلا کر اسے اور خود اپنے آپ کو بھی صاف بچالیں۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ کیا مقتول کا قتل جائز تھا؟ اگر جائز تھا تو آپ کا یہ فرض بنتا ہے کہ آپ معاملے کو نہ چھیڑیں لیکن اگر جائز نہیں ہے تو آپ قاتل کے خلاف اقدام کریں۔ خواہ وہ آپ کے ساتھ ایک مکان ہی میں رہتا ہو اور ایک ہی دسترخوان پر کھاتا پیتا ہو۔ بات یہ ہے کہ مقتول ہمارا ملازم تھا۔ وہ نیکسوس (Naxas) میں ہمارے کھیتوں پر کام کرتا تھا۔ ایک دن وہ نشہ میں دھت تھا اور ہمارے گھریلو ملازم سے اس کا جھگڑا ہوا اور اس نے اسے قتل کر دیا۔ میرے والد نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک خندق میں پھینک دیا اور ایک آدمی ایتھنز سے ایک غیب دان کو بلانے کے لیے بھیجا کہ اب اس کا کیا کیا جائے۔ اس دوران انھوں نے اسے بالکل نظر انداز کر دیا اس کی بالکل دیکھ بھال نہیں کی اور کرتے بھی کیوں۔ وہ تو اسے قاتل سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ مر بھی جائے تو کوئی خاص حرج نہیں ہوگا اور ایسا ہی ہوا وہ بھوک، سردی، اور زنجیروں میں جکڑے جانے کے سبب قاصد کے ایتھنز سے واپس آنے سے قبل ہی مر گیا۔ اب میرے والد اور خاندان والے مجھ سے اس بات پر چراغ پا ہیں کہ میں نے والد کے خلاف یہ مقدمہ کیوں دائر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے اسے نہیں مارا اور اگر مارا بھی ہے تو کیا ہوا۔ وہ قاتل تھا۔ مجھے اس کو نظر انداز کر دینا چاہیے تھا کیونکہ جو بیٹا اپنے باپ کو جرم میں ماخوذ کرے وہ ناخلف ہوتا ہے۔ سقراط! دیکھ لو ان لوگوں کو اس بات کا کتنا کم علم ہے کہ دیوتاؤں کی نظر میں سعادت مندی اور غیر سعادت مندی کیا ہے۔

سقراط: پناہ بخدا۔ یوتھی فرو! کیا مذہب اور مقدس اور غیر مقدس باتوں کے بارے میں تمھارا علم درست ہے؟ جو حالات تم نے بیان کیے ہیں اس میں ہو سکتا ہے تم بھی اپنے والد پر مقدمہ چلا کر مذہبی لحاظ سے ایک غلط کام کے مرتکب ہو رہے ہو؟

یوتھی: سقراط! یوتھی فرو کی بہترین خوبی جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے یہی ہے کہ اسے ان باتوں کا بالکل درست علم ہے اس کے بغیر بھلا میں کس کام کا رہ جاؤں گا؟

سقراط: میرے نادر دوست! میں سوچتا ہوں تمھارا شاگرد بن جاؤں۔ اب اس سے پہلے کہ میلیٹس (Meletus) کا مقدمہ پیش ہو میں اس سے للکار کر کہوں گا کہ ہمیشہ سے مذہبی مسائل پر میری توجہ رہی ہے اب جبکہ اس نے مجھے ہوائی الزامات اور مذہب میں بدعت پیدا کرنے کا ملزم گردانا ہے میں تمھارا شاگرد بنتا ہوں۔ میں اس سے یہی کہوں گا کہ میلیٹس تم یوتھی فرو کو بہت بڑا مذہبی عالم اور صائب الرائے تسلیم کرتے ہو۔ اگر تم اس کی تصدیق کرتے ہو تو تمھیں بھی میری تصدیق کرنا ہوگی اور مجھے عدالت میں نہیں لانا چاہیے۔ اگر اس کی تصدیق نہیں کرتے تو پہلے اسے ماخوذ کرو اور جو میرا استاد ہے، جو نہ صرف نوجوانوں بلکہ عمر رسیدہ افراد پر بھی تباہی لائے گا یعنی مجھ پر بھی جسے وہ تعلیم دیتا ہے اور اپنے والد پر بھی جس کی اس نے فہمائش بھی کی اور سرزنش بھی اور اگر پھر بھی میلیٹس میری بات نہیں سنے گا اور مواخذہ مجھ سے ہٹا کر تم پر نہیں لے جائے گا تو پھر میں اس بات کا عدالت میں اعادہ کروں گا۔

یوتھی: درست بات ہے، سقراط! اور اگر وہ میرے مواخذہ کی کوشش کرے گا تو میں بلا تامل یہ کہتا ہوں کہ میں اس میں کوئی نہ کوئی خامی نکال لوں گا اور عدالت مجھے اتنا نہیں سنائے گی جتنی اس کی خبر لے گی۔

سقراط: میرے عزیز دوست! یہی سب کچھ جان کر میں تمھارا شاگرد بن رہا ہوں کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کوئی بھی تم پر توجہ نہیں دے رہا ہے حتیٰ کہ میلیٹس بھی نہیں۔ لیکن اس کی تیز نگاہوں نے میرا سراغ فوراً لگالیا اور مجھ پر بے ایمانی کا الزام لگا دیا۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ تم سعادت مندی اور بے ایمانی کی اہلیت مجھے بتا دو۔ تم نے کہا ہے کہ تم یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ تمھیں دیوتاؤں کے قتل اور دیگر معاملات کا بھی بخوبی علم ہے۔ وہ کیا ہیں؟ کیا ہر عمل میں سعادت یکساں نہیں ہوتی اور کیا بے ایمانی ہمیشہ سعادت مندی کا تضاد نہیں ہوتی؟ اس کی اپنی ماہیت بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ بے ایمانی کے تصور میں ہر وہ بات شامل ہوتی ہے جو بدعقیدہ ہو۔

یوتھی: سقراط! یقیناً۔

سقراط: سعادت مندی کیا ہے اور بے ایمانی کیا؟

یوتھی: سعادت مندی وہی ہے جو میرا عمل ہے یعنی میرا اس شخص پر مقدمہ چلانا جو قتل، مذہبی بے ادبی اور اسی طرح کے دیگر جرائم کا مرتکب ہوتا ہے، خواہ وہ تمھارا والد ہو یا والدہ یا کوئی اور، اس سے کوئی

فرق نہیں پڑتا۔ ان پر مقدمہ نہ چلانا بدعقیدگی ہے۔ سقراط، میرے عزیز! میں اپنے الفاظ کی
صداقت کا اس سے بڑھ کر اور کیا عمدہ ثبوت دے سکتا ہوں؟ میرا اصول یہی ہے کہ بے ایمان
خواہ کوئی بھی کیوں نہ ہو سزا سے بچ کر نہ جانے پائے۔ کیا لوگ زیوس (Zeus) کو دیوتاؤں
میں بہترین اور صالح ترین نہیں مانتے؟ تاہم وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس نے اپنے والد
(کرونوس)(Cronos) کو اس لیے پابہ زنجیر کیا کہ اس نے اس کے بیٹوں کو کھالیا تھا اور اس نے
خود بھی اپنے والد (یورانس)(Uranus) کو ایسی ہی بنیاد پر نہایت ہی غیر معروف طریقے سے سزا
دی۔ اب جبکہ میں اپنے والد کے خلاف مقدمہ چلا رہا ہوں تو وہ مجھ سے سخت ناراض ہیں۔ وہ اپنی
طرز گفتگو میں کتنے بے اصول ہیں۔ دیوتاؤں کے معاملے میں کچھ اور کہتے ہیں اور میرے معاملے
میں کچھ اور۔

سقراط: یوتھی فرو! ہوسکتا ہے اسی بنیاد پر مجھے بھی بے ایمانی کے جرم میں ماخوذ کیا گیا ہو کیونکہ میں دیوتاؤں
کے بارے میں ایسی کہانیاں تسلیم نہیں کرتا؟ اس لیے میرا خیال ہے کہ لوگ مجھے غلط سمجھتے ہیں لیکن تم
جسے ان امور کا مکمل علم حاصل ہے ان کی تصدیق کرتے ہو تو میرے لیے اس کے علاوہ کوئی دوسرا
راستہ نہیں ہے کہ میں تمھاری برتر دانائی کا اعتراف کروں۔ اس اعتراف کے بعد میں اس کے سوا
اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ زیوس (Zeus) سے محبت کے طفیل
مجھے بتاؤ کہ کیا تم انھیں سچ تسلیم کرتے ہو؟

یوتھی: سقراط! جی ہاں اس سے بھی زیادہ ایسی حیران کن باتیں جانتا ہوں جن کی ابھی دنیا کو خبر نہیں ہے۔

سقراط: کیا تمھارا یہ ایمان ہے کہ دیوتا باہمی جنگ کرتے رہے ہیں۔ ان کی لڑائیاں بہت شدید تھیں جیسا
کہ شعرا اور مصوروں نے اپنے عظیم شاہکاروں میں بیان کیا ہے۔ تمام عبادت گاہیں ان کی تصاویر
سے بھری ہوئی ہیں۔ خاص طور ایتھنز کی عبا پر یہ تمام داستانیں کشیدہ کاری سے تیار کی گئی ہیں اور
جسے بڑے اہتمام سے عظیم پیناتھینیا (Panathenaea) میں ایکروپولس (Acropolis) تک لے
جایا جاتا ہے۔ یوتھی فرو کیا دیوتاؤں کی تمام داستانیں سچ ہیں؟

یوتھی: سقراط! یہ داستانیں سچ ہیں جیسا کہ میں نے ابھی بتایا ہے، اگر آپ سننے کے لیے تیار ہوں تو میں
دیوتاؤں کے بارے دیگر ایسی باتیں گوش گزار کروں جسے سن کر آپ سخت حیران ہوں گے۔

سقراط: شاید۔ تم مجھے بشرط فرصت کسی اور وقت ضرور سنانا لیکن اس وقت میں چاہتا ہوں کہ تم میرے اس

سوال کا واضح جواب وہ جس کا جواب تم نے ابھی تک نہیں دیا۔

''میں نے تم سے پوچھا تھا کہ سعادت کیا ہے؟'' تو تم نے صرف اتنا کہا تھا کہ ویسا ہی کرنا جیسا تم نے کیا ہے یعنی والد پر قتل کا مقدمہ چلانا۔

یوتھی: میں نے جو کچھ کہا تھا سچ تھا۔

سقراط: بلاشک اس کے علاوہ بھی خوش عقیدگی کے متعدد کام ہیں۔

یوتھی: جی ہاں ہیں۔

سقراط: یاد ہوگا کہ میں نے تمھیں اس قسم کے دیگر دو تین کاموں کے نام بتانے کے لیے کہا تھا بلکہ سعادت مندی کے بارے میں ایک عمومی تصور سمجھانے کے لیے بھی کہا تھا جو سعادت مندی کے تمام کاموں کو سعادت مندی کا کام بناتا ہے۔ آپ کو شاید یاد نہیں رہا کہ آپ نے ایک تصور بھی دیا تھا جس نے بے ایمانی کو بے ایمانی اور سعادت مندی کو سعادت مندی بتایا۔

یوتھی: مجھے یاد ہے۔

سقراط: مجھے بتاؤ کہ اس تصور کی ماہیت کیا ہے؟ اس طرح مجھے حوالے کے لیے ایک معیار مل جائے گا جس پر میں تمھارے یا دوسروں کے اعمال کو پرکھ سکوں گا اور یہ کہہ سکوں گا کہ فلاں فلاں عمل سعادت رکھتے ہیں اور فلاں نہیں۔

یوتھی: آپ چاہتے ہیں تو میں بتا سکتا ہوں۔

سقراط: میں چاہتا ہوں۔ تم بتاؤ۔

یوتھی: سعادت مندی وہ عمل ہے جو دیوتاؤں کو پسند ہو اور بے ایمانی سے مراد وہ کام ہے جو انھیں ناپسند ہو۔

سقراط: یوتھی فرو! بہت خوب، تم نے اب مجھے وہ جواب دیا جس کی مجھے ضرورت تھی لیکن جو کچھ تم نے بتایا ہے وہ سچ ہے یا نہیں مجھے تا حال اس کا علم نہیں ہے۔ حالانکہ مجھے ذرا برابر بھی شک نہیں کہ تمھارے الفاظ مبنی بر حقیقت ہیں۔

یوتھی: بلاشک۔

سقراط: چلو پھر تم نے جو کچھ کہا ہے اس پر غور کریں جو شے یا فرد دیوتاؤں کو پسند ہو وہ سعادت ہے اور جو شے یا فرد دیوتاؤں کو ناپسند ہو وہ برائی یا بے ایمانی ہے۔ ان دونوں میں مکمل تضاد اور تناقص کا رشتہ

ہے۔ یہی کہا تھا ناں؟

یوتھی: یہی کہا تھا۔

سقراط: ٹھیک؟

یوتھی: جی ہاں سقراط! میرا بھی یہی خیال تھا۔ میں نے یہی کہا تھا۔

سقراط: یوتھی فرو! مزید برآں تم نے یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ دیوتاؤں میں باہمی دشمنی، ناراضگی، نفرت اور اختلافات پائے جاتے ہیں۔

یوتھی: جی ہاں یہ بھی کہا گیا تھا۔

سقراط: کس قسم کے اختلافات سے دشمنی اور ناراضگی جنم لیتی ہے؟ فرض کرو تم، جو میرے عزیز دوست ہو اور ہم میں کسی عدد کے بارے میں اختلاف رونما ہوتا ہے تو کیا اس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں؟ کیا ہمیں معاملہ سلجھانے کے لیے کسی ماہرِ ریاضیات سے رجوع نہیں کرنا چاہیے۔

یوتھی: درست ہے۔

سقراط: فرض کیجیے ہمارا اختلاف کسی شے کی جسامت کے بارے میں ہے۔ کیا ہم اسے ناپ کر اختلاف کو فوراً ختم نہیں کر سکتے؟

یوتھی: ٹھیک ہے۔

سقراط: اسی طرح ہم کسی شے کے بھاری اور ہلکا ہونے کا مسئلہ اسے تول کر طے کر سکتے ہیں؟

یوتھی: یقیناً۔

سقراط: وہ کون سے اختلافات ہیں جو اس طرح طے نہیں کیے جا سکتے اور جن کی بنا پر ناراضگی جنم لیتی ہے اور افراد ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ شاید تم اس وقت اس کا جواب نہ دے سکو اس لیے میں یہ کہوں گا کہ دشمنی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اختلاف یا تو جائز ہوتے ہیں یا ناجائز، نیک ہوتے ہیں یا بد، شریفانہ ہوتے ہیں یا غیر شریفانہ۔ کیا یہی وہ نکات نہیں ہیں جن پر لوگوں میں اختلاف رونما ہوتے ہیں اور جب ہم اپنے
اختلافات کو اطمینان بخش طریقے سے طے نہیں کر پاتے تو ہم تم ہی نہیں بلکہ تمام ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں۔ ہمارے جھگڑے کی یہی وجہ ہوتی ہے نا؟

یوتھی: سقراط! آپ نے اختلافات کی جو نوعیت بیان کی ہے وہی جھگڑوں کی بنیاد ہوتی ہے۔

عالی ظرف یوتھی فرو! دیوتاؤں کے جھگڑے جب رونما ہوتے ہیں تو وہ اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

سقراط: جی ہاں، یقیناً اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

یوتھی: تم نے کہا ہے کہ ان میں نیک و بد، جائز و ناجائز، شریف اور غیر شریف کے بارے میں اختلاف رائے موجود ہے۔ ان میں جھگڑا بالکل نہ ہوتا اگر یہ اختلاف نہ ہوتا؟

سقراط: آپ نے درست فرمایا۔

یوتھی: کیا انسان کو وہ شے پسند نہیں جسے وہ عمدہ، جائز اور نیک تصور کرتا ہے اور اس کے دوسرے پہلو یعنی نقیض سے نفرت کرتا ہے۔

سقراط: بالکل ٹھیک ہے۔

یوتھی: لیکن تم نے کہا تھا کہ کچھ لوگ اسی شے کو جائز اور دوسری کو ناجائز تصور کرتے ہیں۔ اسی پر جھگڑتے ہیں اور ان میں جنگیں اور جھڑپیں ہوتی ہیں۔

یوتھی: درست ہے۔

سقراط: گویا ایک ہی شے دیوتاؤں کو پسند بھی ہے اور ناپسند بھی۔ اس سے محبت بھی کرتے ہیں اور نفرت بھی۔

یوتھی: درست ہے۔

سقراط: اس نظریہ کے مطابق، یوتھی فرو! وہی شے پاک بھی ہوگی اور ناپاک بھی۔

یوتھی: یہ بات تو ہے۔

سقراط: اس طرح میرے دوست میں حیران ہو کر کہہ رہا ہوں کہ تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا ہے۔ کیا میں نے تم سے یہ دریافت نہیں کیا تھا کہ کون سا عمل نیک اور بد یعنی دونوں قسم کا ہے لیکن اب یہ نظر آ رہا ہے کہ جسے دیوتا پسند کرتے ہیں اسی کو ناپسند بھی کرتے ہیں۔ یوتھی فرو تم نے اپنے والد کو ماخوذ کر کے غالباً وہ کام کیا ہے جو زیوس کو پسند ہوگا اور وہی کرونوس یا یورینس کو ناپسند ہوگا۔ جو ہیفسٹس کے لیے تو قابل قبول مگر ہیری کے لیے ناقابلِ قبول ہوگا۔ ہوسکتا ہے دوسرے دیوتا بھی ہوں جن کی ادا ایک دوسرے سے مختلف ہو۔

یوتھی: لیکن سقراط! میرا یقین ہے کہ تمام دیوتا قاتل کو سزا دینے کی معقولیت پر متفق ہوں گے۔ اس امر پر ان میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہوگا۔

سقراط: بہت خوب، یوتھی فرو! جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے کیا تم نے کبھی کسی سے سنا ہے کہ قاتلوں یا کسی

بھی قسم کے غلط کام کرنے والوں کو کھلی چھٹی دی جائے؟

یوتھی: میں تو یہ کہوں گا کہ اسی قسم کے مسائل پر وہ خاص طور پر عدالتوں میں بحث و مباحثہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہر طرح کے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں اور اپنے دفاع کے لیے کسی بھی قسم کا کام کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

سقراط: لیکن کیا وہ اقبالِ جرم بھی کرتے ہیں اور یوتھی فرو! کمال یہ ہے کہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انھیں سزا نہیں ملنی چاہیے۔

یوتھی: جی نہیں وہ ایسا نہیں کرتے۔

سقراط: گویا چند ایسی باتیں ہیں جنھیں وہ کہنا اور کرنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ وہ یہ بات کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتے کہ مجرموں کو سزا نہ دیجیے۔ لیکن وہ اپنے جرم سے انکار کرتے ہیں۔ انکار کرتے ہیں ناں؟

یوتھی: جی ہاں۔

سقراط: وہ یہ دلیل پیش نہیں کرتے کہ بدکاروں کو سزا نہ دیجیے لیکن وہ اس امر پر بحث کرتے ہیں کہ بدکار کون ہے، اس نے کیا کیا اور کب کیا۔

یوتھی: سچ ہے۔

سقراط: اس طرح دیوتاؤں کا بھی یہی معاملہ ہے۔ اگر بقول تمھارے وہ جائز اور ناجائز کے سوال پر جھگڑتے ہیں اور ان میں کچھ کہتے ہیں اور کچھ انکار کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ کیونکہ نہ تو دیوتا اور نہ ہی کوئی انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ ناانصافی کا مرتکب سزا کا مستوجب نہیں ہے۔

یوتھی: سقراط! یہ بات بالخصوص درست ہے۔

سقراط: لیکن وہ جس میں دیوتا اور انسان دونوں شامل ہیں خصوصی امور پر بحث مل جل کر کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اور اگر ان میں کسی عمل پر کوئی جھگڑا ہے اور جسے وہ ایک مسئلہ کہتے ہیں، ان میں سے کچھ اسے جائز قرار دیتے ہیں کچھ ناجائز۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟

یوتھی: بالکل درست ہے۔

سقراط: بہت خوب میرے عزیز دوست یوتھی فرو! میری بہتر ہدایت اور اطلاع کے لیے ذرا یہ تو بتاؤ کہ تمھارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ ایک ملازم جو قتل کا مجرم ہے، اسے مقتول کا مالک پابہ زنجیر کر دیتا ہے اور وہ مر جاتا ہے، کیونکہ اسے دیوتاؤں کی ترجمانی کرنے والے کی طرف سے اطلاع ملنے

سے قبل ہی پابہ زنجیر کر دیا جاتا ہے اور اس انسان کی طرف سے کسی بیٹے کو چاہیے کہ وہ اپنے والد پر مقدمہ چلائے اور اسے قتل کے جرم میں ماخوذ کرے۔ تم یہ کیسے بتاؤ گے کہ اس کام کی تمام دیوتا تصدیق کرتے ہیں۔ اگر تم مجھے اس سلسلے میں ثبوت دے دو کہ ان کی یہی رائے ہے تو میں تا حیات تمھاری دانائی کا مداح رہوں گا۔

یوتھی: یہ کام مشکل ہے لیکن میں اسے آپ کے لیے واضح کر دوں گا۔

سقراط: میں سمجھ رہا ہوں تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں منصفوں جیسا زود فہم نہیں ہوں۔ کیونکہ تم انھیں قائل کر لو گے کہ یہ کام دیوتاؤں کے نزدیک ناجائز اور لائق نفرین ہے۔

یوتھی: سقراط! بات صحیح ہے بشرطیکہ وہ میری بات سن لیں۔

سقراط: اگر وہ قائل ہو گئے کہ تم اچھے مقرر ہو تو وہ تمھاری بات ضرور سنیں گے۔ تمھاری بات کے دوران میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے دل میں کیا کہا ہوگا؟ اگر یوتھی فرو یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ تمام دیوتا ملازم کی موت کو ناجائز تسلیم کرتے ہیں۔ اس سعادت مندی اور بدی کے بارے میں مجھے کیا پتا لگے گا، چلیے مان لیا کہ یہ حرکت دیوتاؤں کے لیے لائق نفرین ہوگی، تاہم ان امتیازات سے سعادت مندی اور بدی کی شناخت ممکن نہیں ہوگی کیونکہ جن باتوں کو دیوتا ناپسند کرتے ہیں، بتایا جاتا ہے کہ وہ اسے پسند بھی کرتے ہیں۔ اس لیے یوتھی فرو! میں یہ نہیں کہوں گا کہ تم اسے ثابت کرو۔ اگر چاہو تو میں یہ فرض کر لوں گا کہ ایسے عمل سے تمام دیوتا نفرت کرتے ہیں اور ان کی مذمت کرتے ہیں۔ لیکن میں اس کی تعریف میں ذرا سی ترمیم کروں گا کہ دیوتا جس سے نفرت کرتے ہیں وہ بے ایمانی اور برائی ہے اور جو پسند کرتے ہیں وہ سعادت مندی یا پاکیزگی ہے اور جسے کچھ پسند کرتے ہیں اور دوسرے ناپسند کرتے ہیں وہ دونوں میں سے ایک یا ایک بھی نہیں ہے۔ پھر سعادت مندی اور بے ایمانی کی ہماری یہی تعریف ہوئی نا؟

یوتھی: سقراط! کیوں نہیں ہوئی؟

سقراط: کیوں نہیں؟ جہاں تک میرا تعلق ہے، نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے لیکن میرے اس اعتراف سے تمھیں وعدے کے مطابق مجھے ہدایت دینے میں بڑی حد تک مدد ملے گی یا نہیں اس پر غور کرنا تمھارا کام ہے۔

یوتھی: جی ہاں میں یہی کہوں گا جسے تمام دیوتا پسند کریں وہ پاک اور مقدس اور جسے ناپسند کریں وہ ناپاک

ہے۔

سقراط: یوتھی فرو! کیا ہم اس کی صداقت کو جانچیں یا صرف تمہارے اور دوسروں کے کہنے پر اسے تسلیم کر لیں۔ کیا کہتے ہو؟

یوتھی: ہمیں تحقیق کرنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ میری بات تحقیق کے بعد سچائی ثابت ہوگی۔

سقراط: میرے عزیز دوست! ابھی ذرا دیر میں ہمیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ جس نکتے کو میں سب سے پہلے سمجھنا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ کیا مقدس اور پاک سے دیوتا محبت کرتے ہیں کیونکہ وہ صرف مقدس ہے یا وہ اس لیے مقدس ہے کہ دیوتا اسے پسند کرتے ہیں۔

یوتھی: بات سمجھ میں نہیں آئی۔

سقراط: میں اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہم کہتے ہیں ہم سامان اٹھاتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ سامان اٹھایا جا رہا ہے۔ رہنمائی کرتے ہیں یا رہنمائی ہوتی ہے۔ دیکھتے ہیں یا دیکھے جاتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں ان تمام صورتوں میں فرق ہے۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ فرق کیا ہے؟

یوتھی: میرا خیال ہے میں سمجھ گیا۔

سقراط: کیا وہ شے جو محبوب ہے اس سے مختلف نہیں ہے جو محبت کرتا ہے؟

یوتھی: یقیناً۔

سقراط: بہت خوب اب ذرا یہ بتاؤ جسے اٹھا کر لے جایا جاتا ہے تو اس کا اٹھایا جانا اس لیے ہے کہ اسے اٹھایا جاتا ہے یا یہ کسی اور سبب سے؟

یوتھی: نہیں اس کا وہی سبب ہے۔

سقراط: یہی بات رہنمائی کیے جانے اور دیکھے جانے پر بھی صادق آتی ہے؟

یوتھی: سچ ہے۔

سقراط: کوئی شے اس لیے نہیں دکھائی دیتی کہ وہ قابل دید ہے بلکہ اس کے برعکس اس لیے کہ وہ قابل دید ہے دکھائی دیتی ہے۔ کسی کی رہنمائی اس لیے کی جاتی ہے کہ رہنمائی کئے جانے کی صورت میں ہے یا اٹھا کر لے جائی جاتی ہے کہ وہ اٹھا کر لے جائی جانے کی حالت میں ہے۔ نہیں بلکہ بات اس کے برعکس ہے۔ یوتھی فرو! میرا خیال ہے کہ میرا مطلب سمجھ میں آ جائے گا۔ میرا مفہوم یہ ہے کہ عملاً یا جذبے کی ہر حالت میں سابقہ عمل یا جذبہ مضمر ہوتا ہے۔ وہ اس صورت میں اس لیے نہیں آتا کہ

صورت میں آنے کی حالت میں ہے بلکہ وہ صورت میں آنے والی حالت میں اس لیے ہے کہ وہ صورت میں آنے والا ہے۔ وہ تکلیف میں اس لیے نہیں ہے کہ وہ تکلیف کی حالت میں ہے بلکہ وہ تکلیف کی حالت میں اس لیے ہے کہ وہ تکلیف میں ہے۔ کیا تمھیں اس سے اتفاق نہیں ہے؟ (ان تمام مثالوں سے مراد علت کا معلول پر تقدم ثابت کرنا ہے)

یوتھی: جی ہاں، ہے۔

سقراط: کیا وہ شے جسے پسند کیا جاتا ہے۔ صورت پذیر ہونے یا تکلیف میں مبتلا ہونے کی حالت میں نہیں ہوتی؟

یوتھی: جی ہاں۔

سقراط: سابقہ مثالوں کی طرح یہ بات یوں بھی صادق آتی ہے کہ محبت کیے جانے کی حالت کے بعد ہی محبت کرنے کا عمل وجود میں آتا ہے۔ اور عمل حالت کو وجود میں نہیں لاتا؟ (بلکہ حالت محبت سے عمل جنم لیتا ہے)

یوتھی: یقیناً۔

سقراط: یوتھی فرو! تمھاری سعادت مندی کے بارے میں کیا رائے ہے۔ اسے اپنی تعریف کی روشنی میں بتاؤ یعنی جسے تمام دیوتا پسند کریں۔

یوتھی: جی ہاں۔

سقراط: کیونکہ وہ پاک اور مقدس ہے یا کسی اور سبب سے؟

یوتھی: جی نہیں اس کا وہی سبب ہے اور بس۔

سقراط: وہ مقدس ہے اس لیے پسندیدہ ہے۔ نہ کہ پسندیدہ ہے اس لیے مقدس ہے؟

یوتھی: جی ہاں۔

سقراط: اور جو چیز دیوتاؤں کو عزیز ہے وہ اس سے محبت کرتے ہیں اور جو چیز محبت کیے جانے کی حالت میں ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ وہ (دیوتا) اس سے محبت کرتے ہیں؟

یوتھی: یقیناً۔

سقراط: یوتھی فرو! اس طرح جو دیوتاؤں کو عزیز ہے وہ مقدس نہیں ہے اور نہ ہی جو مقدس ہے وہ دیوتاؤں کو عزیز ہے تم نے یہی کہا تھا ناں، لیکن یہ دونوں مختلف باتیں ہیں۔

یوتھی: سقراط! یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟

سقراط: میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہم نے یہ تسلیم کیا ہے کہ مقدس شے دیوتا کو محبوب ہوتی ہے کیونکہ وہ مقدس ہے۔ نہ کہ یہ محبوب ہونے کی وجہ سے مقدس ہے۔ (تقدس محبت کا سبب ہے نہ کہ محبت تقدس کا)

یوتھی: جی ہاں۔

سقراط: لیکن جو دیوتاؤں کو عزیز ہے وہ اس لیے عزیز ہے کہ انھیں اس سے محبت ہے۔ محبت اس لیے نہیں ہے کہ وہ انھیں عزیز ہے۔

یوتھی: درست۔

سقراط: لیکن، میرے یوتھی فرو! جو مقدس ہے وہی ہے جو دیوتا کو عزیز ہے اور اسے اس لیے عزیز ہے کہ وہ مقدس ہے اور جو دیوتا کو عزیز ہے اس سے اس لیے محبت ہوتی کہ وہ دیوتا کو عزیز ہے لیکن جو دیوتا کو عزیز ہے وہ خود اس لیے عزیز ہے کہ وہ دیوتا کو عزیز ہے گویا جو مقدس ہے وہ اس لیے مقدس ہوا کیونکہ وہ اسے عزیز ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ کیونکہ ایک اس نوعیت کی ہے کہ اس سے محبت کی جائے دوسری اس قسم کی ہے کہ اس سے اس لیے محبت کی جاتی ہے کہ وہ محبت کیے جانے کے قابل ہے۔ اس طرح یوتھی فرو جب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تقدس کی روح کیا ہے تو یوں نظر آتا ہے جیسے تم اس کی روح نہیں بلکہ صرف ایک خوبی پیش کر رہے ہوتے ہو کہ جو دیوتاؤں کو پسند ہو۔ تم اب تقدس کی روح کی وضاحت سے انکار کر رہے ہو۔ اس لیے اگر چاہو تو میں تم سے یہ درخواست کروں گا کہ تم اپنا خزانہ چھپاؤ نہیں بلکہ مجھے ایک بار پھر یہ بتاؤ کہ تقدس اور سعادت مندی کی ماہیت کیا ہے۔ خواہ وہ دیوتاؤں کو عزیز ہو یا نہ ہو (یہ معاملہ ہمارے درمیان باعثِ نزاع ہے) اور بے ایمانی کیا ہے؟

یوتھی: سقراط! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے کہ میں اپنا مفہوم کس طرح بیان کروں۔ کیونکہ ہماری بحث خواہ ہم اسے کیسے ہی دلائل پر کیوں نہ استوار کریں اس میں دلائل کسی نہ کسی طرح منہ موڑ کر ہم سے دور ہو جاتے ہیں۔

سقراط: یوتھی فرو! یوں معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے الفاظ میرے بزرگ ڈاڈالس (Daedalus) کے فن پاروں کی طرح کے ہیں۔ اگر میں ان کا مداح یا انھیں فروغ دینے والا ہوتا تو تم یہ کہہ سکتے تھے

کہ میرے دلائل ایک جگہ قائم نہیں رہتے مجھ سے دور بھاگ جاتے ہیں کیونکہ میں ان کی اولاد ہوں۔ لیکن چونکہ یہ تصورات تمھارے ہی ہیں اس لیے تم اس کے لیے کوئی اور پھبتی تراشو کیونکہ واقعی وہ تمھارے ہیں اس لیے تمھاری ہی اجازت سے ان میں نقل مکانی کا رجحان پایا جاتا ہے۔

یوتھی: جی نہیں، سقراط! میں اب بھی یہی کہوں گا یہ آپ ہیں جو ڈاڈالس کی طرح اپنے دلائل کو ادھر اُدھر گھماتے ہیں نہ کہ میں۔ آپ ہی انھیں تبدیل کرتے یا گھماتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے وہ حرکت میں آ ہی نہیں سکتے۔

سقراط: پھر تو میں ڈاڈالس سے عظیم ہوا کیونکہ وہ تو اپنی ایجادوں کو حرکت دیتا تھا۔ میں دوسروں کی ایجادوں کو متحرک کر دیتا ہوں لیکن مزے کی بات تو یہ ہے کہ میں ایسا نہیں کرتا۔ کیونکہ میری تو کوشش ہوگی کہ ڈاڈالس کی ہنر مندی اور ٹینٹالس(Tantalus) کی دولتمندی کی مدد سے انھیں روک کر ایک جگہ قائم کر دوں لیکن بات طویل ہوگئی ہے، اسے اب ختم کرتے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ تم کاہل اور سست ہو۔ مجھے خود یہ بتانا ہوگا کہ تم مجھے سعادت مندی سکھانے کے لیے کیا کرو گے۔ مجھے امید ہے کہ تمھاری محنت اکارت نہیں جائے گی۔ چلو اب یہ بتاؤ کہ یہ ایک مشقت نہیں ہے کہ سعادت مند فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ عادل بھی ہو؟

یوتھی: جی ہاں۔

سقراط: گویا جو بھی عادل ہے وہ سعادت مند ہے یا جو سعادت مند ہے وہ عادل ہے؟ لیکن جو مکمل تو نہیں لیکن جزوی طور پر عادل ہے، کیا وہ بھی سعادت مند ہے؟

یوتھی: سقراط! آپ کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

سقراط: تاہم میں سمجھتا ہوں کہ تم مجھ سے اتنے ہی زیادہ دانا ہو جتنے عمر میں کم ہو۔ میرے محترم دوست جیسا کہ میں کہہ رہا تھا دانائی کی افراط نے تمھیں سست بنا دیا ہے۔ ذرا کوشش کرو میری بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے۔

میں اپنے مفہوم کو ایک مثال کے ذریعے مزید واضح کرنا چاہتا ہوں۔ یہ میرا کہا مفہوم نہیں ہے بلکہ شاعر (سٹیسی نس)(Stasinus) کہتا ہے:

"ان تمام اشیا کے خالق و مالک زیوس(Zeus) کے بارے میں آپ کچھ
نہیں کہہ سکتے کیونکہ جہاں خوف ہوگا وہیں احترام بھی ہوگا"۔

مجھے اس شاعر سے اتفاق نہیں ہے میں تمھیں بتاتا ہوں کہ کس وجہ سے مجھے اتفاق نہیں۔

یوتھی: جی ضرور بتایئے۔

سقراط: میں یہ نہیں کہوں گا کہ جہاں خوف ہوگا وہاں احترام بھی ہوگا کیونکہ متعدد افراد غربت اور امراض وغیرہ جیسی آفات سے خوف کھاتے ہیں لیکن میرا خیال نہیں ہے کہ وہ خوف پیدا کرنے والی ایسی باتوں کا احترام بھی کرتے ہیں۔

یوتھی: درست ہے۔

سقراط: لیکن جہاں احترام ہوتا ہے وہاں خوف ہوتا ہے۔ کیونکہ جسے کسی عمل کے ارتکاب سے احترام اور شرمندگی کا احساس ہوتا ہے وہ ڈرتا ہے اور اسے بدنامی کا خوف رہتا ہے۔

یوتھی: بیشک۔

سقراط: اس لیے ہماری یہ بات درست نہیں ہے کہ جہاں خوف ہوتا ہے وہاں احترام بھی ہوتا ہے۔ ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ جہاں احترام ہوتا ہے وہاں خوف بھی ہوتا ہے۔ لیکن جہاں خوف ہو وہاں ہمیشہ احترام نہیں ہوتا کیونکہ خوف کا تصور وسیع تر ہوتا ہے اور احترام خوف ہی کا جزو ہوتا ہے۔ جس طرح طاق عدد کا جزو ہے اور عدد کا تصور طاق کے مقابلے میں وسیع تر ہوتا ہے۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟ (منطق کی اصطلاح میں اس تعلق کو عموم وخصوص مطلق کہتے ہیں)

یوتھی: بہت اچھی طرح۔

سقراط: میں نے جب پوچھا تھا کہ عادل ہمیشہ مقدس ہوتا ہے یا مقدس ہمیشہ عادل ہوتا ہے تو اس وقت میں اسی قسم کے سوال کرنا چاہتا تھا۔ کیا جہاں سعادت نہ ہو وہاں عدل بھی نہیں ہوگا؟ کیونکہ عدل زیادہ وسیع ہے اور سعادت اس کا ایک جزو ہے۔ کیا تمھیں اس سے اختلاف ہے؟

یوتھی: جی نہیں، میرا خیال ہے آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔

سقراط: اس طرح سعادت اگر عدل کا جزو ہے تو ہمیں چاہیے کہ ہم پتا لگائیں کہ کونسا جزو ہے۔ اگر تم نے گزشتہ معاملات پر غور وفکر کیا ہے، مثلاً تم نے مجھ سے پوچھا ہوتا کہ جفت عدد کیا ہوتا ہے اور جفت عدد کا کونسا جزو ہے۔ تو مجھے تمھارے سوال کا جواب دینے میں مشکل نہ ہوتی کہ جفت ایک ایسا عدد ہے یا ایک ایسی شکل ہے جس کے دو ضلع ہوتے ہیں یہ تسلیم کرتے ہو نا؟

یوتھی: مجھے کلی اتفاق ہے۔

سقراط: اسی طرح میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے بتائیں کہ عدل کا کون سا جز وسعادت مندی یا تقدس ہے تاکہ میں میلیٹس (Meletus) کو بتاؤں کہ وہ میرے ساتھ ناانصافی نہ کرے یا مجھے بدعقیدگی کے جرم میں ماخوذ نہ کرے۔ تم نے سعادت مندی اور تقدس کے برعکس باتوں کی حقیقت کے بارے میں میری رہنمائی کی ہے، مجھے سکھایا ہے۔

یوتھی: سقراط! سعادت مندی یا تقدس میری نظر میں عدل کا وہ جز و ہے جو دیوتاؤں سے متعلق ہے کیونکہ اس کا ایک دوسرا حصہ بھی ہوتا ہے جس کا تعلق انسان سے ہوتا ہے۔

سقراط: یوتھی فرو! خوب، بہت خوب۔ تاہم ایک نکتہ اور بھی ہے جس کے بارے میں مزید وضاحت کا طالب ہوں ''توجہ کے کیا معنی ہیں؟'' کیونکہ لفظ توجہ دیوتاؤں کے لیے اس مفہوم میں نہیں استعمال کرتے جس میں عام لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ گھوڑوں پر توجہ دینا ضروری ہے اور ہر شخص ان پر توجہ نہیں دے سکتا ہے۔ سوائے اس کے جو شہسواری میں مہارت رکھتا ہو۔ کیا ایسی بات نہیں ہے؟

یوتھی: بالکل ہے۔

سقراط: میرا خیال ہے کہ فن شہسواری گھوڑے پر توجہ دینے کا فن ہوتا ہے۔

یوتھی: جی ہاں۔

سقراط: کتوں پر ہر شخص توجہ دینے کا اہل نہیں ہوتا سوائے ماہر شکاری کے؟

یوتھی: بے شک۔

سقراط: میرا یہ بھی قیاس ہے کہ شکاری کا فن کتے پر توجہ دینے ہی کا فن ہے؟

یوتھی: جی ہاں۔

سقراط: بیلوں کے چرواہے کا فن بیلوں پر توجہ دینا ہے۔

یوتھی: بہت خوب۔

سقراط: اسی طرح تقدس یا سعادت مندی دیوتاؤں پر توجہ دینے کا فن ہے۔ یوتھی فرو، تمھارا مطلب یہی ہو سکتا ہے۔

یوتھی: جی ہاں۔

سقراط: کیا توجہ ہمیشہ اس کو فائدہ پہنچانے کے لیے مرکوز نہیں کی جاتی جس پر توجہ دینا مقصود ہوتی ہے؟

مثلاً گھوڑوں پر جب شہسوار توجہ دیتا ہے تو وہ اس سے فائدہ اٹھا کر بہتری کی جانب بڑھتے ہیں،
کیا اس طرح وہ ترقی نہیں کرتے؟

یوتھی: درست ہے۔

سقراط: جیسے کتے شکاری کی توجہ کے فن سے استفادہ کرتے ہیں۔ بیلوں کے چرواہے کی توجہ کے فن سے
بیل کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں جن پر توجہ دی جاتی ہے یا جن کی دیکھ بھال کی جاتی
ہے وہ ان کے نفع کے لیے ہوتی ہے نقصان کے لئے نہیں۔

یوتھی: یقیناً ان کے نقصان کے لیے نہیں۔

سقراط: یعنی ان کے فائدے کے لیے نا؟

یوتھی: بیشک۔

سقراط: تو کیا سعادت مندی یا تقدس جس کی تعریف کی گئی ہے کہ وہ دیوتاؤں پر توجہ دینے کا فن ہے۔ کیا
انھیں فائدہ پہنچاتی ہے یا انھیں ترقی دیتی ہے؟ کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم جب کوئی مقدس عمل کرتے
ہو تو تم کسی نہ کسی دیوتا کو بہتر بناتے ہو؟

یوتھی: نہیں نہیں، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔

سقراط: یوتھی فرو! میں نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ تم نے ایسا کہا ہے۔ میں نے تم سے توجہ کی ماہیت پوچھی
تھی۔ میرا خیال ہے کہ تم نے نہیں بتائی۔

یوتھی: سقراط! آپ نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ میرا مطلب اس طرح کی توجہ نہیں تھا۔

سقراط: خوب! لیکن میں پھر بھی پوچھوں گا کہ دیوتاؤں پر توجہ کیا ہے جسے سعادت مندی کہا جاتا ہے۔

یوتھی: سقراط اس کی نوعیت ویسی ہی ہوتی ہے جیسی ملازم اپنے آقا پر دیتا ہے۔

سقراط: میں سمجھ گیا وہ ایک طرح سے دیوتاؤں کی خدمت ہوتی ہے۔

یوتھی: بالکل۔

سقراط: دوا بھی تو ایک قسم کی استعانت یا خدمت ہوتی ہے جو کسی مقصد کے حصول کے لیے ہوتی ہے۔ کیا تم
یہ نہیں کہو گے کہ صحت کے لیے؟

یوتھی: کہوں گا۔

سقراط: چلیے ایک فن ہے جو جہازوں کی مدد کرتا ہے تاکہ اس سے کچھ نتائج حاصل ہو سکیں؟

جی ہاں سقراط! جہاز تعمیر کرنے کے لیے۔

یوتھی: ایسا ہی ایک فن ہے مکانوں کی تعمیر جو معماروں کی خدمت کرتا ہے جس کا مقصد ہوتا ہے، مکان کی تعمیر۔ ہوتا ہے ناں؟

سقراط: جی ہاں۔

یوتھی: میرے پیارے دوست ذرا یہ تو بتاؤ کہ وہ فن کیا ہے جس سے دیوتاؤں کی خدمت کی جاتی ہے۔

سقراط: اس سے کون سا کام نکلتا ہے۔ آپ کو یقیناً یاد ہوگا کہ آپ کا یہ دعوئی ہے کہ آپ زندہ لوگوں میں مذہب کے بارے میں سب سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔

یوتھی: سقراط! میں سچ کہتا ہوں۔

سقراط: مجھے بتایئے نا، ہاں ضرور بتایئے کہ وہ نیک کام کون سا ہے جسے دیوتا ہماری خدمات کے ذریعے انجام دیتے ہیں؟

یوتھی: جو کام وہ کرتے ہیں وہ متعدد اور نیک ہوتے ہیں۔

سقراط میرے دوست ایسا کیوں ہے وہ عمومی نوعیت کے کام ہیں لیکن ان میں سے خاص کام کی نشاندہی آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ کیا آپ یہ نہیں کہیں گے کہ جنگ میں فتح خاص کام ہے؟

یوتھی: یقیناً۔

سقراط: اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو کاشتکار بھی متعدد عادلانہ کام انجام دیتا ہے لیکن اس کا خاص کام زمین سے غذائی اجناس پیدا کرنا ہے؟

یوتھی بالکل۔

سقراط: اور دیوتاؤں کے عادلانہ اور بہت زیادہ کاموں میں سے کون سے کام خاص ہیں؟

یوتھی: میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ سقراط ان تمام باتوں کا سیکھنا بہت ہی تھکا دینے والا کام ہے۔ میں سیدھے سادھے الفاظ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سعادت مندی یا پاکیزگی ایسے کام سیکھنے کا نام ہے جس سے دیوتا زبانی اور عملی طور پر خوش ہوں یعنی عبادت اور قربانی کے ذریعے۔ اس طرح کی سعادت مندی خاندان اور ملک کی نجات کا ذریعہ بن جاتی ہے جس طرح بدی دیوتاؤں کی ناراضگی اور تباہی و بربادی کا باعث ہوتی ہے۔

سقراط: میں سوچتا ہوں تم اگر چاہتے تو میرے اس خصوصی سوال کا جواب کم سے کم الفاظ میں دے سکتے تھے

لیکن مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ تم مجھے سکھانے کے لیے تیار نہیں۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو تم اصل نکتے پر پہنچ کر کیوں پلٹ گئے؟ اگر تم نے میرے سوال کا جواب دے دیا ہوتا تو میں اس وقت تمھارے طفیل سعادت مندی کی ماہیت سے آگاہ ہو چکا ہوتا۔ چونکہ سوال پوچھنے والے کا انحصار جواب دینے والے پر ہوتا ہے کہ وہ جس راستے پر ڈالے اسی پر چلنا ہوگا اور میں پھر وہی سوال دہراتا ہوں کہ سعادت مند کون ہے اور سعادت مندی کیا ہے؟ کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ یہ عبادت اور قربانی کا علم ہے اور بس؟

یوتھی: جی ہاں۔

سقراط: قربانی، دیوتاؤں کو پیش کرنا ہے اور عبادت، ان سے طلب کرنا ہے؟

یوتھی: سقراط! بات درست ہے۔

سقراط: اس نظریے کے مطابق سعادت مندی لین دین کا علم ہے۔

یوتھی: سقراط! تم نے مجھے بہت اچھی طرح سمجھا ہے۔

سقراط: جی ہاں میرے دوست اس کی وجہ یہ ہے کہ میں تمھارے علم کا پرستار ہوں، اس پر غور کرتا ہوں اور توجہ دیتا ہوں۔ اس لیے تم جو کچھ کہتے ہو وہ میں ضائع نہیں کروں گا۔ اب مہربانی کر کے اتنا بتا دو کہ دیوتاؤں کی خدمت کی ماہیت کیا ہے؟ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم عرض داشت پیش کرتے ہیں اور تحائف نذرانے کے طور پر پیش کرتے ہیں؟

یوتھی: جی ہاں۔

سقراط: کیا ان سے سوال کرنے کا یہ صحیح طریقہ نہیں ہے کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں اس کے لیے سوال کریں؟

یوتھی: یقیناً۔

سقراط: اور نذرانہ دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم بدلے میں ان کی توقع کے مطابق انھیں نذرانہ پیش کریں۔ وہ فن بے معنی ہوگا جو کسی کو وہ شے عطا کرے جس کی اسے خواہش نہ ہو۔

یوتھی: بالکل درست ہے۔

سقراط: یوتھی فرو! سعادت مندی ایسا فن ہے جسے دیوتا اور انسان باہمی کاروبار چلانے کے لیے کام میں لاتے ہیں؟

یوتھی: آپ چاہیں تو گفتگو کا یہ انداز ضرور استعمال کریں۔

ہیں تو صرف صداقت کا متلاشی ہوں کسی اور شے کا بالکل بھی نہیں۔ تاہم میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم

سقراط: مجھے بتاؤ کہ ہمارے نذرانوں سے دیوتاؤں کو کیا نفع حاصل ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ ہمیں عطا کرتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں ہے کیونکہ ایسی کوئی نعمت نہیں جو وہ ہمیں عطا نہ کرتے ہوں۔ لیکن ہم اس کے بدلے میں انھیں کوئی اچھی شے کس طرح نذرانے کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ یہ بات واضح نہیں ہے۔ اگر ہر شے وہی عطا کرتے ہیں اور ہم کچھ پیش نہیں کرتے تو یہ ایسا کاروبار ہوگا جس میں ہمارا فائدہ ہی فائدہ نظر آتا ہے۔

یوتھی: سقراط! کیا تم سوچ سکتے ہو کہ ہمارے نذرانوں سے دیوتاؤں کو کیا منافع حاصل ہوتا ہے؟

سقراط: یوتھی فرو! اگر ایسا نہیں ہوتا تو آخر کار اس نذرانے کا کیا مطلب ہے جسے ہم دیوتاؤں کے حضور پیش کرتے ہیں۔

یوتھی: اور کیا ہماری عقیدت اور احترام کا اظہار یہی ہے۔ ابھی میں کہہ رہا تھا کہ وہ کس سے خوش ہوتے ہیں۔

سقراط: اس طرح کی سعادت مندی دیوتاؤں کو پسند ہے۔ لیکن یہ نہ انھیں فائدہ پہنچاتی ہے اور نہ انھیں عزیز ہے۔

یوتھی: میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس سے عزیز تر دیگر کچھ اور نہیں ہے۔

سقراط: میں پھر یہ بات دہراتا ہوں کہ سعادت مندی دیوتاؤں کو عزیز ہے؟

یوتھی: یقیناً۔

سقراط: لیکن تم یہ بات کہتے ہو تو کیا تمھیں اپنے الفاظ پر حیرانی نہیں ہوتی۔ تم ایک جگہ قائم نہیں رہتے بلکہ جگہ بدل لیتے ہو؟ کیا تم مجھ پر ڈاڈالس ہونے کا الزام لگاؤ گے جس کی بنائی ہوئی مصنوعات متحرک ہیں اور جگہ بدلتی رہتی ہیں۔ انھیں یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ کوئی ایسا فنکار بھی ہے جو ڈاڈالس سے بھی کہیں بڑا ہے اور ان تصویروں کو ایک ہی دائرے میں حرکت دیتا رہتا ہے۔ وہ فن کار تم ہو کیونکہ تم خود دیکھو گے کہ تمھاری دلیل گھوم پھر کر اسی مقام پر آ جاتی ہے۔ کیا ہم نے یہ نہیں کہا تھا کہ مقدس اور پاکیزہ یکساں ہیں یعنی دونوں ہی دیوتاؤں کو عزیز ہیں؟ کیا تم بھول گئے؟

یوتھی: خوب اچھی طرح یاد ہے۔

سقراط: کیا تم یہ نہیں کہتے کہ جسے دیوتا عزیز رکھتے ہیں وہی مقدس ہے اور کیا یہ وہی نہیں ہے جو انھیں عزیز

ہے.........سمجھ رہے ہوناں۔

یوتھی: درست ہے۔

سقراط: گویا یا تو ہمارا پہلا دعویٰ غلط تھا۔ یا اگر وہ درست تھا تو ہم اب غلطی پر ہیں؟

یوتھی: دونوں میں سے ایک ضرور غلط ہوگا۔

سقراط: آیئے پھر سے شروع کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ سعادت مندی کیا ہے؟ یہ ایک ایسی تلاش ہے جس سے میں حتی المقدور نہ تو کبھی دست بردار ہوسکتا ہوں اور نہ ہی تھک سکتا ہوں۔ میری التجا ہے کہ میرا مذاق مت اڑاؤ بلکہ اس پر بہت زیادہ غور وفکر کرو اور اس کی حقیقت کیا ہے اس بارے میں مجھے بتاؤ۔ دیکھو یہ بات اگر کوئی جانتا ہے تو وہ صرف تم ہی ہو اس لیے میں تمھیں پروٹیس کی طرح اس وقت تک روکے رکھوں گا جب تک تم مجھے بتاؤ گے نہیں۔ اگر تمھیں سعادت مندی اور بدی کی ماہیت کا علم نہ ہوتا تو یقیناً تم اپنے ضعیف والد کو ملازم کے قتل میں ماخوذ نہ کرتے۔ تم دیوتاؤں کی نظروں میں اس طرح کے گناہ کے ارتکاب کا حوصلہ نہ کرتے اور تمھیں لوگوں کی رائے کا بھی بہت زیادہ لحاظ ہوتا۔ اسی لیے مجھے پورا یقین ہے کہ تمھیں سعادت مندی اور بدی کی ماہیت کا پورا پورا علم ہے۔ میرے پیارے یوتھی فرو! اپنے لب کھولو اور اپنا علم نہ چھپاؤ۔

یوتھی: سقراط! پھر کسی وقت۔ اس وقت میں جلدی میں ہوں اب جانا ہی چاہیے۔

سقراط: میرے دوست افسوس کہ تم مجھے اس طرح مایوس کر کے جا رہے ہو۔ مجھے توقع تھی کہ تم سعادت مندی اور بدی کی ماہیت کے بارے میں تعلیم دو گے اور اس طرح میں میلیٹس اور اس کے مواخذے سے اپنا دامن چھڑا لوں گا۔ میں اس سے کہتا کہ مجھے یوتھی فرو نے یہ باتیں بتائی ہیں اور میں نے ان تمام ناعاقبت اندیشانہ بدعتوں اور قیاس وظن سے رجوع کر لیا ہے جن میں اپنی لاعلمی کے سبب میں مبتلا تھا اور میں ایک بہتر زندگی کا آغاز کر رہا ہوں۔

☆☆☆

بیانِ صفائی

(Apology)

اہلِ ایتھنز مجھے علم نہیں کہ میرے مدعیوں نے آپ کو کتنا متاثر کیا لیکن میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے اتنی موثر تقریر کی کہ میں یہ بھول ہی گیا کہ میں کون ہوں۔ تاہم انھوں نے ایک لفظ بھی سچ نہیں کہا۔ ان کی بے شمار دروغ بیانیوں میں سے ایک جھوٹ ایسا تھا جس نے مجھے حیران کر دیا۔ یعنی جب انھوں نے یہ کہا کہ آپ لوگ مجھ سے ہوشیار رہیں اور میرے زورِ خطابت سے دھوکا نہ کھائیں، جیسے ہی میں نے زبان کھولی اور یہ ثابت کر دیا کہ میں ایک زوردار خطیب کے سوا سب کچھ ہو سکتا ہوں۔ اس صورت میں ان کا یہ کہنا کہ میں بہت خوش بیان ہوں، بہت ہی شرمناک جھوٹ ہے۔ سوائے اس کے کہ زورِ خطابت سے ان کی مراد صداقت کی قوت ہو۔ اگر ان کا یہی مفہوم ہے تو مجھے اعتراف ہے کہ میں ایک خوش بیان خطیب ہوں لیکن میں ان سے بہت مختلف ہوں۔ میں نے کہا کہ انھوں نے شاید ہی کوئی بات سچ کہی ہو۔ لیکن مجھ سے آپ صرف سچ ہی سنیں گے۔ میں ان کی طرح اپنی تقریر کو پر تکلف اور خوبصورت الفاظ سے آراستہ و پیراستہ نہیں کروں گا۔ قسم ہے دیوتا کی میں وہی الفاظ اور دلائل استعمال کروں گا جو وقت پر سوجھیں گے کیونکہ مجھے اپنے معاملے کی صداقت پر اعتماد ہے۔ اے ایتھنز کے باسیو! میری ایسی عمر نہیں ہے کہ میں آپ کے سامنے بچوں کی طرح زورِ خطابت کے جوہر دکھاؤں۔ کسی کو مجھ سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ آپ مجھ پر اتنا کرم ضرور کریں کہ اگر میں اپنے بیانِ صفائی میں ایسے الفاظ استعمال کر جاتا ہوں جنھیں میدان میں ساہوکاروں کی میزوں پر، یا دیگر مواقع پر عادتاً استعمال کروں تو آپ سے میری التجا ہے کہ آپ اس پر حیران نہ ہوں بلکہ مجھے روکیں ٹوکیں۔ میری عمر ستر برس سے زیادہ ہے اور پہلی بار کسی عدالت میں پیش ہو رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہاں کس طرح کی زبان استعمال ہوتی ہے۔ اس لیے آپ براہ مہربانی، اس معاملے میں مجھے غیر ملکی یا اجنبی تصور کریں۔ جسے آپ اُس وقت معاف کر دیتے ہیں جب وہ اپنی زبان اور اپنے ملک کے رواج کے مطابق بات کرتا ہے۔ کیا میری یہ درخواست ناجائز ہے؟ میرے انداز پر توجہ نہ دیں۔ ہو سکتا ہے وہ اچھا بھی ہو اور برا بھی۔ آپ صرف میرے

الفاظ کی صداقت پر توجہ دیں اور ان پر غور کریں۔ مجھے سچ کہنے اور منصف کو صحیح فیصلہ کرنے دیجیے۔

پہلے میں پرانے سوال اور اپنے مدعی کا جواب دوں گا۔ اس کے بعد دوسری باتیں ہوں گی۔ ماضی میں بھی میرے متعدد مدعی گزرے ہیں انھوں نے ان برسوں میں بارہا مجھ پر جھوٹے الزامات لگائے ہیں۔ مجھے اینی ٹس اور اس کے ہم جنسوں سے کہیں زیادہ ان سے ڈر لگتا ہے جو اپنے طریقے سے بہت زیادہ خطرناک بھی ہیں لیکن وہ آپ لوگوں سے کہیں زیادہ خطرناک تھے۔ انھوں نے آغاز اس وقت کیا جب آپ لوگ بچے تھے اور آپ لوگوں کے نرم و نازک اذہان و افکار کو اپنی جھوٹی باتوں سے متاثر کیا۔ انھوں نے کسی دانا سقراط نامی شخص کے بارے میں بتایا، کہ جس نے اوپر آسمان اور نیچے زمین کے بارے میں اپنے قیاس کے گھوڑے دوڑائے اور بدترین باتوں کو بہترین بنا کر پیش کیا۔ اس کہانی کو پھیلانے والے ہی وہ مدعی ہیں جن سے میں خوف کھاتا ہوں۔ کیونکہ ان سامعین کا خیال ہے کہ جو لوگ اس طرح کی تحقیق کرتے ہیں ان کا دیوتاؤں پر ایمان نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہے اور میرے خلاف ان کے الزام بہت قدیمی ہیں اور وہ اس وقت تراشے گئے تھے جب آپ لوگوں کی عمر بھی کچی تھی۔ آپ کا بچپن، عنفوان شباب تھا اور آپ لوگ آج کی نسبت اس وقت کہیں زیادہ متاثر ہونے والے تھے اور یہ الزامات اسی طرح قائم رہے کیونکہ کوئی ان کا جواب دینے والا نہ تھا۔ مشکل ترین امر یہ ہے کہ میں الزام لگانے والوں کو جانتا تک نہیں حتیٰ کہ ان کے نام سے بھی واقف نہیں۔ حسن اتفاق سے صرف ایک صاحب کا علم ہے جو مزاحیہ شاعر تھے۔ جن تمام لوگوں نے آپ کو حسد یا بغض کی بنیاد پر ورغلایا ہے۔ ان میں سے چند تو پہلے خود قائل ہوئے۔ اس قبیل کے تمام افراد سے نبٹنا نہایت مشکل ہے۔ میں انھیں اس عدالت میں نہیں بلا سکتا، نہ ان پر جرح کر سکتا ہوں اس لیے مجھے اپنے دفاع کے لیے سایوں سے مقابلہ کرنا ہے۔ اس صورت میں میرے لیے یہی رہ جاتا ہے کہ دلیل دوں اور کوئی جواب دینے والا نہیں ہوگا۔ اس لیے میری یہ درخواست ہے کہ آپ میرے ساتھ بھی یہ فرض کر لیں کہ میرے مدمقابل دو طرح کے لوگ ہیں، ایک حال کے اور دوسرے ماضی کے۔ یہ بات میں اس سے قبل بھی کہہ چکا ہوں اور مجھے توقع ہے کہ بعد کے سوال کا پہلے جواب دینے کی مصلحت آپ سمجھ جائیں گے۔ کیونکہ آپ یہ الزامات اوروں سے پہلے متعدد بار سن چکے ہیں۔ چلیے میں اپنا دفاع پیش کر کے مختصر مدت میں اس بہتان کو ختم کر دوں جو عرصہ دراز سے مجھ پر باندھا جا رہا ہے۔ دعا ہے کہ مجھے کامیابی نصیب ہو۔ اگر یہ کامیابی میرے اور آپ کے مفاد میں ہو یا میرے اس معاملے میں میرے نفع کی حامل ہو۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ مجھے اس کی نوعیت کا بخوبی علم ہے۔ اس کے قانون کی پابندی کے لیے معاملہ خدا پر چھوڑتے ہوئے میں اپنے دفاع کا آغاز کرتا ہوں۔ آغاز

ی میں وہ ابتدائی سوال دریافت کروں گا کہ جو اس الزام کی بنیاد ہے اور حقیقتاً اس الزام میں مجھے ماخوذ کرنے
کے لیے میلیٹس (Meleus) نے حوصلہ افزائی کی ہے۔ بتائیے کہ اتہام لگانے والے کیا کہتے ہیں۔ وہی
برے مستغیث ہیں اور میں ان کی تقریر کا ایک بیان حلفی میں خلاصہ بیان کر رہا ہوں کہ سقراط ایک بدکار اور
بجس انسان ہے۔ وہ ارضی وسماوی اشیا کی حقیقت کا متلاشی رہتا ہے اور بدترین معاملے کو بہترین بنا دیتا ہے
اور مذکورہ عقیدہ لوگوں میں پھیلاتا ہے۔ ان کے الزامات اسی قسم کے ہیں۔ یہ ویسے ہی ہیں جیسے آپ نے
ارسٹوفینس (Aristophanes) کی طربیہ میں مشاہدہ کیا ہے جس نے اپنے ڈرامے میں ایک شخص کو شامل کیا
جس کا نام سقراط ہے جو ادھر ادھر گھومتا پھرتا ہے اور کہتا ہے میں ہوا پر چل سکتا ہوں اور وہ ان امور کے بارے
میں لغو اور مہمل باتیں کرتا ہے جن کے بارے میں کم یا زیادہ جاننے کا میں نے کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ میں کسی
ایسے فرد کے بارے میں کوئی تحقیر آمیز بات نہیں کہنا چاہتا ہوں۔ وہ فلسفہ فطرت (Natural Philosophy) کا
طالب علم ہے۔ مجھے نہایت افسوس ہوگا اگر میلیٹس اس قسم کا کوئی الزام مجھ پر لگاتا ہے لیکن اے ایتھنز والو!
سیدھی سادی حقیقت یہ ہے کہ مجھے امور طبیعت یا جہان مادہ کے بارے میں قیاس آرائیوں سے کوئی لگاؤ
نہیں۔ متعدد حاضرین مجلس ہی اس بات کی صداقت کے گواہ ہیں۔ میں ان سے التجا کرتا ہوں کہ جنھوں نے
میری باتیں سنیں ہیں، آگے بڑھیں اور اپنے قریب بیٹھے ہوئے ساتھیوں کو بتائیں کہ کیا آپ نے اس معاملے
میں مجھے اجمال سے یا تفصیل سے اس قسم کی بات کرتے ہوئے کبھی سنا ہے۔ میری گزارش ہے کہ آپ ان کا
جواب ضرور سنئے کہ الزام کے اس حصے کے بارے میں وہ کیا کہتے ہیں۔ اس سے آپ کو بقیہ الزامات کی
حقیقت کا بھی علم ہو جائے گا۔

اس بات کی بھی کوئی بنیاد نہیں کہ میں استاد ہوں اور اجرت وصول کرتا ہوں۔ یہ الزام بھی دیگر
الزامات کی طرح صداقت سے عاری ہے۔ اگرچہ کوئی بھی شخص جو کسی انسان کو سکھانے کا اہل ہو اور وہ
اس کام کے لیے اجرت حاصل کرے تو میری نظر میں یہ بہت ہی باعزت عمل ہوگا مثلاً لیونٹیئم (Leontium)
کا جارجیاز، سیاس (Ceos) کا پروڈیکس (Prodicus) ہے اور ایلس (Elis) کا ہپیاس جو شہر میں گشت کرتے
ہیں اور لوگوں کو ترغیب دیتے ہیں کہ اپنے شہر کے لوگوں کو چھوڑ کر جو انھیں مفت میں سکھاتے ہیں ان
سے تعلیم حاصل کریں جو انھیں نہ صرف اجرت دیتے ہیں بلکہ اجرت قبول کرنے پر ان کے ممنون بھی
ہوتے ہیں۔

فی الوقت ایتھنز میں پیریا کا (Parian) ایک فلسفی قیام پذیر ہے جس کا ذکر میں نے بھی سنا ہے۔ اور

اس طرح سنا ہے کہ میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جس نے سوفسطائیوں پر دنیا جہان کی دولت
اس کا نام کالیئس (Callias) ولد ہپونیکس (Hipponicus) ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس کے دو بیٹے ہیں
نے پوچھا کالیئس اگر تمھارے دونوں بیٹے گھوڑے یا گائے کے بچھڑے ہوتے تو انھیں تربیت سے
سپرد کرنا کتنا آسان ہوتا۔ ہم گھوڑوں کے کسی سکھانے والے کو، جو غالباً کوئی کسان ہوتا، ملازم رکھ لیتے
ان کی خوبیوں اور صلاحیتوں کو صیقل کر کے طاق کر دے۔ لیکن چونکہ وہ آدم زاد ہیں۔ تم انھیں تربیت
کس کے سپرد کرنا چاہتے ہو۔ کیا کوئی ایسا ہے جسے انسانی اور سیاسی اچھائیوں کا علم ہو؟ آخر وہ تمھارے
ہیں تم نے اس بارے میں ضرور سوچا ہوگا۔ ہے کوئی ایسا؟ اس نے کہا ''ہے'' میں پوچھتا ہوں وہ کون ہے؟
کا تعلق کس ریاست سے ہے۔ کتنی اجرت وصول کرتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ وہ پیریا کا باشندہ ہے اور
کا نام ایوینس (Evenus) ہے۔ اس کی اجرت پانچ مینا (Minae) ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا ہے، ایوینس
خوش نصیب ہے کہ واقعی اسے یہ علم اور دانائی حاصل ہے اور اتنی مناسب اجرت پر تعلیم دیتا ہے۔ اگر اتنا علم مجھے
حاصل ہوتا تو میں سخت مغرور ہوتا لیکن سچ تو یہ ہے کہ میرے پاس اس قسم کا کوئی علم نہیں۔

ایتھنز کے باسیو! شاید آپ میں سے کوئی جواب دے۔ سقراط! یہ بتاؤ کہ ان الزامات کا آغاز کس
طرح ہوا۔ تم نے کوئی نہ کوئی تو ایسا کام ضرور کیا ہوگا جو معمول سے ہٹ کر ہوگا؟ اگر تم دوسرے آدمیوں کی طرح
ہوتے تو یہ ساری باتیں اور یہ افواہیں جنم نہ لیتیں۔ ہمیں بتاؤ کہ اس کا سبب کیا ہے۔ کیونکہ جلد بازی میں اگر کوئی
فیصلہ کیا گیا تو ہمیں افسوس ہوگا۔ میں اسے ایک منصفانہ دعویٰ کہہ سکتا ہوں؟

میں آپ کو بتاؤں گا کہ مجھے دانشمند کیوں کہا جاتا ہے اور میری اس بدنامی کا سبب کیا ہے۔ برائے
مہربانی توجہ دیجیے۔ آپ میں سے کچھ لوگ ضرور یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ نہیں، میں
آپ کو سچ سچ بتانا چاہتا ہوں۔ اہل ایتھنز! میری شہرت چند خاص نوع کی دانائی پر مبنی ہے جو مجھے حاصل
ہے۔ اگر آپ پوچھیں گے کس قسم کی دانائی تو میرا جواب ہوگا ایسی دانائی جسے انسان حاصل کر سکتا ہے۔ اس حد
تک میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں دانشمند ہوں لیکن جن لوگوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کی دانشمندی انسان کے
ادراک سے باہر ہے جسے میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ کیونکہ میں خود اس سے عاری ہوں اور جو یہ کہتا ہے
کہ وہ دانائی مجھے حاصل ہے وہ جھوٹ بولتا ہے اور میرے کردار کو داغدار کر رہا ہے۔ اہل ایتھنز! میری التجا ہے
کہ اس مرحلے پر مجھے ٹوکیں نہیں خواہ میں کچھ غیر محتاط باتیں ہی کیوں نہ کہوں کیونکہ جو الفاظ میں ادا کروں گا وہ
میرے نہیں ہوں گے۔ میں ایک ایسے گواہ کا حوالہ دوں گا جو ہمارے یقین و اعتماد کا اہل ہے۔ وہ شاید دیوتا

ہے۔ میری دانشمندی کے بارے میں وہی بتائیں گے کہ ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو کس قسم کی ہے۔ آپ چیریفون (Chaerephone) سے واقف ہوں گے وہ شروع شروع میں میرا دوست تھا اور آپ کا بھی کیونکہ اس نے حالیہ ہجرت میں لوگوں کا ساتھ دیا اور ابھی واپس آیا ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں چیریفون ہر کام میں تند و تیز تھا وہ دیوتا ڈیلفی کی خدمت میں حاضر ہوا اور استخارہ کرنے والے سے بڑی جرأت سے پوچھا، میں نے آپ سے پہلے کہا تھا کہ ٹوکیے گا نہیں۔ ہاں تو اس نے پوچھا کہ کیا کوئی شخص مجھ سے زیادہ دانشمند ہے۔ اور پائی تھیا کی (Pythian) غیب دان خاتون نے بتایا کہ مجھ سے زیادہ دانشمند کوئی دوسرا نہیں ہے۔ چیری فون تو دنیا سے اٹھ چکا ہے لیکن اس کا بھائی جو عدالت میں موجود ہے میری بات کی تصدیق کرے گا۔

میں نے اس کا ذکر کیوں کیا ہے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تہمت مجھ پر کس طرح لگی ہے۔ میں نے جب یہ جواب سنا تو دل میں کہا دیوتا کا مطلب کیا ہے اور اس پہیلی کا حل کیا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں دانشمندی میں بالکل ہی کورا ہوں۔ جبکہ اس نے کہا ہے کہ میں عقلمند ترین شخص ہوں۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ وہ تو دیوتا ہے جھوٹ تو بولنے سے رہا۔ نہیں یہ اس کی فطرت کے خلاف ہوگا کہ وہ جھوٹ بولے۔ بہت غور و خوض کے بعد میں نے اس سوال کو آزمانے کے لیے ایک طریقہ سوچا! میں غور کر کے اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر میں کسی ایسے آدمی کا پتا لگا لوں جو مجھ سے زیادہ دانشمند ہو تو میں دیوتا کے حضور جا کر ان کی بات کی تردید کروں گا کہ دیکھیے یہ آدمی مجھ سے زیادہ دانا ہے جبکہ آپ نے فرمایا تھا کہ میں سب سے زیادہ دانشمند ہوں۔ چنانچہ میں ایک ایسے آدمی کے پاس گیا جو دانشمندی میں شہرت رکھتا تھا اور میں نے اس کا مشاہدہ کیا، ضروری نہیں کہ میں اس کا نام بھی بتاؤں۔ وہ ایک سیاستدان تھا جسے میں نے آزمائش کے لیے منتخب کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب میں نے اس سے گفتگو کا آغاز کیا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ اگرچہ کچھ لوگ اسے دانشمند تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ دانشمند بالکل بھی نہیں۔ اسی بات پر وہ مجھ سے نفرت کرنے لگا۔ وہ میرا دشمن ہو گیا اور اس کے ساتھ وہ لوگ بھی جو وہاں موجود تھے اور جنھوں نے ہماری گفتگو سنی تھی۔ میں وہاں سے دل میں یہ کہتا ہوا چلا آیا کہ اگرچہ ہم دونوں میں کسی کو بھی مکمل طور پر علم نہیں کہ حُسن اور نیکی کیا ہے۔ تاہم میں اس سے قدرے بہتر ہوں۔ کیونکہ میں کچھ جانتا ہوں۔ دوسری مثال میں مجھے قدرے فائدہ حاصل ہوا۔ میں ایک دوسرے ایتھنز کے باشندے کے پاس گیا جسے اپنی دانائی کا اس سے بھی زیادہ زعم تھا۔ لیکن اس بار بھی میں بالکل اسی نتیجے پر پہنچا جس پر پہلے پہنچا تھا اور اس طرح میں نے اسے اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو اپنا دشمن بنا لیا۔

اس کے بعد میں یکے بعد دیگرے مختلف لوگوں سے ملا۔ مجھے وہ دشمنی یاد تھی جو پیدا ہوئی تھی جس پر مجھے سخت افسوس بھی تھا اور خوف بھی۔ دیوتا کے حکم پر پہلے غور کرنا ہوگا۔ میں نے دل میں کہا مجھے ایسے تمام لوگوں کے پاس جانا چاہیے جنھیں جاننے کا ادعا ہے اور غیب دان کی بات کا مفہوم معلوم کرنا چاہیے۔ اہالیانِ ایتھنز میں قسم کھا کر کہتا ہوں، شوقِ تحقیق کی قسم کھاتا ہوں کیونکہ مجھے سچ ہی کہنا ہے میری اس مہم کا نتیجہ صرف اتنا نکلا کہ دانائی میں جو جتنا مشہور تھا وہ اتنا ہی نادان ثابت ہوا۔ اور جن کی شہرت نہیں تھی وہ ان نام نہاد داناؤں سے زیادہ دانشمند اور بہتر ثابت ہوئے۔ میں آپ کو اپنی آوارہ گردی کی، جسے میں صبر آزما مشقت کہتا ہوں، داستان سناؤں گا، جسے میں نے برداشت کیا اور غیب دان کی بات پتھر پر لکیر ثابت ہوئی۔ سیاستدانوں کے بعد میں شعرا کے پاس گیا۔

جن میں حزنیہ، پرجوش گیت نگار اور طرح طرح کے نظم گو شعرا شامل تھے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا یہاں، تو پکڑا جائے گا۔ تجھے پتا چل جائے گا کہ تو ہی ان سب سے زیادہ کم علم ہے۔ چنانچہ میں نے انھی کی نظموں کے اقتباسات کے حوالے دے کر ان سے بات کی اور ان سے اس کا مفہوم دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے کچھ سکھائیں گے۔ آپ یقین کریں۔ مجھے حقیقتِ حال کا اعتراف کرتے ہوئے شرمندگی ہو رہی ہے لیکن مجھے بتانا ہی چاہیے کہ آج کے سامعین میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ان اشعار کی ان سے خود شعرا سے بہتر تشریح نہ کر سکتا ہو۔ اس وقت میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ شعرا عقل سے نہیں بلکہ ایک طرح کے ملکہ اور وجدان کی مدد سے شعر کہتے ہیں۔ ان کی حیثیت غیب دان نجومیوں کی سی ہے جو بہت سی عمدہ باتیں کہتے ہیں لیکن ان کے مفہوم سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ شاعروں کا معاملہ بھی مجھے کچھ ایسا ہی نظر آیا ہے۔ میں نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ اپنی نظم کی قوت سے وہ خود کو ان باتوں میں بھی عقلمند ترین سمجھتے تھے جن کی ان کو سمجھ ہی نہیں تھی۔ میں یہ تصور لے کر ان سے رخصت ہوا کہ میں اسی بنیاد پر ان سے دانائی میں بہتر تھا جس بنیاد پر سیاستدانوں سے تھا۔ آخر کار میں ہنرمندوں سے ملا کیونکہ مجھے احساس تھا کہ اس میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں اور مجھے یقین تھا کہ انھیں متعدد نازک باتیں معلوم ہوں گی۔ یہاں میں غلط نہیں تھا کیونکہ انھیں متعدد ایسی باتیں معلوم تھیں جس سے میں قطعاً ناآشنا تھا اور اس طرح وہ مجھ سے کہیں زیادہ دانا تھے لیکن میرے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ شعرا کی طرح یہ ہنرمند اور فنکار بھی اسی غلط فہمی کا شکار تھے جس کا سیاستدان اور شعرا شکار تھے۔ چونکہ وہ نہایت ماہر کاریگر تھے اس لیے ان کا خیال تھا کہ وہ تمام اعلیٰ باتیں جانتے ہیں۔ اور ان کی اس خامی نے ان کی دانشمندی کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس لیے میں نے خود سے غیب دان کی طرف سے پوچھا کیا

میری یہ خواہش ہے کہ میں جیسا ہوں ویسا ہی رہوں۔ نہ مجھے ان جیسا علم ہو نہ ان جیسی لاعلمی یا دونوں امور میں ان ہی جیسا رہوں۔ میں نے خود کو اور غیب دان کو یہی جواب دیا کہ میں جیسا ہوں بہتر ہوں۔

اس جستجو کے باعث میرے، بہترین اور بدترین دونوں قسم کے لوگ، دشمن پیدا ہو گئے۔ اور انھیں مجھ پر تہمت لگانے کے خوب خوب مواقع ہاتھ آئے۔ بہت سے سامعین مجھے اس لیے دانشمند سمجھتے ہیں کہ ان کے خیال میں جو دانش دوسروں میں نہیں ہے وہ مجھ میں ہے۔ اے ایتھنز کے رہنے والو! حقیقت یہ ہے کہ صرف دیوتا ہی دانا ہے اور ہمارے سوالوں کے جواب دے کر وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ عقل انسانی کی قدر و قیمت بہت ہی کم ہے یا بالکل ہی نہیں۔ اس کی مراد سقراط سے نہیں ہے بلکہ اس نے میرا نام محض مثال کے لیے استعمال کیا ہے۔ گویا اس نے یہ کہا ہے کہ انسانو سنو! وہی داناترین ہے جو سقراط کی طرح یہ جانتا ہے کہ حقیقتاً اس کے علم کی قدر و قیمت کچھ نہیں ہے۔ اسی لیے میں دیوتا کا مطیع و فرمانبردار بندہ بن کر دنیا میں پھرتا ہوں اور ہر اس فرد کو تلاش کرتا ہوں جو دانشمند نظر آتا ہے۔ خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی۔ لیکن اگر دانا نہیں ہے تو میں غیب دان کی بات کی صداقت کے ثبوت میں اسے بتاتا ہوں کہ وہ دانشمند نہیں ہے۔ میں اپنی اسی مصروفیت میں مگن رہتا ہوں میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا کہ کسی عوامی دلچسپی کے کام یا خود اپنے معاملے پر توجہ دوں۔ دیوتاؤں سے انتہائی عقیدت کے سبب میں بہت زیادہ افلاس میں مبتلا ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ امرا کی نوجوان اولاد؟ جنھیں کوئی کام کاج نہیں ہوتا۔ میرے پاس اپنی مرضی سے آتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ دانائی کے جھوٹے دعویداروں کو جانچا اور پرکھا جائے اور اکثر میری نقل میں دوسروں کو پرکھنے نکل جاتے ہیں۔ انھیں جلد ہی پتا چل جاتا ہے کہ بے شمار لوگ ایسے ہیں جو کچھ نہ کچھ جاننے کے دعویدار ہوتے ہیں۔ وہ ان کی تحقیق کرتے ہیں وہ لوگ بجائے خود پر ناراض ہونے کے مجھ پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ سقراط ژولیدہ فکر ہے۔ یہ نوجوانوں کو گمراہ کرنے والا بدقماش رہنما ہے اور کوئی ان سے پوچھ بیٹھے کہ وہ ایسا کیوں ہے؟ اور کس قسم کی برائیاں سکھاتا ہے؟ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ وہ کچھ بتا بھی نہیں سکتے لیکن اس خیال سے کہ لوگ کیا کہیں گے جب جواب نہیں سوجھتا تو وہی گھسے پٹے الزامات دہرا دیتے ہیں جو کہ عام طور پر فلسفیوں پر لگائے جاتے ہیں کہ یہ لوگ آسمان کے بادلوں اور زمین کی تہوں میں پوشیدہ باتوں کو سکھاتے ہیں۔ دیوتاؤں پر ان کا ایمان نہیں ہوتا۔ یہ بدترین امور کو بہترین بنا کر پیش کرتے ہیں لیکن الزام لگانے والے یہ اعتراف نہیں کرتے کہ ان کے علمی دعوؤں کی قلعی کھل گئی ہے جو ایک حقیقت ہے چونکہ ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو جاہ طلب ہوتے ہیں، سرگرم اور مستعد ہوتے ہیں اور

مقابلے کے لیے صف آرا ہوتے ہیں۔ چرب زبان اور خوش بیان ہوتے ہیں اس لیے وہ اپنے الزامات سے آپ کے دماغ کو بھر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میلیٹس، اینی ٹس اور لائیکون (Lycon) جنھوں نے مجھ پر الزامات لگائے ہیں وہ میرے خلاف ہوگئے ہیں۔ میلیٹس شاعروں کی طرف سے، اینی ٹس صناعوں کی طرف سے اور لائی کون پر جوش (طربیہ) گیت نگاروں کی طرف سے مجھ سے دست وگریبان ہو رہے ہیں۔ میں ابتدا میں ہی عرض کر چکا ہوں کہ الزامات کے اس ملبے سے چند لمحوں میں نبٹنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اہالیانِ ایتھنز، سچائی یہی ہے بلکہ مکمل سچائی یہی ہے۔ میں نے آپ سے کچھ نہیں چھپایا ہے، کسی بات کو سے پوشیدہ نہیں رکھا ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ میری صاف گوئی کی وجہ سے وہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ کیا ان کی یہ نفرت میری صداقت کا ثبوت نہیں ہے؟ اسی لیے میں ان کے تعصبات کا شکار ہوں۔ اصل سبب یہی ہے۔ آپ کو موجودہ یا آیندہ کسی تحقیق سے یہ معلوم ہو جائے گا۔

پہلی قسم کے الزام لگانے والوں کے خلاف میں نے اپنے دفاع میں کافی باتیں کہہ لی ہیں۔ اب میرا روئے سخن دوسری قسم کے الزام لگانے والوں کی طرف ہے۔ ان کی قیادت میلیٹس کر رہے ہیں جو نہایت عمدہ انسان ہیں، وطن سے محبت کرتے ہیں۔ یہی ان کا دعویٰ ہے۔ ایسے لوگوں کے خلاف بھی میں اپنے دفاع کی کوشش کروں گا۔ پہلے ذرا ان کے حلفیہ بیان کا مطالعہ کیجیے جس میں کہا گیا ہے کہ سقراط بدکار ہے جو نوجوانوں کو بگاڑتا ہے اور وہ ریاست کے دیوتاؤں کو نہیں مانتا۔ بلکہ اپنے دیوتا خود تراشتا ہے۔ الزامات اسی نوعیت کے ہیں۔ آیئے ان کا فرداً فرداً جائزہ لیں۔ اس کا کہنا ہے کہ میں بدکار ہوں اور نوجوانوں کو بگاڑتا ہوں۔ میں کہوں گا! اے ایتھنز والو! میلیٹس بدکار ہے وہ اس معاملے میں سنجیدہ ہونے کا ڈھونگ رچاتا ہے حالانکہ وہ یہ ساری باتیں بطور مذاق کرتا ہے۔ ایسے معاملات جن میں اسے کبھی معمولی سی بھی دلچسپی نہیں رہی ہے وہ لوگوں پر مقدمہ چلانے کے بھی ذوقِ وشوق کا اظہار کرتا ہے۔ میں اس کی سچائی ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔

میلیٹس ذرا ادھر آ! میں تم سے ایک سوال کروں گا تمھیں نوجوانوں کی اصلاح کی بہت فکر ہے۔

جی مجھے ہے۔

ذرا منصفین کو بتاؤ کہ اصلاح کرنے والا کون ہے۔ تمھیں پتا ہوگا۔ تم نے انھیں بگاڑنے والے کا پتا لگا لیا ہے اور ان کے حضور میرے خلاف بیان دے رہے ہو اور الزام لگا رہے ہو۔ آؤ منصفین کو بتاؤ کہ نوجوانوں کی اصلاح کرنے والا کون ہے۔ میلیٹس تم خود دیکھو تمھاری آواز نہیں نکل رہی ہے۔ تمھارے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ کیا تمھاری یہ حرکت موجب ذلت نہیں ہے اور میری بات کی صداقت کا بڑی حد تک ثبوت

ہے کہ تمھیں ان معاملوں سے دلچسپی نہیں ہے۔ دوست لب کھولو اور بتاؤ ان کی اصلاح کرنے والا کون ہے؟

قانون ہے۔

میرے عزیز دوست لیکن میرا یہ مفہوم ہرگز نہیں تھا۔ میں تو ایسے شخص کا نام جاننا چاہتا ہوں جو اوّل قانون سے واقف ہو۔

''سقراط! اس عدالت میں موجود منصفین۔''

میلیٹس تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ لوگ نوجوان کی ہدایت اور اصلاح کے اہل ہیں؟

''یقیناً وہ ہیں۔''

کیا تمام کے تمام یا چند، یا دوسرے۔

تمام کے تمام۔

قسم ہے دیوی ہائرے (Here)، یہ ایک خوشخبری ہے کہ ادھر اصلاح کرنے والے بہت سے لوگ موجود ہیں۔ اور سامعین کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا وہ ان کی بھی اصلاح کرتے ہیں؟

''جی ہاں کرتے ہیں۔''

اور سینیٹ کے اراکین؟

''جی ہاں سینیٹ کے اراکین بھی ان کی اصلاح کرتے ہیں۔''

غالباً اسمبلی کے اراکین انھیں بگاڑتے ہیں یا وہ بھی ان کی اصلاح کرتے ہیں؟

گویا ایتھنز کا ہر باشندہ انھیں بناتا اور ان کی اصلاح کرتا ہے۔ سب سوائے میرے اور میں اکیلا ہی ان کا بگاڑنے والا ہوں۔ کیا یہ بات تسلیم کرتے ہو؟

''اس بات کو میں پرزور طریقے سے تسلیم کرتا ہوں۔''

اگر تمھاری یہ بات سچ ہے تو مجھ سے زیادہ بدنصیب کون ہوگا۔ لیکن چلیے میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ گھوڑوں کے بارے میں کیا رائے ہے۔ کیا صرف ایک ہی فرد انھیں نقصان پہنچاتا ہے جبکہ پوری دنیا انھیں فائدہ پہنچاتی ہے؟ کیا صداقت اس کے برعکس نہیں ہے؟ ایک ہی آدمی انھیں فائدہ پہنچانے کے لائق ہے نہ کہ اکثریت۔ یوں کہہ لیجیے کہ صرف گھوڑے کو سدھانے والا ہی اسے فائدہ پہنچاتا ہے جبکہ دوسرے اسے نقصان پہنچاتے ہیں۔ کیا یہ بات درست نہیں ہے؟ میلیٹس، گھوڑوں یا دیگر جانوروں کے بارے میں یہ بات سچ ہے۔ یقیناً سچ ہے۔ خواہ تم میلیٹس ہاں کہو یا نہیں۔ ایسی صورت میں نوجوانوں کی حالت بہت ہی عمدہ ہوگی

کہ اگر انھیں بگاڑنے والا صرف ایک ہی ہو اور ساری دنیا ان کی اصلاح کر رہی ہو۔ لیکن میلیٹس تم نے تو بے صاف صاف بتا دیا ہے کہ تم نے نوجوانوں کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔ وہ تمھاری لاپروائی کا اندازہ اس امر سے ہو جاتا ہے کہ جو الزامات تم نے مجھ پر لگائے ہیں ان پر تم نے خود بھی کوئی توجہ نہیں دی۔

میلیٹس اب میں تم سے دوسرا سوال کروں گا اور قسم ہے زیوس کی میں ضرور کروں گا۔ اچھے شہریوں کے درمیان رہنا بہتر ہے یا بروں کے درمیان؟ میری یہی درخواست ہے میرے دوست جواب دو۔ یہ تو ایسا سوال ہے جس کا جواب آسانی سے دیا جا سکتا ہے کیا اچھے لوگ اپنے ہمسایوں سے اچھا سلوک نہیں کرتے۔ اور برے ان سے برائی نہیں کرتے ہیں۔

یقیناً۔

کیا کوئی ایسا بھی ہوگا جسے ان لوگوں سے فائدہ حاصل ہونے کی بجائے نقصان پہنچے جو اس کے ساتھ رہتے ہیں؟ میرے دوست جواب دو یہ قانون کا تقاضا ہے تمھیں جواب دینا ہوگا۔ کیا کوئی نقصان اٹھانا پسند کرے گا؟

"بالکل نہیں۔"

اور تم جب مجھ پر نوجوانوں کو بگاڑنے اور انھیں بدتر بنانے کا الزام تھوپتے ہو تو تمھارا یہ دعویٰ ہوتا ہے بتاؤ میں ایسا ارادتاً کرتا ہوں یا غیر ارادی طور پر؟

میں کہتا ہوں ارادتاً۔

لیکن تم نے ابھی یہ تسلیم کیا ہے کہ اچھے لوگ ہمسایوں سے اچھا سلوک کرتے ہیں اور برے سے برا سلوک۔ کیا یہ ایک صداقت ہے جسے تمھاری برتر عقل نے عمر کے اتنے ابتدائی حصے میں شناخت کر لیا ہے جبکہ میں اپنی اس طویل عمری میں بھی ایسی تاریکی اور لاعلمی میں ہوں کہ جس شخص کے ساتھ میں رہ رہا ہوں اسے بگاڑ رہا ہوں۔ وہ مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے لیکن پھر بھی میں اسے بگاڑے چلا جا رہا ہوں۔ وہ بھی جان بوجھ کر تم یہی کہہ رہے ہو نا! حالانکہ تمھاری اس بات کا نہ میں اور نہ ہی کوئی دوسرا انسان کبھی قائل ہو سکے گا۔ لیکن یا تو میں ان کو بگاڑ نہیں رہا ہوں اور بگاڑ رہا ہوں تو بلا جانے بوجھے۔ معاملہ خواہ کچھ بھی ہو تم جھوٹے ثابت ہو رہے ہو۔ اگر میرا جرم غیر ارادی ہے تو قانون غیر ارادی جرائم پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ تمھیں چاہیے تھا کہ تم علیحدگی میں بلا کر مجھے تنبیہ کرتے اور میری خبر لیتے۔ کیونکہ اگر مجھے اچھا مشورہ مل جاتا تو میں جو کام غیر ارادی طور پر کر رہا تھا ترک کر دیتا۔ بلاشک میں ایسا ہی کرتا لیکن آپ کے پاس مجھے کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے آپ نے مجھے سکھانے

سے انکار کردیا اور مجھے اس عدالت میں کھڑا کردیا جہاں ہدایت نہیں سزادی جاتی ہے۔

ایتھنز والو! یہ بات آپ پر واضح ہو چکی ہو گی جسے میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میلیٹس کو اس معاملے کی نہ زیادہ پروا ہے نہ کم۔ میلیٹس تاہم میں جاننا چاہوں گا کہ وہ کون سا معاملہ ہے جس پر مجھے نوجوانوں کو بگاڑنے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ میں نے تمھارے الزامات سے اندازہ لگایا ہے کہ تمھارا مطلب یہ ہے کہ میں انھیں سکھاتا ہوں کہ وہ ان دیوتاؤں کو تسلیم نہ کریں جنھیں ریاست تسلیم کرتی ہے۔ اس کی بجائے چند نئے دیوتاؤں یا روحانی دیلوں کو مانیں۔ آپ یہی کہتے ہیں نا کہ اسباق کے ذریعے میں نوجوانوں کو بگاڑ رہا ہوں؟

"ہاں میں یہی کہہ رہا ہوں اور زور دے کر کہہ رہا ہوں۔"

پھر تو میلیٹس! ان دیوتاؤں کی قسم، جن کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں، تم مجھے اور عدالت کو ذرا سیدھے سادے الفاظ میں بتاؤ کہ تمھارا مفہوم کیا ہے۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ کیونکہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا تم یہ مانتے ہو کہ میں دوسروں کو سکھاتا ہوں کہ وہ چند دیوتاؤں کو تسلیم کریں۔ اس طرح تو میں دیوتاؤں پر ایمان رکھتا ہوں۔ میں مکمل طور پر منکر نہیں ہوں .... اسے آپ نے میرے جرائم میں شامل نہیں کیا ہے..........

صرف تم یہی کہہ رہے ہو کہ یہ وہ دیوتا نہیں ہیں جسے ریاست تسلیم کرتی ہے۔ الزام یہ ہے کہ مختلف دیوتا ہیں یا تمھارا مطلب یہ ہے کہ میں منکر ہوں اور بس دہریت کی تعلیم دیتا ہوں۔

جی اس سے میری مراد یہی ہے کہ آپ مکمل طور پر منکر ہیں۔ تمھارا یہ بیان کتنا غیر معمولی ہے میلیٹس۔ یہ تم نے کس طرح سوچ لیا ہے۔ تمھارا مطلب یہ ہے کہ میں سورج اور چاند کے دیوتا ہونے کو نہیں مانتا جیسا کہ دوسرے مانتے ہیں؟

"منصفین! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں یہ نہیں مانتا اور کہتا ہوں کہ سورج پتھر ہے اور چاند مٹی۔"

میرے دوست میلیٹس تم نے سوچا ہے کہ اس طرح تم اینگزاغورث (Anaxagoras) پر الزام تراشی کر رہے ہو۔ منصفین کے بارے میں تمھاری رائے اچھی نہیں ہے کہ تم انھیں ناخواندہ تصور کر رہے ہو اور یہ سمجھ رہے ہو کہ انھیں یہ پتا نہیں کہ کلیزومینیا کے (Clazmenian) اینگزاغورث کے چند اصول ہیں جو اس کی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بات نوجوانوں کو سقراط بتا رہا ہے حالانکہ یہ باتیں وہ تھیٹر میں اکثر و بیشتر دیکھتے اور سنتے ہیں۔ (داخلہ فیس زیادہ سے زیادہ صرف ایک ڈریکما) وہ پیسے دیتے ہیں اور سقراط پر ہنستے ہیں جسے ایسے عجیب و غریب خیالات پیدا کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ میلیٹس تو کیا تم یہ مانتے ہو کہ میرا کسی دیوتا پر ایمان نہیں ہے؟

"دیوتازیوس (Dionysus) کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ کا کسی بھی دیوتا پر ایمان نہیں ہے۔"

میلیٹس تمھاری بات پر کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔ میں وثوق سے کہتا ہوں خود تم کو یقین نہیں ہے۔ ایتھنز والو! میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ میلیٹس ناعاقبت اندیش اور گستاخ ہے۔ اس نے اپنا دعویٰ انہی لاابالی پن اور جوانی کے دکھاوے کی ترنگ کے نشے میں تحریر کیا ہے۔ اس نے ایک پہیلی ترتیب دی ہے تاکہ مجھے آزمائش میں ڈالے۔ اس نے دل میں کہا ہوگا کہ دیکھتا ہوں دانشمند سقراط میری اس مزاحیہ پہیلی میں پوشیدہ تضاد کو دریافت کر لیتا ہے یا پھر میں اسے اور دوسروں کو فریب دینے میں کامیاب ہوتا ہوں یا نہیں۔ مجھے صاف نظر آتا ہے کہ وہ اپنے دعوے میں تضاد کا شکار ہوا ہے کیونکہ اس نے کہا ہے کہ سقراط دیوتاؤں کو تسلیم نہ کرنے کا مجرم ہے۔ پھر بھی ان پر ایمان رکھتا ہے لیکن یہ کسی سنجیدہ فرد کا کام نہیں ہے۔

اے ایتھنز کے باسیو! میں چاہتا ہوں کہ جسے میں اس کی بے اصولی کہتا ہوں آپ اس کی جانچ پڑتال میں میرا ساتھ دیں۔ دو گے ناں، میلیٹس تم بھی جواب دو۔ میں حاضرین کو اپنی وہ درخواست اس وقت یاد دلاؤں گا جب میں اپنے مخصوص انداز میں باتیں کروں گا اور وہ مضطرب نہیں ہوں گے۔

میلیٹس یہ بتاؤ کیا کبھی انسان نے انسانی اشیا کے وجود پر تو یقین کیا ہے لیکن انسانوں کے وجود پر نہیں؟ ایتھنز کے رہنے والو! میں چاہتا ہوں کہ وہ جواب دے اور وہ ہمیشہ کی طرح رکاوٹ ڈالنے کے لیے کھڑا نہ ہو۔ کیا کبھی کسی آدمی نے صرف فن شہسواری کے بارے میں سوچا اور گھوڑے کے بارے میں نہیں، یا نے نوازی کا سوچا مگر نے نواز کے بارے میں نہیں؟ میرے دوست ایسا نہیں ہوتا۔ چونکہ تم جواب دینے سے قاصر ہو اس لیے میں عدالت کو خود اس کا جواب تمھاری طرف سے پیش کروں گا کہ کسی آدمی نے ایسا نہیں کیا۔ اب آپ براہ مہربانی میرے دوسرے سوال کا جواب دیجیے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی روحانی اور ملکوتی وسیلوں کو تسلیم کرے لیکن روح یا نیم دیوتاؤں کے وجود سے انکار کرے؟

"ایسا ممکن نہیں۔"

میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ عدالت کی مدد سے مجھے ایسا جواب حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن تم اپنے دعوے میں حلفیہ کہتے ہو کہ میں ملکوتی اور روحانی وسیلوں (نئے پرانے کا سوال نہیں) کی تعلیم دیتا ہوں۔ بہرصورت میں روحانی وسیلوں کو تسلیم کرتا ہوں۔ تم نے یہی بات اپنے دعوے میں کہی ہے اور حلفیہ کہی ہے۔ پھر بھی اگر میں ملکوتی ہستیوں پر ایمان رکھتا ہوں تو میں روحانی ہستیوں یا نیم دیوتاؤں کے وجود سے کس طرح انکار کر سکتا ہوں۔ انکار کرنا ممکن نہیں؟ تمھاری خاموشی کو میں تمھاری رضامندی سمجھنے میں حق بجانب

ہوں۔ روحانی ہستیاں یا نیم دیوتا کیا ہوتے ہیں؟ کیا وہ دیوتا یا دیوتاؤں کی اولاد نہیں ہیں؟

"یقیناً وہ ہیں۔"

اسی کو میں تمھاری تیار کردہ مزاحیہ پہیلی کہتا ہوں۔ نیم دیوتا اور روحانی ہستیاں دیوتا ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ دیوتاؤں پر میرا ایمان ہے۔ تم نے پہلے یہ کہا کہ میں دیوتاؤں پر یقین نہیں رکھتا اور پھر کہتے ہو کہ میں دیوتاؤں پر ایمان رکھتا ہوں۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب نیم دیوتاؤں پر یقین ہو کیونکہ کہا جاتا ہے کہ نیم دیوتا، پریوں یا ایسی ہی کسی اور ماں سے دیوتاؤں کی ناجائز اولاد ہوتے ہیں۔ ایسا کون سا انسان ہے جو دیوتاؤں کے وجود سے انکار کرے لیکن انھیں دیوتاؤں کی اولاد تسلیم کرے۔ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ خچر کے وجود کے قائل ہوں لیکن گھوڑے اور گدھے کے وجود سے انکار کریں۔ میلیٹس مجھے آزمائش میں ڈالنے کے لیے ایسی لغویات تم ہی تیار کر سکتے ہو۔ تم نے اپنے دعوے میں یہ اس لیے درج کیا ہے کہ تمھیں ایسی کوئی ٹھوس بات میرے خلاف نہیں ملی جسے تم الزامات کی فہرست میں شامل کرتے۔ لیکن جس میں ذرہ برابر بھی عقل ہے وہ تمھاری اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کرے گا کہ لوگ ملکوتی اور مافوق البشر چیزوں کو تو مانتے ہوں اور دیوتاؤں، نیم دیوتاؤں اور سورماؤں کو نہ مانتے ہوں۔

میں میلیٹس کے دعوے کے جواب میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ مفصل دفاع غیر ضروری ہوگا۔ لیکن میں بخوبی واقف ہوں کہ میں نے کتنی دشمنیاں پال رکھی ہیں۔ اگر میں برباد ہوا تو یہی بربادی کی بنیاد ہوگی۔ نہ صرف میلیٹس اور نہ ہی اینی ٹس بلکہ دنیا والوں کا حسد اور ناقدری ہوگی جس نے پہلے بھی متعدد اچھے لوگوں کو تباہ کیا ہے اور جو آئندہ بھی نہ جانے کتنوں کی تباہی کا موجب بنے گی۔ مجھے اس کا بالکل خطرہ نہیں ہے کہ میں آخری شکار ہوں گا۔

کوئی نہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ سقراط کیا تم اپنی اس طرزِ زندگی پر شرمندہ نہیں ہو جو تمھیں ایسے انجام سے دوچار کرنے والی ہے جو بے وقت ہوگا۔ اسے میں بآسانی یہ جواب دے سکتا ہوں کہ یہ تمھاری غلطی ہے جو آدمی ناکارہ ہو اسے زندہ رہنے یا مرنے کے مواقع کا حساب کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسے صرف اتنا ہی خیال رکھنا ہے کہ جو عمل وہ کر رہا ہے وہ غلط ہے یا صحیح۔ وہ نیک آدمی کا کردار ادا کر رہا ہے یا برے کا۔ جبکہ آپ کے نظریے کی رو سے جو سورما ٹرائے (Troy) میں گر پڑے وہ اتنے اچھے نہیں تھے۔ اور تھیٹس (Thetis) کا بیٹا ان سب سے بہتر تھا، جس نے ذلت کے مقابلے میں خوف سے نفرت کی اور جب وہ ہیکٹر کو قتل کرنے کا مشتاق ہوا تو اس کی دیوی ماں نے کہا کہ اگر اس نے اپنے دوست پیٹروکلس (Patroclus) کے انتقام میں ہیکٹر (Hector)

قتل یا [illegible] خواہ جو ہے گا۔ [illegible] کی [illegible] میں [illegible]
موت میں ہے۔ یہ تعجب کی [illegible] اور موت دونوں سے خوفزدہ ہو [illegible] سے خوف [illegible]
ہے۔ [illegible] اپنی دوست کا مقام [illegible] کا خوف اس پر مسلط ہو گیا۔ [illegible]
وقت [illegible] سے مقام سے [illegible] ہوتا ہوں۔ [illegible] جہاز میں [illegible] تعجب کا [illegible]
[illegible] ہے۔ یہ [illegible] کہ موت یا خوف کا کوئی خیال تھا کیونکہ کسی بھی شخص [illegible]
ہے۔ خود [illegible] جگہ ہو یا مری جگہ ہو جہاں اس کے [illegible] اسے متعین کر دیا [illegible]
موت میں بھی وہ وہیں موجود رہتا ہے، اسے موت یا کسی بھی شے کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے [illegible]
ذلت کے [illegible] یہی سچا قول ہے۔

اے ایتھنز کے لوگو! میں وہ ہوں جو آپ کے منتخب سپہ سالاروں کے حکم سے پوٹیڈیا (Potidaea)،
ایمفی پولس (Amphipolis) اور ڈیلیم (Delium) میں دوسروں کی طرح موت کا مقابلہ کرتے ہوئے مقرر
مقام پر ڈٹا رہا اور جب کہ میرے خیال کے مطابق خدا مجھے حکم دے رہا ہے کہ میں اپنی ذات اور دوسروں کے
بارے میں تحقیقات کرتا ہوا فلسفیوں کے مقاصد کی تکمیل کروں۔ لیکن میرا کردار کتنا افسوسناک ہوگا اگر میں
موت یا کسی اور خوف سے اپنے مقررہ مقام سے فرار ہو جاؤں۔ لیکن یہ کتنی طرفہ بوالعجبی ہوگی کہ مجھے اس بنا پر
عدالت میں [illegible] کرنا جائز ہوگا کہ میں دیوتاؤں کے وجود کا منکر ہوں۔ اگر میں صرف اسی وجہ سے یہ سوچ
کر خائف ہو کے اس حکم کی حکم عدولی کروں یعنی یہ کہ میں دانشمند ہوں، حالانکہ میں نہیں ہوں۔ کیونکہ موت کا
خوف فی الحقیقت دانشمندی کا شائبہ ہے نہ کہ حقیقی دانشمندی۔ وہ صرف نامعلوم کے معلوم ہونے کا حیلہ ہے۔
موت جسے لوگ سب سے زیادہ بری چیز سمجھتے ہیں، ہو سکتا ہے وہی سب سے اچھی ہو۔ کیا یہ لاعلمی ذلت آمیز قسم
کی نہیں ہے؟ یہ انسانی لاعلمی کتنی شرمناک ہے جس کی رو سے وہ جو کچھ نہیں جانتا اسے جاننے کا دعویٰ کرتا ہے؟
میں صرف اس ضمن میں ہی ایسا ہوں کہ خود کو دوسروں سے مختلف خیال کرتا ہوں اور غالباً اپنے آپ ہی دوسروں
سے نسبتاً زیادہ عقلمند ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔

حالانکہ مجھے نیچے آباد دنیا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں یہ تصور نہیں کرتا کہ میں جانتا
ہوں لیکن مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ ناانصافی اور نافرمانی بڑی حد تک خواہ وہ کسی انسان کی ہو یا دیوتا کی، بری اور
ذلت آمیز چیز ہے اور میں ہرگز کسی ممکنہ اچھائی سے ایک یقینی برائی کے مقابلے میں نہیں ڈروں گا اور نہ ہی اس
سے دامن بچاؤں گا۔ اس لیے اگر آپ مجھے جانے کی اجازت دیں اور آپ اینی ٹس کے دلائل سے قائل نہ

ہوئے ہوں۔ جس نے یہ کہا کہ چونکہ میں مقدمے میں ماخوذ ہوں اس لیے مجھے سزائے موت دی جائے کیونکہ اس کے خیال میں اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھ پر مقدمہ چلانے کی قطعاً ضرورت نہ تھی، اور اگر میں رہا کر دیا گیا تو آپ کے بچوں کو بگاڑ دوں گا جو میری باتیں سنیں گے۔ اگر آپ مجھ سے یہ کہیں کہ سقراط اس بار اینی ٹس کی بات نہیں سنتے اور ہم تمہیں بری کر رہے ہیں لیکن شرط یہ ہو کہ تم اس طریقے سے نہ چھان بین کرو گے اور نہ ہی نکتہ آرائی اور اگر ایسا کرتے ہوئے پکڑے گئے تو تمہیں مرنا پڑے گا۔ اگر اس شرط پر مجھے بری کیا جائے گا تو میں جواب میں کہوں گا کہ ایتھنز والو میں آپ کا احترام کرتا ہوں آپ سے محبت کرتا ہوں لیکن میں آپ کا نہیں بلکہ دیوتا کا حکم مانوں گا۔ اور جب تک میری جان میں جان اور بدن میں قوت ہے میں فلسفہ (علم دوستی اور حقیقت پسندی) پر عمل کرنے اور اس کی تعلیم دینے سے باز نہیں آؤں گا۔ جس سے بھی ملوں گا اسے نصیحت کروں گا اور اپنے انداز میں اس سے باتیں کروں گا۔ میرے دوست آپ جو عظیم اور دانائی سے پر شہر ایتھنز کے ایک شہری ہیں۔ آپ کو شرم نہیں آتی کہ آپ نے بے انتہا دولت، عزت اور شہرت جمع کر رکھی ہے لیکن دانشمندی صداقت، اور روحانی ترقی و بالیدگی پر کوئی توجہ نہیں دیتے نہ اس کا احترام کرتے ہو اور نہ ہی اس کی بات سنتے ہو؟ اور اگر جس شخص سے میں مباحثہ کر رہا ہوں، کہتا ہے کہ جی ہاں میں اس پر توجہ دیتا ہوں۔ پھر تو میں نہ اسے چھوڑوں گا اور نہ ہی اسے فوری طور پر جانے دوں گا۔ میں اس سے استفسارات کروں گا۔ اس کو جانچوں گا اس پر جرح کروں گا اور اگر میں یہ محسوس کروں، اس میں کوئی خوبی نہیں ہے بلکہ وہ محض اس کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کی اس بنا پر سرزنش کروں گا کہ اس نے بڑی چیزوں کی قدر کم کی ہے اور چھوٹی چیزوں کو بڑھا دیا ہے۔ تو ہر اس شخص سے خواہ وہ جوان ہو یا بوڑھا، ملکی ہو یا غیر ملکی، خصوصاً شہریوں سے جو میرے بھائی ہیں جس سے بھی ملوں گا یہی الفاظ دہراؤں گا۔ کیونکہ یاد رکھیے یہ خدا کا حکم ہے۔

میرا یہ ایمان ہے کہ ریاست کو سب سے زیادہ فائدہ اگر مجھ سے پہنچا ہے تو وہ خدا کی اطاعت سے پہنچا ہے۔ کیونکہ میں اور کچھ نہیں کرتا بس ریاست بھر میں گھوم پھر کر آپ بوڑھوں اور جوانوں کو بلا تفریق یہی ترغیب دیتا ہوں کہ آپ اپنی ذات یا مال و متاع کی زیادہ پروا نہ کریں بلکہ پہلے اور خصوصاً اپنی روحانی ترقی کا خیال رکھیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ نیکی، سعادت مندی اور کمال روپے پیسے سے نہیں ملتے بلکہ نیکی ہی سے روپیہ پیسہ اور دنیا بھر کے انفرادی اور اجتماعی نعمتیں انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ یہی میری تعلیم ہے اور یہ اصول نوجوانوں میں بگاڑ پیدا کرتا ہے تو قرار واقعی میں شرارتی انسان ہوں۔ اور اگر کوئی کہتا ہے کہ یہ میری تعلیم نہیں ہے تو وہ دروغ گو ہے۔ اے ایتھنز کے باسیو! اسی لیے میں آپ سے کہتا ہوں کہ جو اینی ٹس کہتا ہے آپ

وہی کیجیے۔ مجھے بری کیجیے یا نہ کیجیے۔ آپ جو کچھ بھی کریں لیکن سمجھ لیں کہ میں اپنا طور طریق نہیں تبدیل کروں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے کئی بار مرنا ہی کیوں نہ پڑے۔

ایتھنز والو! مجھے نہ ٹوکو۔ میری بات سنو، ہمارے درمیان یہ سمجھوتا ہوا تھا کہ آپ میری پوری بات سنیں گے۔ ابھی مجھے کچھ اور بھی کہنا ہے۔ ہوسکتا ہے اس کے بعد آپ کا دل بھر آئے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اگر آپ نے مجھ جیسے انسان کو قتل کر دیا تو آپ مجھ سے کہیں زیادہ خود کو نقصان پہنچائیں گے۔ مجھے نہ تو میلیٹس اور نہ ہی اینی ٹس یا کوئی اور ضرر پہنچا سکتا ہے۔ کیونکہ کسی برے آدمی کے بس میں نہیں ہے کہ وہ کسی بہتر انسان کے لیے باعثِ ضرر بنے۔ مجھے انکار نہیں ہے کہ شاید اینی ٹس اسے مار ڈالے یا ملک بدر کر دے یا شہری حقوق سے بیدخل کر دے۔ وہ یہ سوچے اور دوسرے بھی سوچیں کہ وہ اس پر بہت کاری ضرب لگا رہے ہیں۔ لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ کیوں جو کچھ وہ کر رہا ہے اس کا گناہ دوسرے کو ناجائز طور پر قتل کرنے کے گناہ سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔

ایتھنز کے لوگو! آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں یہ مقدمہ صرف اپنی ذات کے لیے لڑ رہا ہوں، ایسا نہیں ہے بلکہ یہ آپ کے فائدے کے لیے بھی ہے کیونکہ آپ مجھے سزا دیں گے تو یہ عمل خدا کے خلاف عمل شمار ہوگا۔ کیونکہ میں اس کی طرف سے آپ کے لیے ایک عطیہ ہوں۔ اگر آپ مجھے مار ڈالیں گے تو میری جگہ پر کرنے والا آپ کو نصیب نہیں ہوگا۔ یہاں میں ایک مضحکہ خیز استعارہ استعمال کرنے پر مجبور ہوں۔ میں ایک ایسی گھوڑ مکھی ہوں جسے خدا نے اس ریاست کو عطا فرمایا ہے۔ ریاست ایک عظیم اور بہت ہی شریف گھوڑا ہے جو اپنی جسامت کی وجہ سے تیزی سے حرکت نہیں کر سکتا۔ اسے حرکت پر آمادہ کرنے کے لیے اکسانا ضروری ہے۔ میں ہی وہ گھوڑ مکھی ہوں جسے خدا نے ریاست کے ساتھ چسپاں کر دیا ہے۔ میں سارا دن جگہ جگہ آپ سے چپکا رہتا ہوں، آپ کو بیدار رکھتا ہوں، آپ کو قائل کرتا ہوں اور سلامت بھی۔ آپ کو مجھ جیسا کوئی دوسرا نہیں ملے گا۔ اس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ میری جان بخشی کریں۔ ممکن ہے آپ ناراض ہو جائیں (اس شخص کی طرح جسے گہری نیند سے بیدار کر دیا جائے) اور سوچیں کہ آپ مجھے جیسا کہ اینی ٹس کا خیال ہے کہ آسانی سے موت کے گھاٹ اتار دیں گے اور اپنی بقیہ زندگی آرام سے گزاریں گے۔ حتیٰ کہ دیوتا آپ پر رحم کرے اور کوئی دوسری گھوڑ مکھی بھیج دے۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ مجھے دیوتا نے آپ کے لیے مبعوث کیا ہے۔ میرے کام کا ثبوت یہ ہے کہ میں دوسروں جیسا نہیں ہوں۔ اگر ہوتا تو میں اپنے کام ذاتی امور کو اتنی طویل مدت تک یوں ترک نہ کر دیتا یا انھیں بڑے اطمینان سے نظر انداز ہوتا ہوا دیکھتا رہتا۔ آپ پر توجہ جاری رکھتا تو

والد یا بڑے بھائی کی طرح آپ کے پاس آ کر نیکی پر توجہ دینے کی تلقین کرتا۔ ایسے کردار کا حامل شخص عام انسانی فطرت سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر میری تلقین کا مجھے کوئی فائدہ ملتا یا برے دلائل کا صلہ رقم کی صورت میں ملتا تو میرے اس طریقے سے کام کرنے میں کوئی معقولیت نظر آتی۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ مجھ پر گستاخ، خود کرنے والوں نے بھی یہ الزام لگانے کی جرأت کی ہے کہ میں نے کسی سے زبردستی رقم حاصل کی ہو یا کسی نے دی ہو۔ اس کا ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ میری اس بات کی صداقت کی شاہد میری مفلسی ہے۔

ہو سکتا ہے کسی کو یہ تعجب ہو کہ آخر بات کیا ہے کہ میں نجی طور پر لوگوں کو مشورے فراہم کرتا ہوں اور ان کی پریشانیوں پر توجہ دینے میں مصروف رہتا ہوں۔ لیکن نہ عام لوگوں میں آنے اور نہ ہی ریاست کو مشورے دینے کی جرأت کرتا ہوں۔ اس کی وجہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ آپ نے مجھے مختلف مقامات پر متعدد بار مجھ پر وارد ہونے والی غیب دانی یا روحانی کیفیت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے سنا ہوگا۔ یہی وہ ملکوتی امر ہے جس کا میلیٹس نے اپنے دعوے میں مذاق اڑایا ہے۔ یہی روحانی کیفیت ہے جو غیبی آواز کی صورت میں مجھے بچپن سے سنائی دے رہی ہے۔ وہ مجھے ہمیشہ اس عمل سے روکتی ہے جسے میں کرنا چاہتا ہوں۔ کبھی اسے کرنے کا حکم نہیں دیتی۔ یہی وہ بات ہے جس نے مجھے سیاستدان ہونے سے روکے رکھا ہے۔ میرے خیال میں یہ بات درست ہے۔ اے ایتھنز کے باشندو! مجھے یقینِ واثق ہے کہ اگر میں سیاست میں آ جاتا تو کافی عرصہ قبل ہی برباد ہو چکا ہوتا اور نہ تو آپ کو کوئی فائدہ پہنچاتا اور نہ ہی اپنی ذات کو۔ میری حق گوئی پر آپ آزردہ نہ ہوں کیوں کہ سچی بات یہ ہے کہ جو کوئی بھی آپ سے یا کسی اور ہجوم سے اختلاف کرے گا اور ریاست میں وقوع پذیر ہونے والی بے شمار قانون شکنیوں اور غلط کاریوں کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کرے گا اسے اپنی زندگی بچانا دشوار ہو جائے گی۔ جو حق کے لیے جنگ کرے گا خواہ وہ مختصری مدت ہی کے لیے زندہ رہے اس کی کوئی نہ کوئی اپنی جگہ ہوگی جو نجی ہوگی، عوامی نہیں۔

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں میرے پاس اس کے معقول ثبوت موجود ہیں۔ یہ صرف الفاظ ہی نہیں ہیں بلکہ ایک عملی حقیقت ہے جس کی آپ کی نظروں میں بہت قدر و قیمت ہے۔ چلیے میں آپ کو اپنی کتاب حیات کا ایک ورق سناتا ہوں جس سے ثابت ہو جائے گا کہ میں نے موت کے خوف سے کبھی ناانصافی کے آگے سر نہیں جھکایا چونکہ میں نے "ہار" ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے مجھے فوراً ہی مر جانا چاہیے تھا۔ میں آپ کو عدالتوں کی ایک کہانی سناتا ہوں جو دلچسپ تو نہیں مگر سچ ہے۔ اے ایتھنز کے باسیو! میں اپنی تمام زندگی میں صرف ایک بار سرکاری منصب پر فائز ہوا ہوں اور وہ عہدہ سینیٹر کا تھا۔ میرا تعلق اینٹیوچس (Antiochis) قبیلے سے

ہے۔ اتفاق سے ایک مقدمے کی صدارت بھی میرے ہی قبیلے کے پاس تھی۔ وہ مقدمہ ان اعلیٰ فوجی افسران پر چلایا گیا تھا جنھوں نے آرگینوسی (Arginusae) کی جنگ میں مقتولین کی نعشیں اٹھانے میں کوتاہی برتی تھی اور آپ نے خلاف قانون طریقے سے ان پر اجتماعی طور پر مقدمہ چلانے کا مشورہ دیا تھا۔ بعد میں آپ لوگوں کو یہ احساس بھی ہوا لیکن ان انصاف کرنے والوں میں سے صرف میں اکیلا تھا جو خلاف قانون ہونے کا مخالف تھا اور میں نے اپنی رائے بھی آپ کے خلاف دی اور جب خطیبوں نے مجھ پر مقدمہ چلانے اور مجھے گرفتار کرنے کی دھمکی دی اور آپ نے مجھے برا بھلا کہا اور میرے خلاف نعرے بازی کی تو میں نے یہ طے کر لیا کہ چونکہ قانون اور انصاف میرے ساتھ ہیں اس لیے میں قید و بند یا موت کے خوف سے آپ کی ناانصافی میں شریک نہیں بنوں گا اور یہ خطرہ مول لوں گا۔ یہ واقعہ جمہوری دور کا ہے لیکن جب تیس لوگوں کی حکومت کا دور دورہ ہوا تو انھوں نے مجھے اور چار دیگر افراد کو گول ہال میں حاضر ہونے کو کہا اور حکم دیا کہ ہم سلامس (Salamis) سے وہاں کے باشندے لیون (Leon) کو جا کر لائیں جسے وہ موت کی سزا دینا چاہتے تھے۔ یہ ان احکام کا ایک نمونہ ہے جسے وہ اپنے جرائم میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شریک کرنے اور انھیں لپیٹ میں لینے کے خیال سے انجام دیتے تھے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہاں بھی میں نے زبانی نہیں بلکہ عملاً یہ ثابت کر دیا کہ میں موت کے خوف کو رائی برابر بھی وقعت نہیں دیتا ہوں۔ میری بڑی اور واحد تشویش یہی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے کوئی ناپاک اور غلط کام سرزد ہو جائے۔ اس ظالم حکومت کے طاقتور ہاتھ بھی مجھے خوف زدہ کر کے غلط کاری پر مجبور نہ کر سکے۔ جب میں گول ہال سے باہر نکلا تو چاروں افراد سلامس گئے اور لیون کو پکڑ لائے۔ لیکن میں سیدھا ہی گھر چلا گیا۔ اگر وہ سلطنت چند دنوں بعد ختم نہ ہو جاتی تو یقیناً اسی بات پر مجھے موت کی سزا مل چکی ہوتی میری اس بات کی متعدد افراد شہادت دیں گے۔

آپ کا کیا خیال ہے اگر میں سیاسی زندگی گزارتا اور اس بات کے پیش نظر کہ نیک آدمی کی طرح میں نے ہمیشہ حق کا ہی ساتھ دیا اور عدل کی بالادستی قائم رکھی۔ کیا میں اب تک زندہ رہ سکتا تھا؟ یقیناً نہیں۔ اہالیان ایتھنز حقیقتاً نہ میں اور نہ ہی کوئی دوسرا ایسا کر سکتا تھا۔ میں تو اپنی ذاتی اور سرکاری زندگی میں یکساں کردار کا حامل رہا ہوں اور میں نے ان لوگوں کی گھٹیا باتوں کے آگے کبھی سر نہیں جھکایا جنھیں بطور اتہام میرا شاگرد کہا جاتا ہے۔ میرا کوئی بھی باقاعدہ شاگرد نہیں ہے لیکن جب میں اپنے کام کی انجام دہی میں مصروف ہوتا ہوں تو جو چاہے وہ آئے اور میری باتیں سنے خواہ وہ بوڑھا ہو یا جوان کسی کو بھی وہاں سے نکالا نہیں جاتا۔ نہ ہی میں صرف ان لوگوں سے یہ باتیں کرتا ہوں جو مجھے پیسے دیتے ہیں۔ بلکہ ہر شخص چاہے وہ امیر ہو یا غریب، مجھ

سوال پوچھ سکتا ہے۔ جواب دے سکتا ہے اور میری باتیں سن سکتا ہے۔ اس کے بعد چاہے وہ برا آدمی بنے یا بھلا۔ انھیں مجھ سے منسوب نہ کیا جائے کیونکہ نہ ہی میں نے اسے کچھ سکھایا نہ ہی میں نے اسے کچھ سکھانے کا دعویٰ کیا۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اس نے مجھ سے نجی محفل میں ایسی بات سنی یا سیکھی ہے جسے دنیا بھر میں سے کسی نے نہیں سنا تو وہ پکا جھوٹا ہے۔

لیکن مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ لوگ آپ سے مسلسل گفتگو کر کے لطف اندوز کیوں ہوتے ہیں؟ اہل ایتھنز! میں آپ کے سامنے پہلے ہی یہ معاملہ پوری صداقت سے بیان کر چکا ہوں۔ وہ دانش مندی کے دعویداروں پر جرح سنتے ہیں۔ اسی میں انھیں بہت مزہ ملتا ہے۔ لوگوں سے جرح کرنے کا یہ فریضہ مجھ پر خدا نے عائد کیا ہے اور غیب دانوں نے ہر اس طریقے سے میرے لیے نشاندہی کی ہے جس طرح منشائے قدرت نے ہمیشہ سے انسانوں کو آگاہ رکھا ہے۔ ایتھنز والو! یہ سچ ہے اور اگر سچ نہیں ہے تو ابھی اس کی تردید ہو جائے گی۔ اگر میں کبھی بھی نوجوانوں کو بگاڑتا رہا ہوں یا بگاڑ رہا ہوں تو ان میں جو عاقل و بالغ ہو چکے ہیں وہ آگے بڑھ کر الزام لگانے والوں کے ساتھ کھڑے ہو کر اس کی تصدیق کریں کہ میں نے ان کو بگاڑا ہے۔ انھیں غلط صلاح دی ہے اور اس طرح مجھ سے انتقام لے لیں۔ اگر وہ نہیں آتے تو ان کے چند اعزا، والد، بھائی یا دیگر رشتہ دار آئیں اور بتائیں کہ میری وجہ سے ان کے خاندان کو کس قسم کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کے لیے یہ بہت اچھا موقع ہے ان میں متعدد کو میں اس عدالت میں دیکھ رہا ہوں۔ کریٹو (Crito) موجود ہیں جو میرے ہی علاقے کے ہیں اور میرے ہم عمر بھی۔ ادھر دیکھیے! ان کے صاحبزادے کریٹوبولس (Critobilus) ہیں۔ قریب ہی سیفی سس (Cephisus) کے اینٹی فون (Antiphon) ہیں جو ایپی جینس (Epigenes) کے والد ہیں۔ وہاں ان کے متعدد بھائی ہیں جو میرے ساتھ رہ چکے ہیں۔ اسی مجمع میں نیکاس ٹریٹس (Nicostratus) ولد تھیوسٹیڈیڈس (Theostidides)، جو تھیوڈوٹس (Theodotus)، کا بھائی ہے (تھیوڈوٹس کا انتقال ہو چکا ہے، اس لیے ان پر کوئی روک ٹوک نہیں کر سکتا) پیرالس (Paralus) ولد ڈیموڈوکس (Demodocus) جس کا ایک بھائی تھیاجس (Theages) ہے اور ایڈی منٹس (Adeimantus) ولد ارسٹون (Ariston) ہے، جس کا بھائی افلاطون (Plato) بھی موجود ہے اینٹوڈورس (Aeantodorus) بھی ہے جو اپالوڈورس کا بھائی ہے۔ اسے بھی میں دیکھ رہا ہوں۔ میں متعدد افراد کے نام لے سکتا ہوں۔ جنھیں میلیٹس نے اپنی تقریر کے دوران بطور گواہ پیش کیا ہوتا اور اگر وہ بھول گیا تھا تو اگر چاہے تو اب بھی انھیں پیش کر سکتا ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا میں اس کے لیے گنجائش نکال لوں گا۔ وہ بتائیے کہ اس کے بعد اسی طرح کی کوئی مزید شہادت موجود ہے۔

اہل ایتھنز! نہیں ایسی کوئی شہادت موجود نہیں کیونکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ یہ تمام کے تمام میرے
حق میں اور میلیٹس اور رایئی ٹس کے بقول ان کے خاندان کو نقصان پہنچانے والے کے خلاف گواہی دینے کو
تیار ہیں۔ اس میں صرف وہی نوجوان نہیں ہیں جنھیں میں نے بگاڑا ہے یا خراب کیا ہے بلکہ اس میں ان کے ان
بزرگ عزیزوں کی کوئی تحریک بھی شامل ہوگی.......... جنھیں بگاڑا نہیں گیا، وہ میرے حق میں گواہی کیوں دینے
لگے؟ واقعی انھیں گواہی تو صداقت اور عدل کے لیے دینا ہوگی۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ میں سچ بول رہا ہوں اور
میلیٹس دروغ گو ہے۔

اہل ایتھنز! مجھے اپنے دفاع میں یہی اور اسی قسم کی باتیں کہنا ہیں۔ جو میں کہہ چکا ہوں تاہم چند
مزید الفاظ باقی ہیں۔ ہوسکتا ہے ایسا بھی کوئی ہو جو مجھ سے ناراض ہو۔ اسے یاد آ رہا ہو کہ اس نے خود ایسے ہی
کسی موقع پر جو اس سے کم سنگین رہا ہو منصفین کے حضور التجائیں کیں، آنسو بہائے، عدالت میں اپنے بچے
پیش کیے جو ایک رقت انگیز منظر رہا ہوگا۔ مزید برآں عزیزوں اور دوستوں کی کثیر تعداد پیش کی لیکن میں، جسے
غالباً موت کا سامنا ہے، ایسا کچھ نہیں کروں گا۔ اپنے عمل کے برعکس یہ معاملہ دیکھ کر وہ میرے خلاف ہو جائے گا
اور غصے میں اپنی رائے دے گا کیونکہ وہ مجھ سے میری اس حرکت پر خوش نہیں ہے۔ دیکھیے! اگر آپ کے
درمیان ایسا کوئی فرد موجود ہے، تو اسے میں اطمینان بخش جواب دوں گا۔ میرے دوست میں ایک انسان
ہوں۔ دوسرے انسانوں کی طرح گوشت پوست کا بنا ہوا اور بقول ہومر لکڑی اور پتھر کا نہیں۔ میرے بیوی بچے
ہیں۔۔ جی ہاں میرے بیٹے ہیں۔ اہل ایتھنز! ان کی تعداد تین ہے۔ ایک تو تقریباً بالغ ہے دوسرے دو ابھی بچے
ہیں تاہم اپنی بریت کی التجا کے لیے میں ان میں کسی کو بھی پیش نہیں کروں گا۔ کیوں نہیں؟ خودنمائی یا آپ کے
لیے عدم احترام کے سبب نہیں۔ مجھے موت کا خوف ہے یا نہیں ہے۔ یہ دوسرا سوال ہے جس پر میں کچھ نہیں
بولوں گا لیکن عوامی رائے کے احترام میں میرے خیال میں میرا ایسا عمل نہ صرف خود میرے اور آپ کے بے
بلکہ پوری ریاست کے لیے باعثِ بدنامی ہوگا۔ جو میری عمر کو پہنچ چکا ہے اور جو اپنی دانشمندی کے لیے مشہور ہے
اسے زیب نہیں دیتا کہ وہ خود کو اس طرح ذلیل کرے۔ میری یہ رائے میرے شایانِ شان ہے یا نہیں۔
بہرصورت دنیا نے یہ طے کر لیا ہے کہ سقراط ایک حیثیت سے فائق ترین ہے۔ آپ میں سے جن لوگوں کے
بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دانشمندی اور شجاعت اور دیگر خوبیوں میں بہتر ہیں وہ خود کو کس طرح ذلیل کرتے
ہیں ان کا کردار کتنا شرمناک ہے۔ میں نے ایسے معروف اشخاص بھی دیکھے ہیں کہ جب انھیں سزائے موت
دی جاتی ہے تو عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہیں وہ یوں سوچتے ہیں کہ گویا اگر وہ مر گئے تو بہت بڑی اذیت میں

ہیں گے اور اگر انھیں زندہ رہنے کی اجازت مل جائے تو وہ لافانی ہو جائیں گے۔ میرے خیال میں
ایسے لوگ ریاست کے لیے باعث ننگ و رسوائی ہوتے ہیں اور اگر کوئی غیر ملکی آئے گا تو ایسے لوگوں کے
بارے میں یہی کہے گا کہ ایتھنز کے مشہور ترین بزرگ لوگ جنھیں اہل ایتھنز خود عزت و تکریم دیتے ہیں اور حاکم
مقرر کرتے ہیں عورتوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم میں سے ان لوگوں کو جو
مشہور ہیں، ایسے کام بالکل ہی نہیں کرنا چاہیں۔ اور اگر وہ یہ عمل کر لیتے ہیں تو آپ انھیں اس کی اجازت نہ
دیں۔ آپ یوں ظاہر کریں کہ بہ نسبت اس کے جو پرسکون رہتا ہے آپ ایسے شخص کی تنقیص پر مائل ہیں جو ایسا
قابل رحم منظر پیش کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ ریاست کو نشانہ تضحیک بنا دیتا ہے۔

رائے عامہ کے سوال سے قطع نظر منصف سے رعایت طلب کرنا بھی قدرے غلط ہوتا ہے۔ اس کا
مقصد بجائے انھیں حقیقت بتانے اور قائل کرنے کے محض اپنی بریت ہوتا ہے۔ منصف کا فرض انصاف کو تحفتاً
عطا کرنا نہیں ہے بلکہ فیصلہ دینا ہے۔ اس نے حلف اٹھایا ہے کہ وہ فیصلہ قانون کے مطابق دے گا اپنی خوشنودی
کی خاطر نہیں۔ اس ضمن میں ہمیں نہ تو حوصلہ افزائی کرنا چاہیے اور نہ ہی آپ کو اس طرح سے دروغ حلفی کو
فروغ دینے کی عادت کو اپنانا چاہیے۔ یہ کوئی خدا ترسی نہیں ہے۔ اس لیے آپ مجھے ایسا کام نہ کرنے دیں جسے
میں ذلت آمیز اور خلافِ تقویٰ اور گناہ تصور کرتا ہوں۔ خاص طور پر اس موقع پر جب میلیٹس نے مجھے بدی اور
برائی پر ماخوذ کیا ہے۔ اے اہالیانِ ایتھنز! اگر میں اپنی التجاؤں اور منت سماجت سے آپ کی حلف کو غیر موثر بنا
سکتا ہوں تو میں آپ کو یہ سکھا رہا ہوں کہ دیوتاؤں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ گویا اپنی صفائی کے دوران میں خود اپنے
آپ کو ان کے وجود سے انکار کے جرم میں ماخوذ کر لوں گا لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ میرا یہ پختہ ایمان
ہے کہ دیوتاؤں کا وجود ہے جو ان لوگوں کے یقین سے کہیں بلند و بالا ہے جنھوں نے مجھے ماخوذ کیا ہے۔ میں
یہ معاملہ آپ کے اور دیوتاؤں کے سپرد کرتا ہوں تا کہ آپ اپنے اور میرے بہترین مفاد میں فیصلہ کریں۔

ایتھنز والو! مجھے اپنی موت کی سزا پر کوئی تاسف نہیں ہے اس کی متعدد وجوہ ہیں۔ مجھے اس کی توقع
تھی۔ حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ مخالف اور موافق رائے دینے والوں کی تعداد تقریباً مساوی ہے۔ میرا
خیال تھا کہ بہت بڑی اکثریت میرے خلاف ہوگی۔ لیکن اگر ان میں سے مزید تیس افراد میرے حق میں رائے
دے دیتے تو میری بریت ہو جاتی۔ اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں میلیٹس کے داؤ میں نہیں آیا۔ میں مزید یہ
کہہ سکتا ہوں کہ اینی ٹس (Anytus) اور لائیکون (Lycon) کی مدد کے بغیر اسے جو رائے ملی ہے قانونی تقاضے
کے مطابق اس کا پانچواں حصہ بھی اسے نصیب نہ ہوتا اور اس پر ایک ہزار ڈریکما جرمانہ ہو جاتا۔

اس لیے اس نے موت کی سزا تجویز کی ہے۔ ایتھنز والو مجھے کیا تجویز پیش کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے وہی جو میرا حق ہے اور میرا حق کیا ہے۔ اس شخص کو کیا صلہ دیا جا سکتا ہے جو زندگی بھر بے کار رہا ہو اور اس نے ان چیزوں کے بارے میں سوچا تک نہیں جنھیں عام لوگ بہت اہمیت دیتے ہیں۔ دولت، گھر گرہستی، فوجی عہدے اور مجلس اور عدالتوں میں تقریر، زمین کے قطعات اور محفل طرازی۔ یہ سوچ کر کہ میں اتنا دیانتدار ہوں کہ سیاست دانوں کی طرح زندگی نہیں گزار سکتا۔ میں کسی ایسے کام میں مصروف نہیں ہوا جس سے آپ کو یا اپنی ذات کو نفع نہیں پہنچا سکتا تھا۔ میں نے وہ کام کیا جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے مفید تھا۔ میں نے کوشش کی کہ آپ میں سے ہر ایک کو اس بات پر قائل کروں کہ اسے اپنی ذات کی فکر کرنا چاہیے اور اپنے ذاتی مفادات کے حصول سے قبل اسے نیکی اور سعادت مندی، دانش مندی اور آگاہی و شعور کا کھوج لگانا چاہیے۔ اسے ریاست کے مفاد سے قبل ریاست کی فکر ہونا چاہیے۔ اس کا عمل اسی ترتیب سے آگے بڑھنا چاہیے۔ ایسے آدمی کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے؟ اے ایتھنز کے باسیو! بے شک وہ آپ کے حسن سلوک ہی کا مستحق ہے، کیونکہ یہی اس کے شایانِ شان ہے۔ وہ بیچارہ ایسے کسی انعام کا مستحق ہے جو آپ سب کا مربی اور محسن ہے، جسے فرصت صرف اس لیے چاہیے کہ وہ آپ کو کچھ نہ کچھ سکھائے؟ اے ایتھنز کے باسیو! اس کے لیے اس کے سوا اور کیا مناسب انعام ہو سکتا ہے کہ پرائی ٹینیم میں اس کی اس سے بہتر خبر گیری کی جائے جس طرح اولمپیا (Olympia) شہسواری یا دو گھوڑے یا اس سے زیادہ رتھوں کی دوڑ میں گھوڑے دوڑانے والے انعام یافتہ شہری کی، کی جاتی ہے۔ میں ضرورت مند ہوں اور وہ دولتمند ہے۔ وہ آپ کو جو مسرت بخشتا ہے وہ عارضی ہے اور میں آپ کو حقیقی خوشی بہم پہنچاتا ہوں اور اگر میں سزا کا منصفانہ جائزہ لوں تو کہنا پڑتا ہے کہ پرائی ٹینیم (Prytaneum) میں خبر گیری ہی جائز صلہ ہے۔

شاید آپ یہ سوچ رہے ہوں کہ میں آپ سے جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ ایک طرح کی التجا ہے، بالکل ویسی ہی بات ہے جو اس سے قبل میں آنسوؤں اور مناجات کے بارے میں کہہ چکا ہوں۔ لیکن بات ایسی نہیں ہے میں اس لیے ایسی بات کر رہا ہوں کہ مجھے اعتماد ہے کہ میں نے کسی کو جان بوجھ کر نقصان نہیں پہنچایا میں آپ کو قائل نہیں کر سکا کیونکہ وقت کم تھا۔ کاش کہ دوسرے شہروں کی طرح ایتھنز میں بھی ایک دن میں موت کی سزا کا فیصلہ نہ کرنے کا کوئی قانون ہوتا۔

اگر ایسا ہوتا تو شاید میں آپ کو قائل کر لیتا لیکن اس قدر مختصر وقت میں اتنے بڑے الزامات کا جواب دینا ممکن نہیں۔ مجھے اعتماد ہے کہ میں نے کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی ہے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ

پنی ذات سے بھی کوئی زیادتی نہیں کروں گا۔ میں اپنے بارے میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں برائی کا مستحق ہوں یا
اپنے لیے کوئی سزا تجویز کرتا ہوں۔ کیونکہ ایسی سزا بھی ایک برائی ہوگی۔ میں ایسی سزا بھلا کیوں تجویز کروں؟
اس لیے کہ جو کچھ میلیٹس نے تجویز کیا ہے کیا میں اس سے خوفزدہ ہوں؟ نہیں جب مجھے علم ہی نہیں کہ موت اچھی
چیز ہے یا بری تو میں اس کے مقابلے میں ایک نفیس برائی کا انتخاب کیوں کروں۔ کیا میں قید کے لیے کہوں؟
میں قید خانے میں رہ کر کیا کروں گا؟

وہاں مجھے اس سال کے ناظم جیل خانہ کا بندۂ بے دام ہو کر رہنا پڑے گا یا یہ سزا جرمانہ کی شکل میں
ہو۔ اس کے لیے بھی میرا یہی اعتراض ہوگا جیل خانے میں جھوٹ بولنا ہوگا اور میرے پاس ادائیگی کی رقم نہیں
ہے۔ اگر میں کہوں کہ مجھے شہر بدر کر دیا جائے (غالباً یہی وہ سزا ہے، جس کا آپ یقین کریں گے) تو گویا میں
زندہ رہنے کی محبت میں اندھا ہو جاؤں گا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دوسرے شہر کے لوگ مجھے برداشت کریں
گے جبکہ آپ لوگ جو میرے اپنے شہر کے ہیں میرے دلائل اور باتوں کو برداشت نہیں کر پائے اور انھیں اتنا
ضرر رساں اور قابل نفرت سمجھتے ہیں کہ اسے سننا تک گوارا نہیں کرتے۔ ایتھنز والو، یہ نہیں ہو سکتا۔ میری عمر
دیکھیے کیا میں شہر شہر مارا مارا زندگی گزار سکتا ہوں۔ بار بار شہر بدر ہوتا رہوں۔ نکالا جاتا رہوں! مجھے یقین ہے کہ
میں جہاں بھی جاؤں گا نوجوان میرے گرد جمع ہو جائیں گے۔ اگر میں انھیں بھگاؤں گا تو ان کے بزرگ ان کی
درخواست پر مجھے نکال باہر کریں گے۔ اگر میں انھیں آنے دوں گا تو ان کے دوست اور والدین اپنے مفاد میں
مجھے رہنے نہیں دیں گے۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ سقراط تمھاری بات ٹھیک ہے لیکن کیا تم اپنی زبان کو قابو میں نہیں رکھ سکتے اور کسی
دوسرے شہر چلے جاؤ۔ کوئی تمھارے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا؟ اس کا جواب آپ کو ذہن نشین
کرانے میں مجھے بڑی مشکل پیش آئے گی۔ کیونکہ اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ آپ کی اس بات کو تسلیم کرنے
کا مطلب خدا کی نافرمانی ہوگی۔ اس لیے میں اپنی زبان پر پابندی نہیں لگا سکتا۔ آپ یہ نہیں مانیں گے کہ میں
سنجیدہ ہوں۔ اگر میں اس بات کا اعادہ کروں کہ روزانہ نیکی کروں اور جو دیگر امور کے بارے میں آپ نے سنا
ہے کہ میں لوگوں سے اور خود سے چھان بین کرتا ہوں۔ وہ زیادہ لوگوں کے لیے مفید ہیں۔ جس زندگی کی
چھان بین نہیں ہو سکتی وہ اس قابل نہیں ہے کہ اسے بسر کیا جائے۔ اب بھی آپ کو میری بات کا یقین کم ہی
آئے گا۔ پھر بھی میں وہی کہتا ہوں جو سچ ہوتا ہے، جس کے بارے میں آپ کو قائل کرنا میرے لیے دشوار ہے۔
مزید برآں مجھے یہ سوچنے کی عادت ہی نہیں ہے کہ مجھے کبھی کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ اگر میرے پاس رقم

ہوتی تو میں یہ اندازہ لگالیتا کہ اس جرم کے لیے مجھے کیا رقم دینا ہوگی اور میری حالت اس سے بدتر نہ ہوتی؟
میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ جرمانہ میرے وسائل کے مطابق
ہی عائد کیا جائے۔ جی ہاں میں صرف ایک مینا ادا کر سکتا ہوں۔ اس لیے میں اتنے ہی جرمانے کی تجویز پیش
کرتا ہوں۔ میرے دوست افلاطون، کریٹو، کریٹوبولس اور اپالوڈورس نے مجھے کہا کہ میں تیس مینا ادا کرنے کی
تجویز پیش کروں جس کے لیے وہ میرے ضامن ہوں گے۔ چلیے میں جرمانے کی رقم تیس مینا تجویز کرتا ہوں،
اس رقم کے لیے ان کی ضمانت کافی ہوگی۔

اے ایتھنز والو! شہر کی تحقیر کرنے والوں کے سبب جو بدنامی آپ کو ملے گی اس میں زیادہ عرصہ نہیں
لگے گا۔ وہ کہیں گے کہ آپ لوگوں نے سقراط کو قتل کیا جو ایک دانشمند انسان تھا۔ وہ آپ کو ملامت کریں گے
اگرچہ میں دانا نہیں ہوں لیکن وہ مجھے دانا ہی کہیں گے۔ ذرا انتظار کر لیتے تو قدرت خود ہی آپ کی یہ خواہش
پوری کر دیتی کیونکہ آپ دیکھ رہے ہیں میں کتنا عمر رسیدہ ہوں اور موت کی دہلیز پر ہوں۔ میرا روئے سخن سب کی
طرف نہیں بلکہ ان لوگوں کی طرف ہے، جنھوں نے مجھے سزائے موت دی ہے۔ میں ان سے ایک اور بات کہنا
چاہتا ہوں۔ آپ کا خیال ہے مجھے اس لیے سزا ملی ہے کہ میرے پاس ایسے الفاظ نہیں تھے جن کے وسیلے سے
میں بری ہو سکتا تھا۔ یعنی اگر میں یہ مناسب سمجھتا کہ کوئی بات ان کہی اور کوئی کام نامکمل نہ چھوڑا۔ ایسا نہیں
ہے۔ جو خامی میری سزا کا باعث بنی وہ الفاظ نہیں تھے، ہرگز نہیں۔ بلکہ نہ یہ حوصلہ تھا، نہ گستاخی تھی اور نہ ہی ایسا
رجحان کہ میں آپ کو اس طرح مخاطب کرتا جس طرح آپ چاہتے تھے۔ آنسو بہانا، آہ وفغاں کرنا اور ایسی
باتیں اور حرکتیں کرنا جسے آپ دوسروں سے سننے کے عادی ہو چکے ہیں اور جو میرے نزدیک میرے شایانِ
شان نہیں ہیں۔ اس موقع پر کہ جب میری جان کو خطرہ ہے میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ کوئی ایسا کام نہیں کروں
گا جو عام یا مبتذل ہو، نہ ہی مجھے اپنے بیانِ صفائی کے انداز پر کوئی تاسف ہے۔ میں اپنے انداز میں آپ سے
خطاب کرتے ہوئے جان دے دوں گا لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ زندہ رہنے کے لیے آپ کا انداز اختیار کروں۔
مجھے کیا بلکہ کسی بھی شخص کو یہ زیب نہیں دیتا کہ جنگ میں اور عدالتِ انصاف میں موت سے بچنے کے لیے ہر
حربہ استعمال کرے۔ جنگ میں یہ ہو سکتا ہے کہ تعاقب کرنے والے کے سامنے ہتھیار پھینک کر گھٹنے کے بل
التجا کرو تو جان بخشی ہو سکتی ہے۔ دیگر پرخطر مقامات پر جان بچانے کے متعدد طریقے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ وہ
ذلیل باتیں اور عمل کرنے پر رضامند ہو۔ موت سے اپنے آپ کو بچانا مشکل نہیں ہے لیکن غلط کاریوں سے
دامن بچانا مشکل ہے۔ کیونکہ ان کی رفتار موت سے تیز تر ہوتی ہے۔ میں عمر رسیدہ ہوں، آہستہ آہستہ چلتا

ہوں۔ اس لیے سست تر دوڑنے والے بھی مجھ سے آگے نکل گئے ہیں۔ مجھ پر الزام لگانے والے بہت تیز اور چاق و چوبند ہیں۔ وہ تیز دوڑ سکتے ہیں جو باطل پسند ہیں وہ سبقت لے گئے۔ میں رخصت ہو رہا ہوں کیونکہ جنھوں نے مجھے موت کی سزا سنائی ہے۔ وہ بھی کتمانِ حق کی سزا بھگت رہے ہیں۔ بداعمالی اور گناہ کی عقوبت جھیل رہے ہیں۔ میں اپنی سزا کی پاسداری کروں گا۔ انھیں بھی اپنی سزا بھگتنا ہوگی۔ میرا خیال ہے لوگ ان باتوں کو تقدیر کا لکھا سمجھ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ درست ہیں۔

مجھے موت کی سزا دینے والو! میں اپنی مرضی کے خلاف آپ لوگوں کے لیے ایک پیش گوئی کر رہا ہوں کیونکہ میری موت قریب ہے اور موت کے وقت آدمی کو پیش گوئی کی صلاحیت ودیعت ہوتی ہے۔ میں اپنے قاتلوں کے لیے پیش گوئی کرتا ہوں کہ میرے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد اس سزا سے کہیں زیادہ سخت سزا آپ کی منتظر ہوگی جو آپ نے مجھے دی ہے۔ تم نے مجھے قتل کیا ہے کیونکہ تم اس شخص سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے جو تمھیں ماخوذ کرتا تھا اور تم اپنی زندگی کا حساب دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لیکن جیسا تم نے سوچ رکھا ہے ویسا نہیں ہوگا۔ اس سے کہیں بعید از قیاس ہوگا۔ میں بتا رہا ہوں کہ آج سے کہیں زیادہ لوگ تم پر الزامات لگائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں میں نے اب تک روک رکھا تھا۔ آپ لوگ ان سے کہیں زیادہ ناراض ہوں گے۔ اگر آپ نے یہ سوچا ہے کہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر آپ کسی کو اپنی گندی زندگی سے پردہ اٹھانے سے باز رکھ سکیں گے تو یہ آپ کی سخت غلطی ہوگی۔ فرار کا یہ راستہ نہ تو ممکن العمل ہے اور نہ ہی باعزت۔ اشرف اور آسان طریقہ دوسروں کو معذور بنانا نہیں ہے بلکہ خود اپنی اصلاح کرنا ہے۔ جن منصفوں نے مجھے موت کی سزا دی ہے ان کی تحویل میں جانے سے قبل یہی میری پیش گوئی ہے۔

دوستو! جو مجھے بری کرنا چاہتے تھے ان پر جو کچھ گزرا ہے اس پر بھی دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ عدالت کے افسر مصروف ہیں ابھی تھوڑی دیر میں مجھے اس مقام پر پہنچا دیا جائے گا جہاں مجھے موت کو گلے لگانا ہے۔ قدرے توقف کیجیے تاکہ جو تھوڑی بہت فرصت ہے اس میں آپس میں کچھ باتیں کر لیں۔ آپ لوگ میرے دوست ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آج جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے اس کے امور سے آپ کو آگاہ کروں۔ اے میرے منصفو! آپ واقعی میرے منصف ہیں۔ میں آپ کو ایک انوکھی صورت حال بتانا چاہتا ہوں۔ اب تک خداداد قوت جس کا ماخذ باطنی غیب دانی ہے مجھے معمولی سے معمولی باتوں سے بھی اگر کوئی لغزش یا غلطی ہو رہی ہو تو باز رکھے ہوئے ہے۔ اب آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ وہ چیز جسے آپ اور دیگر عوام عام طور پر بدترین چیز کہتے ہیں وہ مصیبت میرے اوپر آنے والی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت مجھ پر وہ مصیبت نازل

ہوئی ہے جو آخری بھی ہے اور بہترین بھی۔ لیکن ہاتف غیبی نے مجھے منع کرنے کا کوئی اشارہ نہیں دیا۔ نہ اُس وقت جب صبح میں گھر سے نکل رہا تھا اور نہ ہی اس وقت جب میں عدالت آ رہا تھا اور نہ ہی میری تقریر کے دوران۔ تاہم مجھے تقریر کے دوران اکثر روکا ٹوکا گیا لیکن موجودہ معاملے میں نہ تقریر میں، نہ عمل میں، غیب نے مجھے روکا۔ اس خاموشی کی میں کیا تشریح کروں؟ میں آپ کو بتاتا ہوں یہ دراصل میرے لیے ایک طرح کی اطلاع ہے کہ جو کچھ مجھ پر گزری۔ وہ بہتر ہے اور ہم میں سے جن لوگوں کا خیال ہے کہ موت بری ہوتی ہے وہ غلطی پر ہیں۔ رسمی قسم کی علامتوں نے یقیناً مجھے منع کر دیا ہوگا کہ میں بدی کی طرف جا رہا ہوں نہ کہ نیکی کی طرف۔

آیئے! اس پر ایک اور انداز سے غور کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ موت کے مفید ہونے کے بہت ہی مضبوط اسباب ہیں۔ اس کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو موت عالم نیستی یعنی مکمل عدم شعور کی حالت ہے یا جیسا کہ عام خیال ہے یہ ایک مقام کی تبدیلی ہے۔ روح اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مرنے کے بعد شعور کا دور دور تک پتا نہیں ہوتا اور یہ ایسی نیند ہوتی ہے جس میں خواب بھی دخل انداز نہیں ہوتے یعنی موت ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ کیونکہ اگر کسی شخص کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ کسی ایسی رات کا جس میں خواب نے بھی کوئی دخل اندازی نہیں کی ہو، دوسری راتوں کی نیند سے مقابلہ کرے اور اس سے پوچھا جائے کہ اس نے اپنی زندگی میں کتنی عمدہ اور پرسکون راتیں بسر کی ہیں۔ کسی کو بھی بشمول بادشاہوں کے، کم ہی ایسی راتیں اور دن نصیب ہوئے ہوں گے لیکن موت اس طرح کی ہوتی ہے تو میں کہوں گا یہ بہت ہی عمدہ ہے لیکن اگر موت انتقالِ مکانی ہے اور جیسا کے لوگ کہتے ہیں تمام لوگ وہاں جمع ہوں گے تو اے میرے دوستو، اور منصفین اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے؟ جب نیا مسافر تحت الثریٰ میں پہنچتا ہے۔ تو اس دنیا کے ماہرینِ انصاف سے اس کی جان چھوٹ جاتی ہے اور اس کا سابقہ اصل منصفوں سے پڑتا ہے جو وہاں معاملات کا تصفیہ کرتے ہیں۔ وہاں مینوس (Minos)، رادامینتھس (Rhadamanthus)، آئیکس (Aeacus)، ٹرپٹولیمس (Triptolemus) اور دیوتاؤں کی دیگر اولادیں جنھوں نے اپنی تمام زندگی نیکی میں گزاری وہاں موجود ہوں گے، اس لیے اس سفر کی زحمت قابلِ برداشت ہونی چاہیے۔ اگر کسی کو اورفیس (Orpheus)، موسائیس (Musaeus)، ہیزیوڈ (Hesiod) اور ہومر (Homer) سے گفتگو کا موقع مل جائے تو اس کے لیے وہ کیا کچھ نہیں دے سکتا؟ جی ہاں اگر یہ درست ہے تو میں بار بار مرنے کو تیار ہوں۔ میرے لیے دلچسپ بات یہ ہوگی کہ وہاں مجھے پالامیڈس (Palamedes)، اجیکس (Ajax) ولد ٹیلامون (Telamon) اور دیگر متعدد ایسے افراد سے ملاقات اور گفتگو کا موقع حاصل ہوگا جنھیں ناجائز طور پر موت کی سزا دی گئی تھی اور میں

وہاں اپنے مصائب کا ان کے مصائب سے موازنہ کر کے اطمینانِ قلب حاصل کروں گا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تلاشِ حق اور حق و باطل کی تمیز حاصل کرنے کا میرا کام اس دنیا میں بھی جاری رہے گا۔

اور مجھے یہ پتا بھی چل جائے گا کہ دانا کون ہے اور کس نے دانائی کا نقاب اوڑھ رکھا ہے۔ اے منصفو، میرے خیال میں معرکہ ٹروجن کے قائد اوڈیسس (Odysseus) یا سیسی فس (Sisyphus) یا بے شمار دیگر مرد اور خواتین کے احتساب کے موقع کے حصول کے لیے کوئی بھی قیمت زیادہ نہیں ہوگی۔ ان سے گفتگو کرنے اور استفسارات کرنے میں کتنا لطف آئے گا۔ دوسرے جہاں میں کسی کو سوال پوچھنے پر موت کی سزا نہیں ملے گی۔ ہاں ہرگز، ایسا نہیں ہوگا۔ اگر اس دنیا کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے درست ہے تو وہاں ہم زیادہ خوش رہیں گے۔ سارے ہی لافانی ہوں گے۔

اس لیے اے انصاف کرنے والو، موت کو خوشیوں کا گہوارہ سمجھو اور یقین رکھو کہ نہ اس دنیا میں نہ دوسری دنیا میں نیکوکاروں کو کبھی کوئی ضرر پہنچے گا۔ دیوتا نہ تو اس کو اور نہ اس کے اعمال کو نظرانداز کریں گے۔ میری زندگی کا اختتام کوئی حادثہ نہیں ہے۔ مجھے صاف صاف نظر آ رہا ہے کہ وقت آ گیا ہے جب مجھے اس دنیا سے کوچ کر جانا اور دنیاوی مصائب سے نجات پانا ہی بہتر ہوگا حالانکہ غیب دان نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا ہے۔ اس وجہ سے بھی میں الزام لگانے والوں سے ناراض نہیں ہوں۔ انھوں نے مجھے کوئی ضرر نہیں پہنچایا۔ اگرچہ وہ مجھے کوئی فائدہ بھی پہنچانا نہیں چاہتے تھے جس کے لیے انھیں تھوڑا بہت ذمہ دار قرار دیتا ہوں۔

تاہم ان سے ایک رعایت مانگوں گا۔ جب میرے بیٹے جوان ہو جائیں گے تو اے میرے دوستو میں چاہتا ہوں کہ آپ انھیں بھی سزا دیں۔ آپ انھیں اسی طرح تنگ کریں جس طرح میں نے آپ کو کیا ہے۔ ان کے ساتھ یہ سلوک اس صورت میں کریں جب وہ نیکی، حق جوئی اور حق پرستی سے زیادہ دولت یا دوسری باتوں کو اہمیت دینے لگیں یا جب وہ جن باتوں سے محروم ہیں اس کا دعویٰ کریں تو آپ ان کی اسی طرح ملامت کریں جس طرح میں آپ کو ملامت کرتا تھا کہ آپ ان باتوں کا لحاظ نہیں کرتے تھے جن کا کرنا چاہیے تھا جب وہ ان خصوصیات پر جو ان میں نہیں ہیں ناز کریں تو آپ ان کے ساتھ یہی سلوک کرنا۔

اگر آپ اس پر عمل کریں گے تو مجھے اور میرے بیٹوں کو سمجھ لیجیے انصاف مل جائے گا۔

کوچ کا وقت آ پہنچا ہے ہم اپنی اپنی راہ لے رہے ہیں میں موت کی اور آپ زندگی کی۔ کون سی راہ بہتر ہے اس کا علم دیوتاؤں ہی کو ہے۔

☆☆☆

کریٹو

(Crito)

شرکائے گفتگو: سقراط اور کریٹو

منظر: سقراط کا قید خانہ

سقراط: کریٹو تم اس وقت یہاں کیسے آ گئے۔ کیا تم بہت پہلے نہیں آ گئے؟

کریٹو: جی ہاں، ایسا ہی ہے۔

سقراط: وقت کیا ہوا ہے۔

کریٹو: صبح کاذب کا وقت ہے۔

سقراط: قید خانے کے ناظم نے تمھیں اندر آنے کی اجازت کیسے دی؟

کریٹو: وہ مجھ سے واقف ہے۔ میں اکثر یہاں آتا رہتا ہوں۔ مزید برآں میں نے اس کی خدمت بھی کی ہے۔

سقراط: تم ابھی ابھی پہنچے ہو۔

کریٹو: جی نہیں، تھوڑی دیر پہلے آیا تھا۔

سقراط: پھر تم بیٹھے کیوں رہے مجھے جگایا کیوں نہیں۔

کریٹو: سقراط! مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ اس طرح کے اضطراب و پریشانی کے موقع پر ایسا کروں۔ مجھے یہ بالکل ہی پسند نہیں تھا لیکن میں بیٹھا آپ کی پرسکون نیند کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ اسی لیے آپ کو جگانا مناسب نہ جانا۔ میں آپ کی کلفت میں کمی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ہمیشہ یہی سمجھا تھا کہ آپ خوش مزاج ہیں۔ لیکن میں نے کبھی کسی کو ایسے حالات میں، جس طرح کہ حالات سے آپ گزر رہے ہیں، اتنے اطمینان اور سکون سے اس کڑے وقت کا سامنا کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

سقراط: دیکھو نا کریٹو! جب لوگ میری عمر تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر انھیں چاہیے کہ وہ موت کے وقت

مضطرب نہ ہوں۔

کریٹو: لیکن جب دوسرے معمر حضرات ایسی ہی مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو درازی عمر کے باوجود ان کی مصیبت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

سقراط: بات صحیح ہے لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم اتنے بے وقت کیوں آئے ہو۔

کریٹو: میں آپ کے لیے ایک پیغام لایا ہوں جو غمناک بھی ہے اور دردناک بھی۔ مجھے یقین ہے آپ کے لیے وہ ایسا نہیں ہوگا لیکن ہم سب کے لیے ہے جو آپ کے دوست ہیں۔ میرے لیے تو بہت ہی المناک ہے۔

سقراط: کیا ڈیلوس (Delos) سے آنے والا جہاز پہنچ گیا ہے۔ جس کی آمد پر مجھے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

کریٹو: جی نہیں، جہاز نہیں پہنچا لیکن اس کی آمد آج ہی متوقع ہے کیونکہ سونیئم (Sunium) سے آنے والے لوگوں نے مجھے بتایا ہے وہ جہاز کو وہاں چھوڑ کر آئے ہیں۔ اس لیے سقراط کل آپ کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔

سقراط: بہت خوب کریٹو، اگر دیوتاؤں کی یہی مرضی ہے تو میں راضی برضا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں ایک روز دیر ہو جائے گی۔

کریٹو: آپ کو کیسے پتا چلا؟

سقراط: میں بتاؤں جہاز کی آمد کے ایک روز بعد موت کے فیصلے پر عمل درآمد ہوگا۔

کریٹو: جی ہاں حکام بھی یہی کہہ رہے ہیں۔

سقراط: لیکن میرا قیاس ہے کہ جہاز کل سے پہلے یہاں نہیں پہنچے گا۔ میں نے گزشتہ رات بلکہ یوں کہیے ابھی ابھی جو خواب دیکھا تھا اسی بنا پر میں یہ کہہ رہا ہوں۔ اچھا کیا تم نے مجھے بیدار نہیں کیا؟

کریٹو: خواب کیا تھا؟

سقراط: میں نے دیکھا کہ عورت جیسا ایک ہیولیٰ گورا، قبول صورت، شوخ رنگ کے لباس میں ملبوس مجھ سے مخاطب ہے اور کہہ رہا ہے۔ ''آج سے تیسرے روز تم سرسبز و شاداب باغ ارم (فیتھیا: Phthia) کی طرف روانہ ہو جاؤ گے۔

کریٹو: سقراط یہ کیسا عجیب اور منفرد خواب ہے۔

سقراط: کریٹو، میں سوچتا ہوں کہ اس کی تعبیر یقیناً بڑی واضح ہے۔

کریٹو: جی ہاں، تعبیر بہت نمایاں ہے لیکن میرے بزرگوار سقراط، میں پھر آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ میرا مشورہ مانیں اور یہاں سے فرار ہو جائیں۔ اگر آپ مر گئے تو صرف یہی نہیں ہوگا کہ میں اپنے ایک ایسے دوست سے محروم ہو جاؤں گا جس کا بدل کبھی نہیں ملے گا بلکہ میرے لیے ایک خرابی اور بھی ہے جو لوگ نہ آپ سے واقف ہیں اور نہ مجھ سے، یہی سوچیں گے کہ میں آپ کی زندگی رقم صرف کر کے بچا سکتا تھا لیکن میں نے لاپروائی برتی۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی رسوائی ہو سکتی ہے۔ لوگ یہ سوچیں کہ میں نے دولت کو دوست کی زندگی پر ترجیح دی ہے؟ بیشتر لوگوں کو تو علم ہی نہیں ہوگا کہ میں آپ کو فرار پر آمادہ کر رہا ہوں اور آپ انکار کر رہے ہیں۔

سقراط: میرے عزیز کریٹو، آخر ہم اکثریت کی رائے کو اتنی وقعت کیوں دیں۔ اچھے لوگ یہی تو ہیں جن کی رائے لائق توجہ ہوتی ہے اور وہ واقعات کو ایسے ہی دیکھیں گے جس طرح کہ وہ رونما ہوئے ہیں۔

کریٹو: لیکن سقراط، ہمیں اکثریت کی رائے کو اہمیت دینا چاہیے کیونکہ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس شخص کو ہر قسم کا نقصان پہنچا سکتے ہیں جو ان کا ہم خیال نہیں ہے۔

سقراط: کاش ایسا ہی ہوتا کریٹو، یعنی اکثریت ہی زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچاتی۔ یوں ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ زیادہ سے زیادہ نفع بھی پہنچانے والے بن جاتے۔ یہ کتنی عمدہ بات ہوگی! لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہ نہ ایسا نہ ویسا کچھ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ وہ کسی کو نہ دانا بنا سکتے ہیں نہ نادان۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں وہ محض اتفاقیہ ہو جاتا ہے۔

کریٹو: چلیے میں آپ سے بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔ لیکن سقراط، ذرا کرم کیجیے اور اتنا بتا دیجیے کہ کیا آپ جو کچھ کر رہے ہیں، میرے اور دوسرے دوستوں کے لحاظ میں تو نہیں کر رہے۔ کیا آپ کو یہ خوف نہیں ہے کہ اگر آپ قید سے فرار ہو گئے تو ہم سب (آپ کے دوست) کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ جاسوس یہ بتا دیں گے کہ آپ کے فرار میں ہمارا ہاتھ ہے اور اس طرح ہم اپنی جائیداد سے جزوی یا کلی طور پر محروم ہو جائیں گے۔ یا اس سے بھی بڑی کوئی مصیبت نازل ہو سکتی ہے؟؟ اگر آپ کو ہماری وجہ سے خوف ہے تو آپ اطمینان رکھیے آپ کی جان بچانے کے لیے ہم یہ کیا بلکہ اس سے بھی بڑا خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہیں۔ آپ میری بات مان لیں اور اس پر عمل کریں۔

: جی ہاں، کریٹو! تم نے تو صرف ایک ہی خطرے کی نشاندہی کی ہے اس میں اور بھی بہت سے خطرات ہیں۔

آپ خوف نہ کھائیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں جو آپ کو جیل سے بھگوانے کی کوئی زیادہ قیمت وصول کیے بغیر یہ کام کرنے پر رضامند ہیں۔ رہ گئے جاسوس تو ان کا مطالبہ بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ تھوڑی سی رقم سے ان کا منھ بند ہو جائے گا۔ میرے تمام وسائل، جو کم نہیں ہیں، آپ پر قربان ہیں۔ اگر آپ کو میرے وسائل کے استعمال میں تامل ہے تو ایسے اجنبی بھی موجود ہیں جو آپ کے لیے بہت کچھ خرچ کرنے پر آمادہ ہیں۔ ان میں سے تھیبان (Theban) کا باشندہ سیمیاس (Simmias) تو بڑی رقم لے کر آیا ہوا ہے، اور سی بیس (Cebes) اور اس جیسے کتنے ہی آپ کے فرار میں مدد دینے کے لیے رقم خرچ کرنے پر تیار ہیں۔ میں یہی کہوں گا آپ پس و پیش نہ کریں۔ اور وہ بات نہ کہیں جو آپ نے عدالت میں کہی تھی کہ آپ اگر شہر بدر ہو کر دوسری جگہ گئے تو آپ کو وہاں کی زندگی اپنانے میں تکلیف کا سامنا ہوگا۔ جہاں بھی آپ جائیں گے لوگ آپ سے محبت کریں گے۔ آپ کے چاہنے والے صرف ایتھنز ہی میں نہیں ہیں۔ تھیسالی (Thessaly) میں میرے دوست بہت ہیں۔ اگر آپ وہاں جائیں گے تو وہ آپ کی قدر و منزلت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ آپ کی مکمل حفاظت کریں گے۔ تھیسالی کا ایک بھی باشندہ آپ پر انگلی نہیں اٹھائے گا۔ میرا یہ خیال ہے سقراط، آپ اپنی زندگی سے بے وفائی نہ برتیں۔ وہ بچ سکتی ہے آپ اس وقت اپنے دشمنوں کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں جو آپ کی جلد از جلد تباہی پر تلے بیٹھے ہیں۔ میں یہ بھی کہتا ہوں آپ اپنی اولاد کو بھی دغا دے رہے ہیں۔ آپ اگر ان کی پرورش کر سکتے ہیں انھیں تعلیم دے سکتے ہیں، اس کی بجائے آپ انھیں چھوڑ کر جا رہے ہیں انھیں قسمت آزمائی کرنا ہوگی۔ اگر وہ عام یتیموں جیسے نہ بنے تو پھر بھی آپ کی وجہ سے وہ کم حقیقت رہ جائیں گے۔ کسی شخص کو اولاد پیدا کرنے کا حق نہیں پہنچتا اگر وہ آخر تک انھیں پروان چڑھانے اور تعلیم دینے کی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ آسان راستہ اختیار کر رہے ہیں نہ کہ وہ جو بہتر اور ہمت اور حوصلے کا متقاضی ہے جو آپ جیسے شخص کے شایان شان ہوگا جو ہر کام میں نیکی اور بھلائی پر توجہ دینے کا دعویدار ہے۔ مجھے یہ سوچ کر نہ صرف آپ سے بلکہ خود اپنے سب دوستوں سے شرمندگی محسوس ہو رہی ہے کہ لوگ اس تمام معاملے کو ہماری بزدلی پر محمول کریں گے۔ مقدمہ چلنا ہی نہیں چاہیے تھا اور اگر چلا تھا تو اسے یہ رخ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا اور یہ آخری بات جو ہماری حماقت کی انتہا ہے جسے ہماری غفلت اور بزدلی کا نتیجہ قرار دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اگر ہم کسی

کام کے ہوتے تو آپ کو بچا سکتے تھے، اور یوں آپ خود کو بچا پاتے۔ بہت ہی آسان تھا۔ جناب
سقراط، دیکھیں اس کے عواقب آپ اور ہم سب کے لیے کتنے افسوس ناک اور ذلت آمیز
ہیں۔ آپ ارادہ کریں۔ بلکہ پہلے ہی طے کر لینا چاہیے تھا کیونکہ اب سوچ بچار کا وقت ہاتھوں سے
نکل چکا ہے اور صرف ایک ہی کام ہو سکتا ہے اور وہ بھی آج ہی کی رات اور بس۔ گر دیر کر دی تو
پھر یہ کام نہ ممکن ہوگا اور نہ قابلِ عمل۔ سقراط، میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ میری بات مان
لیں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ کر لیں۔

سقراط: عزیز کریٹو! تمھارا یہ جوش و جذبہ بہت بیش قیمت ہے کاش یہ درست ہوتا۔ اگر غلط ہے تو آپ جتنے
پر جوش ہوں گے اتنے ہی زیادہ خطرناک بھی ہوں گے۔ اسی لیے ضروری ہے کہ ہم یہ سوچیں کہ تم
جو کہہ رہے ہو اس پر میں عمل کروں یا نہ کروں۔ تم جانتے ہو کہ میں فطرتاً ان لوگوں میں شامل ہوں
جن کی رہبری دلیل کرتی ہے، جسے میں بڑے غور و فکر کے بعد مناسب ترین سمجھ کر منتخب کرتا ہوں۔
اب جب میں اس مرحلے سے دوچار ہوں تو اپنے اصول کو قربان نہیں کر سکتا۔ یہ وہ اصول ہیں جن
کا میں عمر بھر احترام کرتا رہا ہوں۔ وہ میرے لیے اب بھی محترم ہیں۔ میں اس وقت تک تمھاری
بات تسلیم نہیں کر سکتا جب تک مجھے اس سے بہتر اصول دستیاب نہیں ہوتا۔ میں یقیناً تم سے
اختلاف کروں گا۔ لوگوں کی اکثریت جتنی اور جیسی چاہے سزائیں دے، جائیداد ضبط کرے، موت
کا فیصلہ سنائے اور بچوں کی طرح بھوت پریت سے خوف زدہ کرے۔ اس سوال پر سوچنے کا
مناسب ترین طریقہ کون سا ہوگا؟ کیا میں تمھاری اکثریت کی رائے والی دلیل کی طرف دوبارہ
رجوع کروں؟ ہم یہ کہہ رہے تھے کہ ان میں سے کچھ لوگوں کی رائے قابلِ توجہ ہوتی ہیں۔ باقی کی
نہیں۔ کیا سزا ملنے سے قبل اس دلیل پر قائم رہنا مناسب تھا؟ کریٹو، تمھارے ساتھ اسی پہلو پر میں
غور کرنا چاہتا ہوں۔ کیا اس وقت میں جن حالات کا شکار ہوں ان میں یہ دلیل مختلف نظر آتی ہے!
نہیں۔ میں اسے اپناؤں یا نہیں۔ میرا یقین ہے کہ یہ دلیل جسے بااختیار حضرات بھی معقول سمجھتے
ہیں عوام کی یعنی خاص لوگوں کی رائے اہم ہوتی ہے نا کہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں۔ صرف اتنی سی
بات ہے کہ چند لوگوں کی رائے کا لحاظ کیا جائے جبکہ باقی کی رائے کا نہیں۔
کریٹو، کل تم نہیں مرو گے۔ کم از کم بظاہر اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ چونکہ تمھارے اوپر نہیں
بنی اس لیے تم بہتر فیصلہ دے سکتے ہو اس بات کا امکان کم ہے کہ تم اس سے فریب کھاؤ تم ہی بتاؤ

کہ جب میں یہ کہتا ہوں کہ چند افراد کی، جی ہاں صرف چند افراد کی، رائے قابل احترام ہوتی ہے اور دوسرے لوگوں کی رائے قابلِ اعتنا نہیں ہوتی تو کیا میں غلط کہتا ہوں؟ بتاؤ میں صحیح کہہ رہا ہوں یا نہیں؟

کریٹو: بالکل۔

سقراط: اچھی رائے کا احترام کرنا ہے، بری کا نہیں۔

کریٹو: جی ہاں۔

سقراط: داناؤں کی رائے ہی اچھی ہوتی ہے اور نادانوں کی رائے بری ہی ہوتی ہے؟

کریٹو: یقیناً۔

سقراط: دوسرے معاملے میں کیا کہا گیا تھا؟ کیا جمناسٹک کا طالب علم ہر فرد کی رائے کی تعریف و تنقیص کر سکتا ہے یا صرف ایک فرد کی، خواہ وہ طبیب ہو یا استاد۔

کریٹو: جی ہاں، صرف ایک فرد کی۔

سقراط: اسے اس ایک فرد کی تنقیص سے ڈرنا چاہیے۔ وہ اس اکلوتے فرد کی تعریف کرے گا سب کی نہیں۔

کریٹو: ظاہر ہے۔

سقراط: اور اسے چاہیے کہ وہ وہی کچھ سکھائے، کھائے پیئے جسے وہ (ایک فرد) بہتر سمجھتا ہو۔ اس طرح وہ دوسرے لوگوں کی مجموعی رائے سے متاثر ہوئے بغیر اپنی فہم و فراست سے کام لیتا ہے۔

کریٹو: بجا ارشاد۔

سقراط: اور اگر وہ (طالب علم) اس ایک فرد کی حکم عدولی کرتا ہے اور اس کی رائے کو نظر انداز کرتا ہے اور ان لوگوں کی رائے کو اہمیت دیتا ہے جن کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے نقصان اٹھانا پڑے گا یا نہیں؟

کریٹو: اسے اٹھانا پڑے گا۔

سقراط: نافرمان فرد کو اس کا نقصان کہاں کہاں اور کیسے کیسے متاثر کرے گا۔

کریٹو: اس کے جسم کو نقصان پہنچے گا۔ اسی کو تباہ کرے گا۔

سقراط: بہت خوب، کریٹو کیا یہ دلیل ان تمام باتوں پر صادق نہیں آتی جنھیں علیحدہ اور الگ الگ شمار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جائز اور ناجائز، معقول اور نامعقول، نیک و بد جو ہماری گفتگو کے

موضوعات ہیں۔ کیا ہمیں چاہیے کہ ہم اکثریت کی رائے پر عمل کریں اور ان سے ڈریں بجائے صرف ایک سمجھدار فرد کی رائے کو تسلیم کریں؟ کیا ہمیں ایسے شخص کو دنیا بھر سے زیادہ ڈرنا اور مکرم سمجھنا نہیں چاہیے؟ اور اگر ہم اس سے بے وفائی کریں تو کیا ہم اس اصول کو ضرر نہیں پہنچائیں گے جو فطرت نے ہمیں ودیعت کیا ہے۔ جو انصاف سے فروغ پاتا ہے اور ناانصافی سے تباہ ہوتا ہے ایسا کوئی اصول ہے نا؟

کریٹو: سقراط، ایسا اصول یقیناً موجود ہے۔

سقراط: اسی طرح کی ایک مثال لیجیے۔ اگر ہم ان لوگوں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے جن کو معاملے کی فہم نہیں ہے اسے تباہ کر دیں جو صحت سے ترقی پذیر ہو اور مرض سے تباہ ہوتی ہے۔ تو کیا زندگی بچنے کے لائق رہ جائے گی؟ جسم ہی تباہ ہو گا ناں؟

کریٹو: جی ہاں۔

سقراط: کیا ہم ایک بیمار اور تباہ جسم کے ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں؟

کریٹو: بالکل نہیں۔

سقراط: انسان وجود کا وہ ارفع جزو ہے جو عدل سے فروغ پاتا ہے اور ناانصافی سے خراب ہوتا ہے۔ اگر تباہ ہو جائے تو کیا زندگی اس قابل رہ جائے گی کہ اسے بچایا جائے۔ کیا ہمارا یہ فرض ہے کہ یہ اصول انسان میں کسی شکل میں موجود ہو جس کا تعلق انصاف اور ناانصافی سے ہو۔ جسم سے کمتر ہے؟

کریٹو: یقیناً نہیں۔

سقراط: کیا وہ جسم سے زیادہ مکرم ہے؟

کریٹو: کہیں زیادہ۔

سقراط: اس لیے، میرے عزیز، ہمیں اس بات کو اہمیت نہیں دینا چاہیے کہ لوگ کیا کہتے ہیں بلکہ اہمیت اُس ایک فرد کی رائے کو حاصل ہونی چاہیے جو حقیقت کا ادراک رکھتا ہے یا پھر صداقت اور حق کو اہمیت دینی چاہیے۔ اسی لیے تم نے اپنی بات کا آغاز ہی غلطی پر کیا ہے جو مشورہ دے رہے ہو کہ ہمیں جائز و ناجائز، نیکی و بدی، عزت اور ذلت کے بارے میں اکثریت کی رائے کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ دیکھو ہو سکتا ہے کوئی کہے (جو بھی ہو) اکثریت ہماری جان لے سکتی ہے۔

کریٹو: سقراط، ظاہر ہے جواب تو یہی ہو سکتا ہے۔

یہ درست بھی ہے۔ تاہم مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ سابقہ دلیل ہمیشہ کی طرح اپنی پر جگہ قائم ہے۔ میں

سقراط: جاننا چاہتا ہوں کہ کیا میں وہی بات کسی اور انداز سے کہہ سکتا ہوں یعنی زندگی نہیں بلکہ بہتر زندگی
قدر کے لائق ہے؟

کریٹو: جی ہاں، یہ بات بھی اٹل ہے۔

سقراط: اچھی زندگی کے معنی ہیں جائز اور باوقار زندگی۔ یہ بھی درست ہے نا؟

کریٹو: جی ہاں، درست ہے۔

سقراط: ان ہی مقدمات (صغریٰ و کبریٰ) پر انحصار کر کے میں اس سوال پر بحث کروں گا کہ اہل ایتھنز کی
اجازت کے بغیر مجھے فرار کی کوشش کرنا چاہیے یا نہیں۔
اگر یہ طے ہو جائے کہ فرار ہونا جائز ہے تو پھر میں اس کے لیے ضرور کوشش کروں گا۔ ورنہ نہیں۔
دوسری باتیں جن کا تم نے ذکر کیا ہے یعنی رقم، اخلاق کا تباہ ہونا، بچوں کی تعلیم و تربیت سے محرومی یہ
ساری باتیں کثرت آرا کے اصول پر مبنی ہیں جو بغیر کسی ٹھوس دلیل کے اسی مستعدی سے زندگی
بچائیں گی جس مستعدی سے وہ زندگی کا خاتمہ کر رہے ہیں۔ لیکن چونکہ بحث اس مرحلے تک آ پہنچی
ہے، صرف ایک ہی سوال غور کے قابل ہے کیا ہم فرار ہو کر جائز کام کریں گے یا جو لوگ ہماری مدد
کریں گے ان کو مصائب کا شکار کر کے یا انھیں شکریے کے ساتھ رقم دے کر یا حقیقتاً ہم کوئی جائز
کام نہیں کریں گے۔ اگر موخر الذکر کی بات درست ہے تو میرے یہاں رہنے سے موت ملے یا
کوئی بھی مصیبت ٹوٹے ان باتوں کی اہمیت نہیں ہوگی اور نہ ان باتوں کو کسی شمار میں لانا چاہیے۔

کریٹو: سقراط، میرا خیال ہے آپ درست کہہ رہے ہیں پھر ہمیں کیا کرنا ہوگا؟

سقراط: ہمیں اس مسئلے پر مل جل کر غور کرنا چاہیے۔ اگر تم میری بات کی تردید کرو گے جو کہ تم کر سکتے ہو تو میں
بات تسلیم کر لوں گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میرے دوست آپ یہ بات نہیں دہرائیں گے کہ مجھے اہل ایتھنز
کی رائے کے برخلاف فرار ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ آپ نے مجھے قائل کرنے کے لیے جو جدوجہد کی
ہے وہ قابلِ قدر ہے لیکن میں اپنی بہتر قوتِ فیصلہ کی بنیاد پر آپ کے دلائل تسلیم کرنے سے معذور
ہوں۔ اب تم میرے پہلے موقف پر غور کرو اور بتاؤ کہ اس کا بہترین جواب کیا ہو سکتا ہے۔

کریٹو: میں کروں گا۔

سقراط: کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس بات پر متفق ہیں کہ ہم شعوری طور پر کبھی کوئی غلط کام نہیں کریں گے

یا ہوسکتا ہے کہ ایک لحاظ سے غلط کام کرنا چاہیے اور دوسرے لحاظ سے نہیں یا کیا غلط کام ہمیشہ بُرا اور ذلت آمیز ہوتا ہے جیسا کہ میں نے ابھی کہا اور جس کا پہلے ہی ہم اقرار کر چکے ہیں؟ یا وہ باتیں جنھیں ہم نے گزشتہ چند دنوں میں تسلیم کیا تھا۔ انھیں فراموش کر دیں؟ کیا ہم اپنی زندگی میں جن باتوں پر سنجیدگی سے بحث مباحثہ کرتے رہے ہیں اس عمر میں پتا چلا کہ ہم کسی بچوں سے بہتر نہیں ہیں۔ یا اکثریت کی رائے اور اچھے یا بُرے انجام سے قطع نظر جو بھی ہم پہنچ چکے ہیں اس کی صداقت پر ڈٹے رہیں کہ بے انصافی اور غلط بات ہمیشہ اس کے لیے جو اس کو کرتا ہے، غلط، بدی اور ذلت آمیز ہے؟

کریٹو: جی ہاں۔

سقراط: گویا ہمیں کوئی غلط قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔

کریٹو: یقیناً نہیں۔

سقراط: اکثریت کے خیال کے مطابق جس نے زخم کھایا اسے چاہیے کہ وہ دوسرے کو زخمی کرے لیکن ہمیں کسی کو زخمی نہیں کرنا ہے؟

کریٹو: ظاہر ہے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

سقراط: تو کیا ہم غلط اقدام کریں۔

کریٹو: یقیناً نہیں۔

سقراط: بدی کا بدلہ بدی سے دینے کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اکثریت کا اخلاقی اصول یہی ہے۔ یہ جائز ہے یا نہیں؟

کریٹو: جائز نہیں ہے۔

سقراط: دیکھو دوسرے کے ساتھ بدی کرنا اسے نقصان پہنچانا ہی تو ہے۔

کریٹو: بجا ارشاد۔

سقراط: اس طرح ہمیں نہ انتقام لینا چاہیے اور نہ ہی بدی کے بدلے کسی سے بدی کرنی چاہیے۔ خواہ اس سے ہمیں کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچا ہو۔ لیکن کریٹو میں چاہتا ہوں کہ تم سوچو کہ کیا جو کچھ تم نے کہا ہے وہی تمھارا مطلب بھی ہے۔ کیونکہ ایسی رائے کے حامل افراد کی تعداد کبھی زیادہ نہیں رہی ہے اور نہ ہی اب ہوگی۔ جو لوگ اس پر متفق ہیں اور جو نہیں ہیں دونوں میں کوئی قدرِ مشترک نہیں ہے

ہے۔فرض کرو میں یہی کہتا ہوں۔

کریٹو: سقراط، بہت خوب۔

سقراط: کیا ہم اسی بات پر متفق نہیں ہوئے تھے کہ اس کا جواب قانون دے گا یا کیا تم ریاست کے فیصلے کے پابند نہیں تھے؟ اگر میں ان کے الفاظ پر حیرانگی کا اظہار کروں گا تو غالباً قانون یہ اضافہ کرے کہ سقراط ذرا جواب دو۔ تم کو آنکھیں کھلی رکھنے کی بجائے سوال پوچھنے اور ان کا جواب دینے کی عادت ہے۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ تمھیں ہم سے آخر ایسی کون سی شکایت ہے جس کی بنا پر تم ہمیں اور ریاست کو برباد کر دینے کی کوشش کو جائز سمجھتے ہو؟ پہلی بات تو یہ کہ کیا ہم تمھیں وجود میں نہیں لائے؟ کیا ہماری ہی معاونت سے تمھارے والد نے تمھاری والدہ سے شادی نہیں کی اور تمھیں جنم دیا۔ ذرا بتاؤ تو سہی ہم میں سے آخر کس کے خلاف تمھیں شکایت ہے۔ میں جواب دوں گا کسی کے خلاف نہیں۔ اچھا چلو یہ بتاؤ کہ کیا تمھارے دنیا میں آنے کے بعد پرورش، تربیت، تعلیم جس سے تم بھی مستفید ہوئے، ہماری ہی مرہون منت ہے۔ کیا ان قوانین نے جو تمھاری تعلیم کے ذمہ دار تھے تمھارے والدین کو یہ فریضہ نہیں سونپا تھا کہ وہ تمھیں موسیقی اور ورزش کی تربیت دیں؟ میں جواب دوں گا کہ یہ درست ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو کیا تم انکار کر سکتے ہو کہ اپنے والدین کی طرح تم بھی ہمارے پروردہ اور حلقہ بگوش ہو اور اگر یہ بات درست ہے تو تم ہمارے ہم مرتبہ نہیں ہو سکتے اور نہ ہی تم یہ سوچنے میں حق بجانب ہو کہ جو کچھ ہم تمھارے ساتھ کر رہے ہیں تم بھی وہی کچھ ہمارے ساتھ کرو۔ یہ بتاؤ اگر تمھارے والد یا آقا نے جیسی بھی صورت ہو، تمھیں ستایا یا برا بھلا کہا ہو۔ یا تمھارے ساتھ کوئی اور برائی کی ہو تو کیا تم ان کے ساتھ ایسا کرنے کا حق رکھتے ہو۔ کیا تم یہی نہیں کہو گے کہ چونکہ ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ تمھیں برباد کریں تو کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ اس کے بدلے ہمیں اور ہماری ریاست کو تمھیں برباد کرنے کا کوئی حق حاصل ہے۔ اے اصل حقائق جاننے کے دعویدارو، کیا تم یہ نمایشی اظہار کرو گے کہ ایسا کرنے میں تم حق بجانب ہو؟ کیا تمھارے جیسا فلسفی (علم دوست، یا حق پرست) اتنی سی بات معلوم کرنے میں بھی ناکام ہو چکا ہے کہ ہمارا وطن ہمارے ماں، باپ اور اب وجد سے زیادہ بیش قیمت، معزز اور مقدس ہے اور دیوتاؤں اور اہل عقل کی نظر میں یہ بہت ہی وقیع ہے؟ کیا یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اگر وہ غیظ و غضب میں ہو تو والد سے بھی بڑھ کر اس کی دلجوئی کی جائے۔ بڑی لجاحت سے التجا کی جائے۔ یا تو انھیں قائل کیا

جائے یا اگر قائل نہ کیا جا سکے تو ان کا حکم مانا جائے اور جب وہ ہمیں قید یا کوڑوں کی سزا دے تو اس تعزیر کو ہنسی خوشی خاموشی سے برداشت کیا جائے اور اگر وہ جنگ کا حکم دے، جس میں ہمیں زخم آئے یا موت ہمیں قطعاً چوں وچرا نہیں کرنا چاہیے۔ کسی کو بھی نہیں چاہیے کہ وہ میدان جنگ سے منہ موڑے، ہتھیار ڈالے یا اپنا عہدہ چھوڑ دے۔ اسے چاہیے کہ وہ جنگ ہو یا عدالت یا کوئی اور مقام ہو، اسے وہ کچھ کرنا چاہیے جس کا حکم وطن دے۔ اور اگر وہ اپنے ماں یا باپ سے زیادتی نہیں کر سکتا تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے وطن سے زیادتی کا مرتکب ہو؟ کریٹو، ہم اس کا کیا جواب دیں گے۔ قانون سچ بولتا ہے یا نہیں؟

کریٹو: میرا خیال ہے کہ وہ سچ ہی کہتا ہے۔

سقراط: اس وقت قانون یہی کہے گا کہ سقراط ذرا سوچو اگر ہم یہ سوچیں کہ جو کچھ تم کرنے جا رہے ہو۔ اس سے ہمیں نقصان پہنچے گا۔ ہم تمھیں اس دنیا میں لائے، تمھاری پرورش کی، تمھیں تعلیم دی اور تمام شہریوں کو ان تمام نعمتوں میں شریک کیا جو ہم مہیا کر سکتے تھے۔ ہم اس آزادی کی قسم کھا کر جو انھیں نصیب ہے تمام اہل ایتھنز سے یہ علانیہ کہتے ہیں کہ اگر وہ بالغ ہو کر شہر کے طور طریقے دیکھ کر، ہم سے متعارف ہونے کے بعد، اپنا مال واسباب لے کر کہیں اور جانا چاہے تو بے شک چلا جائے۔ ہمارا کوئی قانون نہ اس کو منع کرے گا نہ کوئی مداخلت کرے گا۔ جس شخص کو ہم اور یہ شہر پسند نہیں اور جو کسی بستی یا کسی دوسرے شہر میں منتقل ہونا چاہتا ہے تو اسے اجازت ہوگی کہ وہ جہاں چاہے جائے۔ اس کی جائیداد پر اس کا قبضہ برقرار رہے گا۔ لیکن جس شخص کو ہمارے طریق انصاف اور شہر کے انتظام وانصرام کا تجربہ ہے اور وہ یہاں قیام پذیر رہتا ہے۔ وہ گویا بالکنایہ ہمارے ساتھ عہد کرتا ہے کہ وہ ہمارے حکم پر عمل درآمد کرے گا اور جو شخص ہماری نافرمانی کرے گا ہمارے خیال میں وہ تین قسم کی غلطیوں کا مرتکب ہوگا۔ ایک وہ ہماری حکم عدولی کر کے ایک لحاظ سے اپنے والدین کی نافرمانی کرے گا، دوسری چونکہ ہم اس کی تعلیم کی بنیاد فراہم کرنے والے ہیں۔ تیسری کیونکہ اس نے ہم سے عہد کر رکھا ہے کہ وہ ہمارے احکام بجا لائے گا۔ اور وہ نہ تو ان پر عمل درآمد کرتا ہے اور نہ ہی ہمیں قائل کرتا ہے کہ ہمارے احکام مناسب نہیں ہیں اور ہم انھیں بے مروتی سے نافذ نہیں کرتے بلکہ ہم اسے یہ موقع دیتے ہیں کہ یا تو وہ ان پر عمل کرے یا ہمیں ان کے نامناسب ہونے پر قائل کرے۔ لیکن وہ ان میں سے کوئی راستہ اختیار نہیں کرتا۔

سقراط، اگر تم اپنے طے شدہ منصوبے پر عمل کرو گے تو اسی قسم کے الزامات، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں
بہت واضح ہو جائیں گے۔ تم پر ہی نہیں بلکہ دیگر اہل ایتھنز پر بھی۔ فرض کیجیے میں پوچھوں کہ میں
ہی کیوں ایسا کرتا ہوں۔ دوسرے کیوں نہیں۔ وہ لوگ فوراً یہ جواب دینا مناسب سمجھیں گے کہ تمام
لوگوں سے بڑھ کر میں نے ہی اس عہد کو تسلیم کیا ہے۔ سقراط، وہ کہیں گے کہ اس امر کے واضح
ثبوت موجود ہیں کہ ہم نے اور تمھارے وطن نے تمھیں ناراض نہیں کیا ہے۔ اہل ایتھنز میں تم
ہی ہو جو شہر میں مستقل مقیم رہے ہو۔ تم اس سے کبھی جدا نہیں ہوئے اس لیے ظاہر ہے تمھیں اس
سے واقعی محبت ہے۔ کیونکہ تم سوائے کھیل دیکھنے کی غرض کے کبھی شہر سے باہر نہیں گئے۔ شاید
ایک بار استھمس (Isthmus) یا کسی دوسرے مقام پر گئے تھے۔ تم دوسرے لوگوں کی طرح
سیر و سیاحت پر بھی نہیں گئے۔ نہ تمھیں یہ تجسس تھا کہ تم دوسری ریاستوں اور ان کے قوانین کا علم
حاصل کرو۔

تمھاری وابستگی ہم سے اور ہماری ریاست تک ہی محدود رہی۔ ہم تمھارے خصوصی منظورِ نظر رہے
اور تم ہماری حکمرانی پر راضی رہے۔ اسی شہر میں تمھاری اولادیں پیدا ہوئیں جو اس بات کا ثبوت ہے
کہ تم یہاں مطمئن اور خوش تھے۔ اگر تم چاہتے تو اپنے لیے شہر بدری کی سزا تجویز کرتے جو ریاست
آپ کو اس وقت شہر چھوڑ کر جانے سے منع کر رہی ہے اُس وقت اجازت دے دیتی۔ لیکن تم
جھوٹ موٹ کہتے رہے کہ تمھیں جلاوطنی سے کہیں زیادہ موت عزیز ہے۔ موت کو گلے لگانے پر تم
نارضامند نہیں ہو۔ اب تم ان اعلیٰ و ارفع جذبات کو فراموش کر چکے ہو اور تمھارے دل میں ان
قوانین کے لیے کوئی احترام باقی نہیں رہا، جسے تم برباد کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ اور وہی کر رہے ہو
جو کوئی بھی حقیر سے حقیر غلام کر سکتا ہے۔ تم ان وعدوں اور معاہدوں سے روگردانی کر کے فرار ہو
رہے ہو جن کی تم شہری کے لحاظ سے پابندی کرتے رہے ہو۔ سب سے پہلے اس سوال کا جواب
دو کہ کیا ہم سچ نہیں کہہ رہے ہیں؟ کیا تم نے اپنے قول و فعل میں ہماری بالادستی قبول نہیں کی تھی؟ سچ
ہے یا نہیں؟ کریٹو اس کا جواب دیں؟ کیا اس کا جواب ہاں میں ہوگا؟

کریٹو: یہ تو ہمیں کرنا ہی پڑے گا۔

سقراط: تو کیا وہ یہ نہیں کہیں گے کہ سقراط تم ان عہد ناموں اور معاہدوں سے روگردانی کر رہے ہو جنھیں تم
نے نہ عجلت میں اور نہ ہی زبردستی یا فریب سے بلکہ فرصت اور درایت سے پورے ستر سال غور

کرنے کے بعد ہمارے ساتھ استوار کیا تھا۔ اگر تمھیں ہمارا خیال نہیں تھا یا اگر ہمارے عہد نامے تمھیں ناگوار محسوس ہوتے تو تمھیں دوسرا راستہ منتخب کرنے کا حق حاصل تھا اور تم لیسی ڈیمون یا کریٹ جیسی ریاستوں میں جا سکتے تھے جن کی حکومت کی تم اکثر تعریف کرتے تھے۔ یا تم ہیلینا کی کسی اور ریاست میں بھی منتقل ہو سکتے تھے۔ حالانکہ ایتھنز کے دوسرے باشندوں سے کہیں زیادہ اس ریاست کے نظر آ رہے تھے یا بالفاظ دیگر اس کے قوانین (جس ریاست میں کوئی قانون نہ ہو اس کی کسے پرواہ ہوگی) کے اتنے گردیدہ نظر آ رہے تھے کہ تم نے یہاں سے قدم باہر نہیں نکالا۔ تم تو لنگڑوں، لولوں اور نابیناؤں سے بھی زیادہ اس شہر میں جمے رہے اور اب تم فرار ہو رہے ہو اور اپنا عہد توڑ رہے ہو۔ سقراط تم ایسا نہ کرو۔ ہمارا مشورہ مانو۔ شہر سے بھاگ کر اپنی ہنسی اڑانے کا سامان فراہم نہ کرو۔

ذرا سوچو اگر تم اس طرح حد سے بڑھے اور غلطی کی تو تم خود اپنی یا اپنے دوستوں کی کیا خیر خواہی کرو گے؟ تمھارے احباب شہر بدر ہوں گے، شہریت ضبط کرا بیٹھیں گے یا انھیں جائیداد سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہ باتیں بڑی حد تک یقینی ہیں۔ اگر تم ہمسایہ ریاستوں تھیبس (Thebes) یا میگارا (Magara) فرار ہو کر جاؤ گے تو وہاں کے عمدہ قانون کے تحت دشمن قرار دیے جاؤ گے۔ سقراط وہاں حکومتیں تمھارے خلاف ہوں گی اور وہاں کے تمام وطن دوست شہری تمھیں قانون کی حیثیت کو خراب کرنے والا سمجھیں گے۔ تم ان کی نگاہوں سے گر جاؤ گے۔ لوگ یہی سوچیں گے کہ یہاں تم کو جو سزا ملی وہ انصاف پر مبنی تھی۔ جو قانون کو خراب کرے وہ نوجوانوں یعنی انسان کے اس جز کو خراب کر سکتا ہے جو کچی عقل والا ہوتا ہے۔ کیا تم ان ریاستوں سے بھاگو گے۔ جہاں قانون کی حکمرانی ہے اور لوگ نیک ہیں۔ کیا ان شرائط پر زندہ رہنا کسی لائق ہو سکتا ہے؟ یا سقراط تم ان کے پاس نہایت بے حیائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جاؤ گے اور ان سے گفتگو کرو گے؟ ان سے کہو گے کیا؟ وہی باتیں جو یہاں کہتے ہو یعنی نیکی، عدل، ادارے، قوانین کا عالم، انسانیت کے لیے مفید اور بہترین ہوتا۔ کیا تمھیں ایسا کہنا زیب دے گا؟ یقیناً نہیں۔ لیکن اگر تم اس ریاست سے جہاں عمدہ حکمرانی ہے۔ کریٹو کے دوستوں کے پاس تھیسالی (Thessaly) جاؤ گے تو وہ قید خانے سے تمھارے فرار کی چٹ پٹی داستان سن کر مسحور ہو جائیں گے کیونکہ وہاں بدامنی کا دور دورہ ہے۔ وہ مزے لے لے کر سنیں گے کہ بکرے کی کھال میں لپیٹ کر یا مفروروں کے کسی اور طریقے سے کس

طرح قید خانے سے نکالا گیا لیکن کیا کوئی فرد بھی ایسا نہیں ہوگا جو تمھیں یہ بات یاد نہیں دلائے گا کہ حقیری سی زندگی میں ذرا سا اضافہ کرنے کے لیے مقدس ترین قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تمھیں اس ضعیفی میں بھی شرم نہ آئی۔ اگر انھیں خوش رکھو تو شاید ایسا نہ ہو۔ لیکن اگر وہ ناراض ہوئے تو پھر تم متعدد پست اور ذلیل باتیں سنو گے۔ زندہ تو رہو گے لیکن کس طرح لوگوں کے خوش آمدی کی حیثیت سے، ادنیٰ ملازم کی طرح کام کیا کرو گے؟ تھیسالی (Thessaly) میں کھاتے پیتے رہو گے یا پردیس میں دعوتیں اڑانے جاؤ گے۔ اور نیکی اور عدل کے بارے میں تمھارے حسین جذبات کا کیا بنے گا؟ تم کہو گے کہ میں بچوں کے لیے زندہ رہوں گا۔ تم ان کی پرورش کرنا چاہتے ہو۔ انھیں تعلیم دینا چاہتے ہو کیا تم انھیں تھیسالی لے جا کر ایتھنز کی شہریت سے محروم کر دو گے؟ کیا یہی فائدہ ہے جو تم ان کو پہنچانا چاہتے ہو۔ کیا تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ اگر تم زندہ رہے تو ان کی تعلیم و تربیت بہتر ہوگی۔ خواہ تم ان سے دور ہی کیوں نہ رہو کیونکہ تمھارے احباب ان کی خبر گیری کریں گے؟ کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ اگر تم تھیسالی میں رہے تو وہ ان کی خبر گیری کریں گے اور اگر تم دوسری دنیا میں چلے گئے تو وہ ان کی دیکھ بھال نہیں کریں گے؟ جی نہیں لیکن اگر جنھیں تم سے دوستی کا دعویٰ ہے اور وہ سچے دوست ہیں تو وہ ان کی دیکھ بھال کریں گے اور ضرور کریں گے۔

سقراط اب ہماری سنو جس نے تمھاری پرورش کی ہے، پہلے زندگی اور اولاد کی اور بعد میں عدل کی فکر مت کرو۔ انصاف کو ترجیح دو تا کہ تم تحت الثریٰ کے حکمرانوں کے سامنے سرخرو رہو۔ کیونکہ نہ تم، نہ کوئی شے، جو تمھاری ہے نہ اس زندگی یا دوسری زندگی میں زیادہ پر مسرت زیادہ مقدس، زیادہ جائز بنے رہو گے اگر تم وہی کام کرو گے جس کا کریٹو مشورہ دے رہا ہے۔ اب تم معصوم اور مظلوم کی حیثیت سے رخصت ہو رہے ہو گنہگار کی حیثیت سے نہیں ہمیں قانون نے نہیں بلکہ لوگوں نے نشانہ بنایا ہے۔ لیکن اگر تم برائی کے بدلے برائی کرتے تو زخم کے بدلے زخم دیتے اور ان معاہدوں اور عہد ناموں کو توڑتے ہوئے جو تم نے ہم سے استوار رکھے تھے اور جن کو یعنی خود اپنی ذات کو دوستوں کو اپنے وطن کو اور ہم قوانین کو تم بالکل ہی نقصان نہیں پہنچانا چاہے ان کو نقصان پہنچاتے ہو یا نکل جاؤ گے تو ہم تم سے اس وقت تک ناراض رہیں گے جب تک تم زندہ رہو گے اور دوسری دنیا کے قوانین جو ہمارے بھائی ہیں تمھارا استقبال ایک دشمن کی طرح کریں گے۔ انھیں پتا چل جائے گا کہ تم نے ہمیں برباد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔" پس تم ہماری مانو نہ کہ کریٹو کی"

عزیز کریٹو، یہ وہ آواز ہے جو بانسری کی دھن کی طرح میرے کانوں میں آہستہ آہستہ گونج رہی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں یہی آواز جو کانوں میں گونج رہی ہے دوسری آوازوں کو مجھ تک آنے سے روکے رکھتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم جو کچھ کہو گے وہ میرے کام نہیں آئے گا تاہم اگر کچھ کہنا چاہتے ہو تو ضرور کہہ ڈالو۔

کریٹو:۔ سقراط مجھے کچھ بھی نہیں کہنا ہے۔

سقراط:۔ کریٹو، خدا کی منشا کی تکمیل کے لیے تو تنہا چھوڑ دو تاکہ وہ جہاں چاہے مجھے لے جائے۔

فیڈو

(Phaedo)

شرکائے گفتگو:

فیڈو جس نے فلیئس (Phlius) کے ایشی کریٹس (Echecrates) کے مکالمہ کی روداد بیان کی سقراط (Socrates)، اپالوڈورس (Apollodorus)، سیمیاس (Simmias)، سی بیس (Cebes)، کریٹو (Crito) اور قید خانہ کا نگران۔

منظر: سقراط کا قید خانہ، مکالمے کا مقام فلیئس

ایشی کریٹس: فیڈو کیا تم، جس روز سقراط نے زہر کا پیالہ پیا ٔ وہاں موجود تھے۔

فیڈو: جی ہاں، میں وہاں موجود تھا۔

ایشی: میں وہ تمام باتیں سننا چاہتا ہوں جو اس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں کہی تھیں علاوہ ازیں میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ موت کے وقت اس کی کیا حالت تھی؟ آج کل فلیئس کے بہت ہی کم لوگ ایتھنز جاتے ہیں اور ایک عرصے کے بعد تم پہلے اجنبی ہو جو وہاں سے آئے ہو اور جو اس واقعہ کو سچ سچ بیان کر سکتے ہو۔ ہم نے تو صرف اتنا ہی سنا تھا کہ اس کی موت زہر پینے سے واقع ہوئی تھی۔

فیڈو: کیا آپ نے ان کے مقدمے کی روداد نہیں سنی؟

ایشی: جی ہاں ہمیں کسی نے اس مقدمہ کی روداد سنائی تو تھی لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ مقدمہ کی سزا سنانے کے بعد اس پر فوری عمل درآمد کے بجائے اتنی تاخیر کیوں ہوئی۔ آخر اس کی وجہ کیا تھی؟

فیڈو: ایشی کریٹس تم اسے صرف ایک حادثہ ہی سمجھو۔ ہوا یوں کہ جس جہاز کو ایتھنز والوں نے ڈیلوس (Delos) بھیجا تھا اس کے عقبی حصے کی خصوصی سجاوٹ اس کے مقدمے کے دن سے ایک روز پہلے

مکمل ہوئی تھی۔

ایکی: یہ جہاز کا کیا قصہ ہے؟

فیڈو: اہل ایتھنز کی روایت کے مطابق اس جہاز میں تھیسیس (Theseus) کریٹ (Crete) گیا تھا۔ اس کے ساتھ چودہ نامور پہلوان تھے جنھیں وہ خطرات سے نکال کر بخیریت واپس لایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ خطرے میں گھرے تو انھوں نے اپالو (Apollo) دیوتا کے حضور منت مانی کہ اگر وہ بچ گئے تو وہ ہر سال اسی جہاز کو ڈیلوس بھیجا کریں گے۔ اور یہ رسم آج تک تسلسل سے جاری ہے۔ دیوتا اپالو کا بڑا پجاری اس جہاز کی خصوصی سجاوٹ کرتا ہے اور سجاوٹ کے دن سے لے کر جہاز کی ایتھنز واپسی تک کا زمانہ متبرک سمجھا جاتا ہے اور اس دوران شہر میں پھانسی اور قتل کی سزاؤں پر عمل درآمد کرنے کی قطعی ممانعت ہے اور جب ہوا مخالف ہو تو جہاز کے سفر کے دورانیہ میں اچھا خاصا اضافہ ہو جاتا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا کہ جہاز کو خصوصی طور پر سقراط کے مقدمے کے دن ہی سجایا گیا تھا۔ اسی لیے سقراط قید میں پڑا رہا اور موت کی سزا کے کئی روز بعد اس سزا پر عمل درآمد ممکن ہوا۔

ایکی: فیڈو اس کی موت کس طرح واقع ہوئی؟ اس نے کیا کیا باتیں کہیں اور اس پر کیا کیا گزری؟ اس کے کون کون سے دوست اس کے پاس موجود تھے یا حکومت نے انھیں سقراط سے ملنے سے منع کر دیا تھا اور موت کے وقت اس کا کوئی بھی دوست اس کے پاس موجود نہیں تھا؟

فیڈو: جی نہیں۔ اس کے دوست اس کے پاس تھے بلکہ ان کی اچھی خاصی تعداد اس کے پاس موجود تھی۔

ایکی: اگر آپ کو کوئی اور کام نہ ہو تو میں چاہتا ہوں کہ آپ تمام روداد تفصیل سے سنائیں۔

فیڈو: مجھے ایسا کوئی خاص کام نہیں ہے۔ میں آپ کو تمام واقعات مکمل تفصیل کے ساتھ بتاتا ہوں۔ سقراط کے ذکر سے مجھے ہمیشہ بڑی خوشی ہوتی ہے خواہ یہ ذکر میں کروں یا دوسرے۔

ایکی: آپ ہی جیسے سامعین یہاں بھی موجود ہیں۔ آپ جتنی باتیں چاہیں بیان کریں۔

فیڈو: مجھے اس محفل میں بیٹھ کر عجیب و غریب احساس ہو رہا ہے۔ ایکی کریٹس مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ میں اپنے دوست کی موت کے وقت اس کے پاس تھا۔ اسی لیے مجھے اس پر کوئی ترس نہیں آیا۔ اس نے یوں بے خوف ہو کر جان دی۔ اس کا ایک ایک لفظ، ایک ایک حرکت شفقت اور اعلیٰ ظرفی کی آئینہ دار تھی۔ وہ بخشی ہوئی روح تھی۔ مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ دوسری دنیا کے لیے اسے الوہی بلاوا آیا تھا اور وہ وہاں اپنے جیسی دوسری ہستیوں کی طرح خوش و خرم ہوگا۔ اسی لیے اس موقع پر بھی

مجھے اس پر کوئی ترس نہیں آیا جو خلاف واقعہ تھا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ مجھے خوشی بھی تھی کہ ہم اگر حسب معمول علم دانش کی باتوں میں وقت گزار رہے تھے (یہی تمام گفتگو کا موضوع تھا)۔ جب بھی مجھے یہ احساس ہوتا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں موت سے ہم آغوش ہو جائے گا تو میری ذہنی حالت بہت عجیب ہو جاتی تھی۔ اس وقت مجھ پر خوشی اور درد کی ایک ملی جلی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ہم سب اسی ملی جلی کیفیت کا شکار تھے۔ ہم ہنس بھی رہے تھے اور رو بھی رہے تھے خصوصاً اپالوڈورس کا تو عجب حال تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ وہ بہت جذباتی شخص ہے۔

ایشی: جی ہاں۔

فیڈو: وہ بار بار بے قابو ہو رہا تھا اور اسے دیکھ کر میری اور دوسروں کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔

ایشی: وہاں کون کون موجود تھا۔

فیڈو: ایتھنز کے باسیوں میں سے اپالوڈورس (Apollodorus) کے علاوہ کریٹو بولس (Critobulus) اور اس کے والد کریٹو، ہرموجنیس (Hermogenes)، اپی جینس (Epigenes)، ایسکی نس (Aeschines)، اینٹس تھینس (Antisthenes)، اسی طرح پائینیا (Paeania) کے سٹیسی پس (Ctesippus)، مینکس نس (Menexenus) وغیرہ۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے افلاطون (Plato) بیمار تھا۔

ایشی: کیا کچھ دوسری ریاستوں کے لوگ بھی تھے۔

فیڈو: جی ہاں، تھیبان (Theban) کے سیمیاس، سی بیس (Cebes)، فیڈونڈیس (Phaedondes)، یوکلیڈ (Euclid) اور ٹرپسیون (Terpsion) جو میگارا (Megara) سے آئے تھے۔

ایشی: کیا ارسٹی پس (Aristtippus) اور کلیوم بروٹس (Cleombrotus) بھی وہاں موجود تھے؟

فیڈو: جی نہیں کہا جاتا ہے کہ وہ ایجینا میں تھے۔

ایشی: کوئی اور بھی تھا۔

فیڈو: مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ صرف یہی لوگ تھے اور کوئی نہ تھا۔

ایشی: اچھا یہ فرمائیے کیا باتیں ہوئیں؟

فیڈو: چلیے میں شروع سے ہی بیان کرتا ہوں اور کوشش کروں گا کہ تمام گفتگو من و عن دہراؤں۔ اس تمام عرصے میں ہم لوگ سقراط کے پاس پابندی سے آتے تھے۔ ہم سویرے ہی سویرے اس عدالت میں جمع ہو

ونے جہاں مقدمہ چل رہا تھا۔ یہ مقام قید خانے سے قریب ہی تھا۔ وہاں ہم لوگ اس وقت تک باتوں میں مصروف رہتے جب تک دروازہ کھل نہ جاتا (یہ صبح کو ذرا دیر سے کھلتا تھا)۔ ہم وہاں داخل ہو کر تقریباً تمام دن سقراط کے ساتھ گزارتے۔ آخری دن تو ہم لوگ صبح ذرا جلدی آ گئے۔ شام کو جب ہم ابھی قید خانے میں ہی تھے ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ جہاز ڈیلوس سے واپس پہنچ گیا ہے۔ اسی لیے ہم مقررہ جگہ پر معمول سے پہلے اکٹھے ہو گئے، ہم نے گھنٹی بجائی تو دروازہ کھول دینے کے بجائے قید خانے کا نگران آیا اور اس نے کہا کہ ہم اس وقت اندر آئیں جب ہمیں بلایا جائے گا کیونکہ گیارہ رکنی کمیٹی اس وقت سقراط کے پاس ہے۔ انھوں نے ان کی زنجیریں کھول دی ہیں اور یہ حکم سنا دیا ہے کہ انھیں آج ہی موت کی سزا دی جائے گی۔ نگران تھوڑی دیر بعد آیا اور اس نے داخلے کی اجازت دے دی۔ اندر آئے تو ہم نے دیکھا کہ سقراط کی زنجیریں اتر چکی تھیں اور زینتھپی (Xanthippe) اس کے بچے کو گود میں لیے اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے ایک چیخ ماری اور خالصتاً عورتوں کے سے انداز میں زور زور سے چلانے لگی کہ سقراط تم اپنے احباب سے آخری بار گفتگو کر رہے ہو۔ ان کی بھی تم سے آخری ملاقات ہے۔ سقراط نے کریٹو کی طرف دیکھا اور کہا کریٹو کوئی اسے گھر پہنچا دے۔ کریٹو کے چند ملازم اسے وہاں سے لے گئے۔ وہ زور زور سے رو رہی تھی اور سینہ کوبی کر رہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد سقراط صوفے پر بیٹھ گیا اور جھک کر اپنے پاؤں کی مالش کرنے لگا۔ مالش کے دوران ہم باتیں کرتے رہے۔ انسان جسے مسرت کہتا ہے، ہوتی بڑی انوکھی چیز ہے اور اس کا درد سے کیسا عجیب و غریب رشتہ ہوتا ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں کیونکہ یہ دونوں احساسات بیک وقت کسی انسان میں موجود نہیں ہوتے تاہم جو کوئی ان میں سے ایک سے متاثر ہوتا ہے دوسرے سے بھی اس کا پالا پڑتا ہے۔ ان کے جسم دو ہیں لیکن سر ایک ہی ہے۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ اگر ایسوپ (Aesop) کو اس کا خیال آتا تو ضرور خدا کے بارے میں ایسی کہانی لکھتا جس میں ان دونوں کی کشمکش دکھائی جاتی۔ جب ان کی آویزش کو ختم کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تو ان کے سر جوڑ دیے جاتے۔ یہی وجہ ہے جب ایک چیز وارد ہوتی ہے تو دوسری بھی پیچھے پیچھے آ جاتی ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ بھی ہے۔ دیکھو نا جب زنجیریں پاؤں میں تھیں درد موجود تھا۔ زنجیریں اتر گئیں تو وہی جگہ مسرت کا مرکز بن گئی ہے۔

اس بات پر سی بیس نے کہا مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ایسوپ کا نام لیا ہے کیونکہ اس سے مجھے ایک ایسا سوال یاد آ گیا جسے اکثر پوچھا جاتا ہے۔ ابھی پرسوں ہی خود مجھ سے شاعر ایوینس نے یہی سوال پوچھا تھا۔ یقیناً وہ آئندہ بھی پوچھے گا۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو اس کے لیے جواب تیار کر دیں جسے میں دہراؤں گا۔ بتایئے

میں اس سے کیا کہوں۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آپ نے کبھی ایک مصرعہ بھی نہیں کہا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے آپ قید خانے میں ایسوپ کی کہانیوں کو منظوم کر رہے ہیں اور اپالو دیوتا کی شان میں مذہبی گیت بھی تیار کر رہے ہیں۔

انھوں نے جواب دیا کہ سی بیس کو بتا دو کہ سچ بات یہ ہے کہ میں اس کا یا اس کی نظم کا حریف نہیں بننا چاہتا کیونکہ یہ بہت مشکل کام ہے۔ مجھے پتا ہے اس طرح میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میں اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتا ہوں یا نہیں یا جو میں نے چند خواب دیکھے ہیں ان کی تعبیر معلوم کر سکتا ہوں یا نہیں؟ اپنی زندگی میں مجھے ایسے خواب بھی نظر آئے جس میں یوں محسوس ہوا جیسے میں موسیقی بھی ترتیب دے سکتا ہوں۔ وہی خواب مجھے بار بار کبھی ایک اور کبھی دوسرے انداز میں نظر آتے تھے لیکن ہر بار وہ کام شروع کر دو اور موسیقی ترتیب دو یا اس سے ملتے جلتے الفاظ کہے جاتے۔ میں نے سوچا کہ یہ بات مجھے فلسفہ کے مطالعہ پر آمادہ کرنے اور اس شعبے میں میری حوصلہ افزائی کا اشارہ ہے، جو میرا زندگی بھر کا شغل رہا ہے۔ اشرف ترین اور بہترین مضمون موسیقی ہے۔ خواب مجھے یہی کام کرنے پر اکسا رہا تھا جو میں کر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح دوڑنے والے کی حوصلہ افزائی تماشائی کرتے ہیں اور وہ دوڑتا رہتا ہے لیکن مجھے کامل یقین نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے خواب میں موسیقی کا عام اور رائج مفہوم ہی مقصود ہو۔ موت کی سزا پانے اور اس فرصت کو جو جشن کے سبب مجھے ملی تھی میں نے غنیمت جانا اور کوشش کی کہ اس شک کو یقین میں تبدیل کروں اور چند نظمیں کہہ ڈالوں، کچھ موسیقی بھی ترتیب دے ڈالوں تاکہ خواب میں جو حکم ملا تھا اس پر دنیا سے رخصت ہونے سے قبل عمل کر دوں۔ سب سے پہلے میں نے جشن کے دیوتا کی شان میں ایک مذہبی گیت تیار کیا۔ پھر سوچا کہ شاعر کو اگر وہ واقعی شاعر ہے صرف الفاظ ہی نہیں جوڑنے چاہئیں بلکہ کوئی نہ کوئی کہانی بھی بیان کرنی چاہیے چونکہ مجھے افسانہ طرازی کا ملکہ نہیں تھا اس لیے میں نے ایسوپ کی کہانیوں کا سہارا لیا۔ جو میری دسترس میں تھیں اور مجھے زبانی یاد بھی تھیں۔ جو پہلی کہانی یاد آئی میں نے اسے نظم کا جامہ پہنا دیا۔ سی بیس آپ یہ بات ایونیس کو بتا دیجیے اور میری طرف سے خدا حافظ بھی کہہ دیجیے گا۔ اگرچہ وہ صرف انشا پرداز ہی نہیں بلکہ دانا بھی ہے تو میں چاہوں گا کہ وہ میری پیروی کرے۔ ہوسکتا ہے میں آج ہی دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ اہل ایتھنز یہی چاہتے ہیں۔

سیمیاس (Simmias) نے کہا، ایسے آدمی کے لیے کتنا اعلیٰ پیغام ہے۔ میں بارہا اس کے ہمراہ رہا ہوں اسے اچھی طرح جانتا ہوں وہ آپ کی نصیحت پر اس وقت تک عمل نہیں کرے گا جب تک اس پر کوئی احسان نہ کیا جائے۔ سقراط نے کہا، کیا ایونیس (Evenus) فلسفی نہیں ہے؟

بی پاس نے کہا، ہے تو یہی۔

اگر یہ بات ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ہر اس انسان میں جس میں فلسفہ کا جوہر موجود ہے وہ مرتو جائے گا لیکن کبھی قانون سے انحراف نہیں کرے گا۔ یہی میری رائے ہے۔

اب اس نے اپنی نشست کا انداز بدلا اور ٹانگیں صوفے سے اٹھا کر فرش پر رکھیں اور باقی گفتگو کے دوران وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔

سی بیس نے کہا آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ انسان کو خودکشی نہیں کرنی چاہیے لیکن فلسفی اس شخص کی پیروی کرنے پر آمادہ ہوگا جو اپنی جان دے رہا ہوگا؟

سقراط نے جواب دیا سی بیس اور سیمیاس آپ لوگ فیلولاس (Philolaus) کے شاگرد ہیں۔ کیا اس نے کبھی ایسی بات نہیں کہی تھی؟

جی ہاں کہی تو تھی لیکن ان کے الفاظ میں قطعیت نہیں تھی۔

میرے الفاظ بھی جو کچھ میں نے سنا ہے اسی کی بازگشت ہیں لیکن آخر جو کچھ میں نے سن رکھا ہے اس کا اعادہ کیوں نہ کروں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب کوئی شخص دوسری دنیا کے سفر پر کمربستہ ہو تو اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہاں اپنے قیام کے بارے میں بھی کچھ غور وخوض کرے۔ اس وقت سے لے کر غروب آفتاب تک میرے پاس اس سے بہتر کام کون سا ہے۔

سقراط آپ مجھے بتائیں کہ خودکشی خلافِ قانون کیوں ہے۔ میں نے یقیناً فیلولس کو جس کا ذکر ابھی آپ نے کیا ہے یہ کہتے ہوئے اس وقت سنا تھا جب وہ تھیبس میں ہمارے ہمراہ قیام پذیر تھے۔ انھوں نے اس خیال کی تصدیق کی تھی۔ دوسرے بھی یہی بات کہتے ہیں لیکن میں نے کسی سے اس کے لیے کوئی قطعی دلیل نہیں سنی۔

سقراط نے جواب دیا، مایوس نہ ہو وہ دن ضرور آئے گا جب آپ اس کی دلیل بھی سن لیں گے۔ آپ کے لیے یہ بات حیران کن کیوں ہے کہ کچھ باتیں جن کا شمار بنیادی طور پر بدی میں ہوتا ہے وہ کبھی کبھی کچھ لوگوں کے لیے مفید بھی بن جاتی ہیں۔ موت اس قاعدے سے کیوں مستثنیٰ ہے، بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ جب انسان کے لیے مرجانا ہی بہتر ہو تو اسے اس کے لیے کسی کا محتاج کیوں کر دیا جاتا ہے؟ کیوں نہ وہ خود ہی یہ کام کرلے۔ اس کے لیے اسے دوسروں کا احسان لینے کا انتظام کیوں کرنا پڑتا ہے۔

سی بیس نے دبی دبی ہنسی کے ساتھ اپنی مادری زبان بی اوشیائی لہجے (Boeotian) میں کہا، سچ ہے۔

میرا بیان بظاہر بے جوڑ ہے۔ اس کا مجھے احساس ہے لیکن غور کریں گے تو اس کا یہ عیب ختم ہو جائے گا۔ ایک ایسا بھی اصول ہے جو رازدارانہ طور پر سرگوشیوں میں کہا جاتا ہے کہ انسان ایسا قیدی ہے جسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خود دروازہ کھول کر فرار ہو جائے۔ یہ ایک راز ہے جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ تاہم میرا ایمان ہے کہ دیوتا ہی ہماری حفاظت کرتے ہیں اور ہم انسانوں کی حیثیت محض ان کے مال مویشیوں جیسی ہے۔ آپ بھی اس سے متفق ہیں نا؟

سی بیس نے کہا مجھے آپ سے کلی اتفاق ہے۔

اگر آپ کا کوئی مویشی، مثلاً بیل یا گدھا آپ کی اجازت کے بغیر ہی خود کو مار کر آپ کی راہ سے ہٹ جاتا ہے تو کیا آپ اس سے ناراض نہیں ہوں گے اور اگر ممکن ہوا تو آپ اسے سزا دیں گے یا نہیں؟

سی بیس نے جواب دیا یقیناً۔

اگر ہم اس سوال پر اس انداز سے غور کریں تو یہ بات معقول نظر آئے گی کہ انسان سے کہا جائے کہ وہ صبر کرے اور اس وقت کا انتظار کرے جب خدا اس کو اسی طرح کا بلاوا دے جیسا کہ مجھے دیا گیا ہے۔ سی بیس نے کہا سقراط آپ کی بات درست ہے۔ تاہم آپ اس بظاہر درست اصول سے کس طرح سمجھوتا کر سکتے ہیں یعنی کہ دیوتا ہمارے محافظ ہیں اور ہم ان کے مویشی ہیں اور ابھی ہی کی طرح خوشی خوشی موت کے لیے تیار ہو جائیں۔ ابھی ابھی جسے آپ فلسفیوں سے منسوب کر رہے تھے؟ دانا ترین افراد اس خدمت سے کنارہ کش ہو جائیں جسے دیوتاؤں نے ان کے سپرد کیا تھا اور جس کے وہ حاکم ہیں لیکن یہ بات معقول نظر نہیں آتی کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ کوئی دانا شخص یہ خیال نہیں کرتا کہ وہ ان کی قید سے آزاد ہو کر اپنی دیکھ بھال کر سکتا ہے۔ یہ بات کسی احمق ہی کے دماغ میں آ سکتی ہے۔ وہ یہ دلیل دے سکتا ہے کہ بہتر ہو گا کہ وہ آقا کے قبضے سے نکل کر فرار ہو جائے اور یہ نہ سوچے کہ وہ اس طرح نیکی سے فرار اختیار کر رہا ہے۔ اسے تو نیکی سے ہمیشہ پیوستہ رہنا چاہیے۔ اس کا فرار بے معنی ہو گا۔ دانا ہمیشہ ان ہستیوں کے قریب رہنے کا آرزومند ہو گا جو اس سے بہتر ہیں۔ سقراط دیکھیے نا یہ بات اس بات کے بالکل ہی الٹ ہے جو ابھی کہی گئی۔ اس رائے پر دانا کو افسوس ہو گا لیکن نادان زندگی کے خاتمے پر بغلیں بجائے گا (گویا خودکشی احمقانہ فعل ہوا)۔

معلوم ہوتا تھا کہ جیسے سی بیس کے ذوق و شوق کو دیکھ کر سقراط خوش ہو رہا تھا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا اور بولا دیکھو یہ ایسا آدمی ہے جو ہمیشہ سوال پوچھتا ہے اور پہلی ہی بات سن کر آسانی سے قائل نہیں ہو جاتا۔

سیمیاس نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ وہ جو اعتراضات پیش کر رہا ہے ان میں وزن محسوس

ہوتا ہے۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ صحیح معنوں میں ایسے دانا انسان سے کیا مراد ہے جو فرار بھی ہونا چاہتا ہے اور اس کا ایک آقا بھی ہے جو اس سے بہتر ہے؟ میرا اندازہ ہے کہ اس کا اشارہ آپ کی ذات کی طرف ہے اور اس کا خیال ہے کہ آپ ہم سے جدا ہونے کے لیے بالکل ہی تیار ہیں اور ان دیوتاؤں سے رخصت ہونے کی عجلت میں ہیں جنھیں آپ ہمارا عمدہ آقا تسلیم کرتے ہیں۔

سقراط نے جواب میں کہا جی ہاں۔ آپ کی بات انصاف پر مبنی ہے آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے الزام کا اس طرح جواب دوں گویا میں عدالت کے سامنے پیش ہوں؟

سیمیاس نے کہا جی ہاں یقیناً ہم یہی چاہتے ہیں۔

چلیے میں اپنی صفائی عدالت سے کہیں بہتر طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ سیمیاس اور سی بیس کیونکہ میں یہ بات بخوشی تسلیم کرتا ہوں کہ موت کی سزا کو بلا چوں و چرا تسلیم کر کے غلطی کر رہا ہوں۔ اگر پہلے میں اس بات پر قائل نہ ہو جاتا کہ میں ان دیوتاؤں کے پاس جا رہا ہوں جو دانا اور نیک ہیں (جن پر مجھے فی القدور یقین کامل ہے) اور دوسری بات (اگرچہ میں اس کا قائل نہیں ہوں) کہ میں ان کے پاس جا رہا ہوں جو ان سے بہتر ہیں جنھیں میں اس دنیا میں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اسی لیے میں اس پر ایسا آزردہ نہیں ہوں جیسا مجھے ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ مجھے یہ یقین ہے کہ مردوں کے لیے اب بھی یہاں بہت کچھ موجود ہے جیسا کہ زمانہ قدیم سے کہا جاتا رہا ہے کہ نیکوں کے لیے گناہ گاروں کے مقابلے کہیں زیادہ بہتر سامان یہاں موجود رہتا ہے۔

سیمیاس نے کہا۔ سقراط اس سے آپ کی مراد یہ تو نہیں ہے کہ آپ اپنے خیالات اور تصورات بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے؟ آپ انھیں ہم لوگوں کو عطا نہیں کریں گے؟ کیونکہ یہ ایسی مفید باتیں ہیں جن پر ہمارا حق بھی بنتا ہے۔ مزید برآں اگر آپ ہمیں قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہمارے الزام کا یہی جواب ہو سکتا ہے۔

سقراط نے کہا کہ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا لیکن پہلے مجھے کریٹو کی بات سننے دو کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے وہ بڑی دیر سے مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔

کریٹو نے جواب دیا کہ سقراط میں تم سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ جو خادم آپ کو زہر کا پیالہ پلائے گا، مجھ سے کہہ رہا تھا اور آپ سے بھی یہ کہنا چاہتا ہے کہ آپ زیادہ باتیں نہ کریں کیونکہ اس کے خیال میں باتیں کرنے سے بدن کی حرارت میں اضافہ ہو جاتا ہے جس سے زہر کے فوری موثر ہونے میں رکاوٹ پڑ

سکتی ہے، جس کی وجہ سے ایسے لوگ جو جذبات کو تحریک دیتے رہتے ہیں انھیں دوسرا اور بعض اوقات تیسرا پیالہ بھی پلانا پڑتا ہے۔

سقراط نے کہا تو پھر تم اسے کہہ دو کہ وہ دو یا تین بار زہر کا پیالہ پلانے کے لیے تیار رہے اور بس۔

کریٹو نے کہا مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ آپ کیا جواب دیں گے لیکن وہ کافی دیر سے مجھے مجبور کر رہا تھا کہ یہ بات آپ سے کہوں۔

سقراط نے کہا، اس کی پروانہ کرو اتنا کہہ کر وہ باتوں میں مصروف ہو گیا اچھا تو میرے منصفو! میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ موت کے منہ میں پہنچ کر حقیقی فلسفی (حقیقت طلب اور حق جو) ہمت نہیں ہارتا اور موت کے بعد اسے دوسری دنیا میں اعلیٰ ترین نعمتوں کے حصول کی توقع ہوتی ہے سیمیاس اور سی بیس میں کوشش کروں گا کہ یہ بتا دوں کہ نعمتیں کس طرح حاصل کی جا سکتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ میری رائے میں فلسفہ سے حقیقی لگاؤ رکھنے والے کے بارے میں لوگ ہمیشہ غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں۔ انھیں یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ موت سے اپنی مرضی سے کھیلتا رہتا ہے اور اگر حقیقت حال یہی ہو تو تمام زندگی موت کی تمنا میں گزار دیتا ہے اور ایسے میں جب مقررہ وقت آ جائے تو وہ ملول کیوں ہونے لگا؟ وہ تو اسی وقت کا متمنی تھا اور اسی کے لیے کوشاں بھی۔

سیمیاس نے ہنستے ہوئے کہا اگرچہ مجھے ہنسی نہیں آ رہی تھی مگر اُس نے مجھے ہنسا ہی ڈالا۔ کیونکہ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ سقراط جب لوگ آپ کی بات سنیں گے تو وہ یقیناً یہی سمجھیں گے کہ جو زندگی فلسفی کو پسند ہے وہ دراصل موت ہے اور موت ہی اس کا اصل مقصد ہے۔

سیمیاس وہ لوگ ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں۔ سوائے ان الفاظ کے کہ ''انھوں نے اس امر کا پتہ چلا لیا ہے'' لیکن انھوں نے یہ پتا نہیں چلایا کہ حقیقی فلسفی کن معنوں میں قریب المرگ یا موت کا مستحق ہوتا ہے یا وہ کس طرح کی موت کا اہل ہے اور لوگوں کے خیالات کا بیان کافی ہو چکا ہے۔ آیئے اب ہم لوگ اس مسئلے پر اپنی گفتگو کریں کہ کیا ''موت'' کے لفظ کا کوئی واضح مفہوم ہمارے ذہن میں ہے؟

سیمیاس نے کہا مجھے یقین ہے۔

کیا اس سے مراد جسم اور روح کی جدائی نہیں؟ اور موت اس عمل کی تکمیل ہے۔ روح جدا ہو کر خود اپنے وجود میں آ جاتی ہے اور جسم روح سے آزاد ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں موت کا یہی مفہوم ہے۔

اس نے کہا بات یہی ہے۔

اور سماعت ہی ہیں؟

اس نے جواب دیا، یقیناً۔

اچھا یہ بتاؤ کہ پھر روح پر حق کس وقت منکشف ہوتا ہے؟ کیونکہ جب روح کسی شے
کرکے غور کرتی ہے تو یقیناً جسم اسے گمراہ کرتا ہے۔

درست ہے۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اسے اصل حقیقت کا کچھ ادراک ہوتا ہے تو صرف اسی تصور
ہوتا ہے۔

جی ہاں۔

اور تصور اس وقت بہترین حالت میں ہوتا ہے جب ذہن یکسو اور مطمئن ہوتا ہے اور کوئی
مناظر، غم، خوشی اور نہ کوئی اور شے اسے پریشان کرتی ہے۔ جب روح جسم کو الوداع کہتی ہے اور اس سے
تعلق کم سے کم رہ جاتا ہے اور جب روح کو کوئی جسمانی احساس یا آرزو باقی نہیں رہتی تو اس حالت میں
ذات حق کی تمنائی ہوتی ہے۔

یقیناً درست ہے۔

اس موقع پر یہ خصوصیت پیدا ہوتی ہے کہ فلسفی جسم سے متنفر ہو جاتا ہے۔ اس کی روح جسم سے فرار
اختیار کرکے تنہا اور بے تعلق ہو جاتی ہے۔

یہ درست ہے۔ سیمیاس لیکن ایک اور بات بھی ہے کہ کیا کسی عدل مطلق کا وجود ہے بھی یا نہیں؟
یقیناً ہے۔

اور حسن مطلق اور مطلق نیکی بھی وجود رکھتے ہیں؟ بے شک۔

لیکن کیا تم نے کبھی انہیں کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یقیناً نہیں۔

یا تم نے کبھی کسی اور جسمانی حس سے اس کا ادراک کیا ہے؟ میں صرف ان خوبیوں اور صفات تک
ہی محدود نہیں ہوں بلکہ میرا مفہوم قطعی عظمت، صحت، قوت بلکہ ہر شے کی اصل حقیقت اور فطرت یعنی ذات کا
احاطہ کر رہا ہے۔ کیا ان کی اصل حقیقت جسمانی حواس کے ذریعہ معلوم کی جا سکتی ہے؟ یا انسان کو جو فطری
گوناں گوں صلاحیتیں ودیعت ہوئی ہیں۔ یہی ان کے علم کا قریب ترین وسیلہ ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی ذہنی
بصیرت اس طرح ترتیب دی گئی ہے کہ اسے ہر اس شے کی حقیقت کا صحیح ادراک ہوتا ہے جس پر وہ غور کرتا ہے۔

یقیناً۔

اور جو شخص صرف عقل سے کام لیتا ہے وہی ان کے بارے میں خالص علم حاصل کرتا ہے اور فکر کے ہی عمل میں عقل کے ساتھ بصارت یا کسی دیگر حس کا سہارا لیتا ہے یا اس کی مداخلت قبول کرتا ہے بلکہ وہ صرف خالص عقل ہے۔ ہر شے خالص ماہیت (حقیقت) کی تلاش کرتی ہے اور جو شخص حتی الامکان آنکھ اور کان بلکہ پورے جسم سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے اور انھیں ایسی بے جا مداخلت تصور کرتا ہے جو اگر روح میں شامل ہو جائیں تو حق اور علم کے حصول میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ اگر وہ نہیں تو پھر کون ہے جو ذات حقیقی کا علم حاصل کر سکتا ہے؟

سیمیاس نے جواب دیا کہ سقراط آپ کی باتوں میں قابل تعریف سچائی موجود ہے۔

اور جب حقیقی فلسفی ان امور کو زیر غور لاتا ہے تو کیا وہ ایسے خیالات کا اظہار نہیں کرے گا جنھیں میں بیان کرنے والا ہوں؟ وہ کہے گا کہ ہمیں فکر کی ایسی راہ حاصل ہو گئی ہے جو ہمیں اور ہماری دلیلوں کو انجام تک پہنچا دے گی یعنی جب تک ہم اپنے جسم میں مقید رہتے ہیں اور روح جسمانی آلائشوں سے آلودہ رہتی ہے، ہماری آرزو کی تکمیل ممکن نہیں ہوتی۔ ہماری آرزو حصول حقیقت ہے اور بس۔ کیونکہ ہمارا جسم بے شمار موانعات کی آماجگاہ ہوتا ہے جس کی بنیاد صرف غذائی ضروریات ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ امراض بھی ہوتے ہیں جو تلاش حق میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ غذا، عشق و حرص کے جذبات، خوف، طرح طرح کے قیاس اور مفروضے اور احمقانہ حرکات، سچائی کو آلودہ کر کے قوت فکر کو سلب کر دیتی ہیں، جس کے نتیجے میں جنگ و جدل اور گروہ بندیاں سر اٹھاتی ہیں؟ یہ جسم اور اس کی پیدا کردہ ہوس سے ہی فروغ پاتی ہیں۔ ہر جنگ صرف دولت کے لیے لڑی جاتی ہے اور دولت کا حصول جسم کی غلامانہ اعانت ہی کے لیے ہوتا ہے۔ ایسے ہی موانعات کے سبب فلسفے پر وقت صرف کرنے کا وقت نہیں ملتا۔ آخری اور بدترین بات یہ ہے کہ بالفرض محال اگر جسم تھوڑی بہت فرصت دے بھی دے اور ہمیں سوچنے سمجھنے کا تھوڑا بہت موقع مل بھی جائے پھر بھی یہ رکاوٹیں ہماری راہ میں حائل ہوتی ہی رہتی ہیں جو ہمارے تحقیقی عمل میں افراتفری پھیلا دیتی ہیں اور ہمیں اتنا پریشان کر دیتی ہیں کہ حقیقت خرافات میں ہی کہیں کھو جاتی ہے۔ تجربے سے یہ بات ثابت ہے کہ اگر ہمیں کسی شے کا حقیقی علم مطلوب ہے تو ہمیں جسم سے نجات حاصل کرنا ہو گی۔ روح تنہا ہو کر ہی حقیقت اشیا کا ادراک کر سکتی ہے۔ اس کے بعد ہی ہمیں اپنی دلی مراد حاصل ہو گی جس کی ہمیں لگن ہوتی ہے اور وہ ہے ''دانش''، جس کا حصول زندگی میں ممکن نہیں بلکہ دلیل کے مطابق موت کے بعد ہی ممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ روح جب تک جسم میں رہتی ہے اسے حقیقی

علم نہیں مل سکتا۔ اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں یعنی یا تو حقیقی علم نا قابل حصول ہے یا اس کا حصول موت کے بعد ہی ممکن ہے۔ کیونکہ اسی صورت میں جب تک روح جسم سے علیحدہ ہو گی اور بذات خود موجود رہے گی، اپنی موجودہ زندگی میں ہمیں یہ گمان رہتا ہے کہ ہم اس وقت علم کے قریب پہنچتے ہیں جب جسم سے ہمارا کم از کم تعلق اور وابستگی رہتی ہے اور جسمانی عوارض کی اذیت سے محفوظ رہتے ہیں اور خود کو اس وقت تک پاکیزہ رکھتے ہیں جب خود خدا ہمیں اس سے نجات نہیں دیتا۔ اس طرح احمقانہ جسمانی اعمال سے نجات پا کر ہمیں پاکیزگی نصیب ہو گی اور ہم ذات قدوس سے رابطہ استوار کر کے وہ تمام باتیں معلوم کر لیں گے جو آمیزش اور آلائش سے پاک کاملیت میں مضمر ہیں۔ جو میرے خیال میں سوائے صداقت کے اور کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ ناپاکی کو پاکیزگی پر قابض ہونے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ سیمیاس یہی وہ الفاظ ہیں جو علم سے صحیح معنوں میں محبت کرنے والے آپس میں ایک دوسرے سے کہتے رہتے ہیں، سوچتے رہتے ہیں، تمھیں یہ تسلیم ہے یا نہیں؟

سقراط اس میں کیا شک ہے؟

لیکن اے میرے دوست! اگر یہ بات درست ہے تو پھر صورتِ حال کافی پر امید معلوم ہوتی ہے۔ اب جبکہ میرا سفر ختم ہونے والا ہے اور جہاں ہمیں آخر کار جانا ہے اسی مقام پر ہمیں وہ مقصد حاصل ہو جائے گا جس کے لیے ہم زندگی بھر سرگرداں رہتے ہیں، اسی لیے میں اپنی قیام گاہ کی اس تبدیلی کو جس کا مجھے حکم دیا گیا ہے برضا و رغبت قبول کرتا ہوں۔ ایسا صرف میں ہی نہیں کر رہا ہوں بلکہ ہر وہ شخص کرتا ہے جس کا یہ ایمان ہے کہ اس کا ذہن اس مکانی تبدیلی پر تیار کر لیا گیا ہے اور وہ ایک طرح سے پاک ہو گیا ہے۔

سیمیاس نے کہا یقیناً۔

اس سے کیا یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ پاکیزگی روح کی جسم سے جدائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور ہماری گفتگو کچھ دیر سے اسی موضوع پر جاری ہے کہ روح کس طرح خود کو جسم سے جدا کر کے صرف اور صرف خود اپنے آپ کو اپنے ہی اندر مجتمع کرتی ہے اور اپنے مقام پر اپنے ساتھ قیام کرنے پر راغب ہوتی ہے۔ روح جسم کی زنجیروں سے آزادی کی حالت میں اپنے مقدور پر جمی رہتی ہے۔

اس نے کہا بالکل سچ ہے۔

کیا موت روح کے جسم سے علیحدہ اور آزاد ہو جانے کا ہی نام نہیں ہے؟

اس نے کہا اس میں کیا شک ہے۔

اور صرف حقیقی فلسفی ہی ہمیشہ روح کو پابندیوں سے آزاد کرانے کی سعی میں مصروف رہتے ہیں۔

کیا روح کی جسم سے علیحدگی اور پابندیوں سے آزادی ان کے مطالعہ کا خصوصی موضوع نہیں ہے؟

درست ہے۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں کہا تھا یہ امر بڑا مضحکہ خیز تضاد کا مظہر ہوگا کہ کوئی شخص جہاں تک ہو سکے زندگی کو موت کی قریب ترین حالت میں گزارنے کا مطالعہ کرتا رہے اور جب موت کی گھڑی آتی ہے تو وہ ملول ہو جائے۔

یقیناً۔

سیمیاس دراصل حقیقی فلسفی (علم دوست اور حق جو) ہمیشہ موت کی مشق کرنے میں مصروف رہتے ہیں جس سبب سے انھیں موت کا خوف تمام دیگر انسانوں سے کہیں کم ہوتا ہے۔ اس معاملے پر اس طرح نظر ڈالو کہ اگر وہ ہر طرح سے جسم سے جدا رہتے ہیں اور صرف روح کی محبت میں رہنا چاہتے ہیں اور جب ان کی یہ تمنا پوری ہونے والی ہو تو ایسی صورت میں اگر وہ بجائے خوشی کے شادیانے بجانے کے تھر تھر کانپ رہے ہوں، آہ وزاری کر رہے ہوں تو کیا ان کا یہ فعل غیر مناسب نہیں ہوگا کیونکہ وہ اسی مقام کی طرف جا رہے ہیں جہاں وہ جب پہنچیں گے تو انھیں اس مقصد کے حصول کی توقع ہوگی جس کے لیے وہ عمر بھر کوشش کرتے رہے تھے۔ ان کی یہ خواہش ''دانش'' کے حصول کے ساتھ ساتھ اپنے دشمن سے نجات کی بھی تھی۔ بہت سے لوگ جو موت کے سبب دنیاوی محبتوں اور بیوی بچوں سے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں وہ ان ہی کی تلاش میں دوسری دنیا میں جاتے ہیں اور ان کے وہاں ملنے کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں لیکن کیا ایسا شخص جو دانش سے حقیقی محبت کرتا ہے اسے اسی طرح پر جوش بنایا جاتا ہے کہ وہ اپنی دلی مراد دوسری دنیا ہی میں حاصل کرلے گا۔ کیا وہ موت کے آنے پر ملول ہوگا؟ کیا وہ خوشی خوشی رخصت نہیں ہوگا؟ یقیناً وہ خوشی سے دنیا چھوڑے گا۔ اے میرے دوست! اگر وہ صحیح معنوں میں فلسفی (حق جو) ہوگا تو ایسا ہی کرے گا کیونکہ اسے کامل یقین ہوگا کہ اسے اسی دنیا میں حقیقی دانش حاصل ہوگی اور اگر یہ بات درست ہے تو اگر وہ موت سے ڈرتا ہے تو یہ اس کی نامعقولیت ہوگی جیسا کہ میں پہلے بھی یہ کہہ چکا ہوں۔

سیمیاس نے کہا یقیناً یہ درست ہے۔

اور آپ کسی کو بوقت مرگ تاسف اور ملال کرتا دیکھیں تو کیا اس کی یہ ہچکچاہٹ اس امر کا کافی ثبوت نہیں ہے کہ بہر صورت وہ دانش کو نہیں بلکہ جسم کو عزیز رکھتا ہے اور غالباً اسی کے ساتھ ساتھ اسے دولت یا سیاسی قوت یا ان دونوں ہی سے لگاؤ ہے؟

اس نے کہا حقیقتاً بالکل ایسا ہی ہے۔

سیمیاس ذرا سوچو کہ کیا وہ خوبی جسے ہم جرأت کہتے ہیں فلسفیوں کی خصوصیت نہیں ہے؟

یقیناً ہے۔

دوسری خوبی اعتدال ذات کی ہے جس سے عام لوگ بھی جذبات کے ہیجان پر سکون قلب سے قابو پانا مراد لیتے ہیں اور ایسا شخص ہی اعتدال پسند ہوتا ہے۔ کیا یہ اعتدال پسندی ایسے شخص کی خصوصیت نہیں ہے جو جسم سے نفرت کرتا ہے اور فلسفیانہ غور و فکر میں زندگی گزارتا ہے؟ یہ بات نہایت اطمینان بخش ہے۔ اگر غور کرو تو دوسرے افراد جرأت اور اعتدال پسندی کے بارے میں ایک تضاد کا شکار ہیں۔

وہ کس طرح؟

انھوں نے کہا دیکھو تم جانتے ہی ہو کہ عام لوگ موت کو بہت زیادہ افسوس ناک تصور کرتے ہیں۔

اس نے کہا بالکل درست ہے۔ اور کیا حوصلہ مند لوگ موت اس لیے نہیں قبول کرتے کہ وہ اس سے بھی بڑی مصیبت سے خوف زدہ ہوتے ہیں؟

سچ ہے۔

فلسفی ہی ہے جو سب لوگوں سے زیادہ صرف خوف سے بے خوف رہتا ہے کیونکہ دوسرے کسی نہ کسی وجہ سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ کیا یہ انوکھی بات نہیں ہے کہ انسان خوف پر جرأت اور حوصلے سے قابو بھی پائے اور اپنی بزدلی کے باعث ڈرتا بھی رہے۔

بالکل درست ہے۔

اور کیا خود کو قابو میں رکھنے والوں کا یہی معاملہ نہیں ہے؟ وہ اعتدال ذات کے حامل ہوتے ہیں اور ایک لحاظ سے وہ غیر اعتدال پسند ہوتے ہیں جو ایک ناممکن صورت نظر آتی ہے۔ تاہم ایسی صورت حال بے تدبیر اعتدال پسندی کے طفیل رونما ہوتی ہے کیونکہ یہ ایسی مسرتیں ہوتی ہیں جن سے وہ محروم ہونا نہیں چاہتے اور انھیں جاری رکھنے کی تمنا میں وہ چند مسرتوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں کیونکہ دوسری مسرتیں ان پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ اگر مسرتوں اور لذتوں کو خود پر طاری کرنے کو لوگ غیر اعتدال پسندی کہتے ہیں تو ان کی نظر میں مسرت پر قابو پانا خود مسرتوں سے زیر ہو جانا ہے اور جب میں یہ کہتا ہوں کہ ایک لحاظ سے وہ غیر اعتدال پسندی کے طفیل اعتدال پسند بن جاتے ہیں تو اس کا مفہوم یہی ہوتا ہے۔

بظاہر تو معاملہ ایسا ہی نظر آتا ہے۔

اخلاقی امتیاز کے معیار کے مطابق یہ بات درست نہیں ہوگی کہ کسی خوف یا خوشی یا کلفت کا کم وبیش لحاظ رکھتے ہوئے کسی دیگر خوف، خوشی یا کلفت سے سکوں کی طرح تبادلہ کرلیا جائے۔ میرے عزیز سیمیاس! اگر ایسا کوئی ایک ہی حقیقی سکہ ہے جس کے عوض ان سب کا تبادلہ کیا جا سکے؟ وہ سکہ ہے ''دانش'' اور ہمیں حقیقی حوصلہ یا اعتدال پسندی، یا عدل کا حصول اسی کی معیت میں ممکن ہے۔ ایک ہی لفظ میں تمام حقیقی خوبیاں صرف دانش ہی کے مساوی ہو سکتی ہیں۔ وہ جب خوف، خوشی یا اسی قبیل کی دیگر خوبیاں جیسے مسائل کے ہمرکاب ہوتی ہیں لیکن جو نیکی ان تمام خوبیوں سے عبارت ہوتی ہے اور جب اس کا تعلق دانش سے منقطع کر کے انھیں آپس ہی میں ایک دوسرے سے تبدیل کیا جاتا ہے تو گویا وہ صرف نیکی کا دکھاوا ہی رہ جاتا ہے یا ایک گھٹیا خصوصیت رہ جاتی ہے جو جعلی اور عارضی ہوتی ہے۔ حقیقت اس سے کہیں مختلف ہوتی ہے۔ اعتدال ذات، عدل و حوصلہ مندی دراصل ایسی ہی خصوصیات کے ترک کرنے کا نام ہے اور خود دانش ایک طرح سے ان ہی خوبیوں کا دوسرا نام ہے۔ اس کے اسرار کی معرفت رکھنے والے بظاہر اس کے حقیقی مفہوم کا ادراک رکھتے ہیں اور وہ فہم وفراست سے عاری نہیں تھے جب انھوں نے بہت پہلے ایک تصویر کے ذریعہ یہ اظہار کیا تھا کہ جو دوسری دنیا میں ناپاک اور علم سے بے بہرہ داخل ہوگا وہ گناہوں کی دلدل میں پڑا رہے گا لیکن جو پاکیزہ حالت اور باضابطہ طور پر علم سے لیس ہو کر آئے گا وہ دیوتاؤں کے ہمراہ رہے گا جیسا کہ مذہبی سوانگ میں کیا جاتا ہے کہ زیادہ تر نشان بردار کم ہی عارف ہوتے ہیں۔ یعنی میری ناقص فہم کے مطابق اس لفظ کا مفہوم ''حقیقی فلسفی'' ہے، جس کے زمرہ میں شامل ہونے کے لیے میں تمام عمر حتی المقدور کوشاں رہا ہوں۔ میری یہ کوشش درست طور پر جاری رہی یا نہیں، ہم کامیاب ہوئے یا نہیں، ابھی تھوڑی دیر بعد جب ہم دوسری دنیا میں پہنچیں تو دیوتاؤں نے چاہا تو ہمیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ یہی میرا ایمان ہے۔ سیمیاس اور سی بیس (Cebes) سن لو کہ اس دنیا سے اپنے آقاؤں سے اور آپ لوگوں سے جدا ہوتے وقت مجھے نہ کوئی رنج ہے اور نہ ہی کوئی بے چینی۔ اور یہ رویہ درست ہے کیونکہ مجھے کامل یقین ہے کہ دوسری دنیا میں بھی مجھے ایسے ہی عمدہ آقا اور احباب میسر آئیں گے۔ اگر میں نے ایتھنز کے منصفوں سے کہیں بہتر طریقے سے آپ کو اپنے دفاع کا قائل کر لیا ہے تو اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔

سقراط کی گفتگو کے ختم ہونے کے بعد سی بیس نے بولنا شروع کر دیا ہے کہ سقراط آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کی بیشتر باتوں سے مجھے اتفاق ہے لیکن جہاں تک روح کا تعلق ہے اس کے بارے میں لوگ بے یقینی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ روح جب جسم سے الگ ہو جاتی ہے تو اس کا کہیں کوئی ٹھکانا

نہیں ہوتا اور ہوسکتا ہے کہ فرد کی موت کے فوراً بعد جسم سے علیحدہ ہوتے ہی وہ بالکل دھوئیں کی طرح نیست و نابود ہو جاتی ہے اور جسم سے نکل کر اڑتے اڑتے معدوم ہو جاتی ہے اور آپ کے قول کے مطابق وہ جسم سے نکلتے ہی تمام برائیوں سے پاک وصاف ہو جاتی ہے اور اگر اسے اس حالت میں مجتمع کر لیا جائے تو پھر کہیں جا کر آپ نے رائے کے مطابق روح کی عمدہ اور پاکیزہ حالت کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ یقیناً اس امر کے ثبوت کے لیے بہت زیادہ قوت اور شواہد کی ضرورت ہوگی کہ فرد کی موت کے بعد بھی اس کی روح زندہ رہتی ہے۔ اس میں قوت اور فہم وفراست موجود رہتی ہے۔

سقراط نے کہا سی بیس تمہاری بات درست ہے۔ میری یہ تجویز ہے کہ آیئے ہم دونوں مل کر ان امور کے امکانات پر غور کریں۔ کیا یہ ممکن ہے؟

سی بیس نے کہا جہاں تک میرا تعلق ہے میں آپ کی رائے معلوم کرنے کا شدید متمنی ہوں۔

سقراط نے کہا میرا اندازہ ہے کہ آج جن لوگوں نے میری باتوں کو سنا ہے خواہ وہ میرے پرانے دشمن ہوں، طنز نگار شاعر ہوں، مجھ پر یہ الزام نہیں لگائیں گے کہ میں بے معنی موضوعات پر لب کشائی کر رہا ہوں اور ان سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔ تاہم اگر آپ چاہتے ہیں تو ہم اپنی تحقیق جاری رکھ سکتے ہیں۔

چلیے اس مسئلہ پر غور کریں کہ آیا انسانی روح موت کے بعد دوسری دنیا میں موجود رہتی ہے یا نہیں؟ مجھے ایک قدیم نظریہ یاد آ رہا ہے جس کے مطابق روحیں موت کے بعد دوسری دنیا میں موجود رہتی ہیں۔ وہاں سے واپس بھی لوٹتی ہیں اور مرنے والوں میں سے نیا جنم لیتی ہیں۔ اگر یہ بات درست ہے کہ زندگی موت سے ظہور پذیر ہوتی ہے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہماری روحیں وہاں موجود رہتی ہیں کیونکہ اگر وہاں نہ ہوں تو پھر ان کا دوبارہ جنم کس طرح ہو سکتا ہے اور یہ امر اسی صورت میں حتمی ہو سکتا ہے کہ یہ ثابت ہو جائے کہ زندہ ہستیاں مردوں سے ظہور پذیر ہوتی ہیں اور اس کا کوئی اور ماخذ نہیں ہوتا لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو اس کے لیے دوسرے دلائل تلاش کرنا ہوں گے۔

سی بیس نے کہا بالکل یہی بات ہے۔

پھر تو ہمیں چاہیے کہ ہم پورے مسئلے پر نہ صرف انسان بلکہ عام حیوانات، جمادات اور ہر اس شے کے حوالے سے غور کریں جو پیدا ہوتی ہے، پھر اس کا ثبوت فراہم کرنا آسان ہوگا۔ کیا یہ بات درست نہیں ہے کہ جو دو شے جس کا نقیض موجود ہے وہ اپنے نقیض ہی سے وجود میں آتی ہیں۔ میرا مطلب ہے مثلاً خوبصورت اور بدصورت، انصاف اور ناانصافی، اسی طرح کی لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔ آیئے اب ہم اس بات کو زیر غور

نہیں کہ کیا یہ ضروری ہے کہ کوئی شے اپنے نقیض ہی سے وجود پذیر ہو اور اس کا کوئی اور ماخذ نہ ہو، مثلاً جو شے بڑی ہوتی ہے وہ ظاہر ہے چھوٹی سے بڑی ہوئی ہوگی اور جو شے چھوٹی ہو جاتی ہے ظاہر ہے وہ کبھی نہ کبھی بڑی بھی رہی ہوگی، اس لیے چھوٹی ہوئی۔ یعنی اگر کوئی شے اعلیٰ ہے تو یقیناً کبھی ادنیٰ رہی ہوگی اور اسی طرح ادنیٰ بھی کبھی اعلیٰ رہی ہوگی۔

جی ہاں۔

اسی طرح کمزوری بھی طاقت ہی سے ظہور پذیر ہوتی ہے اسی طرح چستی سستی کی پیداوار ہے۔

بالکل درست ہے۔

بدتر کی پیدائش بہتر ہی سے ہوتی ہے۔ عادل تر بھی غیر عادل تر کی ہی ایک صورت ہے۔

یقیناً۔ کیا یہی بات تمام تضادات پر صادق آتی ہے؟ اور کیا ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ تمام اپنے تناقض ہی کا ظہور ہیں۔ جی ہاں۔

اور اشیا کے اس عالمگیر تناقض میں دو درمیانی قسم کے طریق عمل ایسے ہیں جو ہمیشہ ایک تناقص سے دوسرے تناقض تک جاری رہتے ہیں، مثلاً جہاں بڑا اور چھوٹا ہوتا ہے، وہیں بڑھنے اور گھٹنے کا درمیانی عمل بھی ہوتا ہے جس کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ شے بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے۔

اس نے کہا جی ہاں۔ اور اس کے علاوہ بھی مزید طریقے ہیں، مثلاً تجزیہ اور اتصال، ٹھنڈا ہونا اور گرم ہونا جس میں ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے کا عمل موجود ہوتا ہے۔ یہ بات یقیناً تمام تضادات پر صادق آتی ہے۔ اگرچہ انھیں ہمیشہ الفاظ میں ادا نہیں کیا جاتا۔ فی الحقیقت وہ ایک دوسرے ہی میں سے عالم وجود میں آتی ہیں اور ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے کا ایک طریق عمل ہوتا ہے۔

اس نے جواب دیا بالکل درست ہے۔

تو پھر کیا زندہ رہنے کا اسی طرح تضاد نہیں ہے جس طرح نیند تضاد ہے بیداری کا؟

اس نے کہا، درست ہے۔

اور یہ کون سی حالت ہے؟

اس نے کہا یہ موت ہے۔

اور اگر یہ تضادات ہیں اور ایک دوسرے سے ظہور پذیر بھی ہوتے ہیں تو ان کا ایک درمیانی طریق عمل بھی ہوتا ہوگا۔
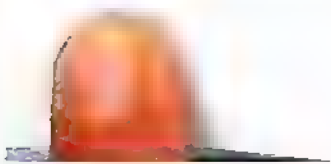
یقیناً۔

سقراط نے کہا چلیے ہم تضادات میں سے کسی ایک جوڑے کا، جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا ہے، اس کے درمیانی طریق عمل کا تجزیہ کرتے ہیں۔ آپ دوسرے جوڑے کا میرے لیے تجزیہ کیجیے گا پہلے جوڑے کے رکن میں نیند اور بیداری ہیں۔ کوئی سوتا ہے تو ہی جاگتا ہے اور جاگتا ہے جب ہی سوتا ہے اور اس تبدیلی کا طریق کار ایک صورت میں سو جانا ہے اور دوسری صورت میں جاگنا ہے۔ آپ مانتے ہیں نا؟

بالکل تسلیم کرتا ہوں۔

چلیے اب آپ میرے لیے اسی طرح موت و حیات کا تجزیہ پیش کریں۔ کیا موت کی حالت، زندگی کی حالت کا تناقض نہیں ہے۔

جی ہاں۔

اور وہ ایک دوسرے میں سے ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

جی ہاں۔

زندگی سے کیا ظہور پذیر ہوتا ہے۔

موت۔

اور موت سے کیا؟

میں جواب میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ زندگی اور بس۔

سی بیس اس کا مطلب ہوا کہ زندہ شے یا فرد، مردہ شے یا فرد سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

اس نے کہا نظر تو ایسا ہی آتا ہے۔

تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہماری روحیں دوسری دنیا میں موجود ہوتی ہیں۔

اس نے کہا کہ ظاہر ہے۔

اور دونوں میں سے ایک طریق کار یعنی پیدائش کا عمل نظر آتا ہے کیونکہ موت کا عمل تو صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس نے کہا یقیناً۔

پھر اس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے؟ کیا ہم متضاد عمل کو خارج کر سکتے ہیں اور کیا ہم قدرت کو اس طریق کار میں عضو معطل سمجھ لیں۔ کیا ہم موت کے عمل کے لیے ظہور پذیری کا کوئی موزوں طریقہ متعین نہیں کر سکتے۔

اس نے جواب دیا یقیناً۔

اور وہ کیا ہوگا؟ زندہ صورت میں واپسی اور اگر ایسا کوئی طریقہ موجود ہے تو زندہ صورت میں واپسی
...نے والوں میں موت کا ظہور پذیر ہوتا ہوگا۔

بجا ارشاد۔ اس طرح اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے کہ زندہ اشیا مردہ اشیا سے اسی طرح جنم لیتی
ہیں جس طرح مردہ اشیا زندہ سے، ایک دوسرا طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ ہم نے پہلے یہ تسلیم کیا تھا کہ اگر یہ
بات ٹھیک ہے تو اس کے لیے یہ ثبوت کافی ہوگا کہ مردوں میں روحیں کسی ایسی جگہ موجود ہوتی ہیں جہاں سے وہ
...جاتی ہیں۔

اس نے کہا سقراط یہ بات درست ہے۔ یہ نتیجہ تسلیم شدہ اموری سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات
یقینی ہے۔

اس نے کہا سی بیس ان باتوں کا تسلیم کرنا غلط نہیں تھا۔ اس کے لیے درج ذیل ثبوت کافی ہوگا۔ اگر
ظہور پذیری ایک خط مستقیم میں واقع ہوتی ہے اور قدرت میں کوئی پاسنگ یا دائرہ یا عناصر میں موڑ یا اپنے تضاد
میں واپسی نہیں ہے تو آپ کو علم ہوگا کہ ہر شے کی ایک ہی صورت اور ایک ہی انجام ہوگا اور ان کی کسی قسم کی ظہور
پذیری نہیں ہوگی۔

اس نے کہا آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

اس نے جواب دیا ایک بالکل سادہ سی بات جسے میں نیند کی مثال سے واضح کروں گا۔ آپ تو
جانتے ہی کہ اگر خواب اور بیداری یکے بعد دیگرے پیدا نہ ہوں تو خوابیدہ اینڈیمیون (Endymion) کی
داستان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہے گی کیونکہ دیگر اشیا بھی محو خواب ہی رہیں گی اور اس میں اور دوسروں میں
کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ اور اگر جوہر کا تجزیہ نہ ہو بلکہ صرف ترکیب ہی ترکیب ہو تو ہمیں انکساغورث کی
نی افراتفری کا سامنا کرنا ہوگا' (جہاں ہر شے مجتمع تھی)۔ میرے عزیز سی بیس! اسی طرح اگر تمام اشیا جن میں
زندگی موجود ہے مر جائیں اور مرنے کے بعد حالت موت میں رہے اور دوبارہ زندہ نہ ہو تو بالآخر ہر شے مردہ ہو
جائے گی کہیں بھی زندگی نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے؟ کیونکہ اگر زندہ اشیا کا ماخذ کچھ اور
ہے اور زندہ اشیا مر جائیں تو کیا تمام اشیا آخر کار موت کے منہ میں نہیں چلی جائیں گی؟

سی بیس نے کہا سقراط اس سے تو فرار ممکن نہیں۔ مجھے تو آپ کے دلائل بالکل ہی صحیح نظر آ رہے ہیں۔

اس نے کہا سی بیس یہ بات میری رائے میں بالکل درست ہے اور ان باتوں کو تسلیم کرنے میں ہمیں
کذب کا شکار نہیں ہونا چاہیے، لیکن مجھے یقین ہے کہ دوبارہ زندگی (حیات بعد از موت) ایک حقیقت ہے

اور یہ زندگی موت سے پیدا ہوتی ہے اور مُردوں کی روحیں زندہ رہتی ہیں۔

سی بیس نے بات کاٹتے ہوئے کہا سقراط یہ تو آپ کا پسندیدہ اصول ہے کہ علم محض یادداشت کا نام ہے۔ اور یہ بات درست ہے تو اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ پہلے ایک وقت ایسا گزر چکا ہے جس میں ہم نے وہ بات سیکھی تھی جسے اب ہم یاد کر رہے ہیں لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہوگا جب تک ہم یہ تسلیم نہ کر لیں کہ ہماری روح انسانی قالب میں آنے سے قبل کسی اور مقام پر موجود تھی۔ روح کے امر ہونے کا یہ دوسرا ثبوت ہے۔

لیکن سیمیاس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ سی بیس ذرا یہ تو بتاؤ کہ یادداشت کے اصول کے حق میں دلائل کیا کیا ہیں، اس وقت مجھے وہ اچھی طرح یاد نہیں ہے۔

سی بیس نے کہا ان سوالات کے توسط سے ایک نہایت ہی عمدہ ثبوت حاصل ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی شخص سے معقول انداز میں سوال پوچھیں تو وہ اپنے بارے میں صحیح صحیح جواب دے گا لیکن وہ ایسا اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک اس کا علم اور معاملے کا درست مفہوم اس کے ذہن میں پہلے سے موجود نہ ہو۔ مزید براں یہ بات اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی جب نقشہ یا خطوط سے مرتب کسی اور ہیئت کو اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

سقراط نے کہا سیمیاس! اگر بعینہٖ تم تذبذب میں مبتلا ہو تو اس معاملے پر ایک دوسرے انداز سے غور کرنے کے باوجود اگر تم مجھ سے متفق نہ ہوئے تو میں تم سے کچھ اور سوالات کروں گا یعنی اگر تم پھر بھی تسلیم نہیں کرتے کہ جسے علم کہا جاتا ہے وہ محض یادداشت ہے؟

سیمیاس نے کہا کہ مجھے یقین نہیں ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یادداشت کے اس اصول کو میں اپنی یادداشت میں تازہ کروں اور جو باتیں سی بیس نے کی ہیں ان میں سے مجھے کچھ کچھ یاد آ رہی ہیں اور میں قائل بھی ہو رہا ہوں تاہم میری خواہش کہ آپ بھی اس ضمن میں فرمائیں۔

انھوں نے جواب دیا کہ اس ضمن میں مجھے اتنا ہی کہنا ہے کہ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو ہمیں یہ بات تسلیم کر لینا چاہیے کہ انسان جو کچھ یاد کرتا ہے گزشتہ زمانے میں کسی نہ کسی وقت وہ بات اس کے علم میں آئی ہوتی ہے۔

بالکل درست ہے۔

آپ کے خیال میں اس علم یا یادداشت کی حقیقت کیا ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص جو بات دیکھتا ہے یا سنتا ہے یا کسی بھی طرح اس کا احساس کرتا ہے وہ صرف اور صرف متعلقہ چیز کے

سے ... جان لینا ہے نہ کہ خود اس چیز کو اپنے ذہن میں لانا۔ ایسی صورت میں تو اس کے علم کی نوعیت اصل سے الگ ہوگی۔ اس صورت میں کیا یہ امر قرین انصاف نہیں ہوگا کہ اسے صرف وہی بات یاد آتی ہے جس کے بارے میں وہ غور کرتا ہے؟

یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس کا مفہوم کیا ہے۔

میں اپنے مفہوم کو درج ذیل مثال سے واضح کروں گا کسی بربط کا علم ویسا ہی نہیں ہوتا جیسا کسی ... سے متعلق ہوتا ہے۔

جی ہاں بالکل نہیں۔

اور ان عشاق کے جذبات کیا ہوتے ہیں جب وہ اس بربط، عبا یا کسی اور شے کی ستائش کرتے ہیں جو ان کے محبوب کے زیر استعمال رہی ہو۔ کیا وہ بربط کو شناخت کر کے اس محبوب کی شبیہ اپنے ذہن میں تیار نہیں کرتے جو اس کا مالک ہے۔ یہی تو یادداشت ہے۔ اسی طرح جو محض سیمیاس کو دیکھتا ہے وہ سی بیس کو یاد کر سکتا ہے اور ایسی مثالیں لا متناہی ہیں۔

سیمیاس نے جواب دیا یقیناً لا متناہی ہیں اور دراصل یادداشت ان باتوں کی یاد دہانی ہے جو وقت اور عدم توجہی کے باعث فراموش ہو گئی ہیں۔

بالکل درست ہے اور کیا کسی گھوڑے یا بربط کی تصویر دیکھ کر آپ کو کوئی آدمی یاد نہیں آتا؟ اور کیا سیمیاس کی تصویر آپ کو سی بیس کی یاد دلا سکتی ہے؟

درست ہے۔ یا آپ سیمیاس کو بذات یاد کر سکتے ہیں۔

بالکل۔

ان تمام مثالوں سے ظاہر ہے کہ یادداشت یا تو مماثلت سے حاصل ہوتی ہے یا غیر مماثلت ہے۔

ہو سکتا ہے۔

اور جب کوئی شے مماثلت سے ذہن میں آتی ہے تو ایک اور تصور بھی یقینی طور پر پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا یہ مماثلت جو کچھ یادداشت میں ہے اس کے عین مطابق ہے یا کسی حد تک۔ (آیا مماثلت کلی یا جزوی؟)

اس نے کہا یقیناً۔

مجھے ذرا بات کو آگے بڑھانے کی اجازت دیں۔ ہم اس بات کی تصدیق کرتے ہیں، کیا نہیں

کرتے کہ برابری وجود رکھتی ہے جو نہ صرف لکڑی یا پتھر یا اسی طرح کے کسی اور مادے کے ٹکڑوں کی طرح ہو بلکہ ان سے ماورا ایک قطعی برابری بھی ہوتی ہے۔ کیا ہم ایسا نہیں کہہ سکتے؟ (لامتناہی محدود مادی وجود سے ماورا)۔ سیمیاس نے جواب دیا ایسا کہہ سکتے ہیں اور زندگی بھر کے اعتماد کی قسم اٹھا کر کہہ سکتے ہیں۔

کیا ہم اس قطعی حقیقت (خالص اور مادی وجود سے مبرا) ماہیت سے واقف ہیں؟

اس نے کہا یقیناً۔ اور ہمیں یہ علم کب اور کہاں سے حاصل ہوا۔ کیا ہمیں لکڑی اور پتھر کے ٹکڑے جیسی مادی اشیا کی برابری نظر نہیں آتی۔ ایسی مادی اشیا کے مشاہدے سے ہم مساوات کا ایک غیر مادی تصور وجود میں نہیں لاتے۔ اور برابری کا یہ تصور ان اشیا سے مختلف ہوتا ہے؟ کیا آپ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان میں فرق موجود ہے؟ یا اس معاملے پر ایک اور طرح سے نظر ڈالیے کہ کیا لکڑی یا پتھر کے وہی ٹکڑے کسی کو برابر نظر آتے ہیں اور دوسرے کو غیر مساوی۔ یہ یقینی ہے۔

لیکن کیا قطعی مساوی ٹکڑے کبھی غیر مساوی نظر آتے ہیں اور برابری یا نابرابری نظر آتی ہے۔ سقراط قطعی نہیں۔

تو پھر کیا یہ مساوی اشیا حقیقی طور پر مساوی ہیں اور کیا برابری کا تصور ایسا ہی ہے جیسے کہ نابرابری کا؟

سقراط میں تو کہوں گا کہ صاف ظاہر ہے، ایسا نہیں ہے۔ تاہم ان کے برابر ٹکڑوں سے جو ہر چند برابری کے تصور سے مختلف ہیں، آپ کو اس تصور کا علم حاصل ہوتا ہے۔

اس نے کہا بالکل درست ہے۔

جو ہو سکتا ہے اس کے مثل ہو یا نہ ہو؟

جی ہاں۔

لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا جب تک آپ کسی شے کو دیکھ کر کسی شے کا تصور کرتے ہیں خواہ اس جیسی ہو یا نہ ہو۔ یقیناً اس میں یادداشت کا عمل دخل ضرور رہے گا۔

بالکل سچ ہے۔

لیکن آپ لکڑی یا دوسری مادی اشیا کے برابر برابر ٹکڑوں کی برابری کے بارے میں کیا کہیں گے؟ وہ جو تاثر پیدا کرتے ہیں وہ کیا ہے؟ کیا وہ خالص مساوات (مادے سے مبرا) کی طرح ایک دوسرے کے مساوی ہیں؟ یا وہ ایک انداز سے خالص مساوات سے کسی نہ کسی حد تک کم ہوتے ہیں؟

اس نے کہا جی ہاں بڑی حد تک۔

تو کیا ہمیں یہ تسلیم نہیں کر لینا چاہیے کہ کسی شے کو دیکھتے ہوئے جب کوئی فرد یہ سوچے کہ جو شے میں دیکھ رہا ہوں وہ مجھے کسی اور شے جیسی نظر آ رہی ہے لیکن وہ بالکل ہی ویسی نہیں بلکہ ایسی کچھ کمی ضرور ہے اور کچھ کمتر ہے۔ کیا جو یہ بات سوچ رہا ہے ضروری ہے کہ اسے کسی ایسی شے کا پہلے ہی سے علم ہوگا کہ دوسری شے اس کے جیسی ہی تھی لیکن اس سے کمتر تھی؟

یقیناً۔

تو کیا خالص مساوات یا برابری کے معاملے میں مساوی اشیا سے متعلق ہمارا یہی حال نہیں ہوگا؟

بالکل۔ گویا اس شے کی مساوی حالت دیکھنے سے قبل ہی ہمیں مساوات کا علم رہا ہوگا۔ اور یہ سوچا ہو گا کہ ان میں سے ہر شے قطعی مساوات کے حصول کے لیے کوشاں ہے تاہم کچھ نہ کچھ کمی رہ گئی ہے۔

بالکل درست۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمیں خالص برابری کا یہ تصور، بصارت، لمس یا دیگر حواس کے ذریعے حاصل ہوا ہے یا حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ اس معاملے میں ان کی اہمیت یکساں ہے۔

جی ہاں سقراط موجودہ بحث کے لحاظ سے ان میں ایک حس دوسری حس جیسی ہی ہے۔

تو حواس کے ذریعے وہ علم حاصل ہوتا ہے جس سے تمام محسوس کرنے والی اشیا خالص برابری تک پہنچنا چاہتی ہیں جو کہ ان کے بس میں نہیں۔

درست۔

تو پھر اس سے قبل کہ ہم دیکھنا، سننا یا کسی بھی طرح ادراک حاصل کرنا شروع کریں ہمیں خالص برابری کا علم ہونا چاہیے کیونکہ بصورت دیگر ہم اُس معیار سے اپنی حسوں کی برابری کے تصور کا موازنہ نہیں کر سکتے کیونکہ حواس اس معیار تک پہنچنا چاہتے ہیں جس پر ممکن ہے پہنچ نہیں سکتے۔

یقیناً۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں مساوات کا علم پہلے سے ہو چکا تھا۔

جی ہاں۔

گویا پیدائش سے پہلے یہی میرا خیال ہے۔

بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے۔ اور اگر ہم نے یہ علم اپنی پیدائش سے قبل ہی حاصل کر لیا اور اس کا استعمال کرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پیدائش سے قبل ہی نہ صرف ہمیں برابری، چھوٹے بڑے بلکہ ایسے دوسرے تمام تصورات سے واقفیت تھی۔ کیونکہ صرف مساوات کا ہی نہیں بلکہ حسن، نیکی، عدل،

تقدس اور تمام چیزوں کی کیفیت کا ذکر نہیں کرتے جنھیں ہم منطقی مباحث میں وجود مطلق (خالص وجود) سے موسوم کرتے ہیں۔ اور یہ علم دونوں صورتوں میں پہلے سے ہے، چاہے ہم سوال کریں اور چاہے جواب دیں۔ لہٰذا اس تمام معاملے میں یقیناً ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس کا علم اس کے پیدا ہونے سے قبل ہی ہمیں حاصل تھا۔

یقیناً۔

لیکن اگر اس علم کے حصول کے بعد ہم اس حاصل شدہ علم کو نہیں بھولتے تو ضروری ہے کہ ہم جب بھی زندہ ہوں علم کے ساتھ زندہ ہوں اور یہ علم تا حیات ہمارے ساتھ رہے۔ کیونکہ کسی بات کا جاننا اس سے متعلق علم کا حصول اور اسے محفوظ رکھنے ہی کا نام ہے۔ سیمیاس جسے ہم بھول جانا کہتے ہیں کیا دراصل وہ علم کا زیاں نہیں ہے؟

سقراط بات بالکل درست ہے۔ لیکن اگر وہ علم جسے ہم نے قبل پیدائش حاصل کیا تھا، وہ پیدائش کے وقت ضائع ہو جائے اور بعد میں ہم اسے اپنے حواس کے ذریعے جاننے لگیں تو کیا وہ طریق کار جسے ہم سیکھنا کہتے ہیں دراصل یاددہانی نہیں ہوگا اور کیا اسے یادداشت کہنا درست نہیں ہوگا؟

بالکل درست ہے۔ بات یہاں تک تو صاف ہوگئی کہ جب ہم کسی شے کا دیکھ کر، سن کر یا کسی اور طرح احساس کرتے ہیں تو یہی احساس ہمیں دوسری، اس شے کی بھی یاد دلاتا ہے خواہ وہ اسی جیسی ہو یا اس سے مختلف جو اس سے متعلق ہوتی ہے لیکن فراموش ہو چکی ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ اس سے دو متبادل صورتیں اخذ کی جاسکتی ہیں یعنی یا تو ہم سب کو پیدائش کے وقت سے ہی یہ علم ہوتا ہے جو تاحیات یا موت کے بعد بھی ہمارے ساتھ رہتا ہے اور جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہم سیکھ رہے ہیں دراصل ہم صرف جو بات انھیں معلوم تھی اسے یاد کر لیتے ہیں اور سیکھنا صرف یادداشت ہی ہے۔

جی ہاں سقراط یہ بات بالکل درست ہے۔

سیمیاس ان میں سے کس صورت کو تم ترجیح دو گے؟ کیا ہمیں پیدائش کے وقت علم ہوتا ہے یا ہم ان اشیا کو یاد کرتے ہیں جو ہمیں قبل پیدائش معلوم تھیں۔

اس وقت میرے لیے یہ طے کرنا مشکل ہے۔

ہر صورت تم یہ تو طے کر سکتے ہو کہ جس شخص کو علم ہے وہ اس کا اظہار کرے گا یا نہیں کرے گا۔ تمھارا کیا خیال ہے؟

یقیناً وہ اظہار کرے گا۔

لیکن کیا اس سے تمھاری مراد یہ ہے کہ جن امور کا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے ان کا اظہار ہر شخص

کرسکتا ہے؟

سقراط کاش وہ ایسا کر سکتے۔ لیکن میں ڈر رہا ہوں کہ کل اسی وقت کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہوگا جو ان

کا اسی طرح اظہار کر سکے گا جیسا کہ حق ہے۔

سیمیاس گویا تمھارے خیال میں ہر شخص ان باتوں کا علم نہیں رکھتا۔

یقیناً نہیں۔

کیا وہ پہلے سے حاصل شدہ علم کو یاد کرنے کے عمل سے گزر نہیں رہے ہیں؟

یقیناً۔

ہماری روحوں نے یہ علم کب حاصل کیا؟ ظاہر ہے انھیں یہ علم یقیناً ہمارے انسانی قالب میں آنے

سے قبل ملا ہے۔

یعنی پیدائش سے قبل ہی ملا ہوگا؟

جی ہاں! سیمیاس گویا ہماری روحیں جسمانی صورت اختیار کرنے سے قبل ہی وجود میں آ گئی ہوں گی

اور ان میں عقل بھی ہوگی۔ سقراط یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب تمام علم پیدائش کے وقت ہی ودیعت ہو جائے

کیونکہ یہی فرصت کا وقت ملتا ہے۔

جی ہاں! میرے دوست از راہ کرم بتایئے کہ ہم اس سے کب محروم ہوئے کیونکہ جب ہم پیدا

ہوتے ہیں تو ہم اس علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ یہ تسلیم شدہ امر ہے۔ کیا ہم نے اسے اسی وقت ضائع کر دیا

جب ہمیں یہ ملا تھا۔ اگر نہیں تو پھر کس وقت؟

جی نہیں! سقراط میں سمجھتا ہوں کہ میں بے خیالی میں لغو باتیں کر رہا تھا۔

اس لیے سیمیاس ہمیں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ جن باتوں کا ہم ہمیشہ ذکر کرتے رہتے ہیں، مثلاً قطعی

حسن، نیکی اور اسی قبیل کے تمام حقائق کا وجود ہے اور اگر ہم اسے اپنے تمام محسوسات کے تناظر میں دیکھیں اور

ان کا اس سے موازنہ کریں تو ہم تمام حقائق کو پہلے ہی سے اپنے پاس موجود پائیں گے۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ

جس یقین کے ساتھ وہ موجود ہیں اسی طرح ہماری روحوں کا بھی ہماری پیدائش سے قبل ہی وجود رہا ہوگا، ورنہ

ہمارے تمام دلائل بے کار ہوں گے۔ اسی طرح کی مجبوری کے تحت ہمیں دونوں باتوں کو تسلیم کرنا ہوگا کہ ہماری

روحوں کا ہماری پیدائش سے قبل وجود تھا اور اگر یہ حقائق موجود نہیں تھے تو روح بھی موجود نہیں تھی۔

جی ہاں سقراط مجھے اعتراف ہے کہ جس طرح ایک کا وجود لازم ہے اسی طرح دوسرے کا بھی اور اس دلیل کی بڑی مضبوط بنیاد اس خیال پر استوار ہے کہ پیدائش سے قبل روح کے وجود کو اس حقیقت کے وجود سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا ہے جس کا ہم ذکر کر رہے تھے۔ کیوں کہ میرے خیال سے کوئی بھی شے حسن، نیکی اور ان دیگر حقائق سے زیادہ نمایاں نہیں ہے جن کا آپ ابھی ابھی ذکر کر رہے تھے۔ یہ تمام اپنی پوری حد تک وجود کی حامل ہیں میں آپ کے ثبوت سے مطمئن ہوں۔

ٹھیک ہے لیکن کیا سی بیس کو بھی اطمینان ہو گیا ہے؟ مجھے اسے بھی تو قائل کرنا ہے۔

سیمیاس نے کہا میرا خیال ہے کہ سی بیس بھی مطمئن ہے۔ اگرچہ وہ انسانوں میں سب سے زیادہ یقین نہ کرنے والا ہے تاہم میں تسلیم کرتا ہوں کہ وہ پیدائش سے قبل روح کی موجودگی کا بڑی حد تک قائل ہے لیکن موت کے بعد بھی روح باقی رہے گی اس بات کا اطمینان بخش ثبوت مجھے نہیں ملا ہے۔ میں اس اعتراض کو رفع نہیں کرسکا جس کا حوالہ سی بیس نے دیا ہے کہ عمومی خوف یہ ہے کہ جب انسان مرتا ہے تو روح بکھر جاتی ہے اور یہی اس کا خاتمہ ہے کیونکہ یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ روح چند دیگر نامعلوم عناصر کے امتزاج سے انسانی جسم میں داخل ہونے سے قبل وجود میں آئی ہوگی پھر ایسا کیوں نہیں ہوسکتا کہ انسانی جسم میں داخل ہونے اور اس سے باہر نکلنے کے بعد وہ دوبارہ نابود ہو جائے۔ یہی اس کا خاتمہ ہو۔ سی بیس نے کہا سیمیاس یہ بالکل درست ہے۔ معلوم ہوتا ہے جس کی ضرورت تھی اس کا آدھا ثبوت مل گیا ہے یعنی ہماری روحیں ہماری پیدائش سے قبل موجود تھیں۔ مزید یہ ہے کہ روح موت کے بعد اور پیدائش سے قبل موجود رہے گی۔

یہی وہ آدھا سوال ہے جو ابھی حل طلب ہے۔ اس کا ثبوت فراہم کرنا ہوگا۔ اس ثبوت کے حصول کے بعد ہی یہ بحث اختتام پذیر ہوگی۔

سقراط نے کہا سیمیاس اور سی بیس یہ ثبوت تو پہلے ہی دیا جا چکا ہے بشرطیکہ آپ ان دونوں دلائل کو یکجا کرلیں۔ اس کا مطلب ہے اس بیان کو اور اُس بیان کو جسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے اور ہم نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ہر زندہ شے مردہ شے سے جنم لیتی ہے کیونکہ اگر روح پیدائش سے اور زندگی حاصل کرنے سے پہلے ہی موجود ہوتی ہے اور پیدا ہونا صرف موت یا حالت مرگ کے ذریعے ممکن ہو تو کیا روح چونکہ اسے دوبارہ پیدا ہونا ہے، موت کے بعد بھی مسلسل زندہ نہ رہے گی؟ جس ثبوت کے آپ طالب ہیں وہ تو پہلے ہی دیا جا چکا ہے۔ تاہم مجھے اندیشہ ہے کہ آپ اور سیمیاس دونوں ہی اس دلیل پر مزید بحث کرنا چاہیں گے۔ بچوں کی طرح آپ پر یہ خوف چھایا ہوا ہے کہ جب روح جسم سے جدا ہوتی ہے تو ہوا کا ایک جھونکا بھی اسے تنکوں کی طرح

خصوصاً اگر کوئی شخص طوفانی موسم میں مرتا ہے، پرسکون موسم میں نہیں۔

سی بیس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا سقراط پھر تو چلیے آپ ہمیں اس خوف سے نجات دلا دیں۔

بات تو یہ ہے کہ یہ صرف ہمارا ہی خوف نہیں ہے بلکہ ہم بڑی عمر کے لوگوں میں بھی ایک بچہ ہوتا ہے جس

موت ایک بھوت نظر آتی ہے۔ ہمیں اسے بھی قائل کرنا ہوتا ہے کہ وہ خوف نہ کھائے۔

سقراط نے کہا: ہمیں چاہیے کہ ہم کسی جھاڑ پھونک کرنے والے سے روزانہ جھاڑ پھونک اس وقت

کراتے رہیں جب تک یہ خوف ختم نہیں ہو جاتا۔

سقراط ذرا یہ تو بتائیے کہ اب جبکہ آپ ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں ہم جھاڑ پھونک

کرنے والا کوئی ماہر کہاں تلاش کریں؟ سی بیس تمہارا علاقہ ہیلاز بہت وسیع و عریض ہے جہاں اچھے انسانوں

کے ساتھ وحشی قبائل کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔ ان ہی لوگوں میں سے دور دراز کا سفر کر کے اچھا آدمی

ڈھونڈ لیجیے اس کے لیے تکلیف اور روپے پیسے کی فکر نہ کیجیے۔ کیونکہ آپ کی دولت کا اس سے بہتر اور کوئی

صرف نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ دوسروں کے ساتھ ساتھ خود بھی اس تلاش میں شریک ہوں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ

آپ دوسروں کو اس کام کا خود سے بہتر اہل نہ پا سکیں۔

سی بیس نے کہا تلاش ضرور کی جائے گی۔ اگر آپ چاہیں تو اب ہم اسی موضوع کی طرف دوبارہ

لوٹ جائیں جس سے ہم بھٹک گئے ہیں۔

سقراط نے جواب دیا کیوں نہیں بسر و چشم اور میں بھی یہی چاہتا ہوں۔

بہت خوب۔

سقراط نے کہا پھر کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اپنے آپ سے یہ پوچھیں کہ وہ کیا شے ہے جس میں

بکھر جانے کی صلاحیت موجود ہے اور وہ کس قسم کی چیزیں ہیں جن کے بکھر جانے کا ہمیں خوف ہے۔ اور وہ کیا

شے ہے جس سے ہمیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر ہم یہ بھی تحقیق کریں گے کہ ان دو قسم کی چیزوں میں

سے روح کا شمار کس میں کیا جا سکتا ہے۔ ہماری روح سے متعلق تمھارے خوف اور توقعات اس سوال کا جواب

فراہم کریں گے۔

اس نے کہا بالکل درست ہے، جو شے مختلف اجزا سے مرکب ہے اور فطری طور پر مخلوط ہے، وہ

جس طرح مرکب ہو سکتی ہے اسی طرح تحلیل بھی ہو سکتی ہے لیکن جو شے مرکب نہیں ہے۔ صرف وہی کچھ اور

ہو تو نا قابلِ تحلیل ضرور ہو گی۔

سی بیس نے کہا جی ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔

اور غیر مخلوط شے کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ نا قابلِ تبدیل ہوگی جبکہ مخلوط ہمیشہ تبدیل ہوتی رہتی ہے اور کبھی ایک حالت میں نہیں رہتی۔

اس نے کہا میں یہ مانتا ہوں۔

آیئے! ہم اپنی سابقہ بحث کی طرف واپس لوٹ آئیں ہم اپنے منطقی دلائل میں جس شے کا ذکر کرتے ہیں کیا وہ وجود حقیقی نہیں ہے، خواہ وہ مساوات ہو، حسن ہو یا کچھ اور۔ کیا حقیقی وجود (جلوہ مطلق) میں کبھی کبھی قدرے تبدیل ہونے کا رجحان موجود نہیں ہوتا؟ کیا وہ' بلکہ ان میں سے ہر ایک' اپنی اصل حالت ہی میں قائم رہتا ہے اور ان کا اپنا وجود یکساں رہتا ہے۔ ان کی خصوصیات میں کوئی رد و بدل نہیں ہوتا اور وہ کسی طرح کے تغیر کو کسی حالت میں کسی وقت بھی قبول نہیں کرتیں۔

سی بیس نے جواب دیا کہ وہ سدا ایک ہی جیسی رہتی ہیں۔

پھر تم کیا کہو گے۔ بے شمار انسان، گھوڑے، لباس یا دیگر اشیا کے بارے میں جو حسین ہیں یا ایک دوسرے کے برابر ہیں یا دیگر بہت سی اشیا جنھیں کسی نہ کسی حقیقی وجود کا نام دیا جاتا ہے' کیا وہ ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہتی ہیں؟ کیا ہم اس خوبی کی متضاد حالت میں انھیں بیان نہیں کر سکتے؟ وہ اپنی حالت یا دوسروں کی حالت کے مقابلے میں ہمیشہ تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور بمشکل اپنی اصل صورت میں قائم رہتی ہیں۔

سی بیس نے جواب دیا دوسری بات درست ہے یعنی وہ ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں' اور انھیں تم چھو سکتے ہو، دیکھ سکتے ہو اور محسوس کر سکتے ہو جبکہ غیر تغیر پذیر اشیا کو تم صرف عقل سے معلوم کر سکتے ہو، وہ غیر مرئی ہوتی ہیں اور نظر نہیں آتیں۔

اس نے کہا بالکل درست ہے۔

سقراط چلیے ہم یہ فرض کر لیں کہ وجود دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو نظر آتے ہیں دوسرے وہ جو نظر نہیں آتے۔ اچھا دونوں کو فرض کر لیتے ہیں۔ جو نظر آتی ہیں وہ تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور جو نظر نہیں آتیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی؟ اسے بھی فرض کر لیتے ہیں۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمارے دو جزو ہیں ایک جسم اور دوسرا روح۔

یقیناً۔ بتائیے جسم کس قسم کا ہے اور کس سے مشابہ ہے؟

ظاہر ہے مرئی ہے اس میں کون شک کر سکتا ہے۔

روح نظر آتی ہے یا نظر نہیں آتی ؟

سقراط، انسان اسے نہیں دیکھ سکتا۔

دیکھے جانے اور نہ دیکھے جانے سے ہماری کیا مراد ہوتی ہے۔ کیا وہ ایسی ہوتی ہے جسے انسان اپنی آنکھ سے دیکھ سکتا ہے یا نہیں دیکھ سکتا۔

جی ہاں انسانی آنکھ سے۔

روح نظر آتی ہے یا نظر نہیں آتی۔

نظر نہیں آتی۔

پھر وہ غیر مرئی ہوئی۔

جی ہاں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ روح غیر مرئی اشیا جیسی اور جسم نظر آنی والی چیزوں جیسا ہے۔

سقراط نتیجہ تو یہی نکلتا ہے۔

اور ہم ابھی ذرا دیر پہلے کیا یہ نہیں کہہ رہے تھے کہ جب روح کسی جسم کو احساس کے وسیلہ کے طور پر استعمال کرتی ہے یعنی بصارت یا سماعت یا دیگر حسوں سے کام لیتی ہے (کیونکہ جسم سے استفادہ کا مطلب حسوں سے کام لینا ہے)، تو اس طرح ہم یہ نہیں کہہ رہے تھے کہ اس طرح جسم روح کو بھی تغیر پذیری کے حلقے میں گھسیٹ لیتا ہے، وہ اسے ادھر اُدھر لیے پھرتا ہے اور غلط ملط کر دیتا ہے۔ دنیا اس کے اطراف گردش کرتی ہے اور اس کی حالت ایک مدہوش شرابی جیسی ہوتی ہے۔ یہ حالت تبدیلی کے قریب آنے سے ہوتی ہے۔

بالکل درست ہے۔

لیکن جب وہ ہوش میں آتی ہے تو پھر غور کرتی ہے اور پھر وہ پاکیزگی، دوام، ابدیت اور غیر تغیر پذیری کے حلقے میں داخل ہو جاتی ہے جو اس کی مثیل ہوتی ہیں اور جب وہ اپنی اصل حالت میں ہوتی ہے اور اس کے کام میں کوئی مداخلت نہیں ہوتی تو وہ ان ہی کے ہمراہ ہمیشہ رہتی ہے۔ پھر وہ آوارہ گردی سے رک جاتی ہے اور غیر تغیر پذیر اشیا سے اتصال کے سبب خود بھی غیر تغیر پذیر ہو جاتی ہے۔ روح کی اسی حالت کو ''عقل'' کہا جاتا ہے۔

سقراط آپ نے یہ بات بہت عمدہ انداز میں بیان کی ہے اور جو سچ ہے۔

اس استدلال اور سابقہ بحث سے جو [illegible] کیا جا سکتا ہے اس کی روشنی میں روح کس گروہ سے

زیادہ مشابہ اور ملتی جلتی ہے؟

سقراط میرا خیال ہے کہ ہر اس شخص کی رائے کے مطابق جو اس استدلال کو سمجھ رہا ہے روح غیر تغیر پذیر اشیا سے بے حد مشابہ ہوگی۔ احمق سے احمق انسان بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ جسم تغیر پذیر اشیا سے زیادہ مشابہ ہے۔

جی ہاں۔

تاہم آیئے اس بات پر ایک اور انداز سے غور کریں جب روح اور جسم کا اتصال ہو جاتا ہے تو قدرت روح کو حکم دیتی ہے کہ وہ جسم پر حکمرانی کرے، حکم چلائے اور جسم کو کہتی ہے کہ وہ اس کے حکم کو مانے اور اسے بجا لائے۔ بتایئے ان میں سے کون سا جزو الوہی اور کون سا لافانی ہستیوں سے مشابہت رکھتا ہے۔ کیا آپ کو وہ جزو الوہی نظر نہیں آتا جسے حکم چلانے کے لیے تخلیق کیا گیا ہے اور فانی وہ ہے جو فطری طور پر رعایا اور خادم ہے؟

سچ ہے۔

اور روح کس سے مشابہ ہے؟

سقراط اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ روح الوہی جزو سے مشابہت رکھتی ہے اور جسم فانی جزو سے۔

پھر سی بیس ہمیں غور کرنا چاہیے کہ جو کچھ اب تک کہا جا چکا ہے اس سے یہی نتیجہ نہیں نکلتا کہ روح کی الوہی جزو سے مشابہت بہت زیادہ ہے اور جو لافانی ہے، معقول ہے اور ہمیشہ یکساں اور غیر تغیر پذیر ہے اور یہ کہ انسانی جسم سے مشابہ ہے جو فانی، غیر معقول، متنوع، حل پذیر اور تغیر پذیر ہوتا ہے۔ میرے عزیز سی بیس کیا ہم اس نتیجے کو اخذ کرنے کے خلاف کوئی بنیاد فراہم کر سکتے ہیں۔

ہم نہیں کر سکتے۔

لیکن اگر یہ بات درست ہے تو کیا جسم تیزی سے تحلیل ہونے کا اہل نہیں ہے اور روح تقریباً یا کلی طور پر ناقابل تحلیل ہے؟

یقیناً۔

آپ نے یہ مشاہدہ بھی کیا ہوگا کہ انسان کی موت واقع ہونے کے بعد اس کا جسم یا نظر آنے والے اس کے اعضا، جو نظر آنے والی دنیا میں موجود رہتے ہیں جنھیں لاش کہا جاتا ہے، فطری طور پر تحلیل ہو جاتا ہے،

ریزہ ریزہ، ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے لیکن جسم کی بربادی کا یہ عمل فوری نہیں ہوتا، وہ کچھ عرصے نہیں بلکہ طویل عرصے تک اپنی صورت میں موجود رہتا ہے بشرطیکہ موت کے وقت مرنے والا توانا رہا ہو اور موسم بھی خوشگوار ہو۔ جسم سوکھ جانے کے بعد اگر دوائیں اور مسالہ لگا کر محفوظ کر لیا جائے جیسے کہ مصر میں رواج تھا تو وہ غیر معمولی طویل مدت تک اسی حالت میں رہ سکتا ہے۔ جسم کے سڑنے گلنے کے بعد ہڈیوں اور رباط کے ٹکڑے تقریباً ناقابل شکست و ریخت ہوتے ہیں۔ آپ یہ تسلیم کرتے ہیں نا؟

جی ہاں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ روح جو نظر نہیں آتی، جب اصل عالم تحت الارض سے جو اسی کی طرح غیر مرئی، پاکیزہ اور شرف والی جگہ ہے مقدس اور دانا خدا کے پاس جانے کے لیے گزرتی ہے، جہاں اگر خدا نے چاہا تو میری روح کو بھی تھوڑی دیر بعد جانا ہے، تو کیا روح کو اکثر لوگوں کے قول کے مطابق اپنی فطرت کی رو سے، جسم سے بچھڑتے ہی کیا ہوا کا کوئی جھونکا اڑا لے جاتا ہے اور وہ فوراً برباد ہو جاتی ہے۔ میرے عزیز سیمیاس اور سی بیس ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو روح دنیا سے رخصت ہوتے وقت پاکیزہ ہوتی ہے کوئی جسمانی خرابی اپنے ہمراہ نہیں لے جاتی۔ اس نے دنیاوی زندگی کی حالت میں کبھی ارادی طور پر جسم سے کوئی واسطہ نہیں رکھا تو وہ ہمیشہ اس سے دامن بچاتی رہتی ہے۔ وہ اپنی ذات میں مگن رہتی ہے اور ہمیشہ اس طرح کے تجردات کو زیر غور رکھتی ہے۔ ان تمام باتوں سے یہی اظہار ہوتا ہے کہ وہ دانش کی رسیا ہوتی ہے اسی لیے وہ ہمیشہ خوشی خوشی مرنے کی مشق کرتی رہتی ہے۔ کیا ایسی زندگی مرنے کی مستحق نہیں ہوتی؟

کیوں نہیں یقیناً۔

میں کہتا ہوں کہ روح جو غیر مرئی ہے، ایک غیر مرئی دنیا کی طرف روانہ ہو جاتی ہے جو الوہی، لافانی اور معقول ہوتی ہے۔ وہاں پہنچتے ہی اسے رحمتیں اپنے آغوش میں لے لیتی ہیں اور انسانی غلطیاں اور نادانیاں، ان کے خوف، ہیجانات اور دیگر انسانی خامیوں اور جسم کو احساسات کا ذریعہ بنانے سے چھٹکارا پا لیتی ہے، اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ پاکیزہ روح کو ہمیشہ کے لیے قرب الٰہی حاصل ہو جاتا ہے، سی بیس کیا یہ صحیح نہیں ہے؟

سی بیس نے کہا جی ہاں بے شک۔

لیکن جو روح آلودہ ہوتی ہے اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت نجس ہوتی اور ہمیشہ جسم کی خدمت میں مصروف رہتی ہے اور اسے جسم سے محبت ہوتی ہے، جسمانی خواہشات اور اعتدال ذات سے مسحور ہو کر یہ یقین کر لیتی ہے کہ حقیقت صرف جسمانی شکل ہی میں آشکارا ہو سکتی ہے جسے انسان چھو سکتا ہے، دیکھ سکتا ہے،

مر سکتا ہے، پی سکتا ہے اور اپنی ہوائے نفس کے لیے ان سے رجوع کرتا ہے یعنی ایسی روح نفرت اور خوف کی عادی ہوتی ہے۔ وہ ان باتوں سے دامن بچاتی ہے جسے جسمانی آنکھ تاریک اور غیر مرئی جانتی ہے لیکن ادا ذہن کا ہدف ہوتی ہے، جس کا حصول فلسفہ کے ذریعے ممکن ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت ایسی روح پاکیزہ اور آمیزش سے پاک ہوگی؟

اس نے جواب دیا یہ ناممکن ہے۔

جسم سے مسلسل تعلق اور اس کی دیکھ بھال میں مصروفیت کے سبب روح کی ماہیت میں جسمانی اور مادی عناصر گھل مل جاتے ہیں۔

بالکل درست ہے۔

تو میرے دوست یہی جسمانی اور مادی عنصر وزنی ہوتا ہے، بوجھ بن جاتا ہے، خاکی اور مرئی ہوتا ہے جو روح اس طرح مانعات کا شکار ہوتی ہے وہ افسردہ ہوتی ہے اور اسے گھسیٹ کر دوبارہ مرئی دنیا میں پہنچا دیا جاتا ہے کیونکہ وہ غیر مرئی وجود اور دوسری دنیا سے خوف زدہ ہوتی ہے وہ قبروں اور مزاروں کے اردگرد بھٹکتی رہتی ہے۔ اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ انھیں اس روح کے غیر مرئی بھوت جیسے ہیولے نظر آتے ہیں جو دنیا سے رخصت ہوتے وقت پاک نہیں تھی بلکہ اس وقت بھی اس میں چند مرئی عنصر شامل تھے، اسی لیے وہ نظر آجاتی ہے۔

سقراط اس کے بہت زیادہ امکانات ہیں۔

جی ہاں سی بیس اس کے بہت امکانات ہیں۔ یہ روحیں نیک لوگوں کی نہیں بلکہ گناہ گاروں کی ہوں گی جو اپنی گزشتہ زندگی کے گناہوں کے پاداش میں یوں بھٹکتی پھرتی ہیں۔ وہ اس حقیقت تک اسی طرح بھٹکتی رہتی ہیں جب تک جسمانی اور مادی جسم کی طلب کے طفیل انھیں دوسرے جسم میں قید نہیں کر دیا جاتا اور انھیں اسی طرح کی فطرت اور کردار کے حامل اجسام میں مقید کیا جاتا ہے جسے انھوں نے گزشتہ زندگی میں پروان چڑھایا تھا۔

سقراط آپ کی مراد کس طرح کی فطرت سے ہے؟

میری مراد ایسے انسان سے ہے، جو پُرخوری، بے راہ روی اور بدمستی کا شکار ہو اور ان سے دامن بچانے کا بھی سوچنا بھی نہ ہو۔ اس کا شمار گدھوں اور اسی طرح کے حیوانات میں ہوتا ہو، تمھارا کیا خیال ہے؟

میرا خیال ہے کہ ان کے بارے میں ایسی ہی رائے قائم کی جا سکتی ہے اور جنھوں نے ناانصافی، ظلم

ظلم اور تشدد کی راہ اختیار کی وہ بھیڑیوں، شکروں اور چیلوں میں گنے جائیں گے۔ وہ اور کس زمرہ میں داخل ہو سکتے ہیں؟

سی بیس نے کہا جی ہاں بلاشبہ وہ ایسے جانور ہیں۔

انھوں نے کہا کہ انھیں ان کی فطرت اور رجحانات کے مطابق جگہ دینے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔

اس نے کہا کوئی مشکل نہیں۔ ان میں سے چند خوش و خرم بھی ہوتے ہیں اور خود اپنی ذات اور اس زمرے جہاں وہ جاتے ہیں سب سے زیادہ خوش یہی ہوتے ہیں، جنھوں نے معاشرتی اور جسمانی اقدار اور بھلائیاں جنھیں اعتدال ذات اور انصاف کہتے ہیں، پر عمل کیا اور وہ یہ خصوصیات صرف مشق اور توجہ سے حاصل کرتے ہیں فلسفہ اور عقل سے نہیں۔

وہ سب سے زیادہ خوش کیوں رہتے ہیں؟

کیونکہ امید ہے کہ وہ اپنے ہی جیسی سماجی زندگی گزارنے والی شہد کی مکھی، بھونرا یا چیونٹی میں شامل ہوں گے اور پھر دوبارہ کسی ایسے انسان میں داخل ہوں گے جن سے نہایت اعلیٰ درجے کے انسان پیدا ہو سکتے ہیں۔

بہت ممکن ہے۔

لیکن علم سے محبت رکھنے والوں کے علاوہ اور کسی کو قرب الٰہی حاصل نہ ہوگا۔ اگر اس نے فلسفہ (دانش) کا مطالعہ نہیں کیا ہو اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت بالکل ہی پاکیزہ نہ رہا ہو۔ سیمیاس اور سی بیس یہی وجہ ہے کہ فلسفہ کے حقیقی پرستار ہمیشہ حیوانی خواہشات اور لذات سے دور دور رہتے ہیں، ان کی مخالفت کرتے ہیں اور ان سے آلودہ نہیں ہوتے۔ اس لیے نہیں کہ وہ غربت یا اپنے اہل خاندان کی تباہی سے دولت کے پجاریوں دیگر دنیا پرستوں کی طرح ڈرتے ہیں اور نہ ہی وہ اقتدار اور شہرت کی ہوس رکھنے والوں کی طرح اپنی بدکاریوں کے باعث رسوائی اور بدنامی سے خوف زدہ رہتے ہیں۔

سی بیس نے کہا نہیں، سقراط یہ کام ان کے شایان شان نہیں ہوگا۔

انھوں نے جواب دیا یقیناً نہیں ہوگا۔ اسی لیے جو لوگ اپنی روح کی فکر کرتے ہیں اور صرف اپنی جسمانی لذتوں کے لیے زندگی نہیں گزارتے، وہ ان تمام باتوں کو خدا حافظ کہتے ہیں اور وہ اندھوں کی طرح راستہ طے نہیں کرتے۔ جب فلسفہ انھیں برائیوں سے نجات دے کر پاکیزگی عطا کرتا ہے تو یہ محسوس کرتے ہیں انھیں اس کے اثر سے دور نہیں بھاگنا چاہیے اور وہ اسی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتے ہیں اور مڑتے ہیں۔

سقراط آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

سقراط نے کہا میں تمھیں بتاتا ہوں علم کے دیوانوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ روح صرف جسم سے بندھی اور چپکی ہوئی ہے۔ جب فلسفہ اسے اپنے ہاتھوں میں نہ سنبھالے تو وہ وجود حقیقی کو قید خانے کی سلاخوں میں سے ہی دیکھ سکتے ہیں، نہ وہ اپنے اندر جھانک سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی ذات کے ذریعہ باہر دیکھ سکتے ہیں اور وہ ہر قسم کی لاعلمی کی دلدل میں نوحہ کناں رہتی ہے۔ یہ اس کی اصل حالت تھی جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اور علم کے دیوانے واقف ہیں فلسفہ کو اس کے قید خانے کی ہیئت ترکیبی نظر آ گئی کہ یہ قید خانہ خود اس کی حرص نے اس طرح تعمیر کیا ہے کہ قیدی خود اس جرم کا سب سے بڑا شریک بن جائے۔ یہ دیکھ کر فلسفہ اس کی دستگیری کرتا ہے اسے دلاسا دیتا ہے اور اسے آزاد کرانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے۔ روح کو وہ یہ بتاتا ہے کہ بصارت، سماعت اور دیگر حواس فریب دیتے ہیں وہ اسے ان سے دور رہنے اور بوقت ضرورت ہی ان کے استعمال کی ترغیب دیتا ہے اور اپنی ذات کو مجتمع رکھنے، اپنی شیرازہ بندی کرنے اپنی ذات اور اپنے حقیقی وجود تصور پر اعتماد کرے اور دوسرے ذرائع سے جو معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں، وہ ہمیشہ ادلتی بدلتی رہتی ہیں، ان پر اعتماد نہ کرے۔ ایسی چیزیں محسوسات سے متعلق اور مرئی ہوتی ہیں لیکن اسے جو کچھ اپنے باطن میں نظر آتا ہے وہ ذہنی اور غیر مرئی ہوتا ہے۔ حقیقی فلسفی کی روح یہی سوچتی ہے کہ اسے اس نجات کی راہ میں روڑے نہیں اٹکانا چاہیے، اس لیے وہ نفسانی خواہشات، عیش و عشرت اور درد و تکلیف سے جہاں تک ہو سکتا ہے پرہیز کرتا ہے وہ یہ سوچتا ہے کہ جب انسان میں بہت زیادہ خوشی، خوف یا حرص پیدا ہوتا ہے تو وہ اس سے متعلق ہر قسم کی برائیوں میں ملوث ہو جاتا ہے جس کا پہلے ہی سے اندازہ ہوتا ہے، مثلاً دولت اور صحت کا زیان جسے وہ اپنی نفسانی خواہشات پر قربان کر چکا ہوتا ہے، لیکن وہ اس سے بڑے گناہ میں ملوث ہو جاتا ہے جو تمام گناہوں سے بڑھ کر اور بدتر ہے اور جو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔

سی بیس نے کہا کہ سقراط وہ کون سا گناہ ہے؟

وہ گناہ یہ ہے کہ جب مسرت یا درد کا احساس شدید ترین ہوتا ہے تو ہر انسان کی روح یہ خیال کرتی ہے کہ اس تیز ترین احساس کی غایت اصل اور حقیقی ہوتی ہے حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ صرف بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہی بات درست نہیں ہے؟

جی ہاں۔

کیا یہی وہ حالت نہیں ہے جس میں روح کو جسم بری طرح جکڑ لیتا ہے۔

کس طرح؟

کیوں؟ اس لیے کہ ہر خوشی اور درد جسم کے لیے کیل اور میخ کی طرح ہوتا ہے جو روح کو جسم میں اس طرح جڑ دیتا ہے کہ وہ جسم ہی کا ایک حصہ بن جاتی ہے اور جسے جسم سچ سمجھتا ہے روح بھی اسے ہی سچ سمجھتی ہے۔ اس کا جسم سے تال میل ہوتا ہے۔ ان کی خوشیاں ایک ہوتی ہیں۔ وہ جسم ہی کی عادات اور ملاقات کے عادات کو اپنا بنا لیتی ہے اور وہ دنیا سے عالم تحت کے لیے روانگی سے قبل بمشکل پاکیزہ رہ سکتی ہے۔ جسم اسے ہمیشہ آلودہ بنائے رکھتا ہے۔ پھر وہ کسی اور جسم میں غرق ہو کر نشو و نما پاتی ہے۔ اس طرح اس کا عالم قدوس اور پاکیزگی و سادگی سے کوئی رابطہ نہیں رہتا۔

سی بیس نے کہا سقراط یہ بات بالکل سچ ہے۔

سی بیس یہی وجہ ہے کہ علم کے سچے طالب اعتدال ذات اور شجاعت کے مالک ہوتے ہیں نا کہ اُن وجوہات کی بنا پر، جو عام ہیں۔

یقیناً نہیں۔

یقیناً نہیں، فلسفی کی روح کسی اور طرح کے استدلال پیش کرے گی۔ وہ فلسفہ سے یہ اجازت طلب نہیں کرے گی کہ اسے آزاد کر دے تا کہ آزاد ہونے کے عمل کے دوران وہ خود مسرت اور درد کی حلقہ بگوش ہو جائے اور ایسا کام کرے جس سے وہ دوبارہ کام سے جاتی رہی اور اپنے جال کو پینی لوپ (Penelope) کی طرح بنتی اور ادھیڑتی رہے۔ لیکن وہ جذبات کو ٹھنڈا رکھے گی، عقل کی پیروی کرے گی اور ہمیشہ اپنی ہی ذات میں قیام کرے گی اور صداقت اور الوہیت اور ہر اس شے پر غور کرے گی جو اظہار اور رائے زنی سے ماورا ہو گی اور ان ہی سے وہ اپنی غذا حاصل کرتی رہے گی۔

وہ اسی طرح زندگی گزارنے کی سعی کرتی ہے اور اسے توقع ہوتی ہے کہ موت کے بعد وہ اپنے ہی جیسوں کے پاس چلی جائے گی اور جسمانی بداعمالیوں سے نجات پا لے گی۔ سیمیاس اور سی بیس جب روح کی پرورش اور تربیت اس نہج پر ہو گی تو اسے کبھی یہ خوف نہیں ہو گا کہ موت کے بعد ہوائیں اسے اڑا لے جائیں گی، وہ بکھر جائے گی، اس کا وجود حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا۔

سقراط جب دیر تک باتیں کرنے کے بعد چپ ہوا تو ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود مراقبہ میں چلا گیا ہو۔ یہی حالت ہم میں سے بیشتر کی تھی۔ جو باتیں ہوئی تھیں ہم ان پر غور کرتے رہے صرف سی بیس اور سیمیاس نے آپس میں دو چار باتیں کیں۔ سقراط نے ان کو دیکھتے ہوئے کہا کہ بحث کے

بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟ کیا انھیں کوئی کمی محسوس ہو رہی ہے؟ انھوں نے کہا اب بھی متعدد نکات [illegible] ہیں جن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس معاملے کی مزید چھان بین کی جائے۔ اگر آپ کا ارادہ کسی دوسرے موضوع پر بحث چھیڑنے کا ہے تو میں کہوں گا، نہیں بہت ہو چکا۔ تاہم اگر موجودہ موضوع پر کوئی شک ہے تو تم اسے بحث میں اضافہ کرنے کے لیے اپنی رائے کا اظہار کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرو اور اگر تمھارا یہ خیال ہے کہ بحث کو آگے بڑھانے کے لیے میری مدد درکار ہوگی تو میں تیار ہوں۔

سیمیاس نے کہا مجھے اعتراف ہے کہ ہمارے دماغ میں شبہات پیدا ہو رہے ہیں اور ہم لوگ سوال پوچھنے کے لیے ایک دوسرے کو آمادہ کر رہے تھے تاکہ آپ سے ان کے جواب مل جائیں لیکن اس خوف سے کہ ہماری یہ جسارت اس موقع پر آپ کے لیے باعثِ زحمت ہوگی ہم میں سے کوئی بھی سوال پوچھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

سقراط نے مسکراتے ہوئے جواب دیا سیمیاس یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ہوسکتا ہے میں دوسروں کو اس بات کے تسلیم کرنے پر آمادہ نہ کر سکتا ہوں کہ میں اپنی موجودہ حالت کو بدقسمتی تصور نہیں کرتا۔ اگر تم لوگوں کو باور نہ کرا سکوں کہ کیا تم اتنی بھی اجازت نہیں دو گے کہ مجھ میں پیش بینی کی اتنی صلاحیت ہے جتنی بطخوں میں ہوتی ہے۔ جو جب یہ محسوس کرتی ہیں کہ موت آنے والی ہے تو وہ زندگی میں کبھی کبھی جو گیت گاتی تھیں اس وقت ایک طویل اور خوبصورت گیت گا کر خوشی کا اظہار کرتی ہیں کہ ذرا دیر بعد وہ دیوتاؤں کے پاس پہنچ جائیں گی۔ انسان چونکہ موت سے خوف زدہ رہتا ہے اس لیے وہ بطخ پر یہ الزام تراشی کرتا ہے کہ وہ آخری وقت میں فریاد کرتی ہیں، یہ درد کی چیخ ہوتی ہے لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جب کوئی پرندہ سردی کا مارا، بھوکا یا درد میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ نغمہ سرائی نہیں کرتا خواہ وہ بلبل ہو یا ابابیل یا رنگین پروں اور کلغی والا ہُد ہُد (Hoopoe) جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک پُر درد نغمہ گاتا ہے۔ تاہم مجھے بطخ کے نغمے کی طرح اس بات پر یقین نہیں ہے۔ لیکن وہ اپولو دیوتا کے نزدیک مقدس ہیں، انھیں پیش گوئی کی صلاحیت عطا ہوئی ہے جو دوسری دنیا کی نعمتوں کا پیشگی علم حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی لیے یہ پرندے اس روز پہلے سے کہیں زیادہ نغمہ سرائی کرتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں اور مجھے یہ یقین ہے کہ میں بھی اسی دیوتا کا خادم اور بطخوں کا ہم مرتبہ ہوں اور یہ سوچ کر کہ مجھے میرے آقا نے پیش گوئی کا ملکہ عطا کیا ہے جو بطخوں سے کمتر نہیں ہے۔ میں ان پرندوں سے کم تر خوش ہو کر کبھی اس دنیا کو خیر باد نہیں کہوں گا۔ اگر تم لوگوں کا یہی اعتراض ہے تو اس کی پروانہ کرو اور اس وقت تک جو چاہے سوال پوچھتے رہو جب تک ایتھنز کے گیارہ مجسٹریٹ اجازت دیتے ہیں۔

سیمیاس نے کہا بہت خوب سقراط پھر تو میں اپنی الجھن بیان کرتا ہوں اور سی بیس اپنا مسئلہ خود بیان
کرے گا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شاید آپ کے بھی یہی احساسات ہوں گے کہ موجودہ زندگی میں جو مسائل سر
اٹھاتے ہیں ان کے بارے میں کوئی بات یقین سے کہنا ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔ تاہم میں اس
شخص کو ڈرپوک سمجھوں گا جو ان کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جاتا ہے اسے پوری طرح ثابت نہیں کرتا اور اس
پر تفصیلی غور کرنے سے احتراز کرتا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ ان کے بارے میں نتائج کے حصول تک
ہر پہلو پر مستقل مزاجی سے کوشش کرتا رہے یہاں تک کہ وہ حقیقت کو خود معلوم کر لے یا کوئی دوسرا اس کے بارے میں
بتا دے اور اگر یہ بات ناممکن ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ناقابلِ تردید انسانی اصولوں کو تسلیم کرلے۔ اس کی یہی کشتی
ہوگی جس پر وہ زندگی کے بحرِ ذخار کو پار کرے گا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اسے حفاظت سے پار اتارنے کے لیے
کوئی الٰہی نہیں ملتا تو یہ کام جان جوکھوں کا ہے۔ آپ نے مجھے حکم دیا ہے اس لیے میں پوچھنے کی جرأت کرتا
ہوں تاکہ بعد میں خود کو لعنت ملامت نہ کروں کہ میں اس موقع پر جو کہنا چاہتا تھا وہ نہ کہہ سکا کیونکہ جب میں ان
کے ہمراہ ان سوالوں پر غور کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بحث تشنہ رہ گئی ہے۔

سقراط نے جواب دیا کہ دوست ہوسکتا ہے کہ تمھاری بات درست ہو تاہم مجھے بتاؤ کہ بحث کس پہلو
سے تشنہ ہے۔

سیمیاس نے کہا اس پہلو سے کہ فرض کیجیے کوئی شخص ان دلائل کو بربط اور ہم آہنگی کے لیے کام میں
لاتا ہے۔ کیا وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم آہنگی غیر مرئی، مجرد، کامل اور قدسی ہے جو ایسے بربط میں موجود ہوتی ہے
جسے اچھی طرح سُر کر لیا جاتا ہے لیکن بربط اور اس کے تار مادہ اور دھات سے بنے ہوتے ہیں ان کا تعلق ذہن
سے ہوتا ہے اور وہ فانی ہوتے ہیں؟ اور جب کوئی بربط کو توڑتا ہے یا تاروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے تو جو اس
نظریے کا حامل ہے وہ آپ ہی کی طرح بحث اٹھائے گا اور اسی مثال پر عمل کرے گا کہ ہم آہنگی برقرار رہتی ہے
فنا نہیں ہوتی اور یہ تصور نہیں کر سکتے۔ وہ کہے گا کہ بربط بغیر تاروں کے اور خود ٹوٹے پھوٹے تار فانی آثار ہیں
اور ہم آہنگی کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوگی اور لکڑی اور تار گل سڑ جائیں گے اس سے قبل کہ ہم آہنگی پر کوئی افتاد
پڑے۔ سقراط آپ کے ذہن میں بھی یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ روح کے بارے میں ہمارا ایسا ہی تصور ہے اور
جب جسم کسی انداز سے سرد و گرم، خشک و تر عناصر کا خوشگوار امتزاج ہوتا ہے۔ اگر صورت حال یہی ہے تو جب
جسم کا یہ تانا بانا مرض یا زخم کے سبب ڈھیلا یا تنگ ہو جاتا ہے تو روح جو اعلیٰ ترین الوہی شے ہے موسیقی یا مصوری
کے شاہکار کے آہنگ کی طرح فوراً ہی نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ اگرچہ جسم کے مادی آثار بڑی مدت تک اس

وقت تک باقی رہ جاتے ہیں جب تک وہ برباد نہ ہو جائیں یا انہیں جلا نہ دیا جائے اور اگر کوئی یہ تسلیم کرے روح جو بدن کے عنصر کا امتزاج ہے تو اس حالت میں جسے موت کہا جاتا ہے پہلے وہ تباہ ہوتی ہے۔ ان کا جواب دیں۔"

سقراط نے اپنی عادت کے مطابق ہم پر نظریں جما دیں اور مسکراتے ہوئے کہا کہ: سیمیاس نے بڑی حد تک درست کہا ہے۔ آپ میں سے جو کوئی بھی مجھ سے زیادہ قابل ہے وہ اس کا جواب کیوں نہیں دیتا۔ اس کے اعتراض میں بڑی قوت ہے۔ لیکن اس کا جواب دینے سے قبل بہتر ہوگا کہ ہم سی بیس کی بات بھی سن لیں۔ اس دوران ہمیں اس بات پر غور کرنے کا وقت مل جائے گا اور دونوں کی باتیں سننے کے بعد اگر ان کی باتیں درست ہیں تو ہم ان سے اتفاق کر لیں گے بصورت دیگر ہم اپنا مقدمہ لڑیں گے۔ سی بیس برائے مہربانی بتاؤ کہ وہ کون سا سوال ہے جو تمہاری بے اطمینانی کا سبب ہے؟

سی بیس نے کہا کہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بحث جس مقام پر تھی وہیں پر موجود ہے اور اس پر اب بھی وہی اعتراضات باقی ہیں جو پہلے تھے۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ بشری شکل میں داخلے سے قبل روح کا وجود ہے۔ اسے بڑی ترکیب سے ثابت کیا گیا ہے جو اطمینان بخش ہے۔ سیمیاس کے اعتراضات کے باوجود اس بات سے انکار کرنے پر مائل نہیں ہوں کہ روح میں قوت ہے اور وہ جسم سے زیادہ دیر تک باقی رہتی ہے۔ میری یہی رائے ہے کہ روح جسم سے افضل ہوتی ہے۔ اسی لیے مجھ سے دلائل پوچھتے ہیں آپ پھر قائل کیوں نہیں ہو جاتے۔ جب آپ یہ دیکھتے ہیں کہ انسان کی موت کے بعد کمزور شے کا وجود باقی رہتا ہے تو آپ کو یہ بات تسلیم کرنے میں کیا باک ہے کہ زیادہ پائیدار شے بھی اسی مدت تک باقی رہے گی؟ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ فرمائیے میں بھی اپنے اعتراض کو جسے میں ضرور بیان کروں گا یہ سیمیاس کی طرح تمثیلی انداز میں پیش کروں؟ جس تمثیل کو میں بطور ثبوت پیش کر رہا ہوں، وہ ایک بوڑھے جولاہے کی ہے۔ جب وہ مر جاتا ہے تو کوئی کہتا ہے کہ وہ مر نہیں سکتا وہ کہیں نہ کہیں زندہ ہے۔ دیکھیے یہ کوٹ ہے جسے اس نے خود بنا تھا اور پہنا تھا۔ بالکل ویسے کا ویسا ہی ہے کہیں سے بھی خراب نہیں ہوا۔ وہ یقین نہ کرنے والے شخص سے پوچھتا ہے کہ انسان زیادہ دیر تک باقی رہتا ہے یا کوٹ جو زیر استعمال ہے اور جب اسے یہ جواب ملتا ہے کہ انسان زیادہ عرصے تک باقی رہتا ہے، تو وہ یہ سوچتا ہے کہ اس نے کم پائیدار شے کی بقا تو ظاہر میں انسان کی بقا کو ثابت کر دیا ہے۔ سیمیاس میں عاجزی سے یہ کہتا ہوں کہ اس ضمن میں آپ کی بات غلط ہے۔ جواب میں کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ آپ یاوہ گوئی کر رہے ہیں۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ

بوڑھا جولاہا... نے بہت سے کوٹ بنائے اور پہنے ہوں گے۔ جو پہنے گئے ہوں۔ کیونکہ آخری کوٹ اس
... اسی طرح انسان کو کوٹ سے بہتر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اسی تمثیل کے ذریعے جسم اور روح کے
... کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کوئی بھی آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ روح پائیدار ہے اور جسم مقابلتاً کمزور تر
... زندگی مختصر تر ہوتی ہے۔ وہ یہ دلیل دے سکتا ہے کہ روح متعدد اجسام میں قیام کرتی رہتی ہے جو ختم ہو
... ہونے ... عام طور پر جب انسان کی زندگی طویل ہو جب تک وہ زندہ رہتا ہے اس کا جسم ٹوٹتا پھوٹتا اور
ختم ہوتا رہتا ہے اور روح اپنے لیے نیا جامہ بنتی ہے خرابی کی مرمت کر لیتی ہے لیکن جب روح ناپید
ہوتی ہے تو اس کا آخری جامہ موجود رہتا ہے جو اس کے بعد بھی باقی رہتا ہے اور جب بالآخر روح ختم ہو جاتی
ہے تو جسم کی فطری کمزوریاں عود کر آتی ہیں اور وہ جلد از جلد سڑ کر ناپید ہو جاتا ہے اس لیے میں موت کے بعد
روح کی بقا ثابت کرنے کے لیے اس کے قوی تر ہونے کی دلیل پر اعتماد نہیں کروں گا۔ آپ نے جن امکانات
کو خوبی سے بیان کیا ہے اسے تسلیم کرتے ہوئے اور نہ صرف یہ امر تسلیم کرتے ہوئے کہ روح ہماری پیدائش
سے قبل بھی وجود تھا میں یہ بھی مانتا ہوں کہ کچھ لوگوں کی روحیں موت کے بعد بھی موجود ہوتی ہیں اور وہ بار بار
پیدا ہوں گے اور مریں گے۔ مزید برآں روح میں فطری طور پر ایسی قوت ہوتی ہے کہ جس کے باعث وہ قائم
رہے گی اور متعدد بار جنم لے گی۔ بعینہٖ ہم یہ بھی تسلیم کر سکتے ہیں کہ وہ بار بار پیدائش کے عمل سے گزر کر فرسودہ
ہو جاتی اور بالآخر ایک روز ایسی موت آتی ہے کہ وہ بالکل ہی فنا ہو جاتی ہے اور جسم کی اس موت اور بربادی
کے جس سے روح فنا ہو جاتی ہم لاعلم رہتے ہیں کیونکہ ہم میں سے کسی کو اس کا تجربہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر یہ
درست ہے تو میں یہی کہوں گا کہ جب تک کوئی شخص یہ ثابت نہ کرے کہ روح یقینی طور پر غیر فانی اور امر ہے،
اس کا موت پر اعتماد یکسر بودا ہو گا۔ لیکن جو شخص روح کا غیر فانی ہونا ثابت نہیں کر سکے اور قریب المرگ ہو وہ
اس خوف میں حق بجانب ہو گا کہ جب جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا تو روح بالکل ہی فنا ہو جائے گی۔

ہم نے بعد میں ان کی باتیں سن کر ایک دوسرے سے کہا کہ اس کی باتیں ہمیں سخت ناگوار محسوس
ہوئیں۔ چونکہ ہم پہلے اس بات کے قائل ہو چکے تھے۔ اب نہ صرف ماضی بلکہ مستقبل کے لیے بھی ہمارے
اعتقاد کو دھچکا لگا اور ہم ذہنی افراتفری کا شکار ہو گئے۔ گویا یا تو ہماری قوت فیصلہ کمزور تھی یا موضوع ایسا ثابت ہوا
جس میں یقین کا حصول ناممکن تھا۔

ایکی کریٹس: فیڈو میرے احساسات بھی تمہارے ہی جیسے ہیں تمہاری باتیں سن کر میں بھی وہی سوال پوچھنا
چاہتا تھا۔ میں اب کس دلیل پر اعتماد کر سکتا ہوں کیونکہ سقراط کے دلائل سے زیادہ معقول اور کون

سے دلائل ہو سکتے ہیں جنھیں یوں رسوا کر دیا گیا ہے؟ یہ اصول میرے ذہن میں پختہ ہو چکا ہے کہ روح ایک طرح کی ہم آہنگی ہے اور اس کا ذکر جیسے ہوا میری یادداشت تازہ ہو گئی کیونکہ یہ میرا اصل اعتقاد تھا۔ اب ضروری ہو گیا ہے کہ اس مسئلے پر دوبارہ غور کر کے ایسی دلیل دریافت کریں جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ انسان کی موت کے بعد بھی اس کی روح باقی رہتی ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ یہ ضرور بتائیے کہ سقراط نے بحث میں کون سا راستہ اختیار کیا تھا؟ کیا وہ بھی اسی ناگواریت میں شامل تھے جسے آپ نے بیان کیا ہے یا انھوں نے اطمینان قلب سے اس حملے کا مقابلہ کیا ہے اور کیا انھوں نے اس کا مقابلہ کامیابی سے کیا یا ناکام ہو گئے؟ جو کچھ گزرا تھا تفصیل سے بیان کر دیجیے۔

فیڈو: ایشی کرینس مجھے سقراط پر اکثر تعجب ہوتا تھا لیکن اس موقع پر تو اس پر بہت ہی زیادہ حیرت ہوئی۔ اس کے لیے اس کا جواب دینا کوئی مشکل بات نہیں تھی لیکن جس نے مجھے حیران کیا وہ یہ بات تھی کہ اس نے نوجوانوں کی باتوں کو نہایت تحمل، خندہ پیشانی سے اس طرح برداشت کیا کہ وہ اس کی داد دے رہے ہوں۔ پھر اسے فوراً اس زخم کا احساس بھی ہوا جس سے ان دلائل کی وجہ سے ہم دوچار ہوئے تھے۔ اس نے پھر فوراً اس پر مرہم لگا کر مندمل کر دیا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اس وقت وہ ایسے سپہ سالار کی طرح تھے جو اپنی شکست خوردہ فوج کو جمع کر رہا ہو اور انھیں اس کی مثال پر عمل کرتے ہوئے میدان جنگ میں واپس آنے کی ترغیب دے رہا ہے۔

ایشی: اس کے بعد کیا ہوا۔

فیڈو: ابھی سن لو گے میں اس کے قریب ہی داہنی جانب ایک سٹول جیسی چیز پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھا تھا جو قدرے اونچا تھا۔ اس نے میرا سر تھپتھپایا اور اپنے ہاتھ سے میری گردن کے بالوں کو دبایا۔ وہ میرے بالوں سے اسی طرح کھیلا کرتا تھا۔ پھر وہ بولا فیڈو میرا خیال ہے کل تمھاری یہ خوبصورت زلفیں تراش دی جائیں گی۔ میں نے کہا سقراط یہ ٹھیک ہے غالباً وہ ایسا ہی کریں گے۔

اگر تم میری بات مانو تو ایسا نہیں ہوگا۔

تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟

اگر ہماری یہ بحث ختم ہو جاتی ہے، ہمارے دلائل ناکام ہو جاتے ہیں اور ہم اسے دوبارہ زندگی نہیں دے سکتے تو کل نہیں آج ہی ہم دونوں اپنے بال کاٹ دیں گے۔ اگر میں تمھاری جگہ ہوتا اور بحث میرے ہاتھ

سے اسی طرح نکل جاتی کہ یمیاس اورسی بیس کا جواب مجھ سے بن نہ پڑتا تو میں خود کو آرگائیوز (Argives) کی طرح یہ قسم دیتا کہ میں اس وقت تک اپنے بالوں کو بڑھنے نہیں دوں گا جب تک میں بحث کی تجدید کر کے ان دونوں کو شکست نہیں دیتا۔

میں نے کہا جی ہاں، لیکن بقول ہراکلس کے، وہ خود بھی دو کا مقابلہ نہیں کرسکتا ہے۔

اس نے کہا پھر مجھے بلا لینا اور میں غروب آفتاب تمھارے لیے آئی اولاس کا کردار ادا کروں گا۔

میں نے جواب دیا میں آپ کو بلا رہا ہوں۔ اس طرح نہیں جس طرح ہراکلس نے آئیولاس (Iolaus) کو بلایا تھا بلکہ یوں سمجھ لیجیے آئیولاس ہراکلس کو پکار رہا ہے۔

اس نے کہا بس اتنا ہی کافی ہوگا لیکن پہلے ہمیں خطرے سے بچنے کا جتن کر لینا چاہیے۔

میں نے کہا خطرہ کیسا؟

اس نے جواب دیا کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم دونوں دلیل دشمن بن جائیں۔ انسان کے لیے اس سے زیادہ بری بات اور کوئی نہیں ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جس طرح کچھ لوگ انسان دشمن ہوتے ہیں اور انسانوں سے نفرت کرتے ہیں اسی طرح دلیل بیزار بھی ہوتے ہیں جنھیں دلائل سے نفرت ہوتی ہے۔ دونوں کی یہ حالت ایک ہی سبب ہوتی ہے جو دنیا سے لاعلمی اور جہالت کے سوا کچھ نہیں۔ انسانوں سے نفرت ناتجربہ کاری پر انتہائی انحصار سے پیدا ہوتی ہے۔ آپ ایک آدمی پر اعتماد کرتے ہیں اور اسے مکمل طور پر صادق، معقول اور قول کا پکا سمجھتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کاذب اور چالباز ثابت ہوتا ہے۔ پھر اسی طرح اس کا واسطہ دوسرے، تیسرے، چوتھے آدمی سے پڑتا ہے خصوصاً ان لوگوں سے جنھیں وہ اپنا خاص آدمی اور یار غار سمجھتا ہے۔ ایسی ہی متعدد مایوسیوں کے بعد وہ تمام انسانوں سے متنفر ہو جاتا ہے اور وہ یہ یقین کر لیتا ہے کہ کسی انسان میں نیکی کی رتی باقی نہیں ہے۔ تم نے بھی اس امر کا مشاہدہ کیا ہوگا۔

جی ہاں میں نے مشاہدہ کیا ہے۔

کیا یہ بات باعثِ رسوائی نہیں ہے۔ کیا یہ واضح نہیں ہے کہ ایسا آدمی معاشرتی تعلقات کا ہنر حاصل کرنے سے قبل ہی دوسرے لوگوں سے میل جول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ معاشرتی تعلقات کا ہنر اسے بتلا رہا ہے کہ کچھ لوگ اچھے ہوتے ہیں اور کچھ برے اور بہت بڑی اکثریت ان کے بین بین ہوتی ہے۔

میں نے کہا اس سے آپ کا مطلب کیا ہے؟

اس نے جواب دیا میرا مطلب یہ ہے کہ تم بہت زیادہ لوگوں کا یا بہت کم لوگوں کا ذکر کرتے ہو لیکن

بہت زیادہ اور بہت کم لوگوں کی تعداد عام نہیں ہوتی۔ یہ اصول ہر انتہا پر خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی، تیز ہو یا سست، صاف ہو یا غلیظ، سفید ہو یا سیاہ، صادق آتا ہے لیکن بہت بڑی اکثریت ان انتہاؤں کے وسط میں ہوتی ہے۔

کیا یہ بات آپ کے مشاہدے میں نہیں آئی ہے؟

میں نے کہا جی ہاں آئی ہے۔

اس نے کہا اور کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ اگر برائی کا مقابلہ کروایا جائے تو بدترین (بدی کی انتہا) بہت کم مقدار یا تعداد میں ملے گی۔

جی ہاں اس بات کا کافی امکان ہے۔ میں نے کہا۔

اس نے جواب میں کہا ہاں ایسا اکثر ہوتا ہے۔ تاہم اس معاملے میں دلائل انسانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ تم نے مجھے، اس سے زیادہ باتیں کرنے پر آمادہ کر لیا جتنی بات میں کرنا چاہتا تھا۔ موازنہ کا نکتہ یہ ہے کہ جب ایک سیدھا سادہ آدمی جو منطقی بحث سے قطعاً ناآشنا ہے پہلے یہ یقین کر لیتا ہے کہ دلیل درست ہے، پھر بعد میں سوچتا ہے کہ وہ غلط ہے خواہ وہ حقیقتاً غلط ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح کا وہ عمل ایک کے بعد دوسری دلیلوں سے کرتا رہتا ہے اور یوں بحث کرنے والے کئی لوگ جیسا کہ تم جانتے ہو، وہ خود کو عالم انسانیت کے عاقل ترین افراد میں شمار کرنے لگتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف وہی ہیں جنھیں یہ علم ہے کہ تمام اشیا بذات خود اور ان سے متعلق دلائل کتنے ناپائیدار اور غیر مستحکم ہوتے ہیں۔ وہ دریائے یوری پس (Euripus) کی لہروں کی طرح ادھر اُدھر تیزی سے رواں دواں رہتے ہیں اور یہ جوار بھاٹا مسلسل جاری رہتا ہے۔

میں نے کہا بالکل درست۔

اس نے جواب دیا ہاں فیڈو اور اگر صداقت علم کے یقین اور امکان کی کوئی حقیقت ہے تو یہ کتنی افسوسناک بات ہوگی کہ کوئی شخص ایک دوسری دلیل تک پہنچتا ہے جو پہلے تو درست معلوم ہو اور بعد میں غلط ثابت ہو اور خود اپنی ذات یا اپنی فہم کو الزام دینے کی بجائے وہ محض ناگواری یا سستی کی بنا پر اپنی ذات سے الزام ہٹا کر دلائل کو مورد الزام گردانے، اور پھر ہمیشہ کے لیے دلائل سے متنفر ہو کر انھیں سخت سُست کہے اور اس طرح صداقت اور حقائق کے علم سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو بیٹھے۔

میں نے کہا جی ہاں واقعی یہ امر انتہائی افسوسناک ہے۔

اس نے کہا آیئے سب سے پہلے ہم احتیاط سے کام لیں اور اپنی روح میں اس خیال کو جاگزیں نہ ہونے دیں کہ کسی دلیل میں کبھی استحکام اور صحت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ ابھی ہماری ذات میں استحکام

پیدا نہیں ہوا ہے اور ہمیں اس کے حصول کے لیے حوصلے اور مہارت سے تم لوگوں کو اپنے مستقبل اور مجھے موت
کی توقع کے لحاظ سے سخت کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس وقت مجھے ڈر ہے کہ اب میرا مزاج فلسفیانہ نہیں رہ گیا
ہے بلکہ عامیوں کی طرح جانب دار بن گیا ہوں۔ جانبدار آدمی جب کسی جھگڑے میں پڑتا ہے تو وہ سوال کے
سچ یا جھوٹ ہونے کے بکھیڑے میں نہیں پڑتا بلکہ وہ صرف اپنے سامعین کو اپنی بات منوانے کی فکر میں محو رہتا
ہے۔ اس وقت ایسے شخص اور مجھ میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ اپنے سامعین کو یہ قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے
کہ اس کی بات درست ہے اور میں خود کو قائل کرنا چاہتا ہوں۔ سامعین کو قائل کرنا میرے لیے ثانوی حیثیت کی
بات ہے۔ تم دیکھو کہ میں بہر صورت اپنے دلائل سے کس طرح فائدہ اٹھاتا ہوں کیونکہ اگر جو کچھ میں کہہ رہا
ہوں وہ صحیح ہے، تو اچھا ہے کہ میں صداقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جاؤں۔ لیکن اگر موت کے بعد کچھ نہیں ہے تو
میں یہ جو مختصری مدت باقی رہ گئی ہے اس میں اپنے احباب کو گریہ وزاری کی تکلیف نہیں دوں گا اور میری یہ
جہالت جاری نہیں رہے گی بلکہ جلد ہی موت کی نذر ہو جائے گی اور کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ سیمیاس اور
سی بیس میں اسی ذہنی کیفیت کے عالم میں دلیل پر گفتگو کروں گا۔ میری درخواست ہے تم لوگ صداقت کی فکر
کرو سقراط کی نہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں سچ بول رہا ہوں تو مجھ سے اتفاق کرو اگر نہیں تو میرے سامنے
پوری قوت سے ڈٹ جاؤ تاکہ میں اپنے جوش میں تمھیں اور خود کو فریب نہ دے سکوں اور شہد کی مکھی کی طرح
موت سے قبل اپنا ڈنک تمھارے جسم میں چھوڑ جاؤں۔

پھر اس نے کہا آیئے بحث کو آگے بڑھاتے ہیں پہلے میں ذرا یقین کر لوں کہ آپ نے جو کچھ کہا
ہے وہ مجھے یاد ہے۔ اگر مجھے صحیح صحیح یاد ہے تو سیمیاس کا یہ خوف بجا ہے کہ اگرچہ روح جو جسم سے زیادہ پاکیزہ
در الوہی ہے اور آہنگ کی صورت میں ہونے کے سبب پہلے ناپید نہیں ہو گی۔ دوسری جانب سی بیس یہ تسلیم کرتا
ہوا نظر آتا ہے کہ روح جسم سے زیادہ پائیدار ہے۔ لیکن یہ کسی کو علم نہیں ہو سکتا کہ روح مختلف اجسام سے گزرتی
ہوئی اپنے آخری جسم کو ہمیشہ کے لیے پیچھے چھوڑ کر خود ناپید ہو جائے گی یا نہیں؟ اور یہ جسم کی نہیں بلکہ روح کی
موت اور تباہی ہو گی، ورنہ جسم میں تو توڑ پھوڑ کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ سیمیاس اور سی بیس یہی وہ نکات ہیں
ناں جس پر ہمیں غور کرنا ہے؟

دونوں نے اپنی باتوں کے اس اعادہ کو تسلیم کیا۔

انھوں نے اپنی بات جاری رکھی اور پوچھا کیا تم لوگوں نے پہلے والے دلائل کا پوری قوت سے انکار
کیا ہے یا صرف اس کے کسی جزو سے؟

انھوں نے جواب دیا کہ اس کے جزو سے۔

اب یہ بتاؤ کہ تمھارا بحث کے اس جزو کے بارے میں کیا خیال ہے جس میں یہ کہا گیا کہ علم صرف یادداشت (یاد دہانی) کا نام ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ جسم میں قید ہونے سے قبل روح کہیں نہ کہیں موجود تھی؟

سی بیس نے کہا کہ بحث کے اس حصے نے اسے بہت زیادہ متاثر کیا تھا اور اس کا یقین بالکل ہی متزلزل نہیں ہوا۔ سیمیاس نے بھی اتفاق کیا اور مزید کہا کہ وہ اس بات سے اختلاف کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔

سقراط نے جواب دیا لیکن آپ کو کسی اور طرح سے سوچنا پڑے گا۔ تھیبان کے میرے دوست اگر تم یہ تسلیم کر لوگے کہ روح ایسا آہنگ ہے جو جسم میں موجود تاروں کے باہمی سُر میں ہونے سے پیدا ہوتا ہے تو یہ ایک امتزاج ہے اس طرح تم کبھی یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ آہنگ سُروں سے تیار ہوتا ہے اور ان عناصر کی تخلیق سے قبل وجود میں آتا ہے جو اس کے لازمی اجزا ہیں۔

سقراط یہ کبھی ممکن نہیں ہے۔

لیکن کیا تم دونوں کی باتوں سے یہ مفہوم نہیں نکلتا کہ انسانی جسم میں داخل ہونے سے قبل ہی روح موجود تھی اور یہ بھی کہ وہ ایسے عناصر سے مرکب ہے جو اُس وقت موجود ہی نہیں تھے؟ بات یہ ہے کہ آہنگ اُس طرح کا نہیں ہے جس طرح کا تم دونوں نے ذکر کیا ہے۔ پہلے بربط، تار اور آوازیں بے آہنگی کی حالت میں ہوتے ہیں اور سب سے آخر میں آہنگ تیار ہوتا ہے اور سب سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ بتاؤ روح کا اس طرح کا بیان تمھارے پہلے والے بیان سے کس طرح مطابقت رکھ سکتا ہے؟

سیمیاس نے یکدم کہا نہیں۔

اس نے کہا، بھئی جب ہم آہنگ کی بات کر رہے ہو تو ہماری باتوں میں ہم آہنگی تو ہونی چاہیے ناں؟

سیمیاس نے کہا بالکل ہونی چاہیے۔

اس نے کہا لیکن ان دو باتوں میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہے کہ علم، یادداشت اور روح ہم آہنگی ہے۔ تم ان میں سے کس بات پر قائم رہنا چاہتے ہو؟

اس نے جواب میں کہا کہ سقراط مجھے ان دو باتوں میں سے پہلی بات پر کہیں زیادہ اعتقاد ہے جبکہ

دوسری بات کا میں نے کبھی مظاہرہ نہیں دیکھا لیکن میں نے ایک وسیع تر تمثیل کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا تھا۔ جو اس کے ماننے والوں کی اکثریت کے لیے قابلِ ستائش ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تمثیلات سے حاصل شدہ یہ دلائل اس وقت تک محض ڈھکوسلا ہوتے ہیں جب تک انھیں اپناتے ہوئے انتہائی احتیاط نہ برتی جائے۔ وہ جیومیٹری اور دیگر علوم میں مغالطے کی طرح ہوتے ہیں لیکن علم اور یادداشت پر یقین کا اثبات ایک قابلِ اطمینان اصول موضوعہ پر مبنی ہے۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ جسم سے قبل روح وجود میں آئی کیونکہ وہ اس حقیقت کی حامل ہوتی ہے، جس کا نام ہی وجود پر دلالت کرتا ہے۔ اس دلیل کو میری ہی طرح اطمینان بخش دلائل کی بنیاد پر تسلیم کیا گیا ہے جو درست اقدام ہے۔ اس لیے اس بات پر کہ روح ہم آہنگی ہے نہ میں خود مزید بحث کروں گا اور نہ ہی کسی دوسرے کو اجازت دوں گا۔

اس نے کہا کہ میں اس پر ایک اور انداز سے نگاہ ڈالوں گا۔ کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ آہنگ یا سروں کی کوئی اور ترتیب اپنے عناصر ترکیبی کے علاوہ کسی اور شے سے ترکیب پا سکتی ہے؟

یقیناً نہیں۔

وہ لوگ کوئی اور کام کرتے ہیں یا کسی اور تکلیف کو برداشت کرتے ہیں جس پر کہ وہ عمل پیرا ہیں یا جسے وہ برداشت کر رہے ہیں؟

اس نے اسے تسلیم کیا۔

گویا یہ معقول بات ہے کہ آہنگ ان عناصر یا اجزا سے سبقت نہیں لے پاتا جس سے وہ مرکب ہے بلکہ وہ ان کے پیچھے آتا ہے؟

اس نے اس کی تصدیق کی۔ کیونکہ اس امر کے بہت کم امکانات ہیں کہ آہنگ کی کوئی چال، یا آواز یا کوئی اور خصوصیت ایسی ہو جو اس کے اجزا کے متضاد ہو۔

اس نے کہا جی ہاں یہ ناممکن ہے۔

اور کیا یہ ہم آہنگی کی نوعیت اس ترتیب اور روش پر منحصر نہیں ہوگی جس پر ان عناصر کو ہم آہنگ کیا جاتا ہے۔

انھوں نے کہا تمھاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے کہا کہ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ایسی ہم آہنگی بڑی عمدہ اور مکمل ہوتی ہے جس میں آہنگ کو زیادہ اچھی طرح اور بھرپور طریقے سے مرتب کیا جاتا ہے۔ اور اس کے برعکس یہ امر ممکن ہے کہ جب آہنگ نہ تو اچھی طرح اور نہ ہی مکمل طور پر مرتب کیا گیا ہو تو

حاصل شدہ ہم آہنگی خام تر اور نامکمل تر ہوتی ہے۔

درست ہے۔

کیا روح کے مدارج ہوتے ہیں؟ یا ایک ہی روح دوسری روح کے مقابلے میں کم یا زیادہ درجے کی یا تکمیل میں کمتر ہوتی ہے؟

نہیں بالکل ہی نہیں۔

تاہم یہ یقین سے کہا جاتا ہے کہ روحوں میں سے ایک عقل، نیکی کی حامل ہوتی ہے اور عمدہ ہوتی ہے جبکہ دوسری عقل سے کوری، گناہ گار اور بری روح ہوتی ہے۔ کیا یہ بات درست معلوم ہوتی ہے؟

جی ہاں درست معلوم ہوتی ہے۔

وہ لوگ جو روح کو ایک ہم آہنگی تصور کرتے ہیں، وہ روح میں نیکی اور بدی کی موجودگی کے بارے میں کیا کہیں گے۔ کیا وہ یہ کہیں گے کہ کوئی دوسری قسم کی ہم آہنگی بھی وجود رکھتی ہے اور یہ کہ نیک اور اچھی روح خود ہم آہنگ ہے اور اس میں ایک مزید ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور بری روح غیر ہم آہنگ ہوتی ہے اور اس میں کسی قسم کی ہم آہنگی بھی پائی نہیں جاتی؟

سیمیاس نے جواب دیا کہ میں تو یہ بات نہیں کہہ سکتا تاہم جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ روح ایک ہم آہنگی ہے، وہ ضرور اس طرح کی باتیں کریں گے۔

اور ہم یہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ایک روح بحیثیت روح، روح سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ جو اس بات کا اعتراف ہے کہ ہم آہنگی بھی کم یا زیادہ نہیں بلکہ صرف ہم آہنگی ہے اور نہ دوسرے سے زیادہ مکمل؟

بالکل درست ہے۔

یعنی جہاں آہنگ یا ہم آہنگی نہیں تو اس کے ہم آہنگ ہونے میں نہ کمی ہے نہ بیشی (یعنی وہاں ہم آہنگی کا تصور ممکن نہیں)۔

سچ ہے۔

جو کم و بیش طور پر ہم آہنگ نہیں ہوتی ہے۔ اس میں آہنگ نہ کم ہوتا ہے نہ زیادہ بلکہ وہ یکساں طور پر ہم آہنگ ہوتی ہے۔

جی ہاں یکساں طور پر ہم آہنگ ہوتی ہے۔

اس طرح ایک روح جو دوسری روح کے مقابلے میں کم و بیش روح نہیں ہوتی وہ کم و بیش ہم آہنگ

بھی نہیں ہوتی؟

بالکل۔ اور اس میں بے سراپن نہ کم ہوتا ہے نہ زیادہ اور نہ ہی ہم آہنگی (کم یا زیادہ)؟

اس میں نہیں ہوتا اور جس روح میں کم وبیش نہ آہنگ ہوتا اور نہ بے سُراپن وہ دوسرے کے مقابلے نہ زیادہ نیکی ہوتی ہے نہ کم۔ نہ زیادہ بدی ہوتی نہ کم۔ بشرطیکہ ہم بدی کو بے سُراپن اور نیکی کو ہم آہنگی تسلیم کرتے ہوں؟

بالکل نہیں۔

سیمیاس زیادہ درست بات تو یہ ہوگی کہ اگر روح ہم آہنگ ہے تو اس میں بدی کا شائبہ تک نہ ہوگا کیونکہ اگر آہنگ صحیح معنوں میں آہنگ ہو تو اس میں کسی قسم کی ناہم آہنگی نہیں ہونی چاہیے۔

جی بالکل بھی نہیں ہونی چاہیے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر روح مکمل طور پر روح ہے تو وہ برائی کی حامل ہو ہی نہیں سکتی۔

اگر ہماری گزشتہ دلیل سچ ہے تو بھلا اس طرح کیسے ہو سکتا ہے؟

پھر اگر اپنی فطرت کے لحاظ سے ہر روح یکساں ہوتی ہے تو زندہ مخلوقات کی تمام روحیں یکساں طور پر نیک ہوں گی۔

اس نے کہا سقراط مجھے آپ سے کلی اتفاق ہے۔

تم ذرا سوچو کیا یہ تمام باتیں درست ہو سکتی ہیں؟ اور یہ تمام نتائج اس مفروضہ کی بنا پر نکلتے ہیں کہ روح ایک ہم آہنگی ہے۔

یہ بات درست نہیں ہے۔

چلیے ایک بار پھر بتایئے کہ روح خصوصاً عاقل روح' کے علاوہ اور کون سا عنصر ہو سکتا ہے جو کہ انسانی عناصر پر حکمرانی کر سکے؟ تم کسی کو جانتے ہو؟

واقعی میں نہیں جانتا۔

تو پھر کیا روح جسم کے جذبات سے مطابقت رکھتی ہے؟ یا ان سے عدم اتفاق رکھتی ہے؟

مثلاً جب جسم کو گرمی اور پیاس ستاتی ہے تو کیا روح مشروب پینے میں مانع ہوتی ہے؟ اور جب جسم کو بھوک محسوس ہوتی ہے تو کیا روح کھانے سے روکتی ہے؟ کیا روح جسمانی ضروریات کی تکمیل سے روکے گی۔ یہ ایک مثال ہے، ایسی ہزاروں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں (یعنی جو جسم چاہتا ہے روح اس کے مطابق عمل

کرتی ہے)۔

بالکل درست ہے۔

لیکن ہم تو پہلے ہی یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ روح اگر ایک آہنگ ہے تو یہ ایسا کوئی سُر نہیں نکال سکتی جو تار کے کھنچاؤ یا ڈھیلے پن یا ضرب سے مختلف ہو۔ کیونکہ وہ ان ہی تاروں سے مرکب ہے جو صرف ان کی پیروی کر سکتی ہے ان کی رہنمائی نہیں کر سکتی۔

اس نے جواب دیا کہ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔

تاہم کیا ہم روح کو اس کے خلاف عمل کرتے ہوئے نہیں دیکھتے؟ وہ ان عناصر کی رہنمائی کرتی ہے جن سے وہ مرکب ہے اور تمام زندگی ہر طرح سے ان کی مخالفت کرتی ہے۔ انھیں اپنی اطاعت پر مجبور کرتی ہے۔ کبھی دواؤں اور ورزشوں کے شدید تکلیف دہ عمل کے ذریعے اور کبھی نرمی سے یہ مقصد حاصل کرتی ہے کبھی خواہشات، شدید ہیجان، خوف کو یوں آنکھیں دکھاتی ہے اور یوں سرزنش کرتی ہے گویا وہ اس کا جز نہیں ہیں بالکل اوڈی سس کے جذبات کی طرح جنھیں ہومر نے اوڈیسی میں یوں بیان کیا ہے:

”اس نے سینہ کوبی کرنے کے بعد اس طرح دل کی سرزنش کی۔ میرے دل یہ بھی برداشت کر کہ تو نے اس سے بھی زیادہ سختیاں جھیلی ہیں۔“

کیا تم سوچتے ہو کہ ہومر نے یہ بات اس لیے کہی ہے کہ اس کے خیال میں روح ایک ایسی ہم آہنگی ہے جو جسمانی جذبات کے ماتحت ہوتی ہے اور ایسی نہیں ہوتی ہے کہ وہ فطری طور پر انھیں اپنے راستے پر چلائے اور ان کو پوری طرح قابو میں رکھے۔ اور خود کو ایسی ہستی سمجھتی ہو جو ہم آہنگی کے مقابلے میں کہیں زیادہ الوہی اور مقدس ہو۔

جی ہاں سقراط میرا بھی یہی خیال ہے۔

اس طرح میرے عزیز دوستو! کیا ہم یہ کہنے میں حق بجانب نہیں ہوں گے کہ روح ایک طرح کی ہم آہنگی ہے کیونکہ یوں ہم مقدس ہومر کی اور خود اپنی تردید کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

اس نے کہا سچ ہے۔

سقراط نے کہا کہ چلو تمھارے وطن تھیبان (Theban) کی دیوی ہارمونیا (Harmonia) کا تذکرہ بہت ہو چکا ہے جس نے اپنے کرم سے ہمیں نوازا ہے لیکن سی بیس ذرا یہ تو بتاؤ کہ میں اس کے شوہر کیڈمس (Cadmus) سے کیا کہوں اور اس سے صلح صفائی کس طرح کروں؟

سی بیس نے کہا میرا خیال ہے کہ آپ اسے کسی نہ کسی ترکیب سے رضامند کر لیں گے۔ آپ نے
ہارمونیا کے متعلق اپنے دلائل اس انداز سے بیان کیے ہیں جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے۔ کیونکہ جب
سیمیاس اپنی مشکل بیان کر رہا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ اس کا جواب دینا ممکن نہ ہوگا اسی لیے مجھے یہ دیکھ کر سخت
حیرت ہوئی کہ آپ کے پہلے ہی جوابی حملے سے اس کی دلیل بے بنیاد ثابت ہوئی اور دوسرا حملہ بھی ناممکن نظر
نہیں آیا جب آپ نے کہا کہ کیڈمس کا انجام بھی ایسا ہو سکتا ہے۔

سقراط نے کہا میرے عزیز دوست ایسا نہیں ہے۔ غرور نہ کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ میں کہنے والا
ہوں وہ کسی کی نظر بد کا شکار ہو جائے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اسے اوپر والوں پر چھوڑ دیں۔ ہم ہومر کے انداز کے
قریب آ کر تمھارے الفاظ کا دم خم آزماتے ہیں۔ دیکھو قابل غور نکتہ یہ ہے کہ تم چاہتے ہو تمھارے لیے یہ ثابت
کیا جائے کہ روح ناقابلِ شکست و ریخت اور لافانی ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو تمھارے نزدیک اس فلسفی کا اعتماد
نہایت بودا اور بے حقیقت ثابت ہوگا جو موت کا اس یقین سے سامنا کرتا ہے کہ موت کے بعد کی زندگی اس
زندگی سے جو کسی اور طرح سے گزاری گئی ہے، بہت بہتر ہوگی۔ تم یہ بھی کہتے ہو کہ روح کی قوت اور الوہیت اور
ہمارے انسان بننے سے قبل اس کے وجود کی طاقت کے اظہار سے اس کی ابدیت کا اظہار نہیں ہوتا۔ اس کو
صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ روح عرصے تک قائم رہتی ہے اور اس نے طویل مدت قائم رہنے کی حالت میں
بہت کچھ جانا بوجھا اور کام کیا ہے۔ تاہم اس بنیاد پر وہ لافانی نہیں ہو سکتی۔ مزید یہ کہ اس کا انسانی جسم میں حلول
کرنا ایک غیر صحت مند عمل ہو سکتا ہے، جس سے اس کے ٹوٹنے پھوٹنے کا آغاز ہوتا ہے اور وہ اپنی دنیاوی زندگی
میں سخت نالاں رہتی ہوگی اور جلد یا بدیر وہ موت کے ہاتھوں فنا ہو جائے گی۔ تمھارا یہ بھی کہنا ہے کہ روح خواہ
ایک جسم میں حلول کرے یا متعدد اجسام میں، اس سے انسانی قوت میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اگر انسان کے
حواس بجا ہوں تو اسے خوف زدہ ہونا چاہیے۔ سبب یہ ہے کہ اسے روح کے غیر فانی ہونے کا نہ تو کوئی علم ہے اور
نہ ہی وہ اس کی کیفیت کو بیان کر سکتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ تمھارا ابھی یہی یا اسی سے ملتا جلتا خیال ہے۔ میں
نے ایک منصوبے کے تحت تمھاری اس بات کا کئی بار اعادہ کیا ہے تاکہ ہم اس کی کسی تفصیل کو نظر انداز نہ کر
دیں۔ تم بھی اگر چاہو تو اپنی اس دلیل میں کمی بیشی کر سکتے ہو۔

سی بیس نے کہا لیکن مجھے اس وقت جو کچھ نظر آ رہا ہے اس سے میری مراد ہے کہ آپ نے جو کچھ کہا
ہے اس میں کسی کمی بیشی کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی ہے۔

سقراط نے قدرے توقف کیا اور یوں لگا جیسے وہ فکر میں محو ہے۔ آخر کار وہ بولا کہ سی بیس تم نے ایک

بہت ہی اہم سوال اٹھایا ہے۔ جس کا تعلق پوری فطرت اور تخلیق میں آنے اور اس کے ختم ہونے کی وجوہ سے ہے۔ اگر تم چاہو تو میں اس ضمن میں اپنا تجربہ بیان کروں اور اگر اس میں تمھارے لیے کوئی کام کی بات نظر آئے، تم اپنی مشکل حل کرنے میں اس سے استفادہ کر سکتے ہو۔

سی بیس نے کہا کہ آپ جو کچھ کہیں گے میں اسے سننا چاہوں گا۔ سقراط نے کہا پھر میں تمھیں بتاتا ہوں کہ جب میں نوجوان تھا تو میری سب سے بڑی خواہش تھی کہ میں فلسفے کا مطالعہ کروں جسے تحقیق فطرت کا نام دیا جاتا ہے۔ اشیا کی تخلیق کے اسباب، کوئی شے کیوں بنائی اور مٹائی جاتی ہے، یہ باتیں مجھے بہت ہی اعلیٰ وارفع نظر آتی تھیں اور میں اس طرح کے سوالات پر غور وخوض کے لیے ہمیشہ بے تاب رہتا تھا کہ کیا جانور کی نشوونما کچھ لوگوں کے قول کے مطابق اس بگاڑ کا نتیجہ ہے جو گرم وسرد کے اصول کی بنا پر رونما ہوتا ہے۔ کیا خون، ہوا یا آگ ہی وہ عنصر ہیں جن کے سہارے ہم سوچتے ہیں؟ ایسا یا اس طرح کا کچھ بھی عمل نہیں ہوتا اور ہو سکتا ہے کہ سننے، دیکھنے، سونگھنے کے احساس اور رائے قائم کرنے کا ماخذ دماغی قوت ہی ہو۔ اور علم اس وقت حاصل ہوتا ہے جب قوت یادداشت اور رائے مستحکم ہو جاتی ہو۔ اس کے بعد پھر میں ان کے بگاڑ کی صورتوں کا مطالعہ کرتا رہا پھر ارضی وسماوی تمام اشیا کو اپنی تحقیق میں شامل کر لیا۔ آخر کار میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں تحقیق کے لیے بالکل نااہل تھا۔ میں یہ بات ثابت کر کے آپ کو مطمئن کروں گا۔ میں ان میں اس قدر محصور ہو گیا تھا کہ میں ان تمام باتوں کو جنھیں میں نے خود اور دوسروں نے اچھی طرح دیکھا تھا نظر انداز کر بیٹھا۔ جن حقائق کو میں پہلے بدیہی سمجھتا تھا انھیں فراموش کر دیا۔ مثلاً یہ حقیقت کہ انسان کی نشوونما غذا اور مشروب کی مرہون منت ہوتی ہے کیونکہ جب غذا کے ہضم ہونے کے بعد گوشت، جسمانی گوشت میں اور ہڈی، ہڈی میں اضافہ کرتی ہے اور اسی طریقے سے جب ہر نسیج کو مناسب نمو حاصل ہوتی ہے تو کمتر حجم بڑھ جاتا ہے اور بچہ بڑا ہو جاتا ہے۔ کیا یہ ایک معقول خیال نہیں ہے؟

سی بیس نے کہا میرے خیال میں، ہے تو سہی۔

اچھا اب میں تمھیں کچھ مزید بھی بتاتا ہوں۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب میں سمجھتا تھا کہ مجھے زیادہ اور کم کا مفہوم بخوبی معلوم ہے۔ جب میں نے ایک طویل آدمی کو ایک چھوٹے آدمی کے برابر کھڑے دیکھا تو میں نے سوچا کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے صرف سر کے برابر طویل ہے۔ یہی صورت گھوڑوں کے ضمن میں بھی نظر آئی۔ مزید برآں مجھے یہ بات اس وقت زیادہ واضح محسوس ہوئی جب میں نے غور کیا کہ دس، آٹھ سے زیادہ ہے کیونکہ اس میں دو اضافی عدد شامل ہیں اور دو کیوبٹ، ایک کیوبٹ سے زیادہ ہے کیونکہ دو ایک سے دو

سی بیس نے پوچھا اب ان تصورات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

اس نے جواب دیا کہ میرے لیے یہ کہنا بعید از قیاس ہے کہ مجھے ان میں سے کسی کی بھی غایت کا علم ہوا ہے۔ یہ دیوتا کی قسم مجھے علم ہونا چاہیے تھا کیونکہ میں خود مطمئن نہیں ہو سکا کہ جب ایک ہی ایک کا اضافہ کیا جاتا ہے خواہ یہ اضافہ اُس ایک میں ہو جس میں اضافہ ہو رہا ہے یا اس ایک میں جو اضافہ کر رہا ہے تو وہ دو بن جاتا ہے یا یہ کہ دونوں اکائیاں محض جمع کر دینے سے دو ہو جاتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا سبب ہے کہ جب دو ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں تو ہر عدد ایک ہوتا ہے دو نہیں لیکن جب انھیں جمع کر دیا جاتا ہے تو صرف باہمی قربت یا اتصال سے وہ دو ہو جاتے ہیں۔

مجھے یہ بھی یقین نہیں آتا کہ ایک کو تقسیم کر دینے سے بھی دو حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طرح دو کا عدد بالکل ہی متضاد طریقے سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ پہلی حالت میں عدد دو ہے باہمی قربت اور اتصال سے دو کا عدد حاصل ہوا۔ اس صورت میں ایک ہی عدد کو جدا اور تقسیم کرنے سے وہی نتیجہ نکلتا ہے۔ مجھے تو اطمینان نہیں ہے کیونکہ میں نہیں جانتا کہ اس طریق کار کے عمل پذیر ہونے تک اکائی کس طرح معرض وجود میں آتی ہے یا کوئی بھی شے کس طرح تخلیق یا تباہ ہوتی ہے یا موجود رہتی ہے۔ لیکن میرے ذہن میں بے ترتیب قسم کا ایک نیا طریق کار موجود ہے، اسی لیے میں دوسرے طریقے کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

اس نے کہا: میں نے کسی کو اینگزاغورث کی ایک کتاب پڑھتے ہوئے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ یہ ذہن ہی ہے جو ہر شے کو ٹھکانے بھی لگاتا ہے اور تخلیق بھی کرتا ہے۔ مجھے اس تصور سے بڑی مسرت ہوئی ہے میں نے اسے قابل ستائش سمجھا اور میں نے دل ہی دل میں کہا اگر ذہن ہی ٹھکانے لگانے والا ہے تو وہ ہر شے کو بہترین مقصد کے لیے ہی ٹھکانے لگائے گا اور ہر شے بہترین جگہ پر ہی رکھے گا۔ اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کسی شے کی تخلیق، تباہی یا وجود کا سبب کیا ہے تو اسے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ مذکورہ شے کے وجود، عمل، یا تکالیف کی کون سی حالت اس کے لیے مفید ترین ہوگی۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اس بات پر غور کرے کہ اس شے یا کسی دوسری شے کے لیے کون سی صورت بہترین اور مرغوب ترین ہوگی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اسے بدترین کا بھی علم ہونا چاہیے۔ کیونکہ دونوں صورتوں کو سمجھنے کا ایک طریق کار ہے۔ اس طرح بحث کرتے ہوئے میں نے اس خیال کو ترک کر دیا کہ مجھے اینگزاغورث کی صورت میں وجود کے اسباب کا اطمینان بخش علم رکھنے والا استاد مل گیا ہے اور میں نے سوچا وہ مجھے پہلے یہ بتائے گا کہ زمین گول ہے یا چپٹی۔ اس کے بعد وہ زمین کے ایسی

صورت میں ہونے کا سبب اور ضرورت کا ذکر کرے گا، جس کے آغاز میں برتر مفاد کا ذکر کرے گا اور یہ اس بات کو مظاہر کرے گا کہ زمین کی موجودہ صورت اس کے لیے بہترین ہے۔ اور اگر وہ یہ کہے کہ زمین مرکز میں ہے تو پھر انہیں مزید وضاحت کرنا ہو گی کہ یہ وضع بہتر ہے اور میں اس وضاحت سے مطمئن ہو جاؤں گا اور کسی اور سبب کی خواہش نہیں کروں گا۔ پھر میں نے سوچا کہ میں یہ سلسلہ جاری رکھوں گا اور پھر سورج، چاند اور ستاروں کے بارے میں دریافت کروں گا اور وہ مجھے ان کی تیز رفتاری، بار بار واپسی اور ان کی دیگر فعالی اور انفعالی صورتوں کا باہمی موازنہ کر کے یہ وضاحت کریں گے کہ وہ سب اپنی بہترین وضع میں کس طرح قائم ہیں کیونکہ میں یہ سوچ نہیں سکتا کہ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ذہن ہی ان کو ٹھکانے لگانے والا ہے تو وہ ان کی موجودہ وضع کے بارے میں کوئی دیگر توجیہ پیش کریں گے سوائے اس کے کہ جو وہ بتا رہے ہیں وہی بہترین وضع ہے۔ اور میں نے یہ بھی خیال کیا کہ ہر شے کی علیحدہ علیحدہ اور مشترکہ توجیہ کی مجھ سے مفصل وضاحت کرتے ہوئے وہ اس امر کو بھی ذہن نشین کرائیں گے۔ ان میں ہر ایک کے لیے اور سب کے لیے بھی کیا مفید ترین تھا۔ میں نے اپنی توقعات کی کوئی بڑی قیمت نہیں لگائی تھی۔ میں نے کتابیں پکڑیں اور ان کا مطالعہ ممکنہ تیزی سے شروع کر دیا۔ میں اپنے جوش میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ بہترین کیا ہے اور بدترین کیا ہے۔

میری توقعات کتنی بلند تھیں اور کتنی جلدی وہ پاش پاش ہو گئیں۔ میں ان کے مطالعے میں جتنا آگے بڑھتا گیا مجھے معلوم ہوتا گیا کہ میرا پسندیدہ فلسفی تو ذہن کو یکسر ترک کر کے کائنات کی ترکیب اور ترتیب کے کسی دوسرے اصول کی طرف راغب نہیں کر رہا ہے، بلکہ وہ محض ہوا، ایتھر، اور پانی اور دیگر بے ربط عناصر کا سہارا لے رہا ہے۔ میں اس کا موازنہ ایسے شخص سے کر سکتا ہوں جو عام طور پر تسلیم کرتا ہے کہ سقراط کے تمام افعال کا سرچشمہ ذہن ہے لیکن جب وہ میرے مختلف افعال کے اسباب کی تفصیلی توجیہ بیان کرنے لگتا ہے تو وہ یہ بتاتا ہے کہ میں یہاں اس لیے بیٹھا ہوا ہوں کہ میرا جسم ہڈیوں اور گوشت سے بنا ہوا ہے اور ہڈیاں سخت ہیں۔ ان جوڑوں میں جو اسے تقسیم کرتے ہیں، لچک دار عضلات ہیں جب ہڈیاں اپنے مخصوص جوڑوں میں عضلات کے پھیلنے یا سکڑنے سے حرکت کرتی ہیں میں اپنے اعضا کو جھکا سکتا ہوں یہی وجہ ہے کہ میں خمیدہ ہو کر بیٹھا ہوں اور وہ یہی تو کہیں گے۔ وہ آپ سے میری گفتگو کی توجیہ کرتے ہوئے اسے آواز، ہوا اور سماعت کا کرشمہ قرار دیں گے۔ اس کے علاوہ بھی ہزار ہا توجیہات بیان کریں گے لیکن وہ اصل علت کو فراموش کر دیں گے جو یہ ہے کہ اہل ایتھنز نے میری موت کی سزا کو بہتر مانا ہے اور اسی طرح میں نے یہی بہتر سمجھا کہ میں یہاں قید خانے میں رہ کر اپنی سزا پر عمل درآمد کراؤں۔ کیونکہ میرا یہ خدشہ بڑی مضبوط بنیاد پر قائم ہے کہ ہو سکتا ہے کہ

بہت پہلے ہی میری یہ ہڈیاں اور گوشت میگارا(Megara) یابی اوٹیا(Boeotia) پہنچ چکی ہوتیں۔ دیوتا کی قسم ان ہی ہوتا اگر وہ صرف اور صرف انہی ہی کی سوچ پر عمل کرتے اور نہ کہ میری سوچ پر کہ ریاست جو بھی سزا دے گی اسے برداشت کرنا میرے لیے فرار اور جلاوطنی سے بہتر اور باوقارتر ہوگا۔ ان تمام معاملات میں یہ توجیہات کی ایک عجیب وغریب الجھن ہے۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہڈیوں، عضلات اور جسم کے دیگر اعضا کے بغیر میں اپنے مقصد پر عمل درآمد نہیں کرسکتا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہنا کہ میں اپنے ذہن کے مطابق عمل کرتا ہوں اور میں جو کچھ اور جس انداز سے کام انجام دیتا ہوں ان ہی کے سبب ہے اور اس میں بہترین کے انتخاب کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا، بڑی بودی بات ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ وہ علت اور شرائط میں امتیاز نہیں کرتے جس کے بغیر علت، علت نہیں۔ ثانی الذکر ہی ہے جسے میرے خیال میں بہت سے لوگ اندھیرے میں رہ کر ہمیشہ کسی مغالطے کے تحت علت سے موسوم کرتے ہیں۔ اس لیے کوئی زمین کو کائناتی چکر میں رکھ کر آسمان سے اسے استحکام دیتا ہے جبکہ دوسرا ہوا کو زمین کا سہارا کہتا ہے، جو ایک طرح کی وسیع ظرف ہے۔ وہ اس قوت کو نظر انداز کردیتے ہیں جس نے انھیں، وہ جس حالت میں ہیں' کسی افادیت کے خیال سے اس طرح ترتیب دے رکھا ہے اور کسی ماورائے انسان قوت کو اس کا ذمہ دار سمجھنے کی بجائے وہ ایک اور قوت کا مجسمہ اٹلس دریافت کرنے کی توقع رکھتے ہیں، جو اس ارضی اٹلس سے زیادہ قوی اور زیادہ دائمی ہوگا اور تمام اشیا کو بہتر طور پر مجتمع رکھ سکے گا۔ اصل میں منافع بخش اور حقیقی قوت ہی اشیا کو اکٹھا کرکے ایک ہی رشتے میں پروتی ہے، وہ کبھی اس بات پر غور نہیں کرتے۔ توجیہ کا یہی وہ اصول ہے جسے میں اگر سیکھنے جاؤں تو مجھے سکھایا جائے گا۔ لیکن چونکہ میں خود بھی یہ معلوم کرنے میں، یا دوسروں سے سیکھنے میں ناکام رہا ہوں لیکن اگر تم چاہو تو میں تمہیں وہ طریقہ سکھاؤں جسے میں توجیہات کی تحقیق کا دوسرا بہتر طریقہ سمجھتا ہوں۔

اس نے جواب دیا میں ضرور سنوں گا۔

سقراط نے گفتگو جاری رکھی۔ میں نے سوچا جس طرح مادی اشیا کے مطالعہ میں مجھے ناکامی ہوئی تھی، اس کے پیش نظر مجھے محتاط رہنا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ میں روح کی بصارت سے محروم ہوجاؤں۔ جس طرح لوگ سورج کو گھورنے کے بجائے اسے اس خوف سے عکس یا کسی اور واسطے سے دیکھتے ہیں کہ کہیں ان کی آنکھوں کو نقصان نہ پہنچے۔ اسی طرح اپنے معاملے میں مجھے خوف تھا کہ میں اگر اپنی آنکھوں یا کسی دوسرے ذریعے سے اشیا کو دیکھنے یا سمجھنے کی کوشش کروں گا تو کہیں میں بصارت کھو نہ بیٹھوں۔ میں نے سوچا کہ میرے لیے بہتر یہی ہوگا کہ میں استدلال کی دنیا میں پناہ لے کر وہیں اشیا کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کروں ممکن

ہے میری یہ تشبیہ بے نقص نہ ہو۔ کیونکہ میں یہ نہیں مانتا کہ جو کوئی اشیا کے بارے میں اپنے تصورات سے
سے رائے قائم کرتا ہے وہ انھیں ایک سیاہ شیشے میں سے دیکھتا ہے۔ وہ ان کی نسبت بہت زیادہ دیکھتا ہے
کے مادی وجود کا خیال رکھتا ہے۔ تاہم میں نے اسی طریقے پر عمل کیا۔ میں نے پہلے ایسا فرضیہ اپنایا جسے میں
تر سمجھتا تھا اور پھر جو کچھ اس سے مطابقت رکھتا تھا میں اسے سچ سمجھتا تھا۔ خواہ اس کا تعلق علت معلول کے باہمی
ربط سے ہو یا کسی اور سے۔ اور جو اس سے مطابقت نہیں رکھتا تھا میری نظر میں وہ غلط تھا۔ لیکن میں اپنے مطلب کو
مزید وضاحت سے سمجھانا چاہوں گا کیونکہ میں یہ نہیں مانتا کہ تم میری گفتگو سمجھ رہے ہو۔

جی ہاں میں بات اچھی طرح سمجھ نہیں سکا۔

انھوں نے کہا جو بات ابھی میں آپ سے کہنے والا ہوں وہ بھی بالکل نئی نہیں ہے۔ وہ بھی بالکل
ایسی ہی ہے جیسی میں ہمیشہ ہر جگہ، ہر بحث میں اور دوسرے مواقع پر دہراتا رہا ہوں۔ میں اب علت و معلول
کے اس تعلق کی آپ کے لیے وضاحت کروں گا جو میرے دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ میں ان جانے پہچانے
اصولوں کا ذکر کروں گا جو زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ پہلے یہ تسلیم کر لیجیے کہ حقیقی حسن، فضیلت اور بزرگی وغیرہ کا
وجود ہے۔ میری طرح اس پر یقین کیجیے۔ ان کے وجود کا اعتراف کیجیے۔ پھر مجھے امید ہے کہ میں آپ پر علت
کی ماہیت اور روح کی ابدیت منکشف کروں گا۔

سی بیس نے کہا آپ ثبوت دینے کا کام فوراً شروع کر دیجیے۔ میں آپ کو اس کی اجازت دیتا
ہوں۔ انھوں نے کہا بہت خوب میں جاننا چاہوں گا تم کو میرا اگلا اقدام منظور ہے یا نہیں کیونکہ میں یہ کہے بغیر
نہیں رہ سکتا کہ اگر حقیقی حسن سے کوئی شے زیادہ حسین ہے تو صرف اسی قدر حسین ہے جتنا وہ حقیقی حسن میں
شریک ہے اور ہر شے کے بارے میں میری یہی رائے ہے۔ کیا آپ علت کے اس تصور پر متفق ہیں؟

اس نے کہا جی ہاں، میں متفق ہوں۔

انھوں نے بات جاری رکھی، میں ان انوکھی علتوں کو جنھیں بیان کیا جاتا ہے نہ تلاش کرتا ہوں اور نہ
ہی وہ میری سمجھ میں آتی ہیں۔ اگر کوئی مجھ سے یہ کہتا ہے کہ رنگوں کی یا شکل و صورت کی یا اسی طرح کی کسی اور
شے کی آب و تاب کا نام حسن ہے، میں ان سب کو فضول سمجھتا ہوں جو مجھے محض الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ اا
سیدھے سادے تنہا بلکہ احمقانہ انداز میں یہ اعتراف کرتے ہیں اور میں خود بھی اپنے دماغ میں یہی سمجھتا ہوں
کہ حسن کے سبب سے تمام حسین اشیا حسین ہو جاتی ہیں۔ خواہ اس کے لیے حسن کو کسی بھی انداز یا طریقے سے
حاصل کیا گیا ہو۔ جہاں تک انداز کا تعلق ہے اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میں پوری

...کہوں گا کہ حسن کی موجودگی سے تمام اشیا حسین ہو جاتی ہیں، مجھے یہی سب سے زیادہ یقینی جواب ... ہے جو میں خود کو اور دوسروں کو دے سکتا ہوں اور میں اسی پر قائم ہوں۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ یہ اصول ... نہیں ہوگا اور یہ وہ جواب ہے جو میں خود کو یا ہر اس شخص کو بآسانی دے سکتا ہوں جو ایسا سوال ... کہ حسن سے ہی حسین چیزیں حسین بن جاتی ہیں۔ کیا تمھیں مجھ سے اتفاق نہیں ہے؟

میں مانتا ہوں۔

اور یہ بھی کہ عظمت سے عظیم اشیا، عظیم ہو جاتی ہیں اور چھوٹے پن سے چیزیں چھوٹی ہو جاتی ہے۔

... ہے۔

اس لیے اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ "ب" کے مقابلے میں "الف" بقدر سر اس سے طویل ہے تو کیا تم اس ... بات ماننے سے انکار کر دو گے اور بڑی شد و مد سے یہ حجت کرو گے کہ آپ کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ... صرف طولانی پن کی وجہ سے ہے۔ چھوٹا ہونا صرف چھوٹے پن کے سبب ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس ... صورت میں آپ کو جوابی دلیل کا خوف ہوگا۔ اگر بڑا پن اور چھوٹا پن صرف بقدر سر ہی ہے تو پہلی بات تو یہ ہے ... بڑا اور چھوٹا ہونے کا معیار ایک ہی ہے (یعنی دونوں کے سر برابر ہیں)۔ دوسری بات یہ ہے کہ بڑا آدمی ... صرف بقدر سر بڑا ہے جو بذات خود چھوٹا ہوتا ہے۔ اس طرح آپ یکسانیت سے تھکا دینے والی نامعقولیت میں ... ہو جائیں کہ آدمی کسی چھوٹی سی شے کی بنا پر بڑا بنا ہے۔ آپ کو اس سے خوف آئے گا۔ آئے گا کہ نہیں؟

... میں نے ہنستے ہوئے کہا یقیناً میں ڈروں گا۔

اسی طرح تمھیں یہ بات بھی خطرے سے خالی نظر نہیں آئے گی کہ دس کا عدد آٹھ سے دو کی وجہ سے ... بڑا ہو جاتا ہے۔ یہ فرق "عدد" کا پیدا کردہ ہے یا یہ بھی کہہ سکتے ہو ایک کیوبٹ (Cubits) سے دو کیوبٹ ... بقدر نصف زیادہ نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد جسامت ہے۔ ایسے تمام معاملات میں اسی طرح کا خطرہ موجود ہے۔

... نے کہا بالکل بجا ہے۔

اسی طرح کیا تم یہ کہتے وقت محتاط نہیں رہو گے کہ ایک میں ایک کے اضافہ یا اسے تقسیم کرنے سے دو ... عدد حاصل ہوتا ہے اور تم نہایت بلند آہنگ میں اپنا پختہ یقین ظاہر کرو گے کہ آپ کو ایسا کوئی طریقہ معلوم نہیں ... جس میں کوئی شے سوائے اس صورت کے کبھی عالم وجود میں نہیں آتی کہ جب تک وہ اپنے ہی جوہر ... (حقیقت) میں شامل نہ ہو جائے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں تک تمھیں علم ہے "دو" ہو جانے کی بنیاد اس کی ... نسبت ہے۔ دو کا عدد حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے اور ایک حاصل کرنے کے لیے "ایک" میں شامل ہونا

ضروری ہے۔ تم کہو گے کہ میں تقسیم اور جمع کی ایسی تمام پہیلیوں کو ایک طرف رکھ دوں گا اس کا جواب وہی دیں گے جو مجھ سے زیادہ دماغ والے ہیں۔ میں چونکہ نا تجربہ کار ہوں اور کہاوت کے مطابق خود اپنے ہی سایے سے اس کا آغاز کرنے کو تیار ہوں۔ میں ابتدائی اصول کی مضبوط بنیاد کو چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اگر کوئی تمھیں اسی جگہ جکڑ لیتا ہے تو تم اس کی پرواہ مت کرو اور اس وقت تک اس کو جواب نہ دو جب تک یہ اندازہ نہ ہو جائے کہ جو نتائج اس سے نکلیں گے وہ ایک دوسرے سے میل کھاتے ہیں یا نہیں اور جب تم سے اس اصول کی مزید وضاحت کا مطالبہ کیا جائے تو اسے اس طرح بیان کریں گے کہ گویا کوئی ایسا ارفع اصول تمھارے ذہن میں ہے جسے تم مستحکم ترین تصور کرو۔ تم اپنے بیان کو کسی مناسب مقام پر روکو گے لیکن اگر تمھارا مقصد وجود حقیقی کو معلوم کرنا ہے تو تم اپنے استدلال کے بنیادی اصول اور اس کے نتائج کو گڈمڈ نہ کر دینا۔ اس وجہ سے نہیں کہ یہ نتیجہ ان کے لیے کسی اہمیت کا حامل ہے جو غالباً اس معاملہ پر غور کرنے پر توجہ نہیں دیتے یا بالکل ہی نہیں سوچتے۔ کیونکہ وہ اتنے نکتہ سنج ہوتے ہیں کہ ان کے خیالات کیسے ہی الجھے ہوئے کیوں نہ ہوں وہ صرف اپنا اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن اگر تم واقعی فلسفی (حقیقت جو) ہو تو ویسا ہی کرو جیسا میں کہتا ہوں۔

سیمیاس اور سی بیس دونوں نے کہا کہ: آپ جو کہہ رہے ہیں وہ بالکل درست ہے۔

ایشی کریٹس: جی ہاں فیڈو مجھے ان کے متفق ہونے پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ جس میں ذرا سی بھی عقل ہے وہ سقراط کے استدلال کو ہر قسم کے ابہام سے پاک تسلیم کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔

فیڈو: ایشی کریٹس یقیناً، اس وقت ساری محفل کا یہی احساس تھا۔

ایشی: جی ہاں! بالکل ہماری ہی طرح جو اس محفل میں حاضر نہیں تھے اور اب آپ کا بیان سن رہے ہیں پھر اس کے بعد کیا ہوا۔

فیڈو: جب یہ تمام باتیں مان لی گئیں اور سب نے یہ تسلیم کر لیا کہ اجسام کا وجود انفرادی ہوتا ہے اور دیگر اشیا ان میں شریک ہوتی ہیں اور ان ہی پر ان کے نام رکھے جاتے ہیں۔ سقراط میری یادداشت نے غلطی تو نہیں کی؟

انھوں نے کہا یہ آپ کا انداز گفتگو ہے تاہم جب تم یہ کہتے ہو کہ سیمیاس، سقراط سے بڑا اور فیڈو سے چھوٹا ہے تو درحقیقت تم اس بات کا اثبات کر رہے ہو کہ سیمیاس میں بڑے ہونے اور چھوٹے ہونے کی دونوں خصوصیات موجود ہیں۔

جی ہاں میں مانتا ہوں۔

اس نے بات جاری رکھی اور کہا کہ تاہم تم یہ رعایت کرتے ہو کہ الفاظ کے مفہوم کے مطابق سیمیاس حقیقت میں سقراط سے اس لیے بڑا نہیں کہ وہ دراصل سیمیاس ہے بلکہ اس جسامت کی وجہ سے بڑا ہے جو اسے ودیعت ہوئی ہے۔ اسی طرح دوسری جانب وہ سقراط سے بڑا اس لیے نہیں ہے کہ وہ سقراط ہے بلکہ جب سقراط کا موازنہ سیمیاس سے کیا جاتا ہے تو پتا چلتا ہے سقراط قد کے اعتبار سے سیمیاس سے چھوٹا ہے۔

درست ہے۔

اور اگر فیڈو کا قد اس سے بڑا ہے تو یہ بڑائی اس لیے نہیں ہے کہ فیڈو، فیڈو ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ فیڈو سیمیاس کے مقابلے بلحاظ قد بڑائی کا حامل ہے اور وہ نسبتاً چھوٹا ہے۔

یہ بات درست ہے۔

اس طرح سیمیاس کو چھوٹا بھی کہا جاتا ہے اور بڑا بھی کیونکہ وہ ان کے وسط میں ہے۔ کسی اور کا بڑا پن اس کے چھوٹے پن سے بازی لے جاتا ہے اور دوسرے کے چھوٹے پن کے سامنے اس کا بڑا پن اسے بڑھا دیتا ہے۔ انھوں نے ہنستے ہوئے بات بڑھائی اور کہا میں کتابی باتیں کر رہا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ درست ہے۔

سیمیاس نے کہا کہ ہاں درست ہے۔

میں یہ بات اس طرح اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے اس خیال سے اتفاق کریں کہ حقیقی بڑا پن بیک وقت چھوٹا اور بڑا نہیں ہو سکتا بلکہ یہ بات بھی مانیں کہ ہمارا حقیقی بڑا پن کبھی چھوٹے پن کو نہ تسلیم کرے گا اور نہ ہی اپنے سے بڑھ جانے پر رضا مند ہوگا، بلکہ دو باتیں واقع ہوں گی یا تو وہ اپنے متضاد چھوٹے پن کے سامنے سے فرار ہو جائے گا یا اپنی متضاد شے کے آتے ہی وہ یکسر ناپید ہو جائے گا لیکن وہ چھوٹا رہنے یا چھوٹا پن اختیار کر کے، وہ جو کچھ ہے، اس حالت کو تبدیل کرنے پر کبھی رضا مند نہیں ہوگا مثلاً میں چھوٹا پن حاصل کرنے کے بعد بھی ویسا ہی رہوں گا، جیسا تھا۔ میں پہلے ہی جیسا انسان رہوں گا بالکل ویسا ہی لیکن بڑا پن چھوٹا بننے پر رضا مند نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح ہمارا چھوٹا پن بڑا ہونے سے انکار کرتا ہے اور نہ ہی کوئی دوسری چیز' جو ہمیشہ یکساں رہتی ہے، اپنے متضاد کو قبول کرتی ہے یعنی وہ اپنی متناقض نہیں بن سکتی بلکہ وہ اس تبدیلی سے یا تو دور چلی جاتی ہے یا بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے۔

سی بیس نے جواب دیا میرا بھی یہی خیال ہے۔

اس مرحلے پر محفل میں سے کسی نے (مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون تھا) کہا کہ خدارا یہ بتایئے کیا اب تک جو کچھ کہا گیا تھا اس کے متضاد نہیں ہے، یعنی بڑے میں سے چھوٹے کا اور چھوٹے میں سے بڑے کا ظہور ہوا۔ مزید یہ کہ تناقض پیدا ہی تناقض سے ہوتا ہے لیکن اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس اصول سے انکار کیا جا رہا ہے۔

سقراط نے اپنا رخ سوال پوچھنے والے کی طرف موڑ کر اس کی بات سنی اور کہا میں آپ کے حوصلے کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے یہ بات یاد دلائی لیکن آپ یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ دونوں معاملات مختلف ہیں کیونکہ ہم اُس وقت صوری تناقض (غیر حقیقی) کی بات کر رہے تھے جبکہ اب ہمارا موضوع تناقض حقیقی ہے۔ وہ جس صورت میں بھی ہمارے ذہن میں ہیں یانی الحقیقت جس طرح کے ہیں ان پر غور کر رہے ہیں۔ ہم یہ کہہ رہے ہیں فطرت میں ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیلی یعنی اپنی حقیقت کے خلاف تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ عزیز من اُس وقت ہم ایسی اشیا کو زیر بحث لا رہے تھے جن پر تناقض عارض ہوا تھا اور جس میں وہ مدغم ہوتی ہیں اور اب ہم تناقض ذاتی کی بات کرتے ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ یہ ذاتی تناقض نہ کبھی ایک دوسرے میں ظہور پذیر ہوں گے اور نہ ہی ایک دوسرے سے پیدا ہوں گے۔

اسی وقت سی بیس سے مخاطب ہوتے ہوئے انھوں نے کہا سی بیس کیا تم ہمارے دوست کے اعتراض سے بوکھلا تو نہیں گئے۔

سی بیس نے کہا جی نہیں، بالکل نہیں۔ تاہم مجھے اس سے انکار نہیں کہ میں اعتراضات سے اکثر پریشان ہو جاتا ہوں۔

سقراط نے کہا کہ چلیے ہم اس بات پر متفق تو ہوئے کہ تناقض کبھی خود متناقض نہیں ہو سکتا یا خود تناقض میں مبتلا نہیں ہوگا؟

اس نے جواب میں کہا ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں۔

تاہم میں تم لوگوں سے کہوں گا کہ اس معاملے کو ایک اور نقطہ نظر سے زیر بحث لائیں، اور میں دیکھتا ہوں کہ تم مجھ سے متفق ہوتے ہو یا نہیں۔ ایک شے ایسی ہے جسے ہم حرارت کہتے ہیں دوسری جسے ہم برودت کا نام دیتے ہیں۔

یقیناً۔

لیکن کیا وہ آگ اور برف کی طرح ہوتی ہیں؟

بالکل نہیں۔

حرارت تو آگ سے مختلف ہوتی ہے اور اسی طرح برودت برف کی طرح نہیں ہوتی؟

جی ہاں۔

تاہم میرا اندازہ ہے کہ تم اتفاق کرو گے کہ جب برف کو حرارت ملے گی اپنے گزشتہ طرز بیان کے مطابق تو وہ نہ برف رہ جائے گی نہ حرارت بلکہ حرارت میں اضافے کے بعد برف یا تو پگھل جائے گی یا یکسر غائب ہو جائے گی۔

اس نے جواب دیا بالکل درست ہے اور خود آگ بھی برودت کے بڑھ جانے کے بعد یا تو بے اثر ہو جائے گی یا بجھ جائے گی۔ لیکن جب آگ برودت کے زیر اثر آئے گی تو وہ اپنی سابقہ حالت میں نہیں رہے گی جیسے کہ وہ پہلے تھی۔

اس نے کہا یہ درست ہے۔

بعض معاملات میں ایک آئیڈیا کا نام اس کے ساتھ صرف اس حوالے ہی سے لازوال رشتے سے منسلک نہیں ہوتا بلکہ کوئی اور شے بھی جو اگرچہ آئیڈیا نہیں ہوتی لیکن اس کے بغیر اس کا وجود قائم نہیں رہ سکتا اور اسے بھی وہی نام اختیار کرنے کا پورا پورا حق ہوتا ہے۔ میں اس کی وضاحت ایک مثال سے یوں کروں گا کہ طاق عدد کو ہمیشہ طاق ہی سے موسوم کیا جاتا ہے ناں؟

بالکل درست ہے۔

لیکن کیا صرف یہی وہ شے ہے جسے طاق کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ قابل فہم ہے کہ کیا دیگر اشیا ایسی نہیں ہیں جن کے اپنے نام ہیں پھر بھی انھیں طاق کہا جاتا ہے باوجودیکہ وہ طاق پن سے مختلف ہوتی ہیں۔ تاہم وہ بنیادی طور پر کبھی طاق پن کے بغیر موجود نہیں ہوتیں۔ میرا مطلب ہے ایسے جیسے تین کا عدد ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد مثالیں ہیں۔ اسی معاملہ کو لے لیجیے کیا تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تین کو اس کے اپنے مخصوص نام سے پکارا جائے اور اسے طاق بھی کہا جائے جو کہ تین جیسا نہیں ہے؟ یہ بات صرف تین ہی کے بارے میں ہی نہیں بلکہ پانچ اور ہر نوبتی عدد کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک طاق پن کے بغیر بھی طاق ہے۔ اسی طرح دو اور چار اور اس سلسلہ کے دیگر نوبتی عدد ہیں جو ہر ایک جفت پن سے عاری ہونے کے باوجود جفت ہیں۔ کیا تم اس بات سے اتفاق کرتے ہو؟

کیوں نہیں۔

اب ذرا اس نکتہ پر توجہ دو جو میرا ہدف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف بنیادی تضادات ہی ایک دوسرے کو خارج کر دیتے ہیں بلکہ وہ اشیا بھی جو اگرچہ بذاتِ خود ایک دوسرے کے متضاد نہیں ہوتیں، تضادات کی حامل ہوتی ہیں۔ میں کہتا ہوں وہ بھی اسی طرح اس شکل کو ترک کر دیتی ہیں جو اس میں جاگزیں ہیں، جب دوسری ان کے قریب آتی ہے تو وہ یا تو ختم ہو جاتی ہیں یا علیحدہ، مثلاً کیا تین کا عدد کسی جفت عدد میں تبدیل ہونے سے قبل ہی تین کا وجود قائم رکھتے ہوئے ہلاکت یا کسی اور صورت حال کا سامنا کرے گا۔

سی بیس نے کہا بالکل درست ہے۔

انھوں نے کہا تاہم دو کا عدد تین کے عدد کا یقیناً متضاد نہیں ہے۔

نہیں ہے۔

گویا نہ صرف متضاد اجسام ایک دوسرے کی پیش قدمی کو رد کر دیتے ہیں بلکہ دیگر ایسی اشیا بھی ہیں جو تضاد کے ظاہر ہونے سے قبل ہی پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔

اس نے کہا بالکل سچ ہے۔

انھوں نے کہا چلیے ہم اگر اپنے امکان بھر یہ طے کرنے کی کوشش کریں کہ وہ کیا کیا ہیں۔

بسر و چشم۔

سی بیس کیا وہ ایسے نہیں ہیں کہ ہر اس شے کو جو ان کے قبضہ میں ہے مجبور کریں کہ وہ نہ صرف اپنی شکل بلکہ اپنی متضاد شکل بھی اختیار کریں۔

آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جیسا کہ ابھی کہہ رہا تھا اور مجھے یقین ہے تم بھی یہ جانتے ہو کہ وہ تمام چیزیں جو تین کے عدد کی شکل اختیار کیے ہوئے ہیں وہ نہ صرف تعداد میں تین ہوں گی بلکہ طاق بھی ہوں گی۔

بالکل درست ہے۔

ایسی اشیا اپنے سے متضاد ایسی اشکال کی مداخلت برداشت نہیں کریں گی جو ہلکا سا بھی ایسا تاثر دیتی ہیں۔

نہیں۔

کیا یہ تاثر طاق کی شکل کا پیدا کردہ نہیں ہے؟

ہاں ہے۔

اور طاق کا متضاد جفت ہوتا ہے ناں؟

درست ہے۔

پھر تو جفت عدد کی شکل تین عدد میں کبھی داخل نہیں ہوگی۔

نہیں ہوگی۔

گویا تین کے عدد کا جفت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

کوئی نہیں۔

اس طرح تثلیث یا تین کا عدد غیر جفت یعنی طاق ہے۔

بالکل سچ ہے۔

آیئے اب ہم پران اشیا کی، میری مقررہ کردہ شناخت کی طرف لوٹ آتے ہیں جو تضادات کے سلسلے کی متضاد نہیں ہیں پھر بھی وہ اس تضاد کا اظہار نہیں کرتیں۔ جیسا کہ میں نے تین کے عدد کی مثال دے کر سمجھایا ہے اگرچہ وہ جفت کی متضاد نہیں ہے تاہم وہ کسی طرح جفت کو شریک نہیں کرتی، بلکہ متضاد کو ہمیشہ دوسری جانب کارکردگی کا موقع فراہم کرتی ہے جس طرح دو کا عدد طاق کو، یا آگ، ٹھنڈک کو قبول نہیں کرتی۔ (ان مثالوں سے اس سے بھی کہیں زیادہ مثالیں ہیں) شاید آپ اس عمومی نتیجے پر پہنچیں گے کہ نہ صرف متضادات ہی تضادات کو قبول نہیں کریں گے بلکہ اور کوئی شے جو کسی تضاد کا باعث ہوتی ہے وہ بھی جس تضاد کو پیدا کرتی ہے اس کے تضاد کو قبول نہیں کرے گی چونکہ تکرار میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس لیے میں اس موقع پر آپ کو یاد دلاؤں گا کہ پانچ کا عدد دس کے عدد سے جو پانچ کے عدد کا دوگنا ہے کبھی جفت نہیں بنے گا جس طرح اس کا عدد طاق کو یکسر رد کر دیتا ہے، دوگنے کا بذات خود ایک مختلف متضاد ہوتا ہے تاہم وہ طاق کو بالکل بھی قبول نہیں کرتا۔ اسی طرح 3:2 کے اجزا نہ ہی اس کا آدھا یا دو تہائی وغیرہ کل کی شکل قبول کریں گے۔ کیا تم یہ تسلیم کرتے ہو؟

اس نے کہا جی ہاں میں اس معاملے میں آپ سے کلی طور پر متفق اور آپ کے ہمراہ ہوں۔

انھوں نے کہا چلیے اس کا دوبارہ آغاز کرتے ہیں۔ تم میرے سوال کا جواب میرے ہی الفاظ میں نہ دیتے بلکہ میری مثال کو سامنے رکھو، جس محتاط جواب کا میں ذکر پہلے کر چکا ہوں مجھے ویسا جواب نہ دیتے بلکہ ہماری گفتگو سے جو حقیقت تم نے اخذ کی ہے اس پر مبنی محتاط جواب دو۔ اگر تم مجھ سے پوچھو کہ وہ کیا شے ہے جس کی موجودگی کسی جسم کو گرم کرتی ہے تو میرا جواب یہ نہیں ہوگا کہ حرارت (ایسے جواب کو میں محتاط مگر احمقانہ کہتا

ہوں) بلکہ کہوں گا آگ یا ہم بحث کے جس مرحلے میں ہیں اس کے لحاظ سے یہ کہیں زیادہ عمدہ اور اعلیٰ جواب ہے۔ یا اگر تم مجھ سے پوچھو کہ جسم مرض کا شکار کیوں ہوتا ہے تو میرا جواب بیماری نہیں ہوگا بلکہ میں کہوں گا بخار سے اور بجائے یہ کہنے کہ طاق پن ہی سے طاق عدد ظاہر ہوتے ہیں میں کہوں گا کہ ان سب کی بنیاد اکائی ہے۔ بلکہ عام اشیا کی بھی یہی صورت ہے ممکن ہے اب بغیر مزید مثالوں کے یہ بات مکمل طور پر تمہارے ذہن نشین ہو جائے۔

اس نے کہا کہ آپ کی بات مجھے اچھی طرح سمجھ میں آ گئی ہے۔

ذرا یہ تو بتاؤ کہ وہ کیا شے ہے، جس کی موجودگی سے جسم زندہ رہتا ہے؟

اس نے جواب دیا روح کی موجودگی سے۔

کیا ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

جی ہاں یقیناً۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شے میں روح جاگزیں ہوتی ہے وہ حامل حیات بن جاتی ہے۔

جی ہاں بالکل۔

کیا زندگی کا تناقض موجود ہے؟

اس نے کہا۔

وہ کیا ہے؟

موت۔

گویا ہم نے جو نتیجہ پہلے اخذ کیا تھا اس کے مطابق یہ واضح ہے کہ روح اس شے کا متضاد کبھی قبول نہیں کرے گی جسے وہ پیدا کرتی ہے۔

سی بیس نے کہا: یہ ناممکن ہے۔

انھوں نے کہا اب یہ بتایئے کہ ابھی ابھی ہم نے اسے کیا نام دیا ہے جو جفت کی شکل میں شریک نہیں ہوتا؟

طاق۔

اور جو اصول سُر یا عدل کو قبول نہیں کرتا وہ کیا ہے؟

بے سُرا پن اور ناانصافی۔

اور ہم اس اصول کو کیا کہتے ہیں جو موت کو تسلیم نہیں کرتا۔

اس نے کہا لافانی۔

کیا روح موت میں شامل ہوتی ہے۔

نہیں۔

پھر تو روح لافانی ہوئی۔

اس نے کہا۔ جی ہاں۔

کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بات ثابت شدہ ہے۔

فرض کرو کہ طاق بنیادی طور پر لافانی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پھر تین کا عدد لازمی طور پر لافانی ہوگا۔ اس میں کیا شک ہے۔

اور کیا ایسا نہیں ہے کہ جس وقت حرارت برف پر حملہ آور ہو اور اگر برودت بھی لافانی ہو تو برف اپنی اصل حالت میں پگھلے بغیر واپس ہو جائے گی۔ کیونکہ وہ کبھی نیست و نابود نہیں ہوگی اور نہ ہی وہ وہاں قدم جما کر حرارت میں شامل ہو سکتی ہے؟

اس نے کہا یہ درست ہے۔

مزید یہ کہ اگر کوئی شے سرد کر لی جائے تو وہ ناقابلِ ہلاکت ہوتی ہے۔ آگ جب برودت کے حملے کی زد میں آئے گی اور نابود نہ ہوگی اور نہ ہی بجھے گی بلکہ بال بیکا کیے بغیر ہی واپس ہو جائے گی۔

اس نے کہا یقیناً۔

مزید برآں یہی بات لافانی اشیا پر بھی صادق آتی ہے اور اگر لافانی بھی لازوال ہو تو جب موت حملہ کرے گی تو روح بھی نابود نہیں ہو سکے گی کیونکہ ماقبل استدلال سے ثابت ہے کہ روح کبھی موت سے ہمکنار نہیں ہوگی یا موت کی صورت میں بھی موجود رہے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح تین کا عدد یا طاق عدد کا وجود جفت کی شکل میں قائم رہے گا یا آگ یا آگ کی گرمی برودت بن کر موجود رہے گی۔ تاہم کوئی نہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہر چند کہ طاق عدد، جفت عدد کی آمد سے جفت نہیں بن جائے گا تو پھر ایسا کیوں نہیں ہوگا کہ طاق نابود ہو جائے اور جفت اس کی جگہ لے لے؟ ایسے شخص کے لیے جو یہ اعتراض کر سکتا ہے ہمارا یہ جواب درست نہیں ہو سکتا کہ طاق لافانی ہے۔ کیونکہ اس بات کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ اگر ہم نے اسے ایک حقیقت مان لیا ہے تو پھر یہ دعویٰ کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی کہ جفت کے آتے ہی طاق اور تین عدد رخصت ہو گئے اور یہی

استدلال آگ، حرارت اور دیگر ہر شے پر صادق آئے گا۔

بالکل درست۔

اور یہی بات ''لافانی'' کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ لازوال بھی لافانی ہوتا ہے تو پھر روح لازوال بھی ہوگی اور لافانی بھی اور اگر یہ تسلیم نہیں کرتے تو پھر اس کی لافانیت کا کوئی اور ثبوت فراہم کرنا ہوگا۔

اس نے کہا نہیں مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں کیونکہ لافانی جو لازوال ہے فنا کے قابل ہو سکتا ہے تو پھر کوئی شے لازوال نہیں ہے۔

ہاں سقراط نے جواب دیا ہر شخص متفق ہوگا کہ دیوتا اور زندگی کی بنیادی شکل (جوہر) اور عام طور کی ہر لافانی شے کبھی نابود نہیں ہوں گی۔

اس نے کہا جی ہاں یہ درست ہے۔ انسان بھی نہیں اور اگر میں غلط نہیں سمجھا تو دیوتا بھی اور انسان بھی۔

جب یہ نظر آتا ہے کہ لافانی شے لازوال ہوتی ہے تو کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ روح جو لافانی ہے لازوال نہ ہو؟

یقیناً۔ اس صورت میں جب کسی شخص پر موت حملہ آور ہوتی ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس کا فانی جز موت کی نذر ہو جائے لیکن اس کا لازوال جز و موت کی آمد کے ساتھ ہی منظر سے ہٹ جائے اور اسے لازوال کی حیثیت سے محفوظ کر لیا جائے۔

جی ہاں۔

اس صورت میں سی بیس یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ روح لافانی اور لازوال ہے اور ہماری روح واقعی دوسری دنیا میں موجود رہے گی۔

سی بیس نے کہا سقراط میں اس بات کا قائل ہوں میرا کوئی اعتراض باقی نہیں رہا۔ لیکن اگر میرے دوست سیمی یاس یا کسی اور کو کچھ کہنا ہو یا مزید کوئی اعتراض باقی رہ گیا ہو تو ابھی وقت ہے۔ بہتر ہے وہ اس کا اظہار کر دے، خاموش نہ رہے کیونکہ اگر وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں اور کہے جانے کے آرزومند ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ اس سے بہتر اور کس وقت یا کس محفل کے لیے وہ اسے بچائے رکھیں۔

سیمیاس نے جواب دیا کہ مجھے بھی بحث کے نتائج پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی لیکن جب

میں موضوع کی اہمیت اور انسان کے کمزور ہونے پر غور کرتا ہوں۔ تو میں یہ محسوس کرتا ہوں اور ایسا کرنے سے
ابھی نہیں آسکتا کہ میرے ذہن میں غیر یقینی پن باقی ہے۔

سقراط نے جواب دیا سیمیاس یہ بات درست ہے اور تم نے اسے بہت اچھی طرح بیان کیا ہے۔
میں یہ اضافہ کروں گا کہ ہمارے پہلے اصول جنھیں تم یقینی تسلیم کرتے ہو ان پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت ہے
اور جب ان کا اچھی طرح تجزیہ کر لیا جائے تو پھر جہاں تک انسان کے بس میں ہے تم استدلال کو سمجھ سکتے ہو۔
اگر تمہیں یقین ہو کہ تم ایسا کر چکے ہو تو پھر مزید کسی تحقیق کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

بالکل درست ہے۔

اس نے کہا میرے دوستو! اگر روح دراصل لافانی ہے تو پھر اس کی نہ صرف اس مہلت کے عرصے میں جسے زندگی کہا جاتا ہے بلکہ ابد تک کس طرح دیکھ بھال کی جائے۔ اس نقطہ نظر سے اس سے لاپروائی برتنے کا خوف اب حد درجہ زیادہ ہو گیا ہے۔ اگر یہ موت ہر شے کو ختم کر دیتی ہے تو گناہ گاروں کے لیے یہ نعمت ہوگی کیونکہ وہ تو نہ صرف اپنے جسم بلکہ روح سے خوشی خوشی کنارہ کش ہو جائیں گے لیکن جب روح کو ابدی ثابت کیا گیا ہے، اس کے لیے گناہوں سے چھٹکارا یا نجات کا سوائے اس کے اور کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وہ اعلیٰ ترین نیکی اور عقل حاصل کرے کیونکہ روح عالم تحت کے سفر میں اپنے ساتھ سوائے تربیت اور تعلیم کے کچھ اور نہیں لے جاتی ہے اور اس سفر کے آغاز ہی میں اس کو بہت زیادہ مفید یا بہت زیادہ مضر سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ عام خیال کے مطابق جو فرشتہ زندگی میں ان کے حصہ میں آیا تھا وہی اس مقام کے لیے ان افراد کی راہنمائی کرے گا، جہاں روحیں جمع ہوتی ہیں اور پھر حساب کتاب ہونے کے بعد وہ عالم تحت میں روانہ ہو جائیں گے اس کے بعد وہ اپنے فرشتے کی راہنمائی میں فیصلے کے مطابق کسی دوسرے عالم کی طرف روانہ ہو جائیں گے اور جب وہ اپنا حصہ وصول کر لیں گے، اپنا وقت پورا کر لیں گے تو پھر دوسرا راہنما انھیں کئی نسلیں گزرنے کے بعد دوبارہ اس دنیا میں واپس لائے گا۔ دوسری دنیا کا یہ راستہ اکلوتا اور سیدھا نہیں ہے جیسا کہ ایسکی لس (Aesechylus) نے اپنی نظم ٹیلی فس (Telephus) میں بیان کیا ہے۔ اگر راستہ ایسا ہی ہوتا تو کسی راہنما کی ضرورت نہ ہوتی، کیونکہ ایسے میں کوئی راہ گم نہیں کر سکے گا۔ لیکن اس راستے کی متعدد شاخیں اور موڑ ہیں۔ میں نے یہ اندازہ ان رسومات اور قربانیوں سے لگایا ہے جو اس دنیا میں اس مقام پر پیش کی جاتی ہیں جہاں تین راستے ملتے ہیں عاقل اور شائستہ روح اپنے مقرر کردہ راہنما کی پیروی کرتی ہے اور اپنے ماحول سے واقف ہوتی ہے۔

لیکن جو روح جسم کی طالب ہوتی ہے اور جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں مردہ ڈھانچے اور مادی

دنیا کے گرد پھڑپھڑاتی رہتی ہے اسے بہت جدوجہد کرنی پڑتی ہے، بڑے بڑے مصائب سے گزرنا پڑتا ہے اور اس کا نگران بمشکل تمام زبردستی اسے اٹھا کر لے جاتا ہے اور جب وہ اس مقام پر پہنچتی ہے جہاں دوسری روحوں کا مجمع ہوتا ہے تو دیگر روحیں اس کے قریب نہیں آتیں اس سے دور دور رہتی ہیں۔ اگر وہ ناپاک اور گناہگار ہو اس نے ناجائز قتل اور جرائم کیے ہوں تو کوئی بھی اس کا ہم نشین نہیں بنے گا، کوئی بھی اسے راستہ نہیں دکھائے گا۔ وہ اپنا وقت پورا ہونے تک تنہا، بے پناہ مصائب کے علاقے میں سرگرداں رہے گی اور وقت پورا ہونے کے بعد اسے اس مقام پر بغیر کسی مزاحمت کے پہنچا دیا جائے گا جس کی وہ اہل ہے۔ بالکل اسی طرح ہر وہ روح اپنی مناسب قیام گاہ پر پہنچ جاتی ہے جو پاک اور عادل ہوتی ہے اور جس نے اپنی زندگی دیوتاؤں کی صحبت اور راہنمائی میں گزاری ہو۔

دیکھو زمین کے مختلف اور عجیب و غریب علاقے ہیں جو قدرتی اور اپنی وسعت کے لحاظ سے عام جغرافیہ دانوں کے تصورات سے یکسر مختلف ہیں۔ یہ بات مجھے ایک ایسے جغرافیہ دان نے بتائی ہے جو گمنام رہنا چاہتا ہے۔

سیمیاس نے پوچھا سقراط آپ کا مطلب کیا ہے میں نے خود بھی زمین کے بارے میں متعدد باتیں سنی ہیں لیکن مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ میں وہ بات سننا چاہوں گا جس پر آپ نے یقین کیا ہے۔

سقراط نے جواب میں کہا سیمیاس سنو! اس کا حال بیان کرنے کے لیے گلوکس (Glaucus) کے فن کی ضرورت ہے اور میں اس فن سے بے بہرہ ہوں حالانکہ میں نہیں جانتا کہ گلوکس کا فن میری کہانی کی صداقت کو کس حد تک ثابت کر سکتا ہے۔ میں خود بھی ان باتوں کی تصدیق نہیں کر سکتا اور اگر میں تصدیق کر بھی لوں پھر بھی سیمیاس مجھے اندیشہ ہے کہ استدلال کی تکمیل ہونے سے قبل ہی میری زندگی ختم ہو جائے گی۔ میں اپنے تصور کے مطابق زمین کی شکل اور اس کے علاقوں کو بیان کروں گا۔

سیمیاس نے کہا اتنا کافی ہوگا۔

انھوں نے کہا پھر سنو! میرا یہ یقین ہے کہ زمین ایک گول جسم ہے جو آسمان کے مرکز میں واقع ہے۔ اس لیے اسے قائم رہنے کے لیے ہوا یا اسی طرح کی کسی قوت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اردگرد کے آسمان کی ہمواری اور خود اپنے توازن کے سبب گرنے یا جھکنے نہیں پاتی کیونکہ جو شے متوازن ہو اور ایسی شے کے عین مرکز میں ہو جو متوازن طور پر پھیلی ہوئی ہو تو وہ کسی طرف یا کسی درجہ میں جھکے گی نہیں لیکن ہر شے سے یکساں دوری پر غیر متحرک رہے گی اور انحراف نہیں کرے گی، یہ میرا پہلا نظریہ ہے۔

سیمیاس نے کہا ظاہر ہے یہ بالکل درست ہے۔

میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ زمین بہت وسیع و عریض ہے ہم لوگ جو اس خطے میں رہتے ہیں جو فاسس (Phasis) سے پلرز آف ہراکلس (Pillars of Heracles) تک پھیلا ہوا ہے اور صرف وہی ذرا سا حصہ ہے جو سمندر کے ساحل پر ہے اور اس کی حیثیت کسی دلدل کے اردگرد مینڈک یا چیونٹی کی طرح ہے۔ ہیں کہ ایسے بہت سے علاقے ہیں اور ان میں بہت سے باشندے۔ زمین کی سطح پر ہر شکل کے چھوٹے بڑے غار اور گڑھے ہیں جن میں پانی، گہری اور نچلی سطح والی ہوا جمع ہو جاتی ہے لیکن حقیقی زمین پاک وصاف ہے اور پاک آسمان پر واقع ہے، جہاں ستارے بھی ہیں اور آسمان بھی جسے اکثر و بیشتر ماہرین ایتھر (either) کہتے ہیں۔ ان گڑھوں میں جمع شدہ دیگر اشیا اسی کا تلچھٹ ہیں۔ ہم لوگ جو ان گڑھوں میں رہتے ہیں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہم زمین کی سطح کے اوپر رہ رہے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہے کہ کوئی مخلوق جو سمندر کے نیچے رہتی ہے یہ سوچے کہ وہ پانی کی سطح پر زندگی گزار رہی ہے اور سمندر مثل آسمان کے ہے اور اس کے وسیلے سے سورج اور دیگر ستارے اسے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی کمزوری اور کسل مندی کی وجہ سے کبھی پانی کی سطح پر نہیں آیا۔ کبھی سر اٹھا کر نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی ایسے فرد کی بات سنی جس نے سطح پر آ کر مشاہدہ کیا ہو کہ وہاں کی دنیا کتنی پاک اور خوبصورت ہے۔ ہمارا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ ہم زمین کے ایک گڑھے میں مقیم ہیں اور یہ تصور کرتے ہیں کہ ہم سطح پر ہیں اور یہ ہوا جسے ہم آسمان کہتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ستارے اس میں تیر رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنی نقاہت اور سستی کے باعث ہم ہوا کی اوپری سطح پر نہیں آ سکتے کیونکہ اگر کوئی بیرونی سطح پر آ جائے یا اسے پرندوں جیسے پر حاصل ہو جائیں اور بیرونی سطح پر پہنچ جائے تو پھر اس مچھلی کی طرح جو پانی سے باہر سر نکال کر دنیا کو دیکھتی ہے اسے وہاں ایک اور ہی دنیا نظر آئے گی اور اگر اس منظر کو برداشت کرنا انسان کے بس میں ہو تو وہ اعتراف کرے گا کہ یہی وہ دنیا ہے جہاں حقیقی جنت، حقیقی نور اور حقیقی زمین واقع ہے۔ کیونکہ زمین، چٹانیں اور ہمارے اردگرد کا سارا علاقہ برباد اور کٹا پھٹا ہوتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح سمندر کے اندر کی چیزوں کو کھارا پانی کھا جاتا ہے۔ نہ صرف سمندر کے اندرونی علاقے میں کوئی صحیح سالم اچھی طرح نشوونما پائی ہوئی شے ہے اور نہ ہی اس مقام پر جہاں وہ زمین سے ملتا ہے۔ وہاں بھی پتھریلے غار، ریت اور کیچڑ اور دلدل کا ایک لامتناہی سلسلہ ہوتا ہے جس کا ہماری دنیا کے حسین مناظر سے کوئی موازنہ نہیں ہو سکتا۔ ہماری دنیا سے دوسری دنیا کا موازنہ اس سے کمتر درجہ ہوگا۔ سیمیاس اگر تم خیالی داستانوں کو ناپسند نہ کرو تو میں تمہیں ایک ایسی داستان اس دنیا کے بارے میں سناؤں گا جو زمین کی سطح پر آسمان کے نیچے ہے اور سننے کے لائق ہے۔

سیمیاس نے کہا کہ سقراط ہم آپ کی خیالی داستان سے مسحور ہو جائیں گے۔

اس نے کہا میرے دوست داستان کچھ یوں ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ہم حقیقی زمین کو اوپر سے دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں ایک ایسی گیند کی طرح نظر آتی ہے جو چمڑے کے بارہ ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائی گئی ہو۔ وہ رنگ برنگ کے ایسے مختلف رنگوں کا جوڑ ہوتا ہے جو تھوڑا بہت ان رنگوں سے ملتا جلتا ہوتا ہے جنھیں ہمارے زمین کے مصور استعمال کرتے ہیں لیکن وہاں ساری زمین ہی انہی رنگوں سے عبارت ہوتی ہے جو ہمارے رنگوں سے زیادہ چمکدار اور صاف ہوتے ہیں۔ ارغوانی رنگ کی چمک حیران کن ہوتی ہے اس میں سنہرا پن اور سفیدی جھلکتی ہے جو ہماری زمین کے چونے اور برف سے کہیں زیادہ سفید ہوتی ہے۔ زمین ایسے ہی دیگر رنگوں سے بنی ہوئی ہے اور ان کی تعداد اور چمک اس سے کہیں زیادہ ہے جنھیں انسانی آنکھ نے کبھی دیکھا ہے۔ ان تمام گڑھوں کا (جن کا ذکر میں نے کیا تھا) جو ہوا اور پانی سے بھرے ہوئے ہیں اپنا ایک علیحدہ رنگ ہے اور وہ رنگ برنگ کے ماحول میں روشنی کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں۔ پورے کا پورا منظر کثرت میں وحدت بن کر نظر آتا ہے اور اس خوبصورت علاقے کی ہر شے پودے، پھول اور پھل جو کچھ وہاں پیدا ہوتا ہے یہاں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ شفاف اور حسین تر ہوتا ہے۔ وہاں پہاڑیاں بھی ہوتی ہیں لیکن ان کی چٹانیں ہماری چٹانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ چکنی اور شفاف ہوتی ہیں اور ان کا رنگ دنیا کے بیش قیمت زمرد، زبرجد، عقیق، اور دیگر پتھروں سے کہیں زیادہ روشن اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والا ہوتا ہے۔ ہمارے یہ پتھر ان کے معمولی سے چھوٹے ٹکڑے ہیں کیونکہ اس دنیا کے تمام پتھر ہمارے جواہرات کی طرح ہوتے ہیں، لیکن وہ کہیں زیادہ چمک دمک والے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خالص ہوتے ہیں وہ ہمارے قیمتی پتھروں کی طرح کٹے پھٹے نہیں ہوتے اور نہ ان میں نمکین اجزا کی آمیزش ہوتی ہے۔ زمین میں ان اجزا کی آمیزش، ان پتھروں میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا کر کے انھیں خراب کر دیتی ہے۔ جانور اور پودے بھی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اوپر کی زمین کے لیے وہ جواہرات میں گنے جاتے ہیں جو سونا اور چاندی وغیرہ کی طرح دمکتے ہیں ان پر ہر دم سورج کی روشنی پڑتی رہتی ہے۔ وہ بڑے ہوتے ہیں اس زمین میں ہر جگہ بافراط پائے جاتے ہیں اور زمین کو ایسا حسن عطا کرتے ہیں کہ دیکھنے والے کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ وہاں بہت سے جانور بھی ہیں اور انسان بھی کچھ زمین پر رہتے ہیں اور کچھ ہوا میں اسی طرح رہتے ہیں جس طرح ہم سمندر کے کنارے۔ پر کچھ ان جزیروں میں مقیم ہیں جو براعظم کے کنارے ہوا سے گھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر انھیں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے لیے ہوا کی وہ افادیت ہے جو ہمارے لیے پانی اور سمندر کی ہے اور ان کے لیے پتھر و بیا

ی ہے جیسا ہمارے لیے ہے۔ مزید برآں ان کے موسموں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں کوئی مرض پیدا نہیں ہوتا
اور ان کی زندگی ہم سے زیادہ طویل ہوتی ہے۔ ان کی بصارت، سماعت اور عقل اور دیگر تمام صلاحیتیں ہم سے
کہیں بہتر اور مکمل ہوتی ہیں۔ اسی تناسب سے ہوا پانی سے اور ایتھر ہوا سے خالص تر ہوتا ہے۔ وہاں بھی
عبادت گاہیں اور متبرک مقامات ہوتے ہیں، جہاں ان کے دیوتا خود رہتے ہیں اور ان کی آوازیں سنتے اور ان
کا جواب دیتے ہیں۔ انھیں ان کی موجودگی کا علم ہوتا ہے اور ان سے دوبدو گفتگو بھی کرتے ہیں۔ وہ سورج،
چاند اور ستاروں کو ان کی حقیقی صورت میں دیکھتے ہیں اور ان کی دیگر نعمتیں اسی کا جزو ہوتی ہیں۔

تمام زمین اور اس پر موجود تمام اشیا کا یہی حال ہے اور زمین پر جو گڑھے اور غار ہیں ان میں مختلف
نوع کے علاقے ہیں۔ کچھ ایسے جو ان سے زیادہ گہرے اور وسیع ہیں جن میں ہم بستے ہیں کچھ گہرے مگر تنگ
ہیں کچھ اتھلے ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع بھی ہیں۔ ان تمام میں لاتعداد سوراخ ہیں اور زمین کی اندرونی
ساخت میں تنگ اور چوڑے راستے ہیں جو ایک دوسرے کو ملاتے ہیں اور ان میں سے پانی نکلتا ہے اور خارج
بھی ہوتا ہے، بالکل برتن کی طرح وہاں پانی کا ایک وسیع قطعہ بھی ہے اور زمین کے نیچے ہمیشہ بہنے والے نالے
اور دریا ہیں اور گرم اور سرد پانی کے چشمے بھی ہیں۔ آگ کا ایک بہت بڑا علاقہ ہے۔ آگ کے بڑے بڑے
دریا ہیں اور رقیق کیچڑ نالیاں ہیں (سسلی (sicily) کی کیچڑ بھری ندیوں کی طرح جن کے پیچھے لاوا بہتا ہے)
اور جن علاقوں میں وہ بہتی ہیں وہ ان سے ہی بھرا ہوا ہے۔ زمین کے اندرونی حصے میں جھولے جیسا ایک علاقہ
ہے جو انھیں اوپر نیچے ہلاتا ہے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں ایک ایسا خلا ہے جو ان سب سے بڑا ہے اور پوری زمین میں گھسا ہوا
ہے۔ یہی وہ خلا ہے جسے ہومر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"دور بہت دور زمین کے نیچے اتھاہ گہرائیوں میں"

جسے اس نے اور دیگر متعدد شعرا نے ٹارٹارس (Tartarus) کا نام دیا ہے اور اس میں جھولے جیسی
حرکت ان دریاؤں کے وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو اس خلا میں داخل ہوتے ہیں اور باہر نکلتے ہیں اور یہاں پانی
کی کوئی تہ نہیں ہے۔ وہ صرف زور و شور سے بلند ہوتا ہے اور نیچے آتا رہتا ہے۔ اس کے گرد جو ہوا ہے وہ اسی
طرح حرکت کرتی ہے۔ وہ زمین کی دور دراز جانب آتے جاتے پانی کے ساتھ ساتھ اوپر نیچے ہوتی رہتی ہے
اور عمل تنفس کی طرح ہوا ہمیشہ اندر جاتی ہے اور باہر نکلتی ہے۔ اس طرح پانی کے ساتھ حرکت کرتی ہوئی خوفناک
آواز پیدا کرتی ہے جو ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ جب پانی اندرونی سطح میں چلا جاتا ہے جیسا کہ عام خیال

ہے وہ زمین کے دور والے علاقے میں دریا کی صورت میں باہر نکلتا ہے اور انھیں اس طرح بھر دیتا ہے گویا یہ کام کسی پمپ سے لیا گیا ہے اور جب وہ اس علاقے کو سیراب کر کے اپنی اسی جگہ لوٹتا ہے تو وہاں نالوں، ندیوں کو لبریز کر دیتا ہے اور وہ اس طرح بھر جانے کے بعد زیرِ زمین نہروں کی صورت میں اپنے مقررہ مقامات کا راستہ بنا لیتی ہیں، جس سے سمندر، جھیلیں، دریا اور چشمے وجود میں آتے ہیں۔ وہاں سے وہ دوبارہ زیرِ زمین چلے جاتے ہیں کچھ مختلف مقامات میں بہتی ہیں اور کچھ کا راستہ بہت ہی مختصر ہوتا ہے۔ وہ قریب کے چند مقامات تک ہی جاتی ہیں اور پھر ٹارٹارس میں شامل ہو جاتی ہیں کچھ کسی ایسی جگہ تک جاتی ہیں جس کی سطح ان کے منبع سے پست ہوتی ہے۔ کچھ اتنی زیادہ پستی تک نہیں جاتیں تاہم تمام کی تمام اپنے منبع سے کسی نہ کسی قدر نیچے ہی بہتی ہیں۔ کچھ بالکل مخالف سمت گرتی ہیں اور کچھ اسی سمت۔ کچھ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی زمین کے گرد بہتی ہیں اور جہاں تک وہ نیچے جا سکتی ہیں جا کر اسی خالی جگہ میں گر جاتی ہیں۔ ادھر اُدھر بہتے ہوئے دریا زمین کے مرکز ہی میں اترتے ہیں۔ اس سے آگے نہیں کیونکہ ان کے دو جانب اس کا راستہ بلند ہوگا۔

یہ دریا بہت بڑے، متعدد زبردست اور کئی طرح ہوتے ہیں بڑے بڑے خاص دریا چار ہیں۔ ان میں سب سے بڑے اور بیرونی کا نام اوشی نس (Oceanus) ہے جو ایک دائرے میں رواں رہتا ہے۔ اس کے عین مقابل دریائے ایشی ران (Acheron) ہے جو مخالف سمت میں بہتا ہوا ریگستانوں سے گزر کر زیرِ زمین چلا جاتا ہے اور ایشی روسی ان (Acherusian) جھیل میں گر جاتا ہے۔ یہی وہ جھیل ہے جس کے کنارے موت کے بعد بہت سے لوگوں کی روحیں جاتی ہیں اور اپنے اپنے مقررہ وقت کے مکمل ہونے کے بعد (جو کسی کے لیے طویل اور کسی کے لیے مختصر ہوتا ہے) دنیا میں واپس کر دی جاتی ہیں، جہاں وہ کسی حیوان کی صورت میں پیدا ہوتی ہیں۔ تیسرا دریا ان دونوں کے درمیان سے گزرتا ہے اور اپنے مخرج کے قریب آگ کے وسیع خطے میں اس طرح شامل ہو جاتا ہے کہ بحیرۂ روم (Mediterranean) سے بڑی ایک جھیل بن جاتی ہے جس میں پانی اور کیچڑ ابلتا رہتا ہے۔ دریا اپنے کیچڑ سے بھرے ہوئے گدلے پانی کو لے کر زمین کے اندرونی حصے میں بل کھاتے متعدد مقامات سے ہوتا ہوا ایشی روسی ان جھیل میں سارا گدلا پانی انڈیل دیتا ہے لیکن جھیل کے پانی میں شامل نہیں ہوتا اور زمین کے گرد متعدد بار چکر کاٹ کر ٹارٹارس جھیل کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو جاتا ہے۔ یہ وہی دریا ہے جسے پائیری فلیجی تھان (Pyriphlegethon) کہا جاتا ہے جو زمین کے مختلف حصوں میں لاوا فوارے کی شکل میں اگلتا ہے۔ چوتھا دریا اس کی مخالف سمت بہتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ ایک نہایت ہی دہشت ناک اور جنگلی علاقے میں گرتا ہے، جو لاجورد کی طرح شوخ نیلے رنگ کا ہے۔ یہ وہی علاقہ ہے جسے

...ن کہا جاتا ہے اور اس دریا کے گرنے کے بعد جو جھیل بنتی ہے اسے اسٹائیکس کا نام دیا گیا ہے۔ جھیل
...نے اور اپنے پانی میں حیرت ناک قوت حاصل کرنے کے بعد وہ زمین کے نیچے سے گزرتی ہے اور
...یری فلیجی تھان دریا کے مخالف سمت میں بہتی ہوئی ایشی روسی ان جھیل سے جا ملتی ہے۔ اس جھیل کا پانی بھی
...دوسرے پانی سے نہیں ملتا بلکہ دائرے میں بہتا ہوا پائیری فلیجی تھان کے مخالف سمت میں گر جاتا ہے اس
کا نام بقول شاعر کوکیٹس (Cocytus) ہے۔

دوسری دنیا کی یہ کیفیت ہے اور جب مرا ہوا فرد اپنے مخصوص فرشتے کی راہنمائی میں مقررہ مقام پر
پہنچتا ہے تو اس فیصلہ کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ دنیا میں پاکیزگی سے رہا ہے یا نہیں اور جو لوگ نہ تو نیکی سے رہے اور
نہ بدی سے۔ انھیں دریائے ایشی ران (Acheron) کے کنارے بھیج دیا جاتا ہے اور وہاں ہمارے خیال کے
مطابق جیسی بھی کشتی موجود ہوتی ہے وہ اس پر سوار ہو جاتے ہیں اور انھیں جھیل پر پہنچا دیا جاتا ہے جہاں وہ
رہتے ہیں اور انھیں ان کے گناہوں سے پاک کیا جاتا ہے اور انھوں نے دوسروں کے ساتھ جو زیادتیاں کی
ہوتی ہیں ان کا خمیازہ بھگتنے کے بعد انھیں درگزر کر کے، انھوں نے دنیا میں جو نیک اعمال کیے تھے اس کا صلہ ہر
ایک کو اس کے استحقاق کے مطابق عطا کیا جاتا ہے لیکن جو لوگ اپنے گناہوں کی زیادتی کے سبب ناقابل
مغفرت نظر آتے ہیں یعنی جنھوں نے مذہب کی متعدد بار بے حرمتی اور بہت سے بلا جواز اور پرتشدد قتل وغیرہ
کیے ہوتے ہیں انھیں ٹارٹارس دریا میں پھینک دیا جاتا ہے جو نہایت مناسب تقدیری امر ہے، وہ اس سے کبھی
باہر نہیں نکلتے۔ جو لوگ ایسے گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں جو بہت بڑے ہوتے ہوئے بھی قابل معافی ہوتے ہیں
مثلاً جنھوں نے غیض وغضب کے عالم میں اپنے باپ یا ماں پر تشدد کیا پھر تمام عمر پچھتاتے رہے یا جنھوں نے
اسی طرح کے جذباتی لمحے میں کسی کو قتل کر دیا ہو، ایسے لوگوں کو بھی ٹارٹارس دریا میں غرق کر دیا جاتا ہے جس کی
اذیت کو انھیں ایک سال تک برداشت کرنا ہوگا جس کے بعد موجیں اسے ساحل پر پھینک دیں گی۔ خودکشی
کرنے والے کو کیٹس (Cocytus) میں سے باپ اور ماں کے قاتل پائیری فلیجی تھان (Pyriphlegethon)
...ماتے۔ ایشی روسی ان (Acherusian) جھیل پہنچا دیے جاتے ہیں وہ وہاں ان کو آوازیں دیتے ہیں جنھیں
انھوں نے قتل کیا ہے یا ان سے زیادتیاں کی ہیں۔ وہ ان کے حال پر رحم کرتے ہوئے انھیں جھیل میں آنے کی
اجازت دے دیتے ہیں۔ اگر ان کی بات مان لی جاتی ہے وہ جھیل سے باہر آ جاتے ہیں اور ان کا عذاب ختم ہو
جاتا ہے اور اگر ان کی سنی نہیں جاتی تو وہ دوبارہ ٹارٹارس دریا میں بھیج دیے جاتے ہیں جہاں سے وہ مسلسل ایک
سے دوسرے دریاؤں میں بہتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جن سے انھوں نے زیادتی کی ہے وہ ان پر ترس کھاتے

ہیں۔ یہی وہ فیصلہ ہے جو ان کے منصفوں نے دیا ہے لیکن وہ افراد جو پاکیزہ زندگی گزارنے میں نمایاں رہے انھیں ارضی قید خانے سے رہا کر دیا جاتا ہے وہ اپنے مقدس گھر کو چلے جاتے ہیں جو عالمِ بالا میں واقع ہے اور حقیقی زمین پر رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان میں سے بھی جنھوں نے فلسفے سے اپنی ذات کو کما حقہ پاک کر لیا وہ جسم کو چھوڑ کر اس سے بھی بہتر گھروں میں رہتے ہیں جنھیں بیان نہیں کیا جا سکتا اب میرے پاس اتنا وقت نہیں رہا کہ میں ان کے بارے میں کچھ کہوں۔

سیمیاس تم ہی بتاؤ ان تمام باتوں کو دیکھ کر کیا ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہم زندگی میں نیکی اور دانائی حاصل کریں؟ انعام کتنا عمدہ اور توقع کتنی اعلیٰ ہے۔

کسی ہوشمند کو یہ نہیں چاہیے کہ میں نے روح اور محلوں کا جو ذکر کیا ہے اسے بالکل سچ تسلیم کرے لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جہاں تک روح کے لافانی ہونے کا ذکر ہوا ہے اسے چاہیے کہ وہ اس پر بے جا طور پر حقارت سے غور نہ کرے۔ اس میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے یہ جسارت بہت شاندار ہے اسے امکان بھرے ان الفاظ سے سکون حاصل کرنا چاہیے یہی وجہ ہے کہ میں نے اتنی طویل گفتگو کی ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی ایسی روح پر خوش ہو جو جسمانی لذتوں اور آلائشوں سے اس خیال سے کنارہ کش ہو جاتی ہے کہ وہ نفع بخش ہونے سے زیادہ نقصان دہ ہیں۔ ایسی روح علم کی مسرتیں حاصل کرتی ہے اور وہ اپنی روح کو کسی مانگے ہوئے لباس فاخرہ سے نہیں بلکہ اعتدال ذات، عدل، حوصلہ، شرافت اور صداقت کے فطری جواہرات سے آراستہ کرتی ہے۔ اس طرح سج سجا کر روح عالمِ تحت کے سفر پر روانہ ہوتی ہے۔ سیمیاس، سی بیس اور دیگر احباب تم سب بھی نہ کبھی رخصت ہو جاؤ گے۔ رہ گیا میں تو مجھے بقول کسی حزنیہ شاعر کے تقدیر پہلے ہی سے پکار رہی ہے۔ ذرا دیر بعد میں زہر پی لوں گا۔ میرا خیال ہے کہ میں پہلے غسل کر لوں تاکہ میری موت کے بعد عورتوں کو میری لاش کو غسل دینے کی ضرورت نہ پڑے۔

جب انھوں نے اپنی گفتگو ختم کر دی۔ کریٹو نے کہا سقراط کیا آپ ہمیں کوئی حکم دینا چاہتے ہیں یا اپنے بچوں کے بارے میں یا کسی اور ضمن میں کچھ کہنا چاہتے ہیں جس میں ہم آپ کے کسی کام آ سکیں۔

اس نے جواب دیا کریٹو کوئی خاص بات نہیں صرف یہی کہ اپنا خیال رکھنا۔ یہ بات میں تم لوگوں سے ہمیشہ کہتا رہا ہوں۔ یہی وہ خدمت جو تم میرے لیے بلکہ خود اپنے لیے میری خاطر انجام دے سکتے ہو۔ ضروری نہیں کہ تم مجھ سے وعدہ بھی کرو لیکن تمھیں اگر اپنی پروا نہیں ہے اور زندگی کی راہ پر چلنے کی فکر نہیں ہے جس کی میں نے آج پہلی بار نشاندہی نہیں کی ہے، اس وقت تم کتنا ہی پکا وعدہ، کتنی ہی سنجیدگی سے کیوں نہ کرو

ے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

کریٹو نے کہا ہم اپنی کوشش کریں۔ اچھا یہ بتایئے ہم آپ کو کس طرح دفنائیں۔

جس طرح بھی چاہو لیکن مجھے اچھی طرح پکڑے رکھنا کہ کہیں چھوٹ کر فرار نہ ہو جاؤں۔

ے مخاطب ہو کر مسکراتے ہوئے بولے میں کریٹو کو اس بات پر قائل نہیں کر سکا کہ میں وہی سقراط ہوں جو ہم ررہا ہے اور دلیلوں کو آگے بڑھا رہا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ میں کوئی اور سقراط ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں جس کا مردہ جسم اسے نظر آئے گا۔ اسی لیے وہ پوچھ رہا ہے میں آپ کو کس طرح دفن کروں۔ حالانکہ میں اپنی تقریر میں بہت سے الفاظ میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ زہر پینے کے بعد میں تم سب لوگوں سے رخصت ہو جاؤں گا اور مقدس مسرتوں کی طرف روانہ ہو جاؤں گا میرے یہی وہ الفاظ ہیں جن سے میں خود کو اور تم لوگوں کو تسلی دے رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے ان (کریٹو) پر کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے میری خاطر ضمانت دے دیں وہ مقدمے کے دوران منصفوں کے آگے میرا ضامن بنا تھا کہ میں حاضر رہوں گا اسی طرح تم لوگ میرے ضامن بنو کہ میں حاضر نہیں رہوں گا بلکہ چلا جاؤں گا، رخصت ہو جاؤں گا۔ یوں اسے میری موت کا زیادہ صدمہ نہیں ہوگا۔ اور اسے میری لاش کو دفن ہوتے یا جلاتے ہوئے دیکھ کر غم نہیں ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری تدفین پر اس کا دل دکھے۔ ہم سقراط کو اس طرح ٹھکانے لگائیں گے یا اس کی پیروی کریں گے یا اسے دفن کریں گے۔ میرے عزیز کریٹو! یہ اچھی طرح یقین کر لو کہ جھوٹے الفاظ نہ صرف بذات خود برے ہوتے ہیں بلکہ وہ روح کو بدی سے آلودہ کر دیتے ہیں۔ خوش ہو کر کہو کہ تم میرے صرف جسم کو دفن کرو گے اور اس کے ساتھ رسم و رواج کے مطابق یا جسے تم بہتر سمجھتے ہو کرو گے۔

یہ الفاظ ادا کر کے وہ کھڑا ہو گیا اور کمرے میں غسل کے لیے چلا گیا۔ کریٹو ہمیں انتظار کا کہہ کر ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ ہم وہیں رہ گئے اور موضوع زیر بحث اور اپنے اس عظیم نقصان پر گفتگو کرتے رہے۔ وہ ہمارے بمنزلہ والد کے تھے جن سے ہم جدا ہو رہے تھے اور ہم اپنی زندگی یتیمی میں گزارنے والے تھے۔ جب انھوں نے غسل کر لیا تو ان کے بچے لائے گئے۔ (ان کے دو چھوٹے ایک بڑا بیٹا تھا) ان کی خاندان کی خواتین بھی آئیں۔ انھوں نے ان سے باتیں کیں اور کریٹو کی موجودگی میں چند وصیتیں کیں پھر انھیں رخصت کر کے وہ ہمارے پاس آ گئے۔

غروب آفتاب کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اندرونِ خانہ انھوں نے اچھا خاصا وقت گزارا تھا۔ وہ غسل کے بعد جب آئے تو ہمارے پاس بیٹھ گئے لیکن بہت کم بات چیت ہوئی اس کی تھوڑی دیر بعد قید خانے کا مہتمم

جو گیارہ کی انتظامیہ کا ملازم تھا داخل ہوا اور ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا سقراط جتنے لوگ یہاں آئے ہیں ان میں آپ ہی سب سے زیادہ شریف النفس، نرم خو، اور بہترین ہیں۔ آپ کو میں ان لوگوں جیسا نہیں سمجھتا جن کو جب احکام کی بجا آوری کے لیے میں انھیں زہر کا پیالہ پلانے لگتا ہوں تو وہ غیض وغضب میں آجاتے ہیں اور مجھ پر لال پیلے ہو کر گالیاں دیتے ہیں۔ میرے لیے بددعائیں کرتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں کیونکہ آپ جانتے ہیں اس میں میرا نہیں دوسروں کا قصور ہے۔ اس لیے الوداع، جو آپ پر بیتے گی اسے خوش طبعی سے برداشت کریں۔ مجھے حکم بجالانا ہے اس کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور وہ کمرے سے باہر جانے لگا۔

سقراط نے اس کی طرف دیکھا اور بولے میں بھی تمھارے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں۔ میں ویسا ہی کروں گا جیسا تم کہو گے۔ پھر ہم سے مخاطب ہو کر کہا۔ دیکھو کتنا دلآویز آدمی ہے۔ جب سے میں اس قید خانے میں ہوں مجھے ملاقات کے لیے پابندی سے آتا تھا۔ کبھی کبھی میرے ساتھ باتیں بھی کرتا جہاں تک ہو سکے بہت اچھا سلوک کرتا ہے۔ دیکھو اس وقت بھی وہ میری حالت پر افسوس کر رہا تھا۔ کریٹو ہمیں اس کا حکم بجالانا چاہیے۔ اس لیے اس سے کہو کہ اگر زہر تیار ہو گیا ہے تو پیالے میں بھر کر لائے۔ اور اگر تیار نہیں ہے تو ملازم سے تیار کروالے۔

کریٹو نے کہا لیکن سورج ابھی پہاڑ کی چوٹی پر چمک رہا ہے۔ غروب نہیں ہوا ہے میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں کہ اعلان کے کافی عرصے کے بعد وہ زہر کا پیالہ پیتے ہیں۔ اس دوران وہ جی بھر کر طرح طرح کے پسندیدہ اور لذیذ کھانے کھاتے رہتے ہیں اپنے دوستوں کی باتوں کا لطف لیتے رہتے ہیں۔

ابھی بہت وقت ہے۔

سقراط نے کہا کریٹو جن لوگوں کا تم ذکر کر رہے ہو ان کی حرکات بہت معقول ہیں کیونکہ ان کے خیال میں یہ تاخیر اُن کے لیے مفید ہو گی۔ لیکن میں بھی ان کی پیروی کر کے معقول کام ہی کر رہا ہوں، کیوں کہ میں سوچتا ہوں کہ زہر پینے میں دیر کر کے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ خود میری نظر میں یہ بڑی بے معنی بات ہو گی کہ میں ایک ایسی زندگی کا لحاظ رکھوں اور اسے بچاؤں جس کا آخری قطرہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ مہربانی کرو اور وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں اور انکار نہ کرو۔

کریٹو نے نوکر کو اشارہ کیا جو پاس ہی کھڑا تھا وہ باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد قید خانے کے مہتمم کو ساتھ لایا جس کے ہاتھ میں زہر کا پیالہ تھا۔ سقراط نے کہا میرے دوست تمھیں ان باتوں کا تجربہ ہے۔ مجھے بتاتے

مجھے کرنا کیا ہے؟ اس نے جواب دیا آپ اس وقت تک ٹہلتے رہیں جب تک آپ کی ٹانگیں جواب نہ دے دیں اس کے بعد لیٹ جائیں۔ زہر اپنا کام دکھانے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے زہر کا پیالہ سقراط کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جنھوں نے نہایت نرمی اور نہایت بردباری سے بغیر کسی خوف کے تشنج اور رنگ اور چہرے کی تبدیلی کے اسے عجیب و غریب ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: آپ کا کیا خیال ہے اگر میں اس پیالے میں سے دو چار چھینٹے کسی دیوتا کی نذر کردوں، کرسکتا ہوں یا نہیں۔ اس نے جواب دیا سقراط ہم صرف اتنا زہر تیار کرتے ہیں جتنا پینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ سقراط نے کہا میں سمجھ گیا لیکن دیوتاؤں کے حضور دعا تو کرسکتا ہوں جو میں ضرور کروں گا کہ وہ اس دنیا سے دوسری دنیا کا میرا یہ سفر آسان بنا دیں اور میری دعا کے مطابق ایسا ہی ہوگا۔ اس کے بعد انھوں نے سانس روک کر پیالہ خوشی خوشی پی لیا۔ اس وقت تک ہم میں سے بیشتر اپنے غم کے جذبات کو قابو میں رکھے ہوئے تھے لیکن جب ہم نے انھیں پیالہ پیتے اور اسے ختم کرتے ہوئے دیکھا پھر ہم سے برداشت نہ ہوسکا اور بڑے ضبط کے باوجود میری آنکھوں سے آنسو ابل پڑے، میں نے منہ چھپا کر رونا شروع کر دیا۔ یہ رونا ان کے لیے نہیں تھا بلکہ اس خیال سے تھا کہ ان جیسے دوست سے جدا ہونے کے بعد ہم پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ صرف میں ہی رونے کا آغاز کرنے والا نہیں تھا۔ کیونکہ جب کریٹو نے دیکھا کہ وہ آنسو ضبط نہیں کر سکے گا تو وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی ویسا ہی کیا اسی وقت اپالوڈورس نے جو مسلسل رو رہا تھا زور زور سے چیخیں مارنی شروع کر دیں جسے سن کر ہم سب بے قابو ہو گئے۔ صرف سقراط تھا جو پُرسکون رہا؟ اس نے کہا یہ چیخ کیسی ہے، میں نے تو خواتین کو اس لیے گھر بھیج دیا تھا کہ وہ ایسی ناشایستہ حرکت نہ کریں کیونکہ مجھے بتایا گیا تھا کہ انسان کو سکون سے مرنا چاہیے۔ خاموش ہو جاؤ اور صبر سے کام لو۔ ہم ان کے الفاظ سن کر سخت شرمندہ ہوئے اور آنسو روک لیے۔ وہ اس وقت تک ٹہلتے رہے جب تک انھوں نے یہ نہیں کہا کہ اب ٹانگیں جواب دے گئی ہیں اور وہ زہر کا پیالہ دینے والے کی ہدایت کے مطابق چت لیٹ گئے۔ میں وقفے وقفے سے ان کی ٹانگوں اور پیروں پر نظر ڈالتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ان کا پاؤں زور سے دبایا اور پوچھا کچھ محسوس ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا نہیں پھر اس سے اوپر اس سے اوپر، جسم بے حس اور سخت ہوتا جا رہا ہے پھر جسم سے ہاتھ ہٹا کر کہا کہ جب زہر دل تک پہنچے گا تو وہ ختم ہو جائیں گے۔ ان کا آخری سرا ابھی بے حس ہو چکا تھا کہ انھوں نے اپنے چہرے سے جسے وہ ڈھانپے ہوئے تھے کپڑا ہٹا دیا اور بولے یہ ان کے آخری الفاظ تھے کریٹو میں نے اسکلی پیئس (Asclepius) سے ایک مرغ لیا تھا یہ قرض ادا کرنا مت بھولنا۔ کریٹو نے کہا قرض ادا کروں گا اور کوئی بات؟ اس سوال کا کوئی جواب نہ ملا ایک یا دو لمحے کے بعد جسم کے حرکت کرنے کی

آواز آئی۔ ملازم نے جسم سے کپڑا ہٹا دیا ان کی آنکھیں اوپر کی جانب جمی ہوئی تھیں۔ کریٹو نے ان کی آنکھیں اور منہ بند کر دیے۔

ایشی کریٹس ہمارے دوست کا آخری وقت اس طرح گزرا۔ جن کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے کے تمام آدمیوں سے جن سے ہم واقف ہیں دانا ترین، عادل ترین اور بہترین تھا۔

جارجیاز

(Gorgias)

شرکائے گفتگو:

کیلی کلس (Callicles)، سقراط (Socrates)، چیریفون (Chaerephon)،

جارجیاز (Gorgias)، پولس (Polus)

مقام گفتگو: **کیلی کلس کا مکان**

کیلی کلس: مشہور کہاوت ہے کہ دانا عداوت میں دیر کر دیتا ہے، دعوت میں نہیں۔

سقراط: کیا ہمیں دعوت میں دیر ہو گئی ہے۔

کیلی: جی ہاں دعوت ہے بڑی پُر لطف۔ لیکن جارجیاز نے ہمارے لیے بہت سے نوادرات کی نمائش کا اہتمام بھی کر رکھا ہے۔

سقراط: دوست کیلی کلس اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کا الزام چیریفون کو دو، کیونکہ وہی ہمیں کھلے میدان میں سیر کراتا رہا ہے۔

چیریفون: پروانہ کریں سقراط، جس محرومی کا آپ لوگ مجھے ملزم سمجھ رہے ہیں۔ اس کی تلافی بھی میں ہی کروں گا۔ بھئی، جارجیاز میرا یار ہے اور میں اسے نوادرات دوبارہ دکھانے پر راضی کر لوں گا۔ ہوسکتا ہے ابھی یا پھر کسی اور وقت۔

کیلی: چیریفون بات تو یہ ہے کہ سقراط جارجیاز کی گفتگو سننا چاہتا ہے۔

چیری: ہاں ہاں وہاں جانے کا ہمارا یہی مقصد تھا۔

کیلی: چلو میرے گھر چلو۔ جارجیاز کا قیام وہیں ہے۔ وہ آپ کو نوادرات بھی دکھا دیں گے۔

سقراط: کیلی کلس یہ تو بڑی اچھی بات ہے لیکن کیا وہ میرے سوالوں کے جواب بھی دیں گے؟ کیونکہ میں

جاننا چاہتا ہوں کہ وہ بتائیں کہ جس ہنر کے وہ ماہر ہیں، اس کی ماہیت اور حقیقت کیا ہے، وہ کس بات کے مدعی ہیں اور دوسروں کو کیا سکھاتے ہیں۔ چیریفون نے جو کہا ہے صحیح ہے، نوادرات کی نمائش کسی اور دن کے لیے ملتوی کر دیں۔

کیلی: چیریفون یہ کیا معاملہ ہے۔ کیا سقراط صرف جارجیاز کی گفتگو سننا چاہتے ہیں۔ دیکھو، سوالوں کے جواب دینا بھی ان کی نمائش کا ایک جزو ہے کیونکہ تھوڑی دیر قبل ہی انھوں نے کہا تھا کہ میرے مکان پر آ کر مجھ سے جو چاہے اور جیسا چاہے سوال کرے۔ وہ ان کے جواب ضرور دیں گے۔

سقراط: خوش بختی اسے ہی کہتے ہیں۔ چیریفون کیا تم ان سے سوال پوچھو گے۔

چیری: کون سا سوال پوچھوں؟

سقراط: پوچھو وہ کیا کام کرتے ہیں۔

چیری: کیا مطلب؟

سقراط: بھئی میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا سوال جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کیا کرتے ہیں، مثلاً اگر وہ جوتے بناتے تو میرے سوال کا جواب یوں دیں گے کہ ''میں موچی ہوں'' سمجھے آپ؟

چیری: سمجھ گیا میں ضرور پوچھوں گا۔ جارجیاز ذرا یہ تو بتایئے کہ ہمارے دوست کیلی کلس نے جو کہا ہے درست ہے کہ آپ ہر اس سوال کا جواب دینے کے لیے آمادہ ہیں جو آپ سے دریافت کیا جائے؟

جارجیاز: بالکل درست ہے چیریفون میں ابھی ابھی یہی بات کہہ رہا تھا۔ میں اس میں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ سال ہا سال گزر گئے جو کسی نے کوئی نیا سوال پوچھا ہو۔

چیری: گویا آپ جواب دینے کے لیے تیار ہیں۔ جارجیاز یہی بات ہے نا؟

جارجیاز: چلو اس بات کی آزمائش کر لو۔

پولس: اگر تم واقعی چاہو تو اس سلسلے میں میری آزمائش بھی کر سکتے ہو کیونکہ میرا خیال ہے کہ وہ دیر سے گفتگو کر رہے ہیں اور تھک گئے ہیں۔

چیری: کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تم جارجیاز سے بہتر جواب دے سکتے ہو۔

پول: تمھیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تمھیں شافی جواب ہی چاہیے نا؟

چیری: کوئی حرج نہیں۔ جب چاہو جواب دے دینا۔

پوچھو۔

پول: میرا سوال یہ ہے کہ اگر جارجیاز اپنے بھائی ہیروڈیکس (Herodicus) کے ہنر کا ماہر ہوتا تو ہم اسے

پیری: پیشے کے لحاظ سے کیا کہہ کر پکارتے۔ کیا اس کا پیشہ ورانہ نام وہی نہ ہوتا جو اس کے بھائی کا ہے؟

کیوں نہیں یقیناً۔

پول: تو آپ اسے طبیب کہیں گے۔ یہ بات ٹھیک ہوگی نا؟

پیری: جی ہاں۔

پول: اگر وہ ارسٹوفون (Aristophon) ولد اگلاؤفون (Aglaophon) یا اس کے بھائی پولی گنوٹس (Polygnotus) کا ہم پیشہ ہوگا تو ہم اسے کیا کہیں گے۔

پیری: یقیناً اسے مصور کہیں گے۔

پول: لیکن اب ہم اسے کیا کہہ کر پکاریں۔ اس کا ہنر کیا ہے۔

پیری: چیریفون سنو، انسان کے پاس ایسے بہت سے ہنر ہیں جن کی نوعیت محض تجرباتی ہے۔ جو تجربوں پر مبنی ہوتے ہیں کیونکہ تجربے کی بنیاد پر انسان اپنے ہنر کے سہارے زندگی گزارتا ہے۔ ناتجربہ کاری کا دارومدار اتفاقات پر ہوتا ہے۔ مزید برآں مختلف افراد مختلف پیشوں کے ماہر ہوتے ہیں۔ بہترین افراد بہتر پیشوں میں مہارت رکھتے ہیں۔ ہمارے دوست جارجیاز کا شمار بہترین افراد میں ہوتا ہے اور جس پیشے کا وہ ماہر ہے وہ اشرف ترین ہے۔

سقراط: جارجیاز مان لو کہ پولس کو خطابت کی تربیت حاصل ہے لیکن وہ چیریفون سے کیا گیا وعدہ پورا نہیں کر رہا ہے۔

جارجیاز: سقراط آپ کا مطلب کیا ہے۔

سقراط: میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس سے جو سوال پوچھا گیا تھا اس نے اس کا شافی جواب نہیں دیا ہے۔

جارجیاز: پھر آپ خود ہی اس سے سوال کیوں نہیں پوچھ لیتے۔

سقراط: میں تو آپ ہی سے پوچھنا چاہتا ہوں بشرطیکہ آپ جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔ کیونکہ میں نے محسوس کیا ہے کہ اس نے اس فن کا زیادہ سہارا لیا ہے جسے خطابت کہا جاتا ہے، علم معقول کا نہیں۔

پول: سقراط آپ کی اس رائے کی بنیاد کیا ہے۔

سقراط: پولس وجہ یہ ہے کہ جب چیریفون نے آپ سے اس ہنر کے بارے میں پوچھا جس میں جارجیاز

ماہر ہے تو آپ نے اس کی اس طرح تحسین کی گویا کہ آپ کسی ایسے شخص کو جواب دے رہے ہیں جس نے اس میں کیڑے نکالے ہوں لیکن یہ بتانے کی زحمت ہی نہیں کی کہ اس کا پیشہ کیا ہے۔

پول: کیوں، میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اس کا پیشہ اشرف ترین ہے؟

سقراط: یقیناً آپ نے یوں ہی کہا تھا لیکن وہ میرے سوال کا جواب تو نہ تھا۔ کسی نے آپ سے اس کی خصوصیت دریافت نہیں کی تھی بلکہ سوال تو اس کی ماہیت کے بارے میں تھا۔ اور یہ بھی کہ ہم اسے پیشے کے لحاظ سے کیا کہہ کر پکاریں۔ چیریفون میں آپ سے پھر کہوں گا کہ آپ اسی طرح مختصر اور جامع جواب دیں جیسا کہ آپ نے اس وقت دیا تھا جب اس نے آپ سے پوچھا تھا کہ اس کے پیشے کی نوعیت کیا ہے اور ہم جارجیاز کو کس نام سے پکاریں۔ جارجیاز چلیے میں آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں اور وہی سوال دریافت کرتا ہوں کہ ہم آپ کو پیشے کے لحاظ سے کس نام سے پکاریں اور آپ کس پیشے میں مہارت کے مدعی ہیں۔

جارجیاز: سقراط میرا ہنر بلاغت ہے۔

سقراط: گویا میں آپ کو فن بلاغت کا ماہر کہہ سکتا ہوں۔

جارجیاز: سقراط بالکل صحیح ہے۔ میں اس فن میں یکتا بھی ہوں۔ آپ بقول ہومر، مجھے اسی فن کی نسبت سے پکاریں جس میں مجھے زعم ہے۔

سقراط: میری بھی یہی آرزو ہے۔

جارجیاز: مہربانی فرما کر اس پر ہی عمل کیجیے۔

سقراط: کیا ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ دوسروں کو بھی بلاغت کا ماہر بناتے ہیں؟

جارجیاز: جی ہاں مجھے اسی امر کا دعویٰ ہے۔ میں نہ صرف ایتھنز میں بلکہ دیگر علاقوں میں بھی یہ کام انجام دیتا ہوں۔

سقراط: جارجیاز کیا آپ ہمیں ابھی مزید سوال پوچھنے دیں گے اور سوالوں کے جواب اسی طرح دیتے رہیں گے اور پولس جیسی تفصیلات کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیں گے؟ کیا آپ اپنے وعدے کا پاس رکھتے ہوئے سوالوں کا مختصر مگر جامع جواب دیں گے؟

جارجیاز: سقراط بات یہ ہے کہ کچھ جواب ایسے ہوتے ہیں جن کا مفصل ہونا ناگزیر ہے، تاہم میری کوشش

یہی ہوتی کہ اپنے امکان بھر اختصار سے کام لوں۔ کیونکہ میرے ہنر کا یہ بھی تقاضا ہے کہ میں جس قدر ممکن ہو اختصار برتوں۔

سقراط: جارجیاز ضرورت اسی بات کی ہے۔ آپ اجمال اختیار کریں اور تفصیل کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیں۔

جارجیاز: بہت خوب میں ایسا ہی کروں گا۔ آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ نے مجھ سے زیادہ اختصار پسند کسی اور شخص کو نہیں دیکھا ہوگا۔

سقراط: کیا خوب، آپ کا یہ دعویٰ ہے کہ آپ فن خطابت کے ماہر اور دوسروں کو یہ فن سکھاتے ہیں۔ چلیے آپ یہ بتایئے کہ فن بلاغت کا تعلق کس سے ہے؟ میں سوال کا آغاز اس بات سے کروں گا کہ فن پارچہ بافی کا کس سے سروکار ہے۔ آپ کا جواب یہی ہوسکتا ہے ناں کہ کپڑوں کی تیاری سے۔

جارجیاز: جی ہاں۔

سقراط: اور موسیقی کا تعلق سروں کی ترتیب سے ہے۔

جارجیاز: ہے تو سہی۔

سقراط: جارجیاز قسم ہے حاضر وناظر کی میں آپ کے بے مثال اجمالی جوابوں کا دل سے قدردان ہوں۔

جارجیاز: سقراط بات ٹھیک ہے میں بھی خود کو اس کا ماہر سمجھتا ہوں۔

سقراط: یہ سن کر مجھے بہت مسرت ہوئی ہے۔ اسی طرح آپ ذرا بلاغت کے بارے میں جواب دیں کہ خطابت کا تعلق کس سے ہے۔

جارجیاز: فن گفتگو سے۔

سقراط: کس نوع کی گفتگو سے۔ کیا ایسی گفتگو جو مریض کو سکھائے کہ وہ کس طرح اچھا ہوسکتا ہے؟

جارجیاز: جی نہیں۔

سقراط: اس کے باوجود فن بلاغت لوگوں کو گفتگو کا سلیقہ سکھاتا ہے۔

جارجیاز: جی ہاں۔

سقراط: اور ان امور کی تفہیم، جن سے متعلق گفتگو ہے۔

جارجیاز: اس میں کوئی شک نہیں۔

سقراط: لیکن کیا فن طبابت جس کا ہم نے ابھی ابھی حوالہ دیا ہے۔ لوگوں کو اس قابل نہیں بناتا کہ وہ بھی

مریض کے احوال سمجھیں اور اس کے متعلق گفتگو کریں؟

جارجیاز: یقیناً، جی ہاں۔

سقراط: اس طرح فن طب کا بھی گفتگو کے فن سے تعلق ہے۔

جارجیاز: جی ہاں۔

سقراط: اور صرف ایسی گفتگو کا جو مرض سے متعلق ہو؟

جارجیاز: ایسا ہی سمجھ لیجیے۔

سقراط: اور کیا ورزش کا تعلق ایسی گفتگو سے نہیں ہے جو جسم کی اچھی یا بری حالت سے متعلق ہوتی ہے۔

جارجیاز: بالکل درست۔

سقراط: جارجیاز اس بات کا اطلاق دیگر فنون پر بھی ہوتا ہے۔ وہ سب کے سب ایسی گفتگو سے متعلق ہوتے ہیں جن کا علیحدہ علیحدہ اس سے واسطہ پڑتا ہے۔

جارجیاز: ظاہر ہے۔

سقراط: پھر ایسا کیوں ہے کہ آپ فن بلاغت کو فن گفتگو ہی سے متعلق کہتے ہیں جبکہ دیگر تمام فنون گفتگو ہی سے وابستہ ہیں۔ آپ انھیں بھی فن بلاغت کیوں نہیں کہتے؟

جارجیاز: سقراط! کیونکہ دیگر فنون کی معلومات کا تعلق کسی نہ کسی طرح کے خارجی عمل سے ہوتا ہے۔ ہاتھ کی مثال لیجیے۔ لیکن فن بلاغت میں ہاتھ کا ایسا کوئی عمل نہیں ہے جو صرف فن گفتگو ہی کے وسیلے سے کام کرتا ہو یا ظاہر ہوتا ہو۔ اس لیے میری بات درست ہے کہ فن بلاغت کا واسطہ گفتگو کے فن سے ہی ہے۔

سقراط: مجھے یقین نہیں ہے کہ میں کلی طور پر آپ سے متفق ہوں اور یہ کہ میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں لیکن میں یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ جلد ہی آپ کی بات سمجھنے کے لائق ہو جاؤں گا۔ برائے مہربانی میرے اس سوال کا جواب دیجیے کہ کیا آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ فنون موجود ہیں؟

جارجیاز: جی ہاں۔

سقراط: عموماً جہاں تک فنون کا تعلق ہے ان کا واسطہ زیادہ تر عمل سے ہی ہوتا ہے گفتگو سے نہیں۔ مصوری، مجسمہ سازی اور بہت سے دیگر فنون میں کام خاموشی ہی سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسے فنون کے بارے میں آپ یہی کہیں گے کہ ان کا فن بلاغت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مطلب مکمل طور پر سمجھ گیا ہے۔

... بھی ہیں جو مکمل طور پر زبان ہی کے ذریعے تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔ ان سے بہت بولنے کی ضرورت بالکل ہی نہیں یا کم ہوتی ہے۔ مثلاً علم ریاضی، حساب کتاب، علم ہندسہ (جیومیٹری) اور چوسر کا کھیل۔ ان میں سے چند ایک کے عمل کا گفتگو سے چولی دامن کا رشتہ ہوتا ہے۔ لیکن بیشتر ایسے ہوتے ہیں جن میں الفاظ کی موجودگی زیادہ ہوتی ہے۔ ان کے تاثر کا سارا دارومدار الفاظ کی قوت پر ہوتا ہے۔ میں بھی سمجھتا ہوں کہ آپ اس دوسری صورت کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ فن بلاغت اسی نوعیت کا ہوتا ہے۔

بالکل۔

... تسلیم نہیں کرتا کہ آپ ان میں سے کسی بھی فن کو فن بلاغت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ آپ نے ... میں یہ صحیح طور پر اظہار کیا ہے کہ فن بلاغت ایسا فن ہے جو صرف گفتگو ہی کے وسیلے سے عمل پذیر اور صورت پذیر ہوتا ہے لیکن نکتہ چین یا مخالف یہ کہہ سکتا ہے کہ اچھا تو جارجیاز آپ ریاضی کو فن بلاغت کہتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ ریاضی کو فن بلاغت میں شمار نہیں کرتے۔ ورنہ اقلیدس (جیومیٹری) بھی اسی زمرے میں شامل ہوگی۔

سقراط آپ کی بات بالکل سچ ہے۔ آپ نے میرا منشا اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔

پھر تو آپ مجھے میرے بقیہ سوالات کے جوابات بھی عنایت فرمائیں۔ یہ معلوم ہو کہ فن بلاغت ان فنون میں شامل ہے جن کا عمل درآمد بالخصوص الفاظ پر منحصر ہوتا ہے اور فنون ایسے بھی ہیں جن میں فقط الفاظ ہوتے ہیں۔ مجھے یہ بتائیے کہ الفاظ کی وہ کیا خوبیاں ہیں، فن خطابت جن سے متعلق ہے۔ فرض کیجیے کوئی مجھ سے ان فنون کے بارے میں سوالات کرتا ہے، جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے، سقراط ذرا یہ بتا دیجیے کہ ریاضی کیا ہے؟ اور میں اسے اس طرح جواب دیتا ہوں جیسے آپ نے مجھے دیا ہے کہ ریاضی کا شمار ان فنون میں ہوتا ہے، جن کی تشکیل الفاظ سے ہوتی ہے اور پھر وہ مزید پوچھتا ہے کہ ان الفاظ کا تعلق کس سے ہوتا ہے؟ میں جواب دیتا ہوں کہ طاق اور جفت اعداد سے اور اس بات سے کہ ان میں ہر ایک کی تعداد کتنی ہے۔ اور اگر وہ مزید سوال کرے کہ حساب وشمار کیا ہے؟ میں جواب میں کہتا ہوں کہ یہ بھی ایسے فن کی مثال ہے جس کا انحصار الفاظ پر ہوتا ہے اور اگر وہ پھر پوچھ لیتا ہے کہ اس کا تعلق کس سے ہے۔ میں کسی جماعت کے

استاد کی طرح کہوں گا "جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے" ریاضی سے لیکن اس میں تھوڑا فرق ہے اور
یہ ہے کہ حساب اور شمار میں طاق اور جفت کی تعداد ہی کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ ان کے اپنے اور باہمی
تعلق کو بھی دیکھا جاتا ہے۔ مزید برآں فرض کیجیے میں کہتا ہوں کہ علم فلکیات الفاظ ہی کا فن
ہے۔ اور وہ پوچھتا ہے سقراط الفاظ کس سے متعلق ہیں۔ میرا جواب ہوگا کہ علم فلکیات کا تعلق
ستاروں، سورج اور چاند کی گردش اور ان کی باہمی رفتار سے ہے۔

جارجیاز: سقراط! یقیناً آپ کے جواب درست ہوں گے۔

سقراط: جارجیاز! اب ذرا آپ فن بلاغت کی اصلیت سے مجھے آگاہ فرمائیں۔ جسے آپ تسلیم کریں گے۔ (کریں گے یا نہیں) کہ یہ ایسا فن ہے جو ہمیشہ الفاظ ہی کے واسطہ سے اپنے مقاصد حاصل کرتا ہے۔

جارجیاز: درست۔

سقراط: الفاظ کیا کام انجام دیتے ہیں؟ میرا یہی سوال ہے کہ جو الفاظ فن بلاغت میں مستعمل ہیں ان کا کن اشیا سے تعلق ہوتا ہے؟

جارجیاز: سقراط ان کا تعلق انسان کی بہترین اور عظیم ترین چیزوں سے ہوتا ہے۔

سقراط: اس بات کا مفہوم واضح نہیں ہے۔ میں اب بھی اندھیرے میں ہوں۔ مجھے پتا نہیں کہ انسان کی عظیم ترین اور بہترین اشیا کون کون سی ہیں؟ آپ نے ضیافتوں میں شراب نوشی کا ایک قدیم گیت ضرور سنا ہوگا جس میں موسیقار زندگی کی نعمتوں کا شمار کرتا ہے۔ ان میں پہلے صحت، پھر حسن اور تیسری شے بقول گیت نگار ایسی دولت جو دیانتداری سے حاصل کی گئی ہو۔

جارجیاز: مجھے یہ گیت یاد ہے لیکن آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔

سقراط: میں کہنا چاہتا ہوں کہ گیت نگار نے جن اشیا کا ذکر کیا ہے ان کے بنانے والے یعنی طبیب، مربی (Trainer) اور دولت پیدا کرنے والے، فوراً آپ کے پاس آئیں گے۔ پہلے طبیب آ کر کہے گا میرے سقراط ہوشیار، جارجیاز آپ کو فریب دے رہا ہے۔ کیونکہ میرے فن کا تعلق انسان کے عظیم ترین مفاد سے وابستہ ہے اور جب میں پوچھوں گا جناب آپ ہیں کون؟ وہ جواب میں کہے گا "میں طبیب ہوں"۔ پھر میں کہوں گا آپ کا مطلب کیا ہے۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کا فن بہترین فوائد فراہم کرتا ہے۔ وہ جواب دے گا۔ یقیناً بتائیے کہ کیا صحت عظیم ترین نعمت

نہیں ہے؟ سقراط اس سے بڑھ کر انسان کے لیے کون سی نعمت ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد مربی کی باری آئے گی اور وہ کہے گا۔ میرے لیے یہ بات بڑی تعجب خیز ہوگی اگر جارجیاز اپنے فن کے مفاد کو میرے فن کے مفاد سے بڑھ کر ثابت کردے۔ میں اس سے بھی یہی کہوں گا کہ تمہارے مخلص دوست کون ہیں اور تمہارا کام کیا ہے؟ وہ جواب دے گا" میں مربی ہوں"۔ میرا کام آدمیوں کے جسم کو خوبصورت اور توانا بنانا ہے"۔ اس مربی سے فراغت پانے کے بعد دولت بنانے والا آئے گا اور حسب توقع وہ سب کی تنقیص کرے گا۔ اور کہے گا سقراط ذرا سوچو جارجیاز یا کوئی دوسرا فرد دولت سے بڑھ کر کوئی اور نعمت پیدا کر سکتا ہے۔ میں ہوں یا آپ، اس سے یہی پوچھیں گے کیا تم دولت پیدا کرنے کے ماہر ہو۔ وہ جواب دے گا جی ہاں میں دولت پیدا کرنے والا ہوں۔ کیا تمہارے خیال میں دولت ہی انسان کے لیے بہترین نعمت ہے۔ اس کا جواب ہوگا"یقیناً"۔ اور ہم ان سے متفق ہوں گے۔ لیکن ہمارے دوست جارجیاز کا کہنا ہے کہ اس کا فن دیگر فنون سے کہیں زیادہ نعمتیں تخلیق کرتا ہے۔ وہ اس خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے دریافت کرے گا کہ کیسی نعمت؟ جارجیاز کو اس کا جواب دینا ہوگا۔ جارجیاز میں چاہتا ہوں آپ یہ سمجھ لیں کہ میرے علاوہ وہ لوگ بھی آپ سے یہی سوال پوچھ رہے ہیں۔ آپ جسے انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت کہتے ہیں وہ ہے کیا؟ آپ اس کی تخلیق کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ ذرا جواب عنایت فرمائیے۔

جارجیاز: بہت خوب، عظیم ترین ہستی وہی ہے؟ جو انسان کو شخصی آزادی اور افراد کو علیحدہ علیحدہ ریاستوں میں دوسروں پر حکومت کرنے کا اختیار عطا کرتی ہے۔

سقراط: آپ کے خیال میں وہ کون ہے؟

جارجیاز: لفظ سے بڑھ کر اور کیا شے ہے جو عدالت میں منصفوں کو یا کونسل میں سینٹ کے نمائندوں کو، یا مجلس عام میں یا دیگر سیاسی جلسوں میں شہریوں کو راہ دکھاتے ہیں؟ اگر آپ کو الفاظ کی ادائیگی کا سلیقہ آتا ہے تو طبیب بھی آپ کا غلام ہوگا۔ مربی بھی آپ کا غلام ہوگا۔ اور دولت پیدا کرنے والے جو آپ کے موضوع گفتگو ہیں۔ اپنے لیے نہیں بلکہ آپ کے لیے دولت جمع کریں گے جس میں ہجوم سے خطاب کرنے اور ان کی رائے کو متاثر کرنے کی اہلیت موجود ہو۔

سقراط: جارجیاز اب میری رائے میں آپ نے فن بلاغت کی مکمل وضاحت کر دی ہے۔ اگر میں غلط نہیں سمجھا ہوں تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ بلاغت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ یہ رائے میں تبدیلی

لانے کا ایک طریق کار ہے۔ اور یہی اس کی معراج اور غایت ہے۔ رائے میں تبدیلی لانے کے علاوہ آپ بلاغت کے کسی اور فائدے سے واقف ہیں؟

جارجیاز: جی نہیں! سقراط آپ نے جو شناخت بیان کی ہے وہ بہت واضح ہے کیونکہ تبدیلی رائے ہی بلاغت کی اصل غایت ہے۔

سقراط: جارجیاز اگر یہی بات ہے تو میری بھی سنو۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت اگر دنیا میں کوئی ایسا فرد ہے جو صرف علم اور صداقت کے حصول کے لیے کسی معاملے پر بحث و تجسس کرتا ہے تو وہ میں خود ہوں۔ آپ کے بارے میں بھی میرا یہی خیال ہے۔

جارجیاز: سقراط تم کہنا کیا چاہتے ہو۔

سقراط: میں بتاتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں واقف نہیں ہوں کہ آپ کے خیال میں جس تبدیلی رائے کا آپ ذکر کر رہے ہیں اس کی ہیئت کیا ہے اور اس عمل میں بلاغت کا کیا کردار ہے۔ حالانکہ ان دونوں کے بارے میں مجھے تھوڑا بہت گمان ضرور ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ بلاغت میں تبدیلی رائے کی جو قوت ہے، وہ کیا ہے اور وہ کس سے متعلق ہوتی ہے۔ لیکن سوچتا ہوں تھوڑا بہت گمان رکھنے کے باوجود میں آپ کو بتانے کی بجائے آپ سے کیوں پوچھ رہا ہوں؟ ایسا میں آپ کے لیے نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری خواہش ہے کہ بحث ایسی راہ پر چل نکلے جس سے اصل حقیقت تک پہنچنا آسان ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بتائیں کہ کیا میرا یہ سوال جائز ہے۔ اگر میں یہ دریافت کروں زیوکسس (Zeuxis) کس طرح کا مصور تھا اور آپ جواب دیں کہ اجسام کا مصور تو کیا میرا یہ سوال مناسب نہ ہوگا کہ کس قسم کے اجسام کا اور ایسے اجسام کہاں ملتے ہیں؟

جارجیاز: بالکل درست ہے۔

سقراط: اس دوسرے سوال پوچھنے کی وجہ یہ ہوگی کہ ایسے بھی مصور ہیں جو اس سے مختلف اجسام کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

جورجیاز: ٹھیک ہے۔

سقراط: لیکن اگر زیوکسس کے علاوہ کوئی اور مصور نہ ہوتا جو اجسام کی خوبصورتی سے مصوری کرتا تو کیا آپ کا جواب عمدہ تر ہوتا۔

جارجیاز: بالکل ہوتا۔

میں بلاغت کے بارے میں بھی اسی طرح معلوم کرنا چاہتا ہوں؟ یا صرف بلاغت ہی ایسا ہنر ہے

سقراط: جو رائے کو تبدیل کرتا ہے یا دوسرے ہنر بھی یہی عمل کر سکتے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ کیا جو شخص پڑھاتا ہے وہ جس کو پڑھاتا ہے اس کی رائے تبدیل کرتا ہے یا نہیں۔

جارجیاز: سقراط وہ بھی رائے تبدیل کرتا ہے۔ اس میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

سقراط: چلیے اگر ان فنون کو دیکھیں جن کا تذکرہ ہم لوگ کر رہے تھے تو کیا ریاضی دان ہمیں اعداد کی ماہیت نہیں بتاتے؟

جارجیاز: کیوں نہیں۔

سقراط: اس لیے ہماری رائے کو متاثر کرتے ہیں۔

جارجیاز: جی ہاں۔

سقراط: پھر تو ریاضی اور بلاغت دونوں ہی رائے تبدیل کرنے والے فنون ہیں۔

جارجیاز: یقیناً۔

سقراط: اور اگر کوئی پوچھ لے کہ کس طرح کی تبدیلی رائے اور اس کا تعلق کس سے ہے۔ تو ہمارا جواب یہی ہوگا کہ ایسی تبدیلی رائے جو ہمیں طاق اور جفت اعداد کی تعداد بتاتی ہے اور ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ دیگر تمام فنون بھی جن کا ہم نے ابھی تذکرہ کیا ہے۔ تبدیلی رائے کے عامل ہیں خواہ وہ کسی قسم کی اور کسی سے بھی متعلق ہو۔

جارجیاز: بالکل درست ہے۔

سقراط: اس طرح بلاغت ہر تبدیلی رائے کا اکلوتا ہنر تو نہ ہوئی ناں؟

جارجیاز: سچ ہے۔

سقراط: یہ دیکھتے ہوئے کہ صرف بلاغت ہی رائے کو متاثر نہیں کرتی بلکہ دوسرے فنون بھی مصوری کی طرح ایسا ہی کام کرتے ہیں۔ ایک سوال ذہن میں آتا ہے جو بڑا ہی بجا معلوم ہوتا ہے کہ بلاغت رائے پر کس طرح اور کیا اثر چھوڑتی ہے۔ کیا جستجو اور پرسش کا یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔

جارجیاز: میرے خیال میں ہے۔

سقراط: جارجیاز چلیے آپ نے میرے سوال کی تصدیق کر دی۔ اب اس کا جواب عطا ہو۔

جارجیاز: سقراط میرا جواب یہ ہوگا کہ بلاغت عدالتوں اور دیگر اجتماعات میں تبدیلی رائے کا ہنر ہے جیسا کہ

میں نے ابھی کہا تھا۔ اس کا موضوع انصاف اور بے انصافی ہے۔

سقراط: بہرحال مجھے اسی بات کا اندیشہ بھی تھا۔ تاہم آپ کو تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ میں آہستہ آہستہ ایک بظاہر سیدھے سادے سوال کو بار بار دہرا رہا ہوں۔ میرا مقصد آپ کی تکذیب کرنا نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ بحث درست راستے پر آگے بڑھتی رہے نہ کہ ہم ایک دوسرے کے الفاظ کے مفہوم اور معنی کو پہلے ہی سے اندازہ لگانے لگیں۔ میں چاہتا ہوں آپ اپنے ہی طریقہ کے مطابق اپنی رائے قائم کریں۔ جس طرح بھی چاہیں اپنے نظریات مرتب کریں۔

جارجیاز: سقراط میرے خیال میں آپ درست کہہ رہے ہیں۔

سقراط: اچھی بات ہے۔ آیئے اب ایک اور سوال پر غور کریں کہ کہا جاتا ہے فلاں بات ہم نے سیکھ رکھی ہے۔

جارجیاز: جی ہاں۔

سقراط: تو پھر یہ ''سیکھ رکھنا'' ویسا ہی جیسا ''یقین رکھنا'' اور کیا سیکھنا اور یقین کرنا ایک ہی عمل ہے؟

جارجیاز: میری رائے میں دونوں ایک ہی عمل کا نام نہیں ہیں۔

سقراط: آپ کی رائے صائب ہے۔ جسے آپ اس طرح ثابت کر سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ جارجیاز کیا یقین غلط بھی ہوتا اور صحیح بھی۔ تو اگر میں غلطی نہ کروں تو آپ کا جواب ہوگا جی ہاں۔

جارجیاز: جی ہاں۔

سقراط: لیکن غلط علم اور صحیح علم بھی ہوتا ہے؟

جارجیاز: جی نہیں۔

سقراط: یقیناً نہیں۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ علم اور یقین میں فرق موجود ہے۔

جارجیاز: بالکل ٹھیک ہے۔

سقراط: تاہم جو جانتے ہیں اور جو یقین رکھتے ہیں دونوں کی رائے تبدیل ہوتی ہے۔

جارجیاز: ہوتی تو ہے۔

سقراط: کیا ہم یہ فرض کر لیں کہ تبدیلی رائے دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو علم کے بغیر یقین پیدا کرتی ہے اور دوسری علم کے ساتھ۔

جارجیاز: ضرور۔

سقراط: ذرا یہ بتایئے کہ بلاغت عدالتوں اور اجتماعات میں انصاف اور بے انصافی کے بارے میں رائے میں کس طرح تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ وہ تبدیلی جو کہ علم لاتی ہے یا جو کہ یقین لاتی ہے؟

جارجیاز: واضح ہے کہ صرف وہی جو یقین پیدا کرتی ہے۔

سقراط: گویا بظاہر بلاغت ایسا ہنر ہے جو رائے کو اس طرح متاثر کرتا ہے کہ اس سے انصاف اور بے انصافی کے بارے میں یقین پیدا ہوتا ہے لیکن یہ ان کا علم نہیں سکھاتا؟

جارجیاز: سچ ہے۔

سقراط: اور ماہر بلاغت عدالتوں اور دیگر اجتماعات کو عادلانہ اور غیر عادلانہ باتوں کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے بلکہ ان کے بارے میں صرف یقین پیدا کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ایسے بڑے مجمع کو ایسی نازک باتیں مختصر وقت میں سمجھانا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

جارجیاز: بالکل ہی نہیں۔

سقراط: آیئے اب ہم غور کریں کہ آخر بلاغت کا اصل مفہوم کیا ہے۔ کیونکہ ابھی تک میں خود یہ طے نہیں کر سکا ہوں کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ جس وقت کسی طبیب، جہاز ساز یا کسی ہنرمند کے انتخاب کے لیے اجتماع ہوتا ہے تو کیا اس میں بلاغت کا ماہر شامل ہوتا ہے؟ یقیناً نہیں۔ کیونکہ ہر انتخاب میں اعلیٰ درجے کے ماہر ہی کو منتخب ہونا چاہیے۔ اس طرح جب فصیل یا بندرگاہ یا جہاز ٹھہرنے کے مقامات کی تعمیر ہوتی ہے تو اس کے لیے ماہر بلاغت نہیں بلکہ ماہر تعمیرات کے مشورے درکار ہوں گے یا جب فوجی افسروں کا انتخاب کرنا ہو یا جنگ کے لیے صف بندیاں کرنا ہوں تو یہاں بھی دفاعی ماہرین مشورہ دیں گے، ماہر بلاغت نہیں۔ جارجیاز اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ تو خود بھی ماہر بلاغت ہیں اور بلاغت سکھانے کے دعویدار بھی۔ آپ کے فن کی ماہیت کے بارے میں آپ سے بہتر کون مجھے بتا سکتا ہے۔ میں آپ کو ضمانت دیتا ہوں کہ مجھے آپ کا مفاد بھی عزیز ہے اور خود اپنا بھی۔ ہو سکتا ہے یہاں جو نوجوان موجود ہیں ان میں سے دو چار اس فن میں آپ کی شاگردی اختیار کرنے کے خواہش مند ہو جائیں۔ میں یہ خواہش ایک دو نہیں بلکہ متعدد نوجوانوں کے دلوں میں موجود دیکھ رہا ہوں۔ لیکن ان میں ابھی یہ حوصلہ نہیں ہے کہ وہ آپ سے کچھ پوچھیں۔ اسی لیے جب میں آپ سے سوال پوچھتا ہوں تو یہ بھی سمجھ لیں یہ سوالات ایسے نوجوانوں کے بھی ہیں۔ جارجیاز یہ بتایئے کہ آپ کے پاس آنے کا فائدہ کیا ہے؟ وہ کہیں گے آپ ملک کو

صلاح و مشورہ دینے کے لیے ہمیں کس چیز کی تربیت دیں گے۔ صرف انصاف اور ناانصافی کے بارے میں یا ان امور سے متعلق بھی جس کا سقراط نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے آپ کس طرح ان کا جواب دیں گے؟

جارجیاز: سقراط بحث کو آگے بڑھانے کا آپ کا طریقہ مجھے اچھا لگا۔ میں کوشش کروں گا کہ بلاغت کی پوری ماہیت آپ کے ذہن نشین کرا دوں۔ آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ ایتھنز کی فصیلیں اور جہازوں کے ٹھہرنے کے مقامات اور بندرگاہ کی تعمیر کے منصوبے اس مشورے کے مطابق تیار کیے گئے تھے۔ جس میں کچھ تھیمسٹوکلس (Themistocles) اور کچھ پیریکلس (Pericles) کا حصہ تھا۔ معماروں کی رائے اس میں شامل نہیں تھی۔

سقراط: جارجیاز تھیمسٹوکلس کے بارے میں روایت تو یہی ہے اور پیریکلس کی تقریر تو میں نے بذات خود سنی تھی۔ جو فصیل کے وسطی حصے سے متعلق تھی۔

جارجیاز: سقراط آپ نے دیکھ لیا ایسے معاملات میں جب بھی کوئی اہم فیصلہ کرنا ہوتا ہے تو بلاغت کے ماہرین ہی سے رائے لی جاتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو نکتہ سمجھا کر کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

سقراط: جارجیاز میرے ذہن میں ان کی یہی خوبی تھی جب میں نے یہ پوچھا تھا کہ بلاغت کی ماہیت کیا ہے۔ جب میں اس معاملے کو مذکورہ نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں تو یہ مجھے اس وقت عظیم الرتبت نظر آتی ہے۔

جارجیاز: سقراط واقعی یہ بڑا ہی عظیم الشان فن ہے بشرطیکہ آپ پر یہ واضح ہو جائے کہ بلاغت کس طرح مفاہیم کا ادراک کرتی ہے اور تمام کمتر درجے کے فنون اس کے قبضہ قدرت میں ہوتے ہیں۔ اس کی ایک نمایاں مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ متعدد مواقع پر میں اپنے بھائی ہیروڈیکس (Herodicus) یا چند دیگر طبیبوں کے ہمراہ کسی مریض کے علاج کے لیے گیا۔ ان میں ایک مریض ایسا بھی تھا جو نہ تو طبیب کو ہاتھ لگانے دیتا تھا نہ دوا کھاتا، نہ نشتر لگوانے کا روادار تھا اور نہ ہی گرم لوہے سے داغوانے کے لیے تیار تھا۔ لیکن میں نے اسے وہ باتیں ماننے پر آمادہ کر لیا جس میں طبیب ناکام ہو چکے تھے۔ یہ کارنامہ ایک ماہر بلاغت ہی کا تھا۔ اگر ایک طبیب اور ایک ماہر بلاغت کسی شہر میں جا کر وہاں اکلیشیا (Ecclesia) یا کسی بھی دوسری اسمبلی کے اجلاس میں یہ بحث کریں کہ ان میں سے

کسے سرکاری طبیب مقرر کیا جائے تو یقین کیجیے کہ طبیب کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکلے گی۔ لیکن اگر وہ چاہے تو عمدہ گفتگو کرنے والا ہی منتخب ہو جائے گا۔ کسی بھی پیشے کو لے لیجیے۔ اوروں سے کہیں زیادہ ماہر بلاغت ہی کے منتخب ہونے کے امکانات روشن ہوں گے۔ وہ منتخب ہو جائے گا کیوں کہ وہ اجلاس سے اوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مدلل تقریر کرے گا اور ہر فن پر کرے گا۔ یہی فن بلاغت کی قوت اور ماہیت ہے۔ سقراط تاہم یہ ضروری ہے کہ دیگر فنون کی طرح بلاغت کو بھی ہر ایک کے خلاف کام میں نہیں لانا چاہیے۔ بلاغت کے ماہر کو چاہیے کہ وہ مکّا بازوں اور پہلوانوں یا شمشیر زنی کے ماہرین کی طرح اپنی طاقت کا ناجائز استعمال نہ کرے۔ کیونکہ اس کی قوت اس کے دوستوں اور دشمنوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے اسے چاہیے کہ وہ اپنے دوست کو نہ زدوکوب کرے، نہ خنجر سے مارے اور نہ ہی قتل کرے۔ فرض کیجیے کسی کو اکھاڑنے میں صرف مکا بازی کی تربیت دی جاتی ہے۔ وہ اپنی قوت کے نشہ میں اپنے والد یا والدہ یا جان پہچان والوں یا دوستوں کو دو چار مکے رسید کر دیتا ہے لیکن اس بنیاد پر مکا بازی کے استاد یا شمشیر زنی سکھانے والے کو قابلِ نفرت گردانا جائے یا شہر بدر کر دیا جائے۔ یقیناً ایسا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ انھوں نے تو یہ فن ایک نیک مقصد کے تحت سکھایا تھا تاکہ اسے دشمنوں، بدکاروں کے خلاف اپنی حفاظت کے لیے کام میں لایا جائے، جارحیت کے لیے نہیں۔ یہ تو دوسرے لوگ تھے جنھوں نے ان کی تربیت کا غلط استعمال کیا اور اپنی قوت اور ہنرمندی کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اس بنا پر نہ تو استاد برے بنتے ہیں اور نہ ہی قصور فن کا ہوتا ہے۔ نہ ہی یہ ہنر بذاتِ خود برا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں، میں یہی کہوں گا ہنرمندی کا غلط استعمال کرنے والے ہی موردِ الزام ہوتے ہیں۔ یہی دلیل فنِ بلاغت پر بھی صادق آتی ہے کیونکہ بلاغت کا ماہر تو ہر شخص کے خلاف ہر موضوع پر گفتگو کر سکتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے ہجوم کو رائے بدلنے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ لیکن اسے یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی طاقت کے زور پر طبیب یا کسی دیگر فن کے ماہرین کی شہرت کو داغدار کرے۔ اسے چاہیے کہ وہ بلاغت کے ہنر کو بھی اپنی جسمانی قوت کی طرح محض جائز طریقے سے استعمال کرے اور اگر بلاغت کے فن میں مہارت کے حصول کے بعد وہ اپنی قوت اور صلاحیت کا غلط استعمال کرتا ہے تو یہ انصاف سے بعید ہوگا کہ اس کے سکھانے والے کو اس کی غلط کاریوں کی بنا پر قابلِ نفرین سمجھا جائے یا شہر بدر کر دیا جائے۔ کیونکہ استاد نے تو اسے ہنر، اچھے استعمال کے لیے سکھایا تھا۔ لیکن اس نے

اس کا غلط استعمال کیا۔ اسی لیے فن کے غلط استعمال کرنے والے فرد کو قابل نفرت سمجھنا اور شہر بدر کرنا حتیٰ کہ موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے اس کے استاد کو نہیں۔

سقراط: جارجیاز آپ کو بھی میری طرح بحث مباحثے کا بہت تجربہ ہے۔ آپ نے یہ دیکھا ہوگا کہ کبھی بھی ان کا انجام بخیر نہیں ہوتا اور نہ ہی اس موضوع کی وضاحت ہوتی ہے جو فریقین کے زیر بحث ہوتے ہیں۔ بلکہ الٹا اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ کوئی نہیں کہتا کہ فریق ثانی نے سچ کہا ہے اور نہ ہی موضوع کی کھل کر وضاحت ہوتی ہے بلکہ وہ طیش میں آ کر دست و گریبان ہو جاتے ہیں۔ فریقین یہی سمجھتے ہیں کہ دوسرا فریق صرف اپنے ذاتی جذبات اور باہمی رقابت کی بنیاد پر بحث کر رہا ہے۔ موضوع کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ اکثر نوبت گالم گلوچ تک پہنچ جاتی ہے حتیٰ کہ حاضرین ایسی بحث کو سن کر خود اپنے آپ سے نالاں ہو جاتے ہیں، میں آخر ایسا کیوں کہہ رہا ہوں؟ اس لیے کہ میرے خیال میں بلاغت کے بارے میں آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ جو کچھ آپ نے آغاز میں کہا تھا اس سے نہ تو میل رکھتا ہے اور نہ ہی اس سے مطابقت۔ میں ہر بات ڈرتے ڈرتے ہی کہہ رہا ہوں کہ مبادا آپ یہ سمجھ لیں کہ مجھے آپ سے کوئی عداوت ہے اور میں اس ضمن میں سچائی معلوم نہیں کرنا چاہتا بلکہ آپ سے کدورت رکھتا ہوں۔ اگر آپ میرے ہی ہم خیال ہیں تو آپ پر جرح کرنا چاہوں گا۔ اگر نہیں، تو پھر آپ سے کوئی تعرض نہیں کروں گا۔ آپ پوچھیں گے کہ ہم خیال کیا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو غلط ہونے کی بنا پر اپنے دلائل کی تردید کو خوشی خوشی تسلیم کر لیتے ہیں۔ اسی طرح اگر دوسرا شخص غلط بات کہے تو میں اس کے دلائل کی تردید کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں۔ میں تردید کروانے کے لیے بھی اتنا ہی تیار رہتا ہوں جتنا تردید کرنے کے لیے۔ میرا خیال ہے یہ طریقہ دونوں کے لیے اسی طرح مفید ہوتا ہے جس طرح کوئی بڑی برائی دوسروں سے دور کرنے سے، کہیں بہتر خود اپنی برائی کا علاج ہے کیونکہ میری نظر میں زیر بحث موضوع کے بارے میں غلط رائے سے بڑھ کر اور کوئی برائی نہیں ہے۔ اگر آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ میرے ہم خیال ہیں تو بحث جاری رکھیے لیکن اگر یہ بات آپ کی برداشت سے باہر ہو تو کوئی حرج نہیں۔ گفتگو اسی مرحلے پر ختم کر لیتے ہیں۔

جارجیاز: سقراط میں بتا دوں کہ میں ویسا ہی انسان ہوں جس کی آپ نے نشاندہی کی ہے۔ لیکن ہمیں سامعین کا بھی خیال رکھنا ہوگا کیونکہ آپ کی آمد سے قبل میں طویل گفتگو کا مظاہرہ کر چکا ہوں۔ اگر

ہم بحث جاری رکھتے ہیں تو وہ طول کھینچ جائے گی۔ اس لیے یہ سوچنا ہوگا کہ کچھ سامعین اپنے دیگر
امور نمٹانے کے لیے جانا چاہتے ہوں گے۔

جیریفون: جارجیاز اور سقراط ذرا آپ خود دیکھیں حاضرین کس طرح نعرۂ تحسین بلند کر رہے ہیں۔ جس سے ان
کی اس خواہش کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ آپ دونوں کی باتیں سننا چاہتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق
ہے خدا نہ کرے کہ میرا ایسا کوئی انتہائی ضروری کام ہو کہ میں آپ لوگوں کی اتنی دلچسپ اور پرمغز
طریقے سے جاری بحث سے محروم ہو جاؤں۔

کیلی: چیریفون قسم ہے دیوتاؤں کی اگرچہ میں بحث و تمحیص کی متعدد مجالس میں شریک رہا ہوں لیکن میں
نہیں سمجھتا کہ مجھے اس سے قبل ایسا لطف آیا ہو۔ اگر آپ لوگ اس بحث کو سارا دن جاری رکھیں تو
مجھے بہت خوشی ہوگی۔

سقراط: کیلی کلس میں سچ کہہ رہا ہوں اگر جارجیاز راضی ہوں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

جارجیاز: ان تمام باتوں کے بعد اگر میں انکار کروں تو میرے لیے بڑی سبکی کی بات ہوگی۔ خصوصاً اس وجہ
سے کہ میں نے ہر فرد کے سوالوں کے جواب دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ چلیے اہل محفل کی خواہش
کے احترام میں آپ جو سوال بھی چاہیں، پوچھنا شروع کر دیں۔

سقراط: جارجیاز اگر آپ اجازت دیں تو میں بتاؤں کہ آپ کے الفاظ میرے لیے کس قدر باعث حیرت
ہیں۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ آپ درست کہہ رہے ہوں اور میں آپ کا مفہوم صحیح طور پر نہ سمجھ سکا
ہوں۔ آپ کا کہنا یہ ہے کہ آپ ہر اس شخص کو ماہر بلاغت بنا سکتے ہیں جو اس فن کو سیکھنے کا متمنی ہو۔

جارجیاز: جی ہاں۔

سقراط: آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ اسے اپنی تربیت سے اس قابل بنا دیں گے کہ وہ ہر موضوع پر محفل کی
توجہ حاصل کر سکے گا اس کے لیے وہ انھیں ہدایات نہیں دے گا بلکہ ان کی رائے تبدیل کر دے گا۔

جارجیاز: بالکل۔

سقراط: آپ تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ خود صحت کے معاملات میں بھی بلاغت کا ماہر طبیب سے کہیں زیادہ
ید طولیٰ رکھتا ہے۔

جارجیاز: جی ہاں پوری محفل سے بھی زیادہ۔

سقراط: آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ ناواقفوں پر ہی اثر انداز ہوگا کیونکہ علم رکھنے والوں سے زیادہ رائے

تبدیل کرانے کی اہلیت کا وہ حامل نہیں ہو سکتا ہے۔

جارجیاز: بجا ارشاد۔

سقراط: اگر چہ وہ خود طبیب نہیں ہے تو کیا ہوا؟

جارجیاز: جی نہیں۔

سقراط: ظاہر ہے، جو طبیب نہیں ہے وہ، وہ سب کچھ نہیں جانتا جس سے طبیب واقف ہے۔

جارجیاز: ظاہر ہے۔

سقراط: گویا جب کہ بلاغت کا ماہر طبیب سے کہیں زیادہ رائے تبدیل کرنے کا ماہر ہے تو کیا ناواقف، صاحب علم کے مقابلے میں ناواقفوں کی رائے تبدیل کرنے کا کہیں زیادہ اہل ہوتا ہے۔ کیا اس سے یہی نتیجہ نہیں نکلتا۔

جارجیاز: جی ہاں! اس معاملے میں ایسا ہی ہوگا۔

سقراط: بلاغت کے ساتھ دیگر فنون کے باہمی روابط پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ماہر بلاغت کو اشیا کے حقائق کا بھی علم ہو۔ اسے تو ناواقفوں کی رائے تبدیل کرنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ سوجھنا چاہیے تا کہ وہ یہ مان لیں کہ ماہر بلاغت کو اہل علم سے زیادہ معلومات حاصل ہیں۔

جارجیاز: سقراط یہ بالکل درست ہے۔ کیا یہ بات باعث اطمینان نہیں ہے کہ اس نے بجائے بلاغت کے اور کوئی فن نہیں سیکھا، پھر بھی اس فن کے ماہرین سے کسی صورت کمتر نہیں ہے؟

سقراط: فن بلاغت کا ماہر کمتر ہے یا نہیں، اس سوال پر ہم ذرا دیر بعد غور کریں گے، اگر اس کا کوئی فائدہ ہوا تو۔ لیکن پہلے میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ وہ طب اور دیگر فنون سے اتنا ہی واقف ہے یا ناواقف ہے، جتنا انصاف اور ناانصافی سے، بے عزتی اور عزت سے، نیکی اور بدی سے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں، کہ کیا وہ اس شے میں موجود اچھائی اور برائی 'عزت یا بے عزتی' انصاف یا ناانصافی سے واقف ہے؟ یا اسے صرف ناواقفوں میں یہ رائے پیدا کرنے کا ملکہ حاصل ہے کہ انھیں معلومات نہ ہونے کے باوجود اس شخص سے کہیں زیادہ معلوم ہے جو اس ہنر سے واقف ہوتے ہیں؟ کیا فن بلاغت کے حصول سے قبل شاگرد کو ان فنون کے بارے میں جاننا چاہیے؟ اگر وہ ناواقف ہے تو آپ جو علم بلاغت سکھاتے ہیں اسے کچھ نہیں سکھا سکتے۔ آپ کا یہ کام نہیں ہے لیکن آپ اسے ایسا بنا دیں گے کہ پوری محفل یہی سمجھے گی کہ وہ ان سب فنون سے واقف ہے۔ حالانکہ وہ بالکل واقف

نہیں ہوگا یا آپ اسے فن بلاغت اس وقت تک سکھانے کے قابل نہیں ہوں گے جب تک وہ پہلے ان تمام باتوں کی حقیقت سے واقف نہ ہو جائے؟ ان باتوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے۔
قسم ہے ارض وسما کی جارجیاز میں چاہتا ہوں کہ آپ بلاغت کے پوشیدہ راز سے پردہ اٹھا کر اس کی قوت بتا دیں جس کا آپ نے وعدہ کیا تھا۔

جارجیاز: سقراط بہت خوب، اگر شاگرد کو اتفاقاً یہ معلومات حاصل نہ ہوں تو اسے ان کے بارے میں بھی مجھ سے سیکھنا ہوگا۔

سقراط: آگے کچھ نہ کہیے۔ آپ کی یہ بات بالکل درست ہے یعنی جسے آپ بلاغت کا ماہر بناتے ہیں اسے انصاف اور ناانصافی کی ماہیت سے واقفیت ہونی چاہیے نہیں تو آپ خود اسے بتا دیں گے۔

جارجیاز: یقیناً۔

سقراط: اچھا یہ فرمایئے کہ جسے بڑھئی کا ہنر آتا وہ بڑھئی ہے یا نہیں۔

جارجیاز: جی ہے۔

سقراط: جس نے موسیقی سیکھی ہو وہ موسیقار ہے۔

جارجیاز: جی ہاں۔

سقراط: اسی طرح جس نے طب کا علم حاصل کیا وہ طبیب ہوا ناں؟ جس نے کوئی بھی فن سیکھا وہ وہی کچھ ہے جو اس فن کے جاننے والے کو کہتے ہیں۔

جارجیاز: یقیناً۔

سقراط: اسی طرح جس نے یہ معلوم کر لیا کہ نیکی کیا ہے وہ نیک ہوا۔

جارجیاز: بالکل درست۔

سقراط: اور جو نیک ہے اس سے یہی توقع کی جائے گی کہ وہ نیک عمل کرے گا۔

جارجیاز: جی ہاں۔

سقراط: کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ نیک آدمی ہمیشہ نیک کام ہی کرنا چاہے گا۔

جارجیاز: بالکل یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

سقراط: بلاشک اس صورت میں نیک آدمی کبھی بدی پر رضامند نہیں ہوگا؟

جارجیاز: ہرگز نہیں ہوگا۔

سقراط: اور دلیل کی روشنی میں ماہر بلاغت بدی کا مرتکب نہیں ہوگا۔

جارجیاز: جی ہاں

سقراط: اور ایسا وہ اس بنا پر بھی ناانصافی کرنے کا خواہش مند بھی نہیں ہوگا؟

جارجیاز: یقیناً نہیں۔

سقراط: اور اسی لیے کبھی بدی پر مائل نہیں ہوگا لیکن آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے ابھی ابھی فرمایا تھا کہ اگر مکا باز اپنی مکا بازی کا غلط استعمال کرتا ہو تو اس کی ذمہ داری اس کے سکھانے والے پر عائد نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اسے شہر بدر کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر فن بلاغت کا ماہر اپنے فن کا برا اور ناجائز استعمال کرتا ہے تو اس کے لیے اس کے سکھانے والے پر الزام نہیں آئے گا۔ نتیجتاً سکھانے والے کو نہیں بلکہ اس مکا باز کو شہر بدر کیا جائے گا جس نے اپنے ہنر کا ناجائز طریقہ سے استعمال کیا ہے۔ آپ نے یہی نہیں کہا تھا؟

جارجیاز: جی ہاں یہی کہا تھا۔

سقراط: اب آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ فن بلاغت کے مذکورہ ماہر سے کبھی کوئی غلط کام ہو ہی نہیں سکتا؟

جارجیاز: سچ ہے۔

سقراط: جارجیاز بحث کے بالکل ہی آغاز میں یہ کہا گیا تھا کہ بلاغت کا واسطہ بحث وتمحیص سے ہے اور (ریاضی کی طرح) طاق اور جفت سے اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ صرف نیک و بد سے ہے۔ یہی کچھ کہا گیا تھا ناں۔

جورجیاز: جی ہاں۔

سقراط: جب آپ یہ بات کہہ رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ بلاغت جو ہمیشہ نیکی کا تذکرہ کرتی ہے بذات خود بد نہیں ہو سکتی لیکن جب آپ نے ذرا بعد یہ بھی کہہ دیا کہ بلاغت کا ماہر اس کا غلط استعمال بھی کر سکتا ہے تو مجھے اس تضاد پر، جس کا آپ شکار ہوئے حیرت ہوئی۔ اور میں نے کہا اگر آپ نے بھی میری طرح سوچا ہے کہ اگر آپ کی تردید ہو جائے تو اس میں بھی فائدہ ہے۔ اس صورت میں بحث کو آگے بڑھانا مفید ہوگا۔ لیکن اگر یہ بات نہیں ہے تو بحث کو یہیں ختم ہو جانا چاہیے۔ ہماری تحقیق کے دوران آپ خود دیکھ لیں کہ یہ تسلیم کر لیا گیا کہ بلاغت کا ماہر اپنے فن کے ناجائز استعمال کا اہل ہی نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ ناجائز پر رضامند ہوتا ہے۔ لیکن قسم ہے جارجیاز کہ ان تمام

امور کی حقیقت تک پہنچنے سے قبل بہت زیادہ بحث وتمحیص سے کام لینا ہوگا۔

سقراط بتائیں کیا آپ واقعی ان باتوں کے قائل ہیں جو آپ نے بلاغت کے بارے میں کہی ہیں؟

پولس: کیا ہوا، اگر جارجیاز کو اس بات سے انکار پر شرمندگی ہوئی کہ بلاغت کے ماہر کو عدل، توقیر واکرام اور نیکی کا علم ہوتا ہے اور یہ تسلیم کیا کہ جو کوئی ان باتوں سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی بلاغت سیکھنے کے لیے اس کے پاس آئے گا وہ یہ ہنر سیکھنے سے پہلے ان باتوں سے واقفیت حاصل کرے گا۔ اس اعتراف کے نتیجے میں ایک تضاد کھل کر سامنے آ گیا جو کہ آپ کا ہمیشہ سے بڑا مرغوب مشغلہ ہے اور اس نے نہیں بلکہ خود آپ نے اپنے حرف گیرانہ سوالات کے ذریعے بحث کی یہ صورت بنا ڈالی ہے۔ کیا آپ سچ مچ ان تمام باتوں پر یقین کرتے ہو۔ کبھی کوئی فرد یہ تسلیم کرے گا کہ وہ انصاف کی ماہیت سے ناواقف ہے اور اس کی تربیت دینے کا اہل نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بحث کو اس مرحلے تک پہنچانے کے لیے بڑا سلیقہ اور طریقہ درکار ہوتا ہے۔

سقراط: میرے عزیز پولس! یاد رکھو ہمیں دوستوں اور اولاد کی اس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ جب ہم بوڑھے ہو جائیں اور ٹھوکریں کھائیں تو نئی نسل ہمارے پاس ہی موجود ہو جو ہمیں اٹھا کر دوبارہ راستے میں کھڑا کر دے اور ہم اپنے ان الفاظ واعمال میں مستحکم ہو جائیں۔ دیکھیے نا اگر میں اور جارجیاز لڑکھڑا رہے ہیں تو آپ موجود ہیں، ہم گرے ہوؤں کو کھڑا کر دیجیے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اپنی ان غلطیوں کی اصلاح کے لیے تیار ہوں جن کی آپ نے نشاندہی کی ہے لیکن اس کی ایک شرط ہے۔

پولس: شرط کیا ہے۔

سقراط: پولس آپ اپنی اس تقریر کی طوالت کو بہت کم کر دیں۔ جس کا آپ نے آغاز میں مظاہرہ کیا تھا۔

پولس: آپ کیا یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق الفاظ استعمال نہ کروں؟

سقراط: میرے دوست یہ سوچنا بھی بڑی زیادتی ہوگی کہ آپ ہیلاز کی ریاست ایتھنز آئیں جہاں تقریر کی سب سے زیادہ آزادی حاصل ہے اور صرف آپ ہی کو پابند بنا دیا جائے اور آپ آزادیِ اظہار کا مظاہرہ نہ کر سکیں۔ میرے معاملہ پر غور کیجیے۔ میں تو مشکل میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ اگر آپ تقریر تو طویل کریں مگر ان سوالوں کے جواب دینے سے گریز کریں جو آپ سے دریافت کیے جائیں۔ ایسی صورت میں یہاں قیام پر مجبور ہو جاؤں گا اور مجھے آپ کی گفتگو سننا ہی پڑے گی۔ آپ سے

رخصت ہونے کا موقع کہاں ملے گا؟ میں صرف یہی کہوں گا کہ اگر آپ واقعی بحث میں دلچسپی رکھتے ہیں یا میرے سابقہ الفاظ کے مطابق اسے آگے بڑھنے کے لیے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ تو آپ اپنے جس بیان سے چاہیں مکر سکتے ہیں۔ اور میرے جارجیاز کی طرح اپنی باری آنے پر سوال بھی پوچھیں اور جواب بھی دیں، دوسروں کی تردید بھی کریں اور اپنی تردید بھی سنیں۔ کیونکہ میرا یہ حسن ظن ہے کہ آپ کو اتنا ہی علم رکھنے کا دعویٰ ہے جتنا جارجیاز کو ہے۔ بات یہی ہے نا؟

پول: جی ہاں۔

سقراط: اور آپ جارجیاز کی طرح حاضرین سے کہیں کہ وہ جو سوال چاہیں آپ سے دریافت کریں اور آپ ان کا جواب دیں۔

پول: درست ہے۔

سقراط: اچھا اب یہ بتایئے کہ آپ سوال کریں گے یا جواب دیں گے؟

پول: میں سوال کروں گا۔ سقراط آپ اس کا جواب دیں گے ناں۔ سوال وہی ہے جس کا آپ کے خیال میں جارجیاز نے جواب نہیں دیا، یعنی علم بلاغت کیا ہے؟

سقراط: آپ کا مطلب ہے یہ کس قسم کا ہنر ہے۔

پول: جی ہاں۔

سقراط: پولس میری رائے میں تو یہ کوئی فن نہیں ہے۔ بالکل ہی نہیں۔

پول: پھر ارشاد فرمایئے کہ آپ کی رائے میں بلاغت کیا ہے؟

سقراط: میں نے حال ہی میں آپ کی ایک کتاب پڑھی ہے جس میں آپ نے لکھا ہے کہ یہ وہ شے ہے جسے آپ نے فن بنا دیا ہے۔

پول: وہ کیا شے ہے۔

سقراط: میں تو اسے ایک طرح کا تجربہ ہی کہوں گا۔

پول: تو کیا بلاغت کو آپ ایک طرح کا تجربہ سمجھتے ہیں۔

سقراط: میری رائے تو یہی ہے۔ ہوسکتا ہے آپ اس کے بارے میں کچھ اور سوچتے ہوں۔

پول: یہ تجربہ کس شعبہ کا ہے۔

ایک ایسا تجربہ جس سے ایک قسم کی مسرت اور فرحت حاصل ہوتی ہے۔

سقراط: اگر بلاغت سے لوگ فرحت پاتے ہیں اور لطف حاصل کرتے ہیں تو کیا یہ نہایت عمدہ چیز نہ ہوئی۔

پولس: پولس یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں کہ بلاغت بہت عمدہ چیز ہے یا نہیں۔

سقراط: ابھی تو میں نے یہ بتایا ہی نہیں کہ بلاغت ہے کیا؟

کیا میں نے آپ کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ بلاغت ایک طرح کا تجربہ ہے؟

پولس: آپ جو دوسروں کو فرحت بخشنے کے دعویدار ہیں کیا مجھے ایک تھوڑی بہت فرحت عطا کریں گے؟

سقراط: کیوں نہیں۔

پولس: کیا مجھ سے پوچھیں گے کہ کھانا پکانا کس طرح کا فن ہے؟

سقراط: اچھا فرمایئے کھانا پکانا کس طرح کا فن ہے؟

پولس: پولس یہ کوئی فن نہیں ہے۔

سقراط: پھر کیا ہے۔

پولس: میں اسے بھی تجربہ ہی کہوں گا۔

سقراط: کس باب میں، ذرا اس کی وضاحت کر دیجیے۔

پولس: پولس یہ بھی ایک قسم کا تجربہ ہے جس سے مسرت اور فرحت حاصل ہوتی ہے۔

سقراط: گویا کھانا پکانا اور بلاغت دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

پولس: جی نہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ دونوں ایک ہی قسم کے عمل کے دو جزو ہیں۔

سقراط: کس عمل کے۔

پولس: مجھے اندیشہ ہے کہ حقیقت، خوش اخلاقی کے تقاضے پورے نہیں کرے گی۔ اس لیے میں اس کا جواب دینے سے ہچکچا رہا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جارجیاز یہ سمجھ لیں کہ میں ان کے پیشے کا مذاق اڑا رہا ہوں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں یہ وہ فن ہے جسے جارجیاز نے اپنا پیشہ بنا رکھا ہے لیکن میں اس کے بارے کیا کہہ سکتا ہوں۔ انھوں نے ابھی ابھی جو کچھ کہا ہے اس سے تو اندازہ نہیں ہوتا کہ اس فن کے بارے میں ان کی رائے کیا ہے لیکن جس بلاغت کی بات میں کر رہا ہوں وہ کسی قابل تحسین عمل کا جزو نہیں ہے۔

سقراط: کس قسم کی عمل کا۔ سقراط آپ میری فکر نہ کریں جو چاہیں کہیں۔

جارجیاز:

سقراط: پھر سن لو کہ میرے خیال سے جس کل کا بلاغت ایک جز ہے، وہ فن ہے ہی نہیں۔ وہ تو برجستہ ادا ہونے والی حاضر جوابی کا عمل ہے جس سے انسان کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔ اس عمل کو میں اعجاز مبالغہ آرائی کہہ سکتا ہوں۔ میری رائے میں اس کے متعدد اجزا ہیں اور کھانا پکانا بھی ان میں سے ایک ہے جو بظاہر ہنر معلوم ہوتا ہے لیکن میری رائے میں محض ایک تجربہ یا معمول ہے کوئی فن نہیں۔ اسی کا دوسرا جزو بلاغت ہے، خیاطی اور مغالطہ بھی اس کے دیگر دو اجزا ہیں۔ گویا اس کی چار مختلف شاخیں اور چار مختلف اشیا ہیں جو اس تعریف پر پورا اترتی ہیں۔ پولس کو ابھی یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ بلاغت کس طرح کی ''خوشامد'' ہے۔ اس لیے وہ اس معاملے میں سوال پوچھ لیں۔ میں نے ابھی ان کے دوسرے سوال کا جواب نہیں دیا ہے کہ کیا میں بلاغت کو فنون لطیفہ میں شمار کرتا ہوں یا نہیں۔ لیکن میں انھیں یہ نہیں بتاؤں گا کہ بلاغت لطیف شے ہے یا نہیں بلکہ میں پہلے ان کے اس ''مبالغہ آرائی'' والے سوال کا جواب دوں گا کہ بلاغت کیا ہے؟ پولس یہ بات ٹھیک تو نہیں ہوگی نا لیکن مجھے جواب دے کر مسرت ہوگی۔ اگر آپ یہ پوچھیں کہ کس جزو کو بلاغت کہتے ہیں۔

پولس: میں ضرور پوچھوں گا کیا آپ جواب دیں گے۔ اچھا بتایئے مبالغہ آرائی کے کس جزو کو بلاغت کہتے ہیں؟

سقراط: کیا میرا جواب آپ کی سمجھ میں آجائے گا؟ بلاغت میری رائے میں سیاست کی بدروح یا کھوٹی شے ہے۔

پولس: سقراط بات درست ہے میری سمجھ میں خاک نہیں آیا۔

سقراط: جارجیاز مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ میں نے ابھی اپنی بات کی وضاحت نہیں کی ہے۔ پولس نام اور فطرت دونوں سے ناتجربہ کار ہے، اسی لیے بگٹٹ بھاگ رہا ہے۔

جارجیاز: آپ اس کی پروا نہ کریں لیکن مجھے سمجھا دیں کہ آپ کیوں کہہ رہے ہیں کہ بلاغت سیاست کا وہ جزو ہے جو کھوٹا یا جعلی ہے۔

سقراط: چلیے میں کوشش کرتا ہوں کہ بلاغت کے بارے میں اپنی رائے کھل کر بیان کروں اور اگر کوئی غلط بات کہوں تو میرے دوست پولس مجھے ٹوک دینا۔ ہم جسم اور روح کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں؟

جارجیاز: ضرور۔

سقراط: آپ یہ بھی تسلیم کریں گے ان دونوں کی اچھی حالتیں بھی ہوتی ہیں۔

جارجیاز: جی ہاں۔

سقراط: ہو سکتا ہے یہ اچھی حالت محض دکھاوے کی ہو؟ میرا مطلب ہے کہ بہت سے لوگ ہیں جو بظاہر صحت مند نظر آتے ہیں لیکن صرف طبیب ہی درست تشخیص کر سکتا ہے کہ وہ واقعی صحت مند ہیں یا محض صحت مند دکھائی دیتے ہیں؟

جارجیاز: درست۔

سقراط: اس کا اطلاق صرف جسم ہی پر نہیں بلکہ روح پر بھی ہوتا ہے۔ ان دونوں میں ایسی بات بھی ہو سکتی ہے جو محض صحت مند ہونے کا تاثر دے رہی ہو۔ حقیقت میں ایسی نہ ہو۔

جارجیاز: جی ہاں یقیناً۔

سقراط: اب میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کی مکمل وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا۔ جسم اور روح دو علیحدہ وجود ہیں۔ ان سے متعلق دو ہنر بھی ہیں۔ سیاست کا عمل روح پر ہوتا ہے۔ دوسرا ہنر جسم سے متعلق ہے۔ میرے علم میں جس کا کوئی خاص نام نہیں ہے لیکن اس کی دو اقسام بتائی جا سکتی ہیں ایک ورزش ہے اور دوسری طب۔ اسی طرح سیاست میں ایک جز و قانون سازی ہے جو ورزش کا دیا ہی متبادل ہے جیسا کہ انصاف طب کا ہے۔ لیکن ان میں امتیاز موجود ہے۔ تسلیم کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ۔ یہ چار جز و ہیں۔ ان میں سے دو جسم اور دو روح پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی ان کی غایت ہے۔ ان ہی چار اجزا کو پیش نظر رکھتے ہوئے یا ان کا اندازہ لگاتے ہوئے ''مبالغہ آرائی'' نے خود کو چار حالتوں یا بناوٹوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ وہ ان میں سے کسی ایک کا حلیہ اختیار کر لیتی ہے اور یہ ڈھونگ رچاتی ہے کہ وہ وہی کچھ ہے جو نظر آ رہی ہے۔ انسان کے اعلیٰ ترین مفاد کا اسے کوئی پاس نہیں ہوتا اور تفریح کا سامان فراہم کر کے لاابالی افراد کو شکار کرتی ہے اور انھیں یہ فریب دیتی ہے کہ وہی ان کے لیے اعلیٰ ترین قدر ہے۔ کھانا پکانے کا عمل طب کی عقل اور بھیس ہے اور یہ حیلہ پیش کرتا ہے کہ اسے یہ علم ہے کہ جسم کے لیے کون سی خوراک مفید ہے اور اگر ایک ایسا مقابلہ ہو جس میں طبیب اور باورچی شریک ہوں اور بچے یا ایسے افراد جن کی عقل بچوں ہی جیسی ہو اس کے منصف ہوں اور طے کریں کہ ان دونوں میں سے کسے خوراک کے بہترین یا بدترین ہونے کا علم ہے تو یقین مانیں طبیب بیچارہ فاقوں مر جائے گا۔ اس طرح کی ''مبالغہ آرائی'' میرے خیال میں نہایت گھٹیا درجے کی ہوتی ہے۔ پولس میرا روئے سخن آپ کی طرف ہے۔ گھٹیا ہونے کی وجہ یہ ہے

کہ اس کا مقصد صرف لطف کا حصول ہے، مقصد کے اعلیٰ ترین ہونے کا نہیں۔ میں اسے فن نہیں بلکہ ایک تجربہ کہتا ہوں کیونکہ یہ اپنے تاثر پیدا کرنے والے عمل کی توجیہ کر سکتا ہے نہ تشریح۔ میں کسی غیر مبدّل شے کو فن نہیں کہہ سکتا لیکن اگر آپ میرے الفاظ کو متنازعہ سمجھتے ہیں تو میں اپنے نظریہ کے دفاع کے لیے مزید بحث کر سکتا ہوں۔

اسی طرح میں کھانا پکانے کے عمل کو ایسی ''مبالغہ آرائی'' تصور کرتا ہوں جس نے طب کی صورت اختیار کر لی ہے۔ تھکن پیدا کرنے والا عمل بھی ''مبالغہ آرائی'' کا ایسا روپ ہے جو ورزش بن جاتا ہے۔ یہ دھوکا دفریب، جھوٹ، کم ظرفی، تنگ نظری کا نہایت ہی مکارانہ عمل ہے جو رنگ و روغن، لباس کی مدد سے کام کرتا ہے اور انسان کو جعلی حُسن عطا کرتا ہے۔ اس طرح ورزش سے پیدا ہونے والی خوبصورت کی نفی کرتا ہے۔

اس سے قبل کہ آپ اکتا جائیں میں جیومیٹری کے ماہرین کی زبان میں بات کروں گا کہ (میرا خیال ہے آپ اب اسے سمجھنے کے قابل ہو گئے ہوں گے) تھکا دینے والی :ورزش:: کھانا پکانا: طب کی طرح، یا شاید تھکا دینے والی: ورزش:: حجت: قانون سازی اور کھانا پکانا: طب:: بلاغت: عدل۔

میں یہی کہوں گا کہ حجت کرنے والے اور بلاغت کے ماہر میں یہی فطری فرق ہے لیکن ان کے قریبی تعلق کی بنا پر ان میں غلط ملط ہونے کا امکان موجود ہے۔ انھیں یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ وہ کیا فائدہ پہنچا رہے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو یہ علم ہوتا ہے کہ ان کی افادیت کیا ہے۔ کیونکہ جسم اپنا خود حاکم ہو اور اسے روحانی قدرت حاصل نہ ہو اور کھانا پکانے اور طب میں روح امتیاز نہ کر سکے اور جسم پر یہ فیصلہ چھوڑ دیا جائے اور فیصلے کا معیار ان سے حاصل شدہ جسمانی لذت ہو تو اینگزاغورث (Anaxagoras) کا وہ لفظ جس سے پولس آپ واقف ہیں ہر چہار جانب حاوی ہو جائے گا۔ ایک ایسی افراتفری مچ جائے گی جس میں کھانا پکانا، صحت اور طب سب گڈ مڈ ہو جائیں گے۔ دیکھیے میں نے بلاغت کے بارے میں اپنی رائے تفصیلاً بیان کر دی ہے کہ جس کا روح سے ویسا ہی تعلق ہے جیسا کہ کھانا پکانے کا جسم سے ہے۔ ہو سکتا ہے میری طویل تقریر میں کچھ تضاد بھی نظر آئے۔ میں نے آپ کو طویل تقریر کرنے سے روکا تھا لیکن میرے خیال میں مجھے درگزر فرمایا جائے کیونکہ یہ مختصر جواب آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے مجبوراً مجھے اس کی تشریح کرنا پڑی؟ اگر میں بھی آپ کی بات کو سمجھنے کا اہل نہ ہوں تو آپ بھی میری ہی جیسی طویل گفتگو کریں گے۔ لیکن اگر

میں آپ کی بات سمجھ لیتا ہوں تو مجھے آپ کی مختصر گوئی کا فائدہ اٹھانے دیجیے۔ یہی انصاف کا تقاضا ہے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ میرے جواب کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔

پول: آپ کا مطلب کیا ہے؟ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بلاغت ایک طرح کی ''مبالغہ آرائی'' ہوتی ہے؟

سقراط: جی نہیں میں کہہ رہا ہوں کہ ''مبالغہ آرائی'' کا ایک جز و بلاغت ہے۔ پولس اگر اس عمر میں بھی آپ کو یاد نہیں رہتا تو بوڑھے ہو کر آپ کیا کریں گے۔

پول: اچھا یہ بتایئے کیا بلاغت کے اچھے ماہرین کو آپ کے خیال کے مطابق گھٹیا درجے کا چاپلوس گردانا جاتا ہے؟

سقراط: یہ آپ کا سوال ہے یا تقریر کا آغاز ہے۔

پول: یہ میرا سوال ہے۔

سقراط: پھر میرا جواب یہ ہے کہ انھیں خاطر میں نہیں لایا جاتا۔

پول: کس طرح خاطر میں نہیں لایا جاتا۔ کیا ریاست میں ان کو قوت حاصل نہیں ہوتی؟

سقراط: اگر تمہارا مطلب یہ ہے کہ قوت اس کے حامل کی خوبی ہوتی ہے تو بالکل ہی نہیں۔

پول: میں یہی کہنا چاہتا تھا۔

سقراط: اگر حقیقت حال یہی ہے تو میں کہوں گا کہ ریاست میں ان کا اثر تمام شہریوں سے کہیں کم ہوتا ہے۔

پول: آپ نے کیا فرمایا۔ کیا وہ مطلق العنان حکمرانوں (Tyrants) کی طرح نہیں ہوتے۔ وہ جسے چاہیں مار ڈالیں، غارت کریں یا ملک بدر کر دیں۔

سقراط: پولس قسم ہے کہ آپ کی بات میری فہم سے بالاتر ہے۔ آپ اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں یا استفسار کر رہے ہیں۔

پول: میں آپ سے سوال پوچھ رہا ہوں۔

سقراط: لیکن آپ ایک ساتھ دو سوالات پوچھ رہے ہیں۔

پول: دو سوال کیسے؟

سقراط: کیوں ابھی آپ نے کہا تھا کہ بلاغت کے ماہرین مطلق العنان حکمرانوں کی طرح ہوتے ہیں اور جسے چاہیں مار ڈالیں، لوٹ لیں یا ملک بدر کر دیں۔

پول: جی میں نے کہا ہے۔

سقراط: اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں آپ ایک نہیں دو سوالات پوچھ رہے ہیں۔ گھبرائیے مت میں دونوں کا جواب دوں گا۔ پولس میں آپ پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ بلاغت کے ماہرین اور مطلق العنان حکمرانوں کو ریاست میں سب سے کم قوت حاصل ہوتی ہے۔ یہ بات میں پہلے بتا چکا ہوں کیونکہ وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرتے بلکہ وہی کچھ کرتے ہیں جسے وہ بہترین تصور کرتے ہیں۔

پول: تو کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہ بہت طاقتور ہوتے ہیں؟

سقراط: پولس آپ اس کے بالکل متضاد بات کہہ چکے ہیں۔

پول: سقراط جی نہیں۔ آپ قسمیہ بتائیں کہ آپ اسے کیا کہتے ہیں۔

سقراط: آپ نے کہا ہے کہ قوت اس کی ایک خوبی ہے جو اس کا حامل ہوتا ہے۔

پول: جی میں نے کہا ہے۔

سقراط: اور کیا آپ اپنی بات پر اڑے رہیں گے کہ اگر کوئی بیوقوف شخص اپنی دانست میں بہترین کام کرتا ہے تو کیا یہ اس کی خوبی ہوگی اور کیا آپ اسے عظیم قوت کہیں گے۔

پول: بالکل نہیں۔

سقراط: اس صورت میں آپ کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ بلاغت کا ماہر احمق نہیں ہوتا اور یہ بھی کہ بلاغت ایک فن ہے نہ کہ "مبالغہ آرائی" کا دوسرا نام۔ اس طرح آپ کو میری تردید کرنی ہوگی لیکن اگر آپ میری تردید نہیں کریں گے تو ایسا کیوں ہے کہ بلاغت کے ماہرین (مطلق العنان حکمرانوں) کو اپنے کاموں پر فخر نہیں ہوتا جو انھوں نے انجام دیے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ قوت ایک خوبی ہے اور اسی کے ساتھ آپ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جو کام بلا سوچے سمجھے کیا جائے وہ بدی ہے۔

پول: میں یہ مانتا ہوں۔

سقراط: بتائیے کہ کسی ریاست میں بلاغت کے ماہرین یا مطلق العنان حکمرانوں کو عظیم قوت حاصل ہے۔ یہ بات اس وقت تک مانی نہیں جا سکتی جب تک پولس سقراط کی باتوں کی تردید کر کے یہ ثابت نہ کر دے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں اپنی خواہش کے مطابق کرتے ہیں۔

پول: یہ شخص۔

سقراط: میں کہتا ہوں وہ جو چاہتے ہیں نہیں کر سکتے۔ آپ میری تردید کیجیے۔

کیوں آپ نے پہلے یہ نہیں کہا تھا کہ وہی کرتے ہیں جسے بہترین سمجھتے ہیں۔

پولس: میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔

سقراط: تو پھر یقیناً وہ وہی کچھ کرتے ہیں جس کی انھیں تمنا ہوتی ہے۔

پولس: میں اس کا انکار کرتا ہوں۔

سقراط: لیکن وہ، وہ کچھ کرتے ہیں جو ان کی دانست میں بہترین ہے؟

پولس: جی ہاں۔

سقراط: سقراط یہ بات نہایت خوفناک اور بے معنی ہے۔

پولس: پولس آپ کے یہ الفاظ بڑے اچھے ہیں۔ میں آپ کے مخصوص انداز میں یہ بات کہہ رہا ہوں لیکن اگر آپ اس سلسلے میں کوئی سوال پوچھنا چاہتے ہیں تو پوچھیں یا یہ ثابت کیجیے کہ میں غلط کہہ رہا ہوں یا آپ خود اس کا جواب دیں۔

پولس: بہت خوب، چلیے جتنا مجھے معلوم ہے اور جو آپ کا مفہوم ہے اسی کے مطابق جواب دینے کو تیار ہوں۔

سقراط: کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ لوگ وہی کام کرتے ہیں جو وہ چاہتے ہیں یا ان کی خواہش اس سے بھی زیادہ اس مقصد کے حصول کے لیے ہوتی ہے جس کے لیے وہ ایسا عمل کرتے ہیں؟ مثلاً جب وہ کسی طبیب کے مشورے کے مطابق دوا استعمال کرتے ہیں تو کیا وہ اس کڑوی دوا کو پینا چاہتے ہیں یا وہ اسے صحت کے حصول کے لیے پیتے ہیں جس کے لیے وہ دوا تجویز کی گئی ہے۔

پولس: ظاہر ہے صحت کے لیے۔

سقراط: اسی طرح جب لوگ بحری سفر پر نکلتے ہیں یا تجارت کا شغل اختیار کرتے ہیں۔ انھیں اس وقت اس کی خواہش نہیں ہوتی جو وہ کر رہے ہوتے ہیں۔ انھیں کسی بحری سفر کے خطرات مول لینے کی یا تجارت کی زحمت اٹھانے کی تمنا نہیں ہوتی بلکہ وہ دولت کے حصول کے لیے یہ بحری سفر اختیار کرتے ہیں۔

پولس: یقیناً۔

سقراط: یہ بات ہر جگہ صادق نہیں آتی۔ جو شخص کسی شے کے حصول کے لیے کوئی کام کرتا ہے تو یہ اس کی مرضی نہیں ہوتی لیکن وہ اس شے کے لیے یہ کام کرتا ہے جسے وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔

پول: جی ہاں۔

سقراط: اب یہ بتایئے کہ تمام چیزیں یا تو اچھی ہوتی ہیں یا بری یا اس کے بین بین یا نہ ادھر کی نہ اُدھر کی۔

پول: سقراط بات بالکل سچ ہے۔

سقراط: دانائی، صحت، دولت وغیرہ کو آپ اچھا کہیں گے اور ان کی اضداد کو برا کہیں گے۔

پول: یہی کہوں گا۔

سقراط: اور ایسی چیزیں جو نہ تو اچھی ہیں نہ ہی بری بلکہ ان میں کبھی اچھائی پیدا ہو جاتی اور کبھی برائی اور کبھی ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس کی مثال بیٹھنا، چلنا، دوڑنا، کشتی رانی، یا اسی طرح لکڑی، پتھر وغیرہ ہیں، یہی وہ چیزیں ہیں جنھیں آپ نہ اچھا کہتے ہیں نہ برا۔

پول: بالکل درست۔

سقراط: کیا یہ نہ ادھر، نہ اُدھر والے امور کو اچھائی کی غرض سے انجام دیا جاتا ہے یا ان کے نہ ادھر، نہ ادھر ہونے کو خوبی سمجھا جاتا ہے؟

پول: صاف بات ہے کہ نہ ادھر، نہ اُدھر والی اشیا کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔

سقراط: جب ہم چلتے ہیں تو اچھائی کے لیے چلتے ہیں اور یہ سوچتے ہوئے چلنا بڑی اچھی بات ہے اور جب کھڑے ہوتے ہیں تو اچھائی کے لیے۔

پول: جی ہاں۔

سقراط: اور جب ہم کسی کو قتل کرتے ہیں، اسے ریاست بدر کرتے ہیں، اس کے مال واسباب کو لوٹتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے لیے مفید نہیں۔

پول: یقیناً۔

سقراط: جو لوگ ایسے کسی بھی عمل کے مرتکب ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی اچھائی کے لیے ایسا کرتے ہیں۔

پول: جی ہاں۔

سقراط: کیا ہم یہ تسلیم نہیں کر چکے ہیں کہ کسی دوسری شے کے حصول کے لیے کوئی کام کرتے ہیں تو دراصل ہم وہ کام کرنا نہیں چاہتے جو کر رہے ہوتے ہیں۔ بلکہ دوسری شے کی وجہ سے کام کرتے ہیں۔

پول: بہت ہی درست ہے۔

سقراط: گویا ہم صرف کسی کو مارنے، ریاست بدر کرنے، اس کے مال واسباب کو لوٹنے کے لیے ایسا نہیں

کرتے بلکہ ہم وہ کام کرتے ہیں جو ہمارے مفاد میں ہوتے ہیں اور اگر وہ ہمارے مفاد کے منافی ہو تو ہم اس کی تمنا نہیں کرتے۔ کیونکہ آپ کے بقول ہم وہی کچھ کرتے ہیں جو ہمارے مفاد میں ہوتا ہے۔ لیکن جو شے نہ اچھی ہو نہ بری یا صرف بری ہو، ہم اس کی تمنا نہیں کرتے۔ پولس آپ خاموش کیوں ہیں۔ کیا میں درست نہیں کہہ رہا ہوں؟

پولس: آپ درست کہہ رہے ہیں۔

سقراط: اس بات سے ہم یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جب کوئی شخص خواہ وہ مطلق العنان حکمران ہو یا بلاغت کا ماہر کسی دوسرے کو اس خیال سے قتل کرتا ہے، ریاست بدر کرتا ہے یا لوٹتا ہے کہ اس کا یہ کام اس کے مفاد میں ہے اور جب یہ کام درحقیقت اس کے مفاد میں نہیں ہوتا تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ، وہ کام کررہا جسے وہ بہترین تصور کرتا ہے۔

پولس: جی ہاں۔

سقراط: لیکن اگر وہ برا کام کرتا ہے تو کیا وہ وہی کرنا چاہتا ہے؟ آپ بولتے کیوں نہیں؟

پولس: میرے رائے میں نہیں۔

سقراط: لیکن آپ کے خیال کے مطابق اگر عظیم طاقت نیکی ہے تو کیا کسی ریاست میں ایسے فرد کو عظیم طاقت حاصل ہوگی؟

پولس: جی نہیں۔

سقراط: گویا میری یہ بات درست تھی کہ کوئی شخص ریاست میں عظیم طاقت حاصل کیے بغیر بھی نیک کام کر سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ جو چاہتا ہے نہ کرسکے؟

پولس: سقراط یوں لگتا ہے کہ آپ ریاست میں کوئی ایسا کام کرنے کی طاقت حاصل نہیں کرنا چاہتے جسے آپ نیک سمجھتے ہوں بلکہ کرنا ہی نہیں چاہتے۔ آپ جب کسی کو قتل کرتے، لوٹتے، یا قید کرتے ہوئے دیکھتے ہوں گے تو اس پر آپ کو رشک ہوتا ہوگا۔ ارے نہیں۔

سقراط: آپ کا مطلب ہے جائز یا ناجائز طریقے سے۔

پولس: دونوں طرح سے، کیا ہر صورت میں وہ قابل رشک نہیں ہے۔

سقراط: تحمل۔

پولس: تحمل کیوں۔

سقراط: کیونکہ آپ کو ان بدبختوں پر رشک نہیں آنا چاہیے جو قابلِ رشک نہیں ہیں بلکہ ان پر تو صرف ترس ہی آ سکتا ہے۔

پول: تو کیا جن کا میں نے ذکر کیا ہے وہ بد بخت ہیں؟

سقراط: یقیناً وہ ہیں۔

پول: گویا آپ کی رائے میں جو کسی کو قتل کرنا چاہتا ہے، اسے قتل کر دے اور جائز طریقے سے قتل کرے تو وہ قابل رحم اور بد بخت ہے۔

سقراط: جی نہیں، میں یہ بات اس کے بارے میں نہیں کہتا۔ لیکن میرے خیال میں وہ قابل رشک بھی نہیں ہے۔

پول: کیا آپ نے ابھی ابھی یہ نہیں کہا تھا کہ وہ بد بخت ہے؟

سقراط: جی میرے دوست اگر اس نے کسی کو ناجائز بنیاد پر قتل کیا ہو تو اس صورت میں وہ بھی قابل رحم ہے اور اگر اس نے اسے جائز بنیاد پر قتل کیا ہے تو وہ قابل رشک نہیں ہے۔

پول: بہر حال آپ اتنا تو تسلیم کریں گے کہ جو ناجائز بنیاد پر قتل کر دیا جائے وہ بد بخت ہے اور قابل رحم ہے۔

سقراط: پولس اتنا نہیں جتنا وہ شخص جو اسے قتل کرتا ہے اور اتنا بھی نہیں جتنا وہ شخص جو جائز بنیاد پر قتل کر دیا جاتا ہے۔

پول: سقراط بھلا یہ کیا بات ہوئی۔

سقراط: اس کا معاملہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ناانصافی کرنا سب سے بڑی برائی ہے۔

پول: کیا وہ سب سے بڑی برائی ہے؟ کیا ناانصافی کی اذیت برداشت کرنا سب سے بڑی برائی نہیں ہے۔

سقراط: یقیناً نہیں۔

پول: گویا آپ ناانصافی کے مرتکب ہونے کی بجائے اس کی اذیت برداشت کریں گے۔

سقراط: میں دونوں میں سے کچھ بھی برداشت نہیں کروں گا لیکن اگر مجھے دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو ناانصافی برداشت کرلوں گا ناانصافی کا مرتکب نہیں ہوں گا۔

پول: پھر تو آپ مطلق العنان حکمران بننا نہیں چاہتے۔

جی نہیں اگر آپ کا بھی مطلق العنان حکمرانی (Tyranthy) کا مفہوم وہی ہے جو میرا ہے۔

سقراط: میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس کا مفہوم ہے کہ ریاست میں اپنی مرضی کے مطابق ہر وہ کام کرنے

پولس: کی قوت جسے آپ مفید سمجھتے ہوں۔ آپ چاہیں تو قتل کریں یا ملک بدر کریں یا جو چاہے کریں۔

سقراط: میرے محترم دوست میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ کہہ لوں پھر آپ اس کا جواب دیں۔ فرض کریں میں بغل میں خنجر رکھ کر ایک پر ہجوم میدان میں جاتا ہوں اور پولس میں آپ سے کہوں میرے پاس ایک انوکھی طاقت ہے اور مطلق العنان حکمران بن جاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ ان لوگوں میں سے جس کو آپ موت کا مستحق سمجھتے ہیں اسے قتل کر دوں تو جس کو میں قتل کرنا چاہتا ہوں وہ شخص واجب القتل قرار پائے گا۔ اگر میں اس کا سر توڑنا چاہوں یا کپڑے تار تار کرنا چاہوں تو میں یہ کام چشم زدن میں کرلوں گا۔ اس شہر میں مجھے اتنی عظیم طاقت حاصل ہے۔ اگر آپ میری بات کا یقین کرلیں اور میں آپ کو خنجر بھی دکھا دوں تو غالباً یہی جواب دیں گے کہ سقراط اس صورت میں تو کوئی بھی طاقتور بن سکتا ہے۔ وہ جس عمارت کو، ایتھنز کی بندرگاہ کی گودیوں کو اور بیڑوں اور دوسری کشتیوں کو خواہ وہ سرکاری ہوں یا نجی، چاہے تو جلا کر راکھ کر دے لیکن کیا آپ کی بہترین سوچ کے مطابق یہ عظیم طاقت ہے؟

پولس: ایسے کاموں کی وجہ سے یقیناً نہیں۔

سقراط: کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ ایسی طاقت کو ناپسندیدہ کیوں کہتے ہیں؟

پولس: بالکل بتا سکتا ہوں۔

سقراط: کیوں ناپسندیدہ ہے۔

پولس: کیونکہ جن کاموں کو آپ نے اس سے منسوب کیا ہے وہ لائق تعزیر ہیں۔

سقراط: اور تعزیر ایک برائی ہے۔

پولس: یقیناً۔

سقراط: آپ دوبارہ یہ تسلیم کریں گے کہ میرے عزیز دوست عظیم قوت اگر اس کے مفاد میں ہو جائے تو اس کے حامل کے لیے اچھی بات ہوگی اور عظیم قوت کا مفہوم بھی یہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ قوت ایک برائی بن جاتی ہے، طاقت نہیں رہ جاتی۔ آیئے اب ہم اس معاملے پر ایک دوسرے انداز سے نظر ڈالیں۔ قتل، ریاست بدری، مال و اسباب کی لوٹ مار جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں کبھی نیکی ہوتے

ہیں اور کبھی نیکی نہیں ہوتے۔

پول: بجا ارشاد۔

سقراط: کیا ہم مان لیں کہ ہم دونوں اسی بات پر متفق ہیں۔

پول: جی ہاں۔

سقراط: اب ذرا یہ بتائیے کہ آپ انھیں کب اچھا سمجھتے ہیں اور کب برا۔ اس کا معیار کیا ہے؟

پول: سقراط میں یہ سمجھتا ہوں آپ خود اس سوال کا جواب دیں تو مناسب ہوگا۔

سقراط: پولس اچھی بات ہے چونکہ آپ اس سوال کا جواب مجھ سے چاہتے ہیں اس لیے میں تو اتنا کہہ سکتا ہوں جائز ہوں تو نیکی ہے ناجائز ہوں تو بدی۔

پول: سقراط آپ کی تردید کرنا بہت مشکل ہے اور آپ کی اس دلیل کو بچہ بھی رد نہیں کر سکتا؟

سقراط: میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ میری بات کی تردید کر کے مجھے اس احمقانہ خیال سے نجات دلائیں۔ مجھے توقع ہے کہ آپ میری تردید ضرور کریں گے اور ایک دوست کے ساتھ نیکی کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔

پول: سقراط کیوں نہیں میں اس ضمن میں قدیم تاریخ کو نہیں کھنگالوں گا۔ دو چار دن قبل رونما ہونے والے واقعات ہی آپ کی تردید کے لیے کافی ہیں اور یہ ثابت کر دیں گے متعدد افراد جنھوں نے برے کام کیے ہیں خوش و خرم ہیں۔

سقراط: کون سے واقعات۔

پول: غالباً آپ کو علم ہے کہ پرڈیکاس (Perdiccas) کا بیٹا آرکیلاس (Archelaus) آج کل مقدونیہ (Macedonia) کا حکمران ہے۔

سقراط: پولس میں اس معاملے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میری اس سے کوئی جان پہچان نہیں ہے۔

پول: اچھا تو کسی سے ملے بغیر اس کے بارے میں کیا تم فوری طور پر نہیں بتا سکتے کہ وہ خوش ہے یا نہیں۔

سقراط: یقیناً نہیں۔

پول: سقراط پھر تو ظاہر ہے آپ یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ عظیم بادشاہ خوش ہے یا نہیں؟

سقراط: سچی بات بتاتا ہوں مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ علم اور انصاف کے سلسلے میں وہ کیسا ہے۔

پول: بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ کیا مسرت ان ہی امور سے عبارت ہے؟

پولس یقیناً۔ یہ میرا نظریہ ہے کہ جو خواتین اور حضرات شریف اور نیک ہوتے ہیں وہ خوش وخرم بھی

سقراط: ہوتے ہیں اور میری رائے میں ناانصاف اور بدکردار ہمیشہ غمزدہ رہتے ہیں۔

پھر تو آپ کے نظریے کی رو سے آرکیلاس (Archelaus) غمزدہ ہے۔

پولس: جی ہاں میرے دوست اگر وہ بدکردار ہے تو۔

سقراط: میں اس کے بدکردار ہونے سے انکار نہیں کرسکتا۔ کیونکہ جس تخت پر آج وہ متمکن ہے اس کا اسے

پولس: حق نہیں پہنچتا۔ وہ تو پرڈیکاس (Perdiccas) کے بھائی الکیٹاس (Alcetas) کی لونڈی کا بیٹا ہے۔ اگر وہ حق پر ہوتا تو اسے ہمیشہ کے لیے غلام ہی رہنا چاہیے تھا۔ اس طرح وہ آپ کے نظریے کے مطابق خوش وخرم رہتا۔ لیکن اب وہ ناقابلِ بیان حد تک غمزدہ ہے کیونکہ اس سے بہت بڑا جرم سرزد ہوا ہے۔ پہلے اس نے اپنے چچا ال سی ٹاس کو اس بہانے سے اپنے پاس بلایا کہ وہ اس کا تخت و تاج اسے بازیاب کرائے گا جسے پرڈیکاس نے غصب کرلیا تھا۔ اس نے ایک ضیافت کا اہتمام کر کے اسے اور اس کے بیٹے سکندر (Alexander) کو جو اس کا چچازاد اور ہم عمر بھی تھا خوب شراب پلائی۔ مدہوشی کے عالم میں دونوں کو ایک گھوڑا گاڑی میں پھینک کر دور لے گیا اور دونوں کو قتل کردیا۔ اور دونوں کو راستے سے ہٹا دیا۔ اتنی بڑی بدکرداری کے باوجود اسے کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ سب سے زیادہ غمزدہ انسان ہے۔ اس نے کبھی اظہارِ ندامت نہیں کیا۔ وہ کس طرح؟ میں آپ کو بتاتا ہوں اس کا ایک چھوٹا بھائی تھا جس کی عمر بمشکل سات برس تھی۔ وہ پرڈیکاس (Perdiccas) کا حقیقی بیٹا اور تخت کا حقیقی وارث تھا۔ آرکیلاس (Archelaus) اس کی ایسی پرورش اور تربیت نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ اسے حکمرانی سونپ دے گا۔ وہ اسے خوشی تصور نہیں کرتا تھا۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اس نے اسے کنوئیں میں پھینک کر غرق کرڈالا اور اس کی ماں قلوپطرا (Cleopatra) کو بتایا کہ بچہ بطخ کا پیچھا کرتے ہوئے کنوئیں میں جا گرا اور جانبر نہ ہوسکا تو یوں آپ کے خیال کے مطابق وہ اس وقت مقدونیہ بھر میں سب سے بڑا مجرم ہے اور وہ بالکل خوش وخرم نہیں بلکہ غمزدہ ترین شخص سمجھا جائے گا۔ میری رائے میں اہل ایتھنز کی اکثریت جن میں آپ سرفہرست ہوں گے، کوئی بھی مقدونیہ کا باشندہ آرکیلاس نہیں بننا چاہتا ہوگا۔

سقراط: پولس میں نے ابتدا میں آپ کی اس لیے تحسین کی تھی۔ آپ اہل منطق نہیں بلکہ بلاغت کے ماہر ہیں۔ بھلا یہ کون سی دلیل ہوئی جس کی بنا پر آپ نے کہا کہ ایک بچہ بھی میرے بیان کی تردید کرسکتا

ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ناانصاف انسان خوش نہیں رہتا۔ عزیز دوست بتایئے بھلا اس بات کی تردید کہاں ہوئی اور کیسے ہوئی۔ میں آپ کی دلیل کا ایک لفظ بھی تسلیم نہیں کرتا۔

پول: یہ آپ کر بھی نہیں سکتے۔ اس کے لیے آپ کو میری ہی طرح سوچنا ہوگا۔

سقراط: میرے سادہ لوح دوست بات یہ نہیں ہے آپ کسی عدالت میں بلاغت کے ماہر کی طرح میری تردید کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں ایک فریق یہ سمجھ لیتا ہے کہ بلاغت کے الزامات کے ثبوت کے لیے اچھی شہرت والے متعدد گواہ کافی ہوں گے جبکہ فریق ثانی کا محض ایک گواہ ہوتا ہے بلکہ وہ بھی نہیں۔ لیکن جہاں حقیقت حال معلوم کرنا ہو وہاں اس طرح کے ثبوت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ کسی کی سچائی متعدد بظاہر اچھی شہرت والے گواہوں کی بڑی تعداد کے بوجھ تلے دب جائے۔ آپ جو بھی دلیل لائیں گے خواہ ایتھنز والے ہوں یا باہر والے سب ہی اس کی حمایت کریں گے۔ اگر آپ میرے بیان کی تردید کے لیے شاہد بلانا چاہیں تو آپ نکیاس (Nicias) ولد نکریٹس (Niceratus) کو پیش کر سکتے ہیں اور اس کے ان بھائیوں کو بھی اس کے ہمراہ لایئے جنھوں نے ڈائیونائیسس (Dionysus) کے احاطے میں تین ٹانگوں والی نشستیں نصب کرائی ہیں یا آپ سکیلیئس (Scellius) کے بیٹے ارسٹوکریٹس (Aristocrates) کو بھی بلائیں جس نے ڈیلفی (Delphi) میں معبد میں عظیم چڑھاوا چڑھا کر شہرت پائی ہے۔ آپ چاہیں تو پیریکلس (Pericles) کو مع اہل وعیال یا ایتھنز کے مشاہیر کے پورے خاندانوں کو مدعو کر لیں۔ وہ سب آپ کا ساتھ دیں گے۔ میں ہی تنہا رہ جاؤں گا جو آپ سے متفق نہیں ہوں گا۔

لیکن میرے خیال میں ایسی کوئی قابل ذکر بات میں کر ہی نہیں سکتا جب تک میں آپ کو اپنے الفاظ کا گواہ نہ بنالوں۔ یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب آپ بھی اپنے الفاظ کا شاہد مجھے مقرر کریں۔ دیگر افراد کی فکر نہ کریں کیونکہ کسی بات کی تردید کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک وہ جو آپ کا ہے دوسرا وہ جو تمام دنیا کا ہے لیکن میرا طریقہ ان سے مختلف ہے۔ آیئے ان کا موازنہ کر لیں اور دیکھیں کہ ان کا اختلاف کس نوعیت کا ہے کیونکہ ہم ایسے امور پر بحث کر رہے ہیں جن کا علم باعث تکریم اور لاعلمی باعث تحقیر ہے۔ اصل مسئلہ یہ معلوم کرنا ہے کہ مسرت اور کلفت کا علم ہونا چاہیے یا نہیں اور کون سا علم شریف تر ہوگا یا کون سی لاعلمی اس سے زیادہ گھٹیا ہوگی۔ اس لیے پہلے میں آپ سے یہ پوچھوں گا کہ کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ جو شخص بے انصاف ہے اور بے انصافیوں کا مرتکب ہوتا

رہتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ آرکیلاس(Archelaus) کو جو کہ بے انصاف ہے ایک خوش وخرم شخص سمجھتے ہیں۔ یہی آپ کی رائے ہے؟

پول: بالکل ایسا ہی ہے۔

سقراط: لیکن میں کہتا ہوں یہ ناممکنات میں سے ہے۔ یہاں ایک ایسا نکتہ ہے جو باعث نزاع باہمی ہے۔ بہت خوب۔ کیا آپ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے اور مکافات عمل کا سزاوار ہو تو کیا وہ پھر بھی خوش رہے گا؟

پول: بالکل نہیں۔ اس صورت میں تو وہ سب سے زیادہ رنجیدہ ہوگا۔

سقراط: اس کے برعکس اگر آپ کی رائے میں ناانصافی کا مرتکب سزا نہ پائے تو وہ خوش وخرم رہے گا؟

پول: جی ہاں۔

سقراط: پولس میرے خیال سے ناانصاف یا ناانصافی کا مرتکب ہر صورت میں رنج والم میں مبتلا رہے گا۔ دیوتاؤں اور انسانوں کے ہاتھوں سزا پانے کی صورت میں کمتر رنجیدہ اور نہ پانے کی صورت میں زیادہ رنجیدہ۔

پول: سقراط آپ عجیب وغریب نظریے کے حامل ہیں۔

سقراط: میرے دوست میں آپ کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ دوست کی حیثیت سے میں آپ کا احترام کرتا ہوں ہم اور آپ جن نکات پر بحث کر رہے ہیں وہ یہی ہیں۔ یہی ہیں ناں۔ میں کہہ رہا تھا کہ ناانصافی کا مرتکب ہونا اس کا شکار ہونے سے کہیں برا ہے۔

پول: بالکل ایسا ہی ہے۔

سقراط: اور آپ نے اس کے برعکس بات کی؟

پول: جی ہاں۔

سقراط: میں نے یہ بھی کہا تھا کہ بدکردار نہایت ہی غمگین رہتے ہیں لیکن آپ نے اس کی تردید کی تھی۔

پول: دیوتا زیوس کی قسم! میں نے کہا تھا۔

سقراط: پولس یہی آپ کی رائے ہے ناں۔

پول: جی ہاں اور اب بھی میرا گمان ہے کہ میری بات درست ہے۔

سقراط: آپ نے مزید یہ بھی کہا تھا کہ بدکردار فرد اگر سزا نہ پائے تو خوش وخرم رہتا ہے۔

پول: جی کہا تھا۔

سقراط: لیکن میں زوردار طریقے سے کہتا ہوں کہ وہ سب سے زیادہ رنجیدہ رہتا ہے لیکن جن کو سزا مل جائے وہ اس سے کم رنجیدہ ہوتے ہیں۔ کیا آپ اس رائے کی بھی تردید کر سکتے ہیں۔

پول: دوسروں کے مقابلے میں اس کا رد کرنا کہیں زیادہ دشوار ہے۔

سقراط: پولس بلکہ یہ امر ناممکن ہے کیونکہ حق کی تردید کون کر سکتا ہے؟

پول: آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ اگر کسی کو آپ ناجائز طور پر مطلق العنان حکمران بنتا ہوا دیکھیں تو اسے شکنجے میں کس دینا چاہیے۔ اس کی ناک اور کان کاٹ دیں۔ اس کی آنکھیں نکال کر جلا دیں اسے ہر قسم کی جسمانی اذیت دینے کے بعد اور اس کے اہل و عیال کے ساتھ بھی ایسا سلوک کریں۔ اس کے جسم میں میخیں ٹھونک دیں۔ بدن کو گرم سلاخوں سے داغیں یا اسے زندہ نذرِ آتش کر دیں تو کیا یہ سب کچھ برداشت کرنے سے وہ خوش رہے گا یا یہ کہ جب وہ فرار ہو کر مطلق العنان حکمران بن کر ساری عمر جو کچھ جی میں آئے گا کرتا رہے گا۔ حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہوگی۔ اپنی رعایا اور دوسروں کی تحسین اور رشک کا مرکز بنے گا؟ کیا وہ پہلی صورت میں خوش اور دوسری میں غمگین و غضبناک ہوگا؟ کیا آپ کا اشارہ اسی ناقابلِ تردید تضاد کی جانب ہے؟

سقراط: میرے قابلِ احترام پولس! آپ نے ایک بار پھر تردید کرنے کے بجائے کہا کہ آپ ادھر اُدھر کی ہانک رہے ہیں۔ ابھی تو آپ میرے خلاف گواہ طلب کر رہے تھے۔ ذرا میری یادداشت کو تازہ کرنے کے لیے یہ بتایئے کہ آپ نے یہی کہا ہے نا کہ مطلق العنان بننے کی ناجائز کوشش میں۔

پول: بالکل کہا ہے۔

سقراط: ایسی صورت میں مجھے یہی کہنا ہے کہ نہ تو وہ خوش ہوگا جو ناجائز طور پر مطلق العنان بن جاتا ہے۔ نہ وہ شخص جو اس کی کوشش کی پاداش میں اذیتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن جو مطلق العنان بن جاتا ہے وہ ان دونوں میں سے رنجیدہ تر ہوگا۔ پولس کیا آپ ہنس رہے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ یہ انوکھی قسم کی تردید ہو کہ کسی کی بات کا جواب دینے کی بجائے محض اس پر ہنس دیا جائے۔

پول: سقراط کیا آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ میں آپ کی بڑی حد تک تردید کر چکا ہوں۔ آپ بات ہی ایسی کرتے ہیں جس کی تردید کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اہلِ محفل سے پوچھ لیجیے۔

سقراط: پولس میں عوامی آدمی نہیں ہوں۔ ابھی گزشتہ برس سے اپنے قبیلے کے سردار ہونے کے ناطے جب میرا قبیلہ پرائی ٹینز (Prytanes) کے فرائض انجام دے رہا تھا اور مجھے ان سے رائے لینا تھی تو یہ کام میں نے اتنے بھونڈے طریقے سے شروع کیا کہ لوگ ہنسنے لگے۔ میں اس وقت بھی بری طرح ناکام ہوا تھا۔ برائے مہربانی مجھے دوبارہ اسی طرح کی آزمائش میں نہ ڈالیں لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ اگر آپ کے پاس تعداد کے سوا اور کوئی دوسری دلیل نہیں ہے تو میں اپنی باری لینے کے لیے تیار ہوں۔ کیا آپ دلیلوں کو اسی طرح پرکھیں گے جیسا کہ ضرورت ہے۔ کیونکہ میں اپنے الفاظ کی صداقت کی شدت کو ثابت کرنے کے لیے صرف ایک ہی گواہ پیش کرسکتا ہوں اور وہ وہی ہستی ہے جس سے میں بحث کررہا ہوں۔ اس کی طرف سے جو آزمائش آئے گی میں اس کا مقابلہ کرنا جانتا ہوں۔ لیکن اہل محفل سے میرا کیا واسطہ، میں تو ان سے مخاطب بھی نہیں ہوں۔ اچھا یہ بتائیے کیا آپ اپنی باری آنے پر میری باتوں کا جواب دیں گے اور اپنے الفاظ کی صداقت پرکھیں گے؟ کیوں کہ میرے خیال میں ہر شخص یہ بات مانتا ہے کہ ظلم کا ارتکاب اسے برداشت کرنے اور سزا سے بچ جانے کے مقابلے میں سزا پانے سے کہیں زیادہ برا ہے۔

پولس: ان میں سے کوئی بات بھی میں کیا کوئی بھی نہیں کہے گا۔ کیا آپ خود ناانصافی نہیں کریں گے بلکہ صرف برداشت کرلیں گے؟

سقراط: جی ہاں میں اور آپ تو کیا بلکہ ہر انسان ایسا ہی کرے گا۔

پولس: جی نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس نہ میں، نہ آپ، نہ کوئی اور بندہ بشر ایسا کرے گا۔

سقراط: لیکن کیا آپ جواب دیں گے؟

پولس: کیوں نہیں یقیناً جواب دوں گا۔ کیونکہ میں آپ کی باتیں سننے کے لیے سخت بے چین ہوں۔

سقراط: اچھا یہ بتائیے کہ ہوسکتا ہے آپ کو علم بھی ہو جائے اسی لیے چلیے نئے سرے سے بات شروع کرتے ہیں۔ پولس یہ بتائیے کہ آپ کی رائے میں ان دونوں میں بدتر کیا ہے، بے انصافی کرنا یا اسے برداشت کرنا؟

پولس: میں تو کہوں گا برداشت کرنا بدترین بات ہے۔

سقراط: اب بتاؤ کہ ان میں سے کون سی صورت موجب ذلت ہے؟

پولس: ناانصافی کا مرتکب ہونا۔

سقراط:۔ اور بڑی تذلیل، بڑی برائی ہے۔

پول:۔ یقیناً نہیں۔

سقراط: میں آپ سے ایک سوال پوچھوں گا۔ جب جسم، رنگ، شکل، آواز کسی ادارہ یا کسی شے کو حسین کہتے ہیں تو انھیں کسی نہ کسی معیار کے مطابق حسین کہتے ہوں گے، مثلاً جسم اسی نسبت سے خوبصورت ہوتا ہے جتنا وہ کارآمد ہو یا ان کے نظارے سے ناظر کو حظ حاصل ہوتا ہے۔ کیا آپ ذاتی حسن کا کوئی معیار بیان کر سکتے ہیں؟

پول: جی نہیں میرے لیے ممکن نہیں۔

سقراط: اسی طرح آپ عموماً شکلوں اور رنگوں کے بارے میں بھی کہیں گے کہ وہ خوبصورت ہیں کیونکہ ان کے دیکھنے سے دل باغ باغ ہو جاتا ہے یا وہ مفید ہیں یا دونوں ہی ہیں۔

پول: بالکل یہی وجہ ہوگی۔

سقراط: اور آپ اسی بنیاد پر آواز اور موسیقی کو بھی حسین کہیں گے؟

پول: جی ہاں۔ اسی بنیاد پر۔

سقراط: قوانین اور اداروں میں اس وقت تک حسن نہیں پایا جاتا جب تک وہ مفید یا خوشگوار یا دونوں نہ ہوں۔

پول: میں ایسا نہیں سوچتا۔

سقراط: اور کیا یہی بات علم کے حسن پر بھی صادق نہیں آتی؟

پول: سقراط میں تسلیم کرتا ہوں کہ حسن کے پرکھنے کے لیے آپ کا مسرت اور افادیت کا پیمانہ مجھے منظور ہے۔

سقراط: اسی طرح بدصورتی اور ذلت ناپنے کا پیمانہ اس کے برعکس دکھ اور ضرر ہوگا۔

پول: یقیناً۔

سقراط: ، ، حسین اشیا میں سے ایک حسین تر ہوتی ہے تو پھر اس اضافی حسن کو معلوم کرنے کے معیار کا ایک پر یا دونوں پر اطلاق ہوگا۔ مطلب ہے کہ مسرت پر، افادیت پر یا دونوں پر؟

پول: بجا ارشاد۔

سقراط: اسی طرح، دو بدصورت اشیا میں سے جب کوئی ایک بدصورتی یا اہانت میں فوقیت لے جاتی ہے تو

ہوتا ہے۔

دراصل اسے دکھ، ضرر میں تفوق حاصل ہوتا ہے۔

جی ہاں۔

پولس: لیکن آپ نے زیادتی کرنے اور اسے برداشت کرنے کے بارے میں ابھی ابھی [illegible]

سقراط: اظہار کیا تھا وہ کیا تھی؟ کیا آپ نے یہ نہیں کہا تھا کہ زیادتی برداشت کرنا زیادہ [illegible]

کرنا زیادہ ذلت آمیز ہے؟

میں نے کہا تھا۔

پولس: اگر زیادتی کرنا زیادتی برداشت کرنے سے زیادہ اہانت انگیز ہے تو زیادہ [illegible]

سقراط: تکلیف دہ بھی ہوگا اور اس صورت حال میں دکھ اور کلفت یا دونوں ہی بہت زیادہ [illegible]

اس سے یہی نتیجہ نہیں نکلتا؟

پولس: کیوں نہیں۔

سقراط: پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ ناانصافی کے ارتکاب کے نتیجے میں جو کلفت [illegible]

ناقابل برداشت ہوتی ہے یا نہیں۔ کیا ضرر پہنچانے والا ضرر پانے والے سے زیادہ تکلیف

برداشت کرتا ہے؟

پولس: سقراط ایسا تو یقیناً نہیں ہے۔

سقراط: پھر تو انھیں درد میں فوقیت حاصل نہیں ہوتی؟

پولس: نہیں۔

سقراط: اگر فوقیت درد میں حاصل نہیں ہے تو دونوں ہی میں نہیں؟

پولس: یقیناً نہیں۔

سقراط: پھر تو انھیں دوسری صورت میں فوقیت حاصل ہے؟

پولس: جی ہاں۔

سقراط: گویا بدی میں۔

پولس: درست۔

سقراط: اس طرح ناانصافی کے ارتکاب میں بدی بہت زیادہ ہوگی اور ناانصافی برداشت کرنے سے کہیں

بڑھ کر ہوگی۔

پول: ظاہر ہے۔

سقراط: لیکن کیا آپ ہی نہیں بلکہ پوری دنیا اس بات پر متفق نہیں تھی کہ ناانصافی کا ارتکاب اسے برداشت کرنے سے کہیں زیادہ اہانت انگیز ہے۔

پول: جی ہاں۔

سقراط: اب پتا چلا کہ یہ تو بدتر ہے۔

پول: درست ہے۔

سقراط: یہ بتایئے کہ کیا آپ کمتر برائی یا کمتر اہانت کے مقابلے میں عظیم تر برائی یا عظیم تر اہانت کو ترجیح دیں گے؟ پولس اس کا جواب دیں ڈریں نہیں آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ آپ اپنا معاملہ دلیل کے ماہر طبیب کے شفا بخش ہاتھوں کے سپرد کر دیجیے۔ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ آپ ہاں یا نہیں جو چاہیں فوراً کہہ دیں۔

پول: میں تو ''نہیں'' کہوں گا۔

سقراط: کیا کوئی ایسا ہے جو چھوٹی برائی کے مقابلے میں بڑی برائی کو ترجیح دیتا ہو؟

پول: سقراط اس طرح کی دلیل کے پیش نظر کوئی بھی ترجیح نہیں دے گا۔

سقراط: پولس گویا میں نے درست کہا تھا کہ نہ میں، نہ آپ، نہ کوئی بھی اور آدمی ایسا نہیں ہوگا جو ناانصافی برداشت کرنے کی بجائے اس کا مرتکب ہو کیونکہ ناانصافی کا ارتکاب ان دونوں میں کہیں بڑی برائی ہے۔

پول: نتیجہ تو یہی نکلتا ہے۔

سقراط: پولس تم خود دیکھ لو جب آپ دونوں قسم کے نتائج کا موزانہ کرتے ہیں تو وہ کتنے مختلف نظر آتے ہیں۔ سوائے میرے تمام انسان آپ ہی کی طرح سوچتے ہیں۔ لیکن تنہا آپ کا متفق ہونا اور شہادت دینا میرے لیے کافی ہے۔ مجھے کسی اور سے کیا لینا ہے۔ مجھے آپ ہی کی رائے سے غرض ہے دوسروں سے نہیں۔ اس ضمن میں اتنا ہی کافی ہے۔ چلیے اب دوسرے سوال کی جانب آتے ہیں۔ یعنی کیا کسی خطا کار کے لیے آپ کی رائے کے مطابق سزا برداشت کرنا عظیم ترین برائی ہے یا کیا سزا سے فرار ہو جانا اس سے بڑی برائی نہیں ہے۔ یہ میری رائے ہے۔ ذرا غور کیجیے آپ بھی کہیں گے کہ خطا کا ارتکاب کرنے کے بعد سزا پانا جائز طور پر اصلاح حاصل کرنے کا دوسرا

نام ہے۔

ایسا ہی کہوں گا۔

پول: کیا آپ یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ تمام جائز باتیں جہاں تک وہ جائز ہیں، لائق احترام ہیں۔ آپ

سقراط: ذرا غور کر کے جواب عنایت فرمائیں۔

پول: ہاں سقراط! میرے خیال سے ہیں۔

سقراط: ذرا پھر غور کیجیے جہاں کہیں کسی بیماری کا عامل (جراثیم) ہوگا کیا وہاں کوئی مریض (معمول) نہ ہوگا؟

پول: میں بھی یہی کہتا ہوں کہ ضرور ہوگا۔

سقراط: کیا معمول کو عامل کے عمل کا خمیازہ نہیں بھگتنا پڑے گا؟ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مثلاً اگر کوئی شخص وار کرتا ہے تو کوئی تو ہوگا جس پر یہ وار کیا جائے گا؟

پول: جی ہاں۔

سقراط: اور اگر وار کرنے والا زور سے یا تیزی سے وار کرتا ہے تو مفعول پر بھی زور سے یا تیزی سے وار چلے گا۔

پول: درست۔

سقراط: اور جس پر وار کیا گیا ہے اس کی اذیت اسی نسبت سے ہوگی جس طرح سے وار کرنے والے نے وار کیا ہو۔

پول: جی ہاں۔

سقراط: اگر کوئی آگ لگاتا ہے تو کوئی شے تو ہوگی جو جلے گی۔

پول: یقیناً۔

سقراط: اور اگر اسے اتنی تیزی سے جلایا جائے کہ اس کی تکلیف میں اضافہ ہو تو جو شے جل رہی ہے وہ اسی طرح جلے گی۔ (یعنی اس کی تکلیف میں شدت آئے گی)

پول: سچ ہے۔

سقراط: اگر کسی چیز کو کاٹا جائے تو بھی سابقہ دلیل معتبر ہوگی؟ یعنی کوئی تو ایسی چیز ہوگی جسے کاٹا جا رہا ہے؟

پول: جی ہاں

سقراط: اور اگر کاٹنے کا عمل گہرا، بڑا اور تکلیف دہ ہو تو زخم بھی اسی قسم کا ہوگا۔

پول: صاف ظاہر ہے۔

سقراط: گویا آپ اس عمومی نظریے سے متفق ہیں جسے میں ابھی بیان کر رہا تھا کہ معمول پر قائم شدہ اثر عامل کے عمل کے مطابق ہوتا ہے۔

پول: میں تسلیم کرتا ہوں۔

سقراط: آپ نے یہ تسلیم کر لیا ہے تو میں پوچھتا ہوں سزا برداشت کرنا عمل ہے یا اس کا اثر؟ (یعنی علت ہے یا معلول)

پول: سقراط یہ اس کا اثر ہے اس میں کسی شک کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

سقراط: اور اثر ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی عامل بھی تو ہوگا نا؟

پول: سقراط کیوں نہیں۔ عامل سزا دینے والا ہوگا۔

سقراط: اور جو سزا دیتا ہے وہ جائز طور پر سزا دیتا ہے۔

پول: جی ہاں۔

سقراط: اس طرح اس کا عمل انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔

پول: انصاف پر ہی مبنی ہوتا ہے۔

سقراط: گویا جس شخص کو سزا دی جاتی ہے وہ پاداش کے لیے اس کا سزاوار ہوتا ہے۔

پول: ظاہر ہے۔

سقراط: جو امر انصاف پر مبنی ہوتا ہے اسے ذی وقار (باعزت) مانا جاتا ہے؟

پول: یقیناً۔

سقراط: اس صورت میں سزا دینے والا جو کرتا ہے وہ بھی معزز ہے اور سزا پانے والا جو برداشت کرتا ہے وہ بھی۔

پول: بجا ارشاد۔

سقراط: جو بات باوقار ہوتی ہے وہ اچھی ہوتی ہے کیونکہ قدر و منزلت اور وقار کی حامل باتیں یا تو خوشگوار ہوتی ہیں یا مفید۔

پول: اس میں کیا شک ہے۔

سقراط: گویا کہ جسے سزا ملتی ہے وہ نیکی اور اچھائی کو برداشت کرتا ہے۔

پولس: بالکل درست ہے۔

سقراط: یعنی اسے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

پولس: جی ہاں۔

سقراط: کیا میں یہ سمجھ لوں کہ "مفید" کا وہی مفہوم آپ کا بھی ہے جو میرا ہے۔ میرا مطلب تو یہ ہے کہ جسے جائز طور پر سزا ملتی ہے اس کی روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔

پولس: یقیناً۔

سقراط: گویا سزا پانے والا اپنی روح کی برائیوں سے نجات پا جاتا ہے؟

پولس: جی ہاں۔

سقراط: تو کیا اس طرح اسے عظیم ترین خرابی سے نجات نہیں مل جاتی؟ اس معاملے کو یوں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ جہاں تک کسی کی دولت کا تعلق ہے۔ اس میں اس کی غربت سے بڑھ کر کوئی اور خرابی نہیں ہوتی؟

پولس: جی ہاں اس سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوتی۔

سقراط: جہاں تک انسانی جسم کا تعلق ہے آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں سب سے بڑی خرابی نقاہت، بیماری اور بدصورتی ہوتی ہے۔

پولس: میں بھی یہی کہتا ہوں۔

سقراط: کیا آپ یہ نہیں سوچتے کہ روح میں بھی اسی طرح کی خامیاں ہوتی ہیں۔

پولس: اس میں کیا شک ہے۔

سقراط: ان میں بھی ناانصافی، لاعلمی اور بزدلی وغیرہ کو شمار کر سکتے ہیں۔

پولس: یقیناً۔

سقراط: یعنی جسم، ذہن اور مال و دولت تینوں میں ناانصافی، بیماری اور غربت جیسی ایک ہی طرح کی خامیاں پائی جاتی ہیں۔

پولس: درست۔

سقراط: ان میں سے کون سی خامی سب سے زیادہ باعث تحقیر اور ذلت آمیز ہے۔ کیا ان میں سب سے

زیادہ تحقیر انگیز ناانصافی نہیں ہے جو روح کی عمومی خرابی ہے۔

پول: جی یہی سب سے بڑی خرابی ہے۔

سقراط: اور جب یہ سب سے زیادہ تحقیر آمیز ہے تو بدترین بھی ہے۔

پول: سقراط۔آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔

سقراط: میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جو بات سب سے زیادہ تحقیر انگیز ہوتی ہے اسے اس سے قبل ہم سب سے زیادہ تکلیف دہ، مضر یا دونوں تسلیم کر چکے ہیں۔

پول: یقیناً۔

سقراط: اور اب ہم نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ناانصافی اور روح کی دیگر خرابیاں سب سے زیادہ تحقیر کا باعث ہوتی ہیں۔

پول: یہ تو تسلیم ہے۔

سقراط: یہ سب سے زیادہ باعثِ تحقیر ہوتی ہیں کیونکہ یہ سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔وہ انتہائی شدید اذیت پیدا کرتی ہیں یا مضر ہوتی ہیں یا دونوں ہی۔

پول: یقیناً۔

سقراط: اس طرح غریب اور بیمار ہونے کے مقابلے میں ناانصاف، غیر محتاط، بزدل اور لاعلم ہونا زیادہ تکلیف دہ ہے۔

پول: سقراط ایسا نہیں ہے۔آپ کی اس دلیل سے تکلیف دہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

سقراط: تو پھر آپ کی دلیل کے مطابق اگر وہ زیادہ باعثِ تکلیف نہیں ہے تو روح کی خرابی تمام خرابیوں سے زیادہ باعثِ تحقیر ہوئی اور تحقیر میں اضافے کا سبب روح کی کوئی نہ کوئی زیادتی، غیر معمولی ضرر رسانی ہوتی ہے۔

پول: ظاہر ہے۔

سقراط: اور جو بات ضرر رسانی میں بازی لے جائے وہ سب سے بڑی خرابی ہوگی۔

پول: جی ہاں۔

سقراط: یہ بتائیے کہ وہ کون سا فن ہے جس سے ہم غربت سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔کیا دولت حاصل کرنے کے بعد نہیں؟

پول: جی ہاں۔

سقراط: اور کون سا فن ہمیں بیماری سے نجات دلاتا ہے۔ کیا وہ طبابت کا فن نہیں ہے۔

پول: بالکل درست ہے۔

سقراط: اور کون سا فن ہمیں برائیوں اور ناانصافی سے نجات دلاتا ہے؟ اگر آپ اس کا فوری جواب نہیں دے سکتے تو اپنے دل سے پوچھیے کہ جب آپ بیمار پڑتے ہیں تو کہاں جاتے ہیں۔ ہم انھیں کس کے پاس لے جاتے ہیں؟

پول: سقراط طبیب کے پاس اور کہاں۔

سقراط: ہم بے انصاف اور اعتدال ذات سے بے بہرہ فرد کو کس کے پاس لے جاتے ہیں۔

پول: آپ کا مطلب ہے منصف کے پاس۔

سقراط: جو کہ انہیں سزا دیتے ہیں؟

پول: جی ہاں۔

سقراط: جو افراد انھیں سزا دیتے ہیں کیا وہ قانون کے لگے بندھے ضابطوں پر عمل نہیں کرتے؟

پول: ظاہر ہے کرتے ہیں۔

سقراط: گویا دولت پیدا کرنے کا فن انسان کو غربت سے، طبابت سے، امراض سے، اور انصاف سے، ناانصافی سے اور بے اعتدالی سے نجات دلاتا ہے۔

پول: یہ بھی ظاہر ہے۔

سقراط: آپ بتائیے کہ ان تینوں میں سے عمدہ ترین کون سا فن ہے۔

پول: آپ ذرا انھیں بیان کریں۔

سقراط: دولت پیدا کرنا، طبابت اور انصاف۔

پول: انصاف دیگر دو سے کہیں زیادہ افضل ہے۔

سقراط: اور اگر انصاف افضل ترین ہے تو اسے سب سے زیادہ مسرت، فائدہ یا دونوں کا باعث بھی ہونا چاہیے۔

پول: جی ہاں۔

سقراط: لیکن کیا شفایابی ایک پُرمسرت بات ہے؟ اور کیا جو شفایافتہ ہیں وہ خوش رہتے ہیں؟

پول: میرے خیال سے نہیں۔

سقراط: کیا یہ مفید ہے؟

پول: مفید ہے۔

سقراط: اس لیے کہ مریض ایک بہت بڑی اذیت سے نجات پا جاتا ہے اور یہ درد برداشت کرنے ہی کا انعام ہے کہ شفا مل جاتی ہے۔

پول: یقیناً۔

سقراط: تو کیا جس کی صحت کبھی نہیں بگڑتی، وہ اس سے زیادہ خوش نہیں رہتا جسے شفا حاصل ہوتی ہے؟

پول: ظاہر ہے وہی جس کی صحت کبھی نہیں بگڑتی۔

سقراط: جی ہاں کیوں کہ مسرت کسی برائی سے نجات نہیں بلکہ اس بدی سے ہمیشہ دور رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔

پول: درست ہے۔

سقراط: مثال کے طور پر دو ایسے آدمیوں کو لے لیجیے جن میں کسی نہ کسی قسم کی جسمانی خرابی موجود ہے۔ ان میں ایک کو شفا ہو جاتی ہے اور بیماری دور ہو جاتی ہے۔ دوسرے کو شفا نہیں ملتی اور مرض بدستور باقی رہتا ہے۔ ان میں سے کون بدحال تر رہے گا؟

پول: ظاہر ہے وہ جو شفایاب نہ ہو سکا۔

سقراط: اچھا یہ بتایئے، کیا وہ سزا جس کا ہم نے ذکر کیا تھا سب سے بڑی خرابی یعنی بدی سے نجات نہیں دلاتی؟

پول: سچ ہے۔

سقراط: انصاف سزا دے کر ہمیں بہتر منصف مزاج بناتا ہے۔ کیا یہ بدی کے لیے بمنزلہ دوا کے نہیں ہے؟

پول: ضرور ہے۔

سقراط: جس کی روح ہر بدی سے مبرّا ہو وہ مسرت کے پیمانے میں پہلے درجے پر ہے۔ کیونکہ اسی کو سب سے بڑی بدی سمجھا جاتا ہے۔

پول: ظاہر ہے۔

سقراط: اور جو بدی سے نجات حاصل کرے وہ دوسرے درجے پر ہے؟

پولس: درست ہے۔

سقراط: گویا وہ جس کی سرزنش کی جائے، تادیب کی جائے، اور جسے سزا دی جائے۔

پولس: جی ہاں۔

سقراط: اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو نا انصاف ہے اور ناانصافی سے نجات حاصل نہ کرسکا اس کی زندگی نہایت ابتر ہے۔

پولس: یقیناً۔

سقراط: گویا اس کی زندگی نہایت ابتر ہوتی ہے جو گھناؤنے جرم کرتا ہے اور جو سب سے زیادہ نا انصاف ہونے کے باوجود سرزنش، تعزیر اور سزا سے بچا رہتا ہے۔ یہی وہ کارنامہ ہے جو آپ کے قول کے مطابق آرکیلاس اور دیگر جابر و ظالم حکمرانوں اور بلاغت کے ماہرین نے انجام دیا ہے۔

پولس: درست ہے۔

سقراط: میرے دوست کیا ان کے طریقہ کار کا موازنہ اس شخص سے نہیں کیا جا سکتا جو بدترین امراض میں مبتلا ہو اور اپنے جسمانی عوارض کے عوض کسی نہ کسی ترکیب سے طبیبوں کے تکلیف دہ معالجے سے بچ نکلتا ہے اور شفایاب نہیں ہوتا کیونکہ بچوں کی طرح وہ داغے جانے یا چیر پھاڑ سے خوف زدہ ہوتا ہے۔ کیا ان کی صورتحال میں مماثلت نہیں ہے؟

پولس: بجا ارشاد۔

سقراط: یوں معلوم ہوگا کہ جیسے اسے نہ صحت کی ماہیت اور نہ ہی جسمانی قوت کا علم ہو اور پولس اگر ہمارے سابقہ نتائج درست ہیں تو ان کی حالت ایسی ہے کہ جیسے وہ انصاف سے گریز کر رہے ہوں۔ جسے وہ تکلیف دہ امر سمجھ رہے ہیں اور اس سے پیدا ہونے والے فائدے انھیں نظر نہیں آ رہے ہیں۔ انھیں یہ احساس ہی نہیں ہے کہ مریض روح کا ساتھ بیمار جسم کے ساتھ سے کہیں زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے یعنی ایسی روح جو فاسد ہے، گناہ میں ڈوبی ہوئی اور ناپاک و نجس ہے۔ اسی لیے وہ سزا اور سب سے بڑھ کر بدی سے نجات حاصل کرنے سے بچنے کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ وہ اپنے گرد دولت اور دوستوں کا حلقہ فراہم کر لیتے ہیں اور اپنی ترغیب دینے کی صلاحیت کی امکانی حد تک نشو و نما کرتے ہیں۔ لیکن پولس اگر ہم صحیح سمجھ رہے ہیں تو کیا آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس سے کیا نتیجہ برآمد ہو رہا ہے؟ کیا ہم اسی شکل کا نتیجہ اخذ کر لیں؟

پول: جی ہاں! اگر آپ چاہتے ہیں؟

سقراط: کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ناانصافی اور ناانصافی کا ارتکاب سب سے بڑی بدی ہے؟

پول: صاف ظاہر ہے۔

سقراط: مزید برآں کیا سزا برداشت کرنا، اس بدی سے پاک ہونے کا ایک طریقہ نہیں ہے؟

پول: درست ہے۔

سقراط: اور تکلیف برداشت کرنا ایسا عمل ہے جو بدی کو ہمیشہ کے لیے جاری رکھتا ہے؟

پول: جی ہاں۔

سقراط: اس لیے خطا کرنا، بدی کے معیار کے مطابق دوسرے درجے پر ہے لیکن خطا کا ارتکاب کرنا اور سزا نہ پانا اس معیار پر سب سے اول اور بڑی برائی ہے۔

پول: صحیح ہے۔

سقراط: اچھا اب بتاؤ کہ کیا ہم اسی نکتہ پر اختلاف نہیں کر رہے تھے؟ میرے دوست آپ کا خیال تھا کہ آرکیلاس (Archelaus)، خوش ہے کیونکہ وہ بہت بڑا مجرم ہے اور اسے کوئی سزا نہیں ملی ہے۔ اس کے برخلاف، میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس نے یا اس جیسے کسی بھی شخص نے جس نے بھی کوئی خطا کی ہے اور سزا سے بچا رہا ہے وہ سب سے زیادہ دکھی ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ اور یہ بھی کہ ناانصافی کرنے والا اسے برداشت کرنے والے سے کہیں زیادہ دکھی ہوتا ہے اور جو سزا سے گریز کرتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ غمزدہ ہوتا ہے جو اسے برداشت کرتا ہے۔ کیا یہی بات میں نے نہیں کہی تھی؟

پول: کہی تھی۔

سقراط: اور اب یہ ثابت ہو چکا ہے وہی سچ تھی۔

پول: یقیناً۔

سقراط: لیکن پولس اگر یہ بات سچ ہے تو یہ بتائیں کہ اس میں آپ کی عظیم بلاغت کہاں ہے؟ اگر ہم نے ابھی جو کچھ کہا ہے اسے تسلیم بھی کرتے ہیں تو یہ ہر شخص کا فریضہ بنتا ہے کہ وہ خود کو خطا کاری سے محفوظ رکھے ورنہ اسے بہت دکھ برداشت کرنا ہوگا۔

پول: درست ہے۔

سقراط: اور اگر کوئی شخص جس کا وہ خیال رکھتا ہے، غلط کام کرتا ہے تو اسے خود ایسی جگہ جانا چاہیے جہاں فوراً

اس کی سزا اسے مل جائے۔ وہ منصف کے پاس اسی طرح دوڑ کر جائے جس طرح کسی طبیب کے
پاس جاتا ہے تاکہ ناانصافی کا مرض کہیں مزمن نہ ہو جائے اور روح کے ناقابل علاج سرطان کا
شکار نہ ہو جائے۔ اس کا یہ انجام نہ ہونے دیا جائے۔ پولس اگر جن باتوں پر ہم متفق ہو چکے ہیں ان
پر قائم رہیں تو کیا اس کے علاوہ کوئی اور بھی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

پولس: سقراط اس کا تو بس یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

سقراط: پولس اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کسی شخص کی اپنی، اپنے والدین، احباب، اولاد یا وطن کی زیادتیوں پر
معافی چاہنے میں ہمارے لیے بلاغت بالکل ہی کارآمد نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے لیے مفید مطلب
ہوگی جس کی یہ رائے ہو کہ اسے عفو و درگزر کی بجائے دوسروں کے سامنے پہلے خود کو، اس کے بعد
اپنے خاندان کو یا کسی ایسے دوست کو ان کی غلطیوں پر موردِ الزام ٹھہرانا چاہیے۔ لازم ہے کہ وہ تمام
غلطیوں اور کوتاہیوں کو سب کے سامنے پیش کر دے، ان پر پردہ نہ ڈالے تاکہ غلطی کا ارتکاب
کرنے والے کو سزا ملے اور اس کی اصلاح ہو جائے۔ اسے چاہیے کہ وہ اس میں کوتاہی نہ کرے
بلکہ باہمت انسان کی طرح جراح کے نشتر سے چیر پھاڑ یا داغے جانے کے لیے بلا جھجک آمادگی کا
اظہار کرے اور صحت اور نیکی کے حصول کی توقع پر درد اور تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت
کرے۔ جس نے ایسے اعمال انجام دیے ہیں جن کی سزا کوڑے کھانا ہو۔ اسے اس کے لیے تیار
رہنا چاہیے۔ اگر قید و بند ہے تو قید خانے چلا جائے۔ اگر جرمانہ ہے تو اسے ادا کرے، اگر ریاست
بدری ہے تو ریاست بدر ہو جائے، موت ہے تو اسے گلے لگائے۔ اور خود کو اور اپنے عزیز و اقارب
کو جرم کی وجہ سے پیش کرنے میں خود پہل کرے اور اپنی بلاغت کو اسی مقصد کے حصول کے لیے
کام میں لائے تاکہ خود اس کے یا اس کے اقربا کے جرائم کا کھل کر اظہار ہو سکے اور وہ انصاف کے
عمل سے نہ بچ سکیں کیونکہ سب سے بڑا گناہ یہی ہے۔ پولس اسی موقع پر بلاغت مفید ہو سکتی ہے
آپ اس بات پر ہاں کہیں گے یا نہیں؟

پولس: سقراط آپ کی باتیں میرے لیے عجیب و غریب ہیں۔ تاہم ہو سکتا ہے کہ میں آپ کی رائے سے
متفق بھی ہوں۔

سقراط: اگر میری رائے کو جھٹلایا نہیں جاتا تو کیا اس سے یہی نتیجہ نہیں نکلتا۔

پولس: جی ہاں یقیناً۔

سقراط: اور اس کے برعکس نظریہ کے مطابق اگر واقعی ہمارا یہ فریضہ ہے کہ ہم دوسروں کو خواہ وہ دشمن ہوں یا نہیں، ذہنی یا جسمانی اذیت دیں۔ میں اس میں تحفظ خود اختیاری کے امور کو شامل نہیں کرتا تو ضروری ہے کہ میں احتیاط سے کام لوں۔ کیونکہ اگر یہ میرا دشمن اپنے بچاؤ کی خاطر کسی تیسرے شخص کو زخمی کرنے کی کوشش کرے تو میں زبانی اور عملی، ہر طرح سے اسے سزا سے بچانے کی کوشش کروں گا منصف کی عدالت میں حاضری دوں گا۔ اور اگر اسے سزا ملنے کا احتمال ہو تو میں اس کے فرار میں مدد دوں گا تاکہ اسے سزا نہ ملے۔ اور اگر اس نے کچھ رقم چرائی ہے تو میں کوشش کروں گا کہ وہ اسی کے پاس رہے جسے وہ اپنے اوپر خرچ کرے۔ میں اس کام میں مذہب یا انصاف کو خاطر میں نہیں لاؤں گا لیکن اگر وہ کسی ایسے جرم کا مرتکب ہو جس کی سزا موت ہے تو اسے ہلاک ہو جانا چاہیے۔ یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ قیامت تک گناہگار کی حیثیت سے یاد کیا جاتا رہے۔ اور اگر یہ سب کچھ ممکن نہ ہو تو اسے اپنی زندگی کے دن پورے کرنے کی مہلت ملنا چاہیے۔ پولس ایسے ہی مقاصد کے لیے بلاغت کا استعمال کارآمد ہے لیکن اس کے لیے یہ مفید مطلب نہیں، جو ناانصافی کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتا۔ کم از کم ہماری گزشتہ بحث میں ہم نے اس کے لیے کسی اور مفید کام کی نشاندہی نہیں کی تھی۔

کیلی: چیریفون ذرا یہ بتائیے کہ سقراط اس وقت سنجیدہ ہیں یا مذاق کر رہے ہیں۔

چیری: کیلی کلس میں تو یہ کہوں گا کہ سقراط اس وقت بہت ہی زیادہ سنجیدہ ہیں۔ آپ خود ان سے پوچھ لیں۔

کیلی: دیوتاؤں کی قسم میں ضرور پوچھوں گا۔ سقراط ذرا یہ بتائیے کہ آپ واقعی سنجیدہ ہیں یا مذاق کر رہے ہیں کیونکہ اگر آپ سنجیدہ ہیں اور آپ کی بات درست ہے تو کیا اس طرح انسان کی پوری زندگی الٹ پلٹ نہیں ہو جاتی؟ اور کیا ہمارے سارے عمل اس کے برعکس نہیں ہیں جو ہمیں کرنا چاہیے تھا۔

سقراط: کیلی کلس، سنو اگر انسانوں میں چند مشترک جذبات نہ ہوتے، اگرچہ وہ مختلف لوگوں میں مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں، میرا مطلب ہے اگر ہر فرد میں ایسے جذبات ہوں جو دوسروں سے یکسر مختلف ہوں اور مشترک نہ ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اپنے جذبات کا ابلاغ کس طرح کریں گے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ میرے اور آپ کے احساسات مشترک ہیں۔ ہم دونوں محبت کرنے والے ہیں اور دونوں کی محبت کے دو علیحدہ علیحدہ مرکز ہیں۔

مجھے السی بیاڈس ولد کلینیس (Cleinias) اور فلسفہ (علم دوستی) سے اور آپ کو ایتھنز کے ڈیمس اور پائیری لیمپس (Pyrilampes) کے بیٹے ڈیمس سے محبت ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ اپنی تمام ذہانت کے باوجود اپنے محبوب چہیتے کی کسی رائے یا بات کی تردید کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ جیسے وہ بدلتا ہے آپ بھی بدل جاتے ہیں۔ کبھی آگے کبھی پیچھے ایتھنز کے ڈیمس، جب کسی ایسی بات سے انکار کرتا ہے جسے آپ محفل میں بیان کر رہے ہوں تو آپ اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے ہیں۔ آپ پائیری لیمپس کے خوبرو بیٹے ڈیمس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ کیونکہ اپنے محبوب افراد کے الفاظ اور رائے سے اختلاف کی آپ میں ہمت نہیں ہے اور اگر کوئی شخص آپ کی توجہ ان باتوں کی طرف دلاتا ہے جو آپ ان سے متاثر ہو کر کہہ ڈالتے ہیں۔ تو آپ دیانتدار ہونے کی صورت میں غالباً یہی جواب دیں گے کہ آپ اپنے چہیتوں کی باتیں جب تک انھیں منع نہ کیا جائے تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ آپ اسی وقت خاموش ہوں گے جب وہ چپ ہو جائیں۔ آپ کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ میرے الفاظ بھی کسی کی صدائے بازگشت ہیں۔ اس لیے آپ حیران نہ ہوں۔ لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں خاموش ہو جاؤں تو فلسفہ کو خاموش کر دیجیے۔ جو میرا محبوب ہے ہمیشہ مجھ سے کچھ نہ کچھ کہتا رہتا ہے اور میں وہی سب کچھ آپ سے بیان کر دیتا ہوں۔ وہ میرے دوسرے محبوب کی طرح متلون مزاج نہیں ہے کیوں کہ کلینیس کا برخوردار آج ایک بات کہتا ہے کل دوسری لیکن فلسفہ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ میرا یہ وہی استاد ہے جس کے الفاظ پر آج آپ اظہار حیرت کر رہے ہیں اور جسے آپ نے خود سن لیا ہے۔ اس کی بات کی آپ ضرور تردید کریں یا یہ ثابت کریں کہ جیسا میں نے کہا ہے۔ ناانصافی کرنا اور اس کی سزا سے بچ جانا کوئی بہت بڑی برائی نہیں ہے یا اگر آپ اس کے الفاظ کی تردید نہیں کرتے؟ ابوالہول کی قسم کیلی کلس میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ کیلی کلس کا دل کبھی مطمئن نہیں ہوگا اور اس کی پوری زندگی تضادات کا شکار رہے گی۔ تاہم میرے دوست میں بھی چاہوں گا کہ خواہ میرا بربط بے سُرا ہو جائے، اور جو راگ میں نے الاپنا شروع کیا ہے اسے گانا ممکن نہ ہو۔ یہ سب کچھ مجھے منظور ہے یا یہ کہ ساری دنیا میرے مقابل اٹھ کھڑی ہو، میرے خلاف صف بستہ ہو جائے لیکن میں تضادات کا شکار ہونا پسند نہیں کروں گا اور نہ ہی خود اپنی تردید کروں گا۔

کیلی: سقراط آپ بڑے پرجوش مقرر ہیں اور دلائل کا بے دھڑک استعمال کرتے ہیں۔ اب آپ کی تقریر

میں تیزی اس لیے آ گئی ہے کہ پولس خود اسی غلطی میں پھنس گیا ہے جس کا اس نے جورجیاز پر الزام لگایا تھا۔ اس نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب جورجیاز سے آپ نے دریافت کیا تھا کہ اگر کوئی ایسا شخص اس سے رجوع کرتا ہے جو فن بلاغت سیکھنے کا متمنی ہے اور وہ انصاف کے مفہوم سے ناواقف ہے تو کیا پہلے وہ اسے انصاف کے معنی سکھائیں گے؟ جورجیاز نے بڑے تحمل سے جواب دیا کہ اگر وہ اس کا جواب نفی میں دے گا تو لوگ ناراض ہو جائیں گے۔ اس اعتراف سے نتیجہ یہ نکلا کہ جورجیاز خود اپنی ہی بات کی تردید پر مجبور ہو گیا اور انصاف سے متعلق وہی بات تسلیم کر لی جس پر سب راضی تھے۔ میرے خیال میں اسی بات پر پولس (Polus) بجا طور پر ہنسا تھا۔ لیکن وہ خود اسی دام میں پھنس گیا ہے۔ میں اس کی ذہانت کا قائل نہیں ہوا جب اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ ناانصافی برداشت کرنا ناانصافی کرنے سے کہیں زیادہ گھٹیا عمل ہے۔ یہی وہ دلیل تھی جس سے آپ اسے زیر دام لائے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی اس نے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں آپ کے سامنے انکساری سے کام لیا تھا۔ اس کا منہ بند ہو گیا تھا۔ سقراط! سچ تو یہ ہے کہ آپ جو صداقت کے حامی بننے کا ڈھونگ رچاتے ہیں اس وقت خود صداقت کے ایسے مقبول عام اور عامی نظریے کا سہارا لے رہے ہیں جو فطری نہیں بلکہ محض رسمی ہیں۔ عموماً رسم و رواج اور فطرت ایک دوسرے سے متفق نہیں ہوتے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اپنے مافی الضمیر کے بیان میں انکساری سے کام لیتا ہے تو وہ اپنی ہی بات کی تردید پر مجبور ہو جاتا ہے اور آپ نے اس طریقے کی افادیت کو محسوس کیا اور ایسی ترکیب سے کام لیتے ہوئے عیارانہ طور پر جو رسمی دلائل دے رہے تھے آپ سے ایسا سوال پوچھ لیا جس کا جواب فطری قانون کے مطابق دینا چاہیے تھا۔ اور جب وہ فطری دلائل کی جانب آتا تھا تو آپ رسمی دلائل کی طرف کھسک جاتے تھے۔ ناانصافی کے مرتکب ہونے اور اسے برداشت کرنے کی بحث کے دوران آپ نے جو دلائل دیے وہی اس کی مثال ہیں۔ جب پولس رسمی طور پر گھٹیا پن کے بارے میں رسمی باتیں کر رہا تھا آپ فطری دلائل کے زور پر اس پر حاوی ہو گئے کیونکہ فطری دلیل کے مطابق ناانصافی برداشت کرنا نسبتاً بڑی رسوائی ہے چونکہ یہ ایک عظیم تر گناہ ہے لیکن رسمی طور پر برائی کا ارتکاب نسبتاً بڑی رسوائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزاد انسان کے لیے ناانصافی کو برداشت کرنا فطری عمل نہیں ہے۔ یہ تو غلاموں کا مقدر ہے۔ جن کے لیے زندگی سے کہیں بہتر موت ہے۔ وہ زیادتیوں کا شکار ہو کر تشدد کا نشانہ بنتا ہے تو دراصل وہ خود اپنی یا کسی ایسے شخص کی

جس سے اس کو لگاؤ ہے حفاظت کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے جیسا کہ میں سمجھتا ہوں کہ قانون سازوں کی اکثریت کمزور ہوتی ہے۔ وہ قانون اور انعامی اور تعزیری ضابطے ہی ایسے بناتے ہیں جس سے ان کی اور ان کے مفادات کی پشت پناہی ہوتی ہے۔ وہ قوی تر اور ایسے لوگوں کو جو ان سے بازی لے جاسکتے ہیں خوف زدہ کر دیتے ہیں۔ تاکہ وہ ان پر حاوی نہ ہوسکیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ بددیانتی نہایت شرمناک عمل اور ناانصافی ہے۔ یہاں ناانصافی سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اپنے ہمسایوں سے اپنی احساس کمتری کے علم میں بازی لے جائی جائے۔ میں گمان کرتا ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے برابر ہونے پر خوش ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر عام افراد جو کہ اکثریت میں ہیں، زیادہ سہولتوں کے حصول کی سعی میں مصروف رہتے ہیں، جسے عام طور پر شرمناک اور غیر واجب سمجھ کر ناانصافی کا نام دیا جاتا ہے۔ حالانکہ فطرت کا خود یہ اشارہ ہے کہ بدتر کے مقابلے میں بہتر اور کمزوری کے مقابلے میں قوت کا حصول جائز ہے اور بہت سے طریقوں سے وہ اس کا اظہار بھی کرتی ہے کہ انسانوں اور جانوروں میں اور تمام شہروں اور نسلوں میں بھی انصاف ادنیٰ پر اعلیٰ کے غلبہ اور اس سے زیادہ مال و دولت کے حصول سے عبارت ہے۔ بتایئے آخر وہ کیا اصول تھا جس پر عمل پیرا ہو کر زرزیس (Xerxes) نے ہیلاز پر حملہ کیا تھا یا اس کے والد نے ساتھی (Scythians) کے لوگوں پر حملہ کیا تھا (ایسی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں)۔ لیکن بے شک یہی وہ لوگ ہیں جو فطرت کے مطابق عمل کرتے ہیں، ہمارے اختراع کردہ اس مصنوعی قانون کے مطابق نہیں، اور دوسرے انسانوں پر نافذ کرتے ہیں۔ بہترین اور طاقت ور نوجوانوں کو منتخب کرتے، انھیں آگے بڑھاتے ہیں اور پالتو شیروں کی طرح انھیں سدھاتے ہیں۔ اپنی آواز سے انھیں مسحور کرتے ہیں اور انھیں یہ بتاتے ہیں کہ باہمی مساوات پر ہی قناعت کریں اور جو ایک دوسرے کے برابر ہوتے ہیں وہی معزز اور انصاف پسند ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ایسا ہے جسے اتنی زیادہ قوت حاصل ہے کہ وہ ان پابندیوں کو پھلانگ کر ان سے اپنی جان چھڑا لے گا وہ ہمارے ضابطوں، افسون، ٹونکوں اور ان تمام قوانین کو پامال کر ڈالے گا جو خلاف فطرت ہیں۔ غلام بغاوت کر کے ہمارے حکمران بن جائیں گے اور فطری انصاف کا بول بالا ہوگا اور اسی جذبے کا اظہار شاعر پنڈر بھی کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ:

''قانون ہی فانی اور لافانی تمام ہستیوں کا بادشاہ ہوتا ہے''۔

وہ یہ بھی کہتا ہے کہ:

''وہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول پر عمل پیرا ہو کر نہایت شدت سے تشدد کرتا ہے۔ میں نے یہ اصول ہراکلس کے کارناموں سے اخذ کیا ہے۔''

مجھے اصل الفاظ یاد نہیں لیکن ان کا مفہوم یہی تھا کہ بغیر اس کے کہ انھیں خریدتا یا کوئی اسے یہ دے دیتا۔ وہ جریون (Geryon) کے بیل فطری قانون کے مطابق ہانک کر لے گیا۔ گویا کمزوروں کے بیل اور مال واسباب اس کی ملکیت بن گئے جو طاقتور تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ اپنا فلسفہ ترک کر کے اعلیٰ حقائق کی طرف جا کر اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ سقراط بات یہ ہے کہ فلسفہ کو اگر اعتدال کے ساتھ مناسب عمر میں برتا جائے تو یہ نہایت شایستہ عمل ہے لیکن فلسفہ کی افراط حیاتِ انسانی کے لیے تباہی کا سامان ہے۔ تاہم اگر کوئی اس فن میں کمال رکھتا ہو اور بعد میں زندگی بھر اس فلسفہ پر عمل پیرا رہتا ہے تو وہ یقینی طور پر ان باتوں سے لاعلم رہتا ہے جسے ایک معزز اور شریف شخص کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اسے ریاستی قوانین اور اس زبان اور لہجے کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا جسے نجی اور عوامی سطح پر انسانوں کے اپنے باہمی روابط کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ عمومی لحاظ سے وہ بنی نوع انسان کی مسرتوں اور فطرتِ انسانی سے نابلد ہوتا ہے۔ اس قبیل کے لوگ جب سیاست یا تجارت کے شعبے میں داخل ہوتے ہیں تو مضحکہ خیز نظر آتے ہیں۔ میرے تصور میں وہ سیاست دان نہیں ہے جو فلسفہ کے اکھاڑے میں اترتا ہے۔ اور بقول یوری پائڈز (Euripides) ''ہر شخص جس شعبے میں ممتاز ہو، اسی شعبے میں مرکزِ نگاہ ہوتا ہے اور دن کا بیشتر وقت اسی کام میں صرف کرتا ہے''۔ ''لیکن جس کام میں وہ کمتر ہوتا ہے اس سے دامن بچاتا ہے۔ اس کی سبکی کرتا ہے اور خود اپنے ساتھ جانب دارانہ سلوک کرتے ہوئے اس کے برعکس امور کی تحسین کرتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں وہ اس طرح خود اپنی توصیف کرے گا۔ اصل اصول تو یہ ہے کہ انھیں متحد کر دیا جائے۔ تعلیم کے ایک جزو کی حیثیت سے فلسفہ نہایت افضل ہے۔ اور نوجوانی میں کسی کے لیے بھی اس کا حصول موجب رسوائی نہیں ہے لیکن جب وہ معمر ہو جائے تو فلسفہ پر عمل مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔ ایسے فلسفیوں کو میں ویسا ہی سمجھتا ہوں جیسا کہ کسی تتلانے والے یا بچوں کی نقل اتارنے والوں کو سمجھتا ہوں۔ مجھے ان بچوں پر بڑا پیار آتا ہے جو ایسی چھوٹی عمر کے ہوتے ہیں کہ وہ الفاظ کو صاف صاف

ہیں کرتے۔ کھیلتے ہوئے تتلاتے ہیں۔ ان کے جملوں میں ایک طرح کا وقار اور روانی ہوتی ہے۔ جو اس کی عمر کا تقاضا ہوتی ہے لیکن جب میں کسی حقیر مخلوق کو بچے کے الفاظ کی اٹک اٹک کر نقل اتارتے ہوئے سنتا ہوں تو میں بدمزہ ہو جاتا ہوں۔ اس کی آواز کانوں کو گراں گزرتی ہے اور اس میں غلامانہ رنگ جھلکتا ہے۔ اسی لیے جب میں کسی کو تتلاتے سنتا ہوں یا بچوں کی نقل اتارتے ہوئے دیکھتا ہوں تو اس کی یہ حرکت مجھے بہت مضحکہ خیز اور غیر انسانی نظر آتی ہے اور جی چاہتا ہے اسے درے مارے جائیں۔ فلسفہ کے طالب علموں کے بارے میں بھی میرے ایسے ہی احساسات ہیں جب کسی نوجوان کو اس شعبہ میں مصروف دیکھتا ہوں تو اس کا یہ مطالعہ مجھے ایسے انسان کے شایان شان نظر آتا ہے جو صاحب کردار اور روشن دماغ ہے اور جو فلسفہ کو نظر انداز کرتا ہے اسے میں کمتر درجہ کا انسان سمجھتا ہوں جو کبھی عالی منش اور نجیب نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر میں بعد کی زندگی میں بھی دیکھوں کہ وہ فلسفہ کی تعلیم کے حصول میں مشغول ہے اور اس نے اسے ترک نہیں کیا ہے، تو سقراط میں اسے زدوکوب کرنا چاہوں گا۔ لیکن جیسا کہ میں اس سے قبل ذکر کر چکا ہوں۔ ایسا آدمی خواہ اس میں کتنی ہی خوبیاں کیوں نہ ہوں وہ زن صفت ہوگا۔ وہ مصروفیت کے مرکز اور منڈی سے جہاں بقول شاعر وہ ممتاز ہوتا ہے بگٹٹ فرار ہو جائے گا۔ وہ بقیہ زندگی گوشہ گیر ہو کر گزار دے گا اور اپنی تعریف میں مصروف دو تین نوجوان کے ساتھ کانا پھوسی کرتا رہے گا۔ لیکن ایک آزاد انسان کی طرح کبھی کھل کر بات نہیں کرے گا۔ سقراط اب میں آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ جو ڈرامے یوری پائڈز کے کردار زیتھس (Zethus) کی توجہ کی طرح ہوگی جو اس نے ایمفیون (Amphion) کی طرف مبذول کی تھی۔ اس کا ذکر میں ابھی ابھی کر چکا ہوں چونکہ چاہتا ہوں کہ آپ سے وہی باتیں کہہ ڈالوں جو زیتھس نے اپنے بھائی سے کہی تھیں کہ سقراط آپ ان باتوں کی طرف توجہ نہیں دے رہے جن پر آپ کو پوری توجہ دینا چاہیے تھی۔ اور یہ کہ:

> "آپ جو اتنی پاکیزہ روح کے مالک ہیں اور آپ کے ظاہر میں بچگانہ پن نمایاں ہے۔ آپ نہ کسی عدالت میں اپنا مقدمہ پیش کر سکتے ہیں اور نہ کوئی دلیل یا ثبوت۔ اور نہ ہی کسی اور کی جانب سے زوردار مشورے دے سکتے ہیں۔"

میرے عزیز سقراط آپ میری باتوں کا برا نہ منائیں کیونکہ میں انھیں آپ کی خیر خواہی کے خیال

سے کہہ رہا ہوں۔ آپ اس طرح خود کو نہتا دیکھ کر شرمندگی محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ حالت صرف آپ ہی کی نہیں ہے بلکہ ہر اس شخص کی ہے جو فلسفہ کو بہت زیادہ آگے لے جاتا ہے۔ فرض کر لیجیے ایک شخص آپ یا آپ جیسے کسی دوسرے شخص کو ایسے جرم میں قید کر لیا جاتا ہے جو آپ سے سرزد نہیں ہوا ہے تو آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ کچھ کہا جائے آپ وہاں چکرا جائیں گے، سانس اکھڑ جائے گی ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکلے گا اور جب آپ عدالت میں پیش ہوں گے مدعی خواہ کتنا ہی لاچار اور کسی کام کا نہ ہو تو اگر وہ سزائے موت کا مطالبہ کرے تو آپ کو یہ سزا مل جائے گی کہ سقراط:

"ایسا ہنر کس کام کا جو دانا کو نادان بنا دے"۔

وہ ایسا بے دست و پا کر دے کہ وہ نہ تو اپنی، نہ کسی اور کی جان بچا سکے اور حالت یہ ہو جائے کہ وہ سخت خطرے میں ہو، مال و متاع چھین رہا ہو اور اس کی شہریت ختم ہو رہی ہو۔ ایسے شخص کی میرے خیال میں گوشمالی ضروری ہے۔ میرے دوست میری بات مانو اور میری بات کی کوئی تردید نہ کرو۔ "کاروبار کا فلسفہ سیکھو اور دانا ہونے کی شہرت حاصل کرو، لیکن یہ نازک خیالیاں دوسروں کے لیے رہنے دو"۔ خواہ اسے حماقت کہا جائے یا نامعقولیت۔

"کیونکہ وہ آپ کو اور آپ کے اہل خانہ کو صرف افلاس ہی عطا کریں گے۔"

میں کہوں گا کہ الفاظ کی ہندی کی چندی نکالنے والوں سے قطع تعلق کر لو اور صرف اس شخص کی ریس کرو جو دولت مند اور خوشحال ہے۔

سقراط: کیلی کلس اگر میری روح سونے کی ہو جائے تو کیا میں اس پتھر کے حصول پر اظہار مسرت نہ کروں جس پر سونے کو رگڑ کر پرکھتے ہیں اور میں اس طرح بہترین سونا پہچان کر اسے اپنی روح میں ڈھال لوں گا۔ اور مجھ میں اور پتھر میں مکمل مطابقت پیدا ہو جائے تو اسی صورت میں مجھے علم ہو جائے گا کہ میری کیفیت اطمینان بخش ہے۔ اور اب مزید کسی دوسری آزمائش کی ضرورت نہیں۔

کیلی: سقراط آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

سقراط: میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے آپ کی شخصیت میں میری مطلوبہ کسوٹی مل گئی ہے۔

کیلی: کس طرح۔

سقراط: کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میری روح کی قائم کی ہوئی کسی رائے سے آپ متفق ہو جائیں گے تو میں

خواہش، کیونکہ آپ میرے دوست ہیں جس کا اعتراف آپ نے کیا ہے۔ اس لیے میری اور آپ کی متفقہ رائے کا مطلب حقیقت کا حصول ہی ہو سکتا ہے۔ کیلی کلس اس سے بہتر اور کوئی تحقیق نہیں ہو سکتی جس کے لیے آپ نے مجھے تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ آدمی کا کردار کیا ہونا چاہیے، اس کا شغل کیا ہونا چاہیے اور اس معاملے میں اسے نوجوانی اور پختہ عمر میں کس حد تک جانا چاہیے؟ میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں اپنے کردار کے لحاظ سے غلطی کروں گا تو یہ شعوری نہیں ہوگی بلکہ یہ میری لاعلمی سے ہوگی۔ اس لیے آپ مجھے صلاح دینے سے پہلوتہی نہ کریں اور اسے اس وقت تک جاری رکھیں جب تک میں یہ نہ سیکھ لوں کہ مجھے کس بات پر عمل کرنا ہے اور میں اسے کس طرح حاصل کر سکتا ہوں۔ اور اگر آپ مجھے اپنے الفاظ کو قبول کرتا ہوا محسوس کریں اور اس کے بعد آپ کی صلاح کے مطابق عمل کرتا ہوا نہ دیکھیں تو آپ مجھے کودن اور غبی کہیں۔ اور یہ سمجھ لیں کہ میں آپ کی مزید ہدایات حاصل کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ ذرا ایک بار پھر یہ سمجھا دیجیے کہ آپ کی پنڈر (Pindar) کے فطری انصاف سے کیا مراد ہے۔ کیا آپ کا یہ مفہوم ہے اعلیٰ آدمی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ادنیٰ آدمی کے مال ومتاع پر زبردستی قبضہ جما لے۔ بہتر لوگ بدتر لوگوں پر حکمرانی کریں اور شرفا کو اوسط لوگوں سے زیادہ وسائل حاصل ہوں؟ مجھے جو باتیں یاد ہیں وہ درست ہیں ناں؟

کیلی: جی ہاں میں یہی کہہ رہا تھا۔ اب بھی اس پر قائم ہوں۔

سقراط: کیا بہتر سے آپ کی مراد افضل تر ہے کیونکہ آپ اس وقت جو کچھ کہہ رہے تھے میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا آپ کہہ رہے تھے کہ افضل تر طاقتور تر ہوتا ہے اور یہ بھی کہ کمزور کو طاقتور کا فرمانبردار ہونا چاہیے۔ کیونکہ آپ نے کہا تھا کہ بڑی ریاستوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ چھوٹی ریاستوں پر دھاوا بول دیں کیونکہ وہ افضل اور طاقتور ہیں۔ گویا کہ افضل، بہتر اور طاقتور تینوں یکساں ہیں۔ کیا بہتر، کمزور اور ادنیٰ بھی ہو سکتا ہے اور اعلیٰ ترین اسی طرح بدترین بھی ہو سکتا ہے۔ کیا بہتر کو اسی طرح بیان کیا جا سکتا ہے جس طرح اعلیٰ وافضل کو بیان کیا جاتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی میں وضاحت چاہتا ہوں کہ کیا افضل، بہتر اور طاقتور تینوں بجنسہٖ یکساں ہیں یا مختلف؟

کیلی: میں بغیر کسی ابہام کے یہ کہتا ہوں کہ وہ یکساں ہی ہیں۔

سقراط: اس صورت میں تو اکثریت اس فرد واحد سے فطری طور پر افضل ہے جو بقول آپ کے ان کے خلاف قانون سازی کرتا ہے۔

کیلی: یقیناً۔

سقراط: تو کیا جو قانون اکثریت بنائے وہ افضل قانون ہوتا ہے؟

کیلی: درست۔

سقراط: اس طرح وہ بہتر افراد کے بنائے ہوئے قوانین ہوئے کیونکہ آپ ہی نے کہا ہے کہ افضل درجے والے بہت بہتر ہوتے ہیں۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: چونکہ وہ افضل ہوتے ہیں اس لیے فطری طور پر ان کے بنائے ہوئے قوانین اچھے ہوں گے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: ابھی ابھی آپ نے کہا تھا کہ اکثریت کی یہ رائے ہے کہ مساوات کا دوسرا نام انصاف ہے۔ اور یہ کہ نا انصافی برداشت کرنے سے بدتر نا انصافی کا مرتکب ہونا ہے۔ بات یہی ہے یا نہیں؟ کیلی کلس بولو جواب دو اور انکساری کو رکاوٹ نہ بننے دو۔ اکثریت ایسا ہی سوچتی ہے یا نہیں؟ میری التجا ہے کہ آپ اس کا جواب دیں تا کہ اگر آپ اس سے متفق ہوں تو مجھے آپ جیسے صاحب الرائے کی حمایت سے بہت تقویت ملے گی۔

کیلی: جی ہاں اکثریت کی رائے وہی ہے جو آپ بیان کر رہے ہیں۔

سقراط: اس طرح نہ صرف رسم و رواج بلکہ فطرت بھی یہ تصدیق کرتی ہے کہ نا انصافی برداشت کرنے سے کہیں بدتر نا انصافی کا ارتکاب ہے اور یہ بھی کہ مساوات کا دوسرا نام انصاف ہے۔ گویا آپ نے پہلے جو دعویٰ کیا تھا وہ غلط تھا اور مجھ پر یہ الزام لگایا تھا کہ فطرت اور رسم و رواج باہم متناقض ہیں اور یہ بھی کہ میں ان دونوں کے درمیان بددیانتی سے اٹھکھیلیاں کر رہا تھا، جب دلیل فطرت سے متعلق ہوتی، میں رسم و رواج کی طرف پلٹ جاتا اور جب دلیل رسم و رواج سے متعلق ہوتی تو میں فطرت سے رجوع کر لیتا تھا۔

کیلی: یہ شخص فضول گوئی سے کبھی باز نہیں آئے گا۔ اس عمر میں سقراط آپ کو شرم نہیں آتی کہ آپ الفاظ پر گرفت کرتے ہیں اور ذرا سی سہو کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ آپ کو یاد نہیں کہ میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ افضل سے میری مراد بہتر ہے۔ آپ یہ گمان کرتے ہیں کہ میں یہ کہوں گا کہ غلاموں اور بے قدر لوگوں کے ہجوم کے جن کی بجز ان کی جسمانی طاقت اور کوئی اہمیت نہیں ہے۔

الول جلول الفاظ کو قانون کا درجہ حاصل ہوگا؟

سقراط: میرے فلسفی آپ کی سوچ کا یہی انداز ہے؟

کیلی: یقیناً۔

سقراط: کیلی کلس میں سوچ رہا تھا کہ اس طرح کی کوئی نہ کوئی بات آپ کے ذہن میں موجود ہے۔ اسی لیے میں نے اپنا سوال دہرایا تھا کہ افضل کسے کہتے ہیں۔ میں آپ کا مفہوم بڑی وضاحت سے معلوم کرنا چاہتا تھا کیونکہ آپ یقیناً یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ایک آدمی سے دو آدمی بہتر ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ آپ کے غلام آپ سے بہتر ہیں کیونکہ وہ زیادہ طاقت ور ہیں۔ اسی لیے میں ایک بار پھر پوچھوں گا کہ اگر طاقتور بہتر نہیں ہے تو پھر کون ہے۔ عالی جناب میری گزارش ہے کہ آپ اپنی ہدایات میں قدرے نرمی برتیں۔ ورنہ مجھے آپ کے پاس سے فرار ہونا پڑے گا۔

کیلی: اچھا تو حضور طنز فرما رہے ہیں۔

سقراط: کیلی کلس نہیں بالکل نہیں۔ میں زیتھس (Zethus) کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے توسط سے ابھی آپ نے میرے متعلق کئی طنزیہ کلمات ادا کیے تھے۔ چلیے میں نہیں ہوں، اچھا تو پھر یہ بتائیے کہ کیا آپ کا بہتر اور افضل کا اشارہ میری جانب نہیں ہے، تو آپ کسے بہتر سمجھتے ہیں۔

کیلی: جو افضل ترین ہو۔

سقراط: آپ کو محسوس نہیں ہوتا کہ آپ خود بے معنی الفاظ استعمال کر رہے ہیں یعنی آپ کوئی وضاحت نہیں کر رہے ہیں۔ ذرا اتنا بتا دیجیے کہ اگر آپ کا بہتر اور افضل کا مفہوم دانائی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟

کیلی: پورے وثوق سے کہتا ہوں میرا مفہوم ہے کہ دانائی میں بہت آگے ہے۔

سقراط: اس طرح آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ایک دانا شخص ہزاروں نادانوں سے افضل ہوتا ہے اور اسے ان پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔ وہ تمام کے تمام اس کی رعیت ہوں گے۔ اور وہ ان سے زیادہ صاحب ثروت ہوگا۔ میرا یقین ہے کہ آپ کا یہی مفہوم ہے (آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں لفظ پر آپ کی گرفت کر رہا ہوں۔)۔ کیونکہ آپ کا یہ خیال ہے کہ ایک فرد دس ہزار پر بھاری ہوتا ہے؟

کیلی: ہاں میرا یہی مفہوم ہے اور میں اسی کو فطری انصاف تصور کرتا ہوں کہ بہتر اور دانا حکمرانی کرے اور وہ ادنیٰ سے زیادہ صاحب ثروت ہو۔

سقراط: ذرا توقف کیجیے اور مجھے بتائیے کہ اس صورت میں آپ کی رائے کیا ہوگی کہ فرض کیجیے ہم لوگ آج

جس طرح یکجا ہیں یعنی ہم تمام جمع ہیں اور ہمارے پاس ماکولات اور مشروبات کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، ہماری اس محفل میں ہر طرح کے افراد ہیں کچھ طاقتور ہیں اور کچھ کمزور۔ ہم میں سے ایک طبیب ہے جو غذا کے معاملے میں سب سے زیادہ سمجھدار اور بعض سے قوی تر اور بعض سے کمزور۔ وہ چونکہ ہم سب سے زیادہ سمجھدار ہے تو کیا وہ غذا کے معاملے میں ہم سے بہتر اور افضل ہوگا؟

کلی: یقیناً۔

سقراط: چونکہ وہ بہتر ہے اس لیے ماکولات و مشروبات میں اس کا حصہ سب سے زیادہ ہوگا۔ اپنے با اختیار ہونے کے سبب وہ اسے محفل میں تقسیم کرنے کا مجاز ہوگا۔ لیکن وہ اپنی ذات کے لیے اوروں سے زیادہ حصہ نہیں حاصل کرے گا اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو سزا پائے گا۔ اس کا حصہ چند افراد سے زیادہ اور کچھ افراد سے کم ہوگا اور اگر بہترین ہونے کے باوجود وہ کمزور ترین ہوا تو اس کا حصہ سب سے کم ہوگا۔ کیلی کلس میرے دوست کیا میں ٹھیک نہیں کہہ رہا ہوں۔

کلی: آپ گوشت، شراب، طبیب اور پتا نہیں کیا کیا مہمل باتیں کر رہے ہیں۔ میں ان کی بات نہیں کر رہا ہوں۔

سقراط: چلیے چھوڑیے اچھا تو کیا آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ دانا بہتر ہوتا ہے جواب اثبات یا نفی میں چاہیے۔

کلی: جی ہاں۔

سقراط: تو کیا بہتر بڑے حصے کا حقدار نہیں ہے۔

کلی: گوشت اور شراب کا نہیں۔

سقراط: میرا خیال ہے غالباً چوغوں کا۔ ماہر ترین پارچہ باف کو سب سے بڑا چوغہ بڑی تعداد میں ملے گا اور وہ بہترین ملبوسات پہنے گا۔

کلی: چوغہ کا ذکر بے معنی ہے۔

سقراط: چلیے اسے بھی چھوڑیے۔ ماہر ترین اور بہترین جفت ساز کو جوتے کے معاملے میں فوقیت حاصل ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے وہ سب سے بڑے جوتے استعمال کرے گا اور اس کے پاس ایسے جوتوں کی بہت بڑی تعداد ہوگی۔

کلی: جوتوں کا تذکرہ بے معنی ہے۔ یہ آپ کیا فضول باتیں لے بیٹھے ہیں۔

سقراط: چلئے اگر آپ کا یہ مفہوم نہیں ہے تو غالباً آپ یہ کہیں گے کہ سمجھ دار، اچھا ہوتا ہے۔ اس لیے اہل کاشتکار کو بیجوں کا سب سے بڑا حصہ ملنا چاہیے اور اس کی زمینوں کے لیے وہ جتنا بیج چاہے لے جائے؟

کیلی: سقراط آپ جو بات چاہتے ہیں، وہی کرتے رہتے ہیں، تبدیل نہیں کرتے۔

سقراط: جی ہاں کیلی کلس باتوں کا موضوع بھی تبدیل نہیں کرتا۔

کیلی: قسم ہے دیوتاؤں کی آپ ہمیشہ موچیوں، دھوبیوں، باورچیوں اور طبیبوں ہی کا ذکر کرتے رہتے ہیں گویا ان کا ہماری بحث میں بڑا عمل دخل ہے۔

سقراط: پھر آپ مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ وہ کون سا آدمی ہے جو افضل اور داناتر ہونے کے سبب زیادہ حصے کا حقدار ہے۔ آپ نہ تو میری رائے مانتے ہیں نہ خود کوئی رائے دیتے ہیں۔

کیلی: میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں اول یہ کہ افضل سے میری مراد نہ تو موچی ہے اور نہ ہی باورچی، بلکہ میری مراد سمجھ دار سیاست دانوں سے ہے جو ریاست کے انتظامی امور کا علم رکھتے ہیں اور نہ صرف سمجھ دار ہوتے ہیں بلکہ جی دار بھی اور اپنے منصوبوں پر عمل درآمد کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔ ایسے نہیں ہوتے کہ طاقت کی کمی کے سبب ہوش کھو بیٹھتے ہوں۔

سقراط: عالی مرتبت کیلی کلس ذرا توجہ فرمائیے گا کہ آپ نے مجھ پر جو الزام لگایا ہے۔ میرا الزام اس سے کتنا مختلف ہے۔ آپ مجھے ایک بات پر برا بھلا کہتے ہیں۔ ایک بار آپ نے یہ کہا تھا کہ بہتر اور افضل فرد طاقتور تر ہوتا ہے پھر آپ نے کہا کہ وہ داناتر ہوتا ہے اور اب آپ ایک نئی بات کہہ رہے ہیں کہ افضل اور بہتر فرد باہمت ہوتا ہے۔ میرے عزیز دوست میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک ہی مرتبہ بتا دیں کہ آپ کسے بہتر اور افضل قرار دیتے ہیں اور وہ کس طرح بہتر ہوتے ہیں۔

کیلی: میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ بہتر اور باہمت فرد وہ ہے جو ریاستی امور کی انجام دہی سے واقف ہو۔ انھیں اپنی ریاست کا فرمانبردار ہونا چاہیے اور انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی رعایا سے زیادہ صاحب ثروت ہو؟

سقراط: لیکن سوال یہ ہے کہ چاہے وہ فرمانبردار ہوں یا نہ ہوں۔ کیا ان کا حصہ سب سے بڑا ہونا چاہیے؟

کیلی: آپ کا مطلب کیا ہے۔

سقراط: میرا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص خود اپنا حاکم ہوتا ہے لیکن غالباً آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اسے خود پر حکمرانی

کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ اسے صرف دوسروں پر حکم چلانا ہے۔

سقراط: خود اپنا حاکم ہونے سے آپ کی مراد کیا ہے۔

کیلی: سیدھی سادی سی بات ہے جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان کو اعتدال پسند ہونا چاہیے اور خود کو قابو میں رکھنا چاہیے اور اپنے ہیجان خیز جذبات اور حظ نفسانی کو لگام دینا چاہیے۔

سقراط: خوب! کیا معصومیت ہے۔ آپ کا اشارہ ان احمقوں کی طرف ہے جو اعتدال پسند ہوتے ہیں۔

کیلی: یقیناً سب سمجھتے ہیں کہ میری یہی مراد ہے۔

سقراط: سقراط، بالکل ایسا ہی ہے۔ وہ فی الجملہ احمق ہوتے ہیں۔ بھلا بتایئے جو انسان کسی کا محکوم ہو وہ خوش

کیلی: کیسے رہ سکتا ہے؟ اس کے برخلاف میں بہانگ دہل کہتا ہوں کہ جو صحیح معنوں میں زندگی گزارتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنی ہوس کو جہاں تک جی چاہے بڑھالے اور اپنی خواہشات کو پابند نہ کرے۔ برا بھلا نہ کہے؟ اور جب وہ اپنی آخری حدود کو چھولے تو اس میں اتنی سمجھ اور حوصلہ ہونا چاہیے کہ وہ انھیں خوب دل کھول کر برتے اور اپنی تمام آرزوؤں اور خواہشوں کی تکمیل کرے۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ یہی فطری عدل اور نجابت ہے۔ تاہم بہت سے ایسے ہیں جو اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے۔ وہ طاقتور کو اس لیے الزام دیتے ہیں کہ انھیں اپنی کمزوری پر شرم آتی ہے جسے وہ چھپانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ بے اعتدالی ہیچ پوچ ہے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ایسے لوگ اپنی فطری شرافت کو غلام بنا لیتے ہیں اور اپنی خواہشات کی تکمیل میں ناکامی کے باعث اپنی بزدلی کے نتیجے میں اعتدال اور انصاف کے ترانے گاتے ہیں۔ دیکھیے ناں اگر کوئی فرد واقعتاً کسی بادشاہ کا فرزند ہے یا فطری طور پر اس لائق ہے کہ کوئی مملکت یا جابرانہ فرمانروائی حاصل کرے اس کے لیے اعتدال پسندی سے بدتر اور گھٹیا اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔ میں کہتا ہوں کیا وہ شخص جسے ہر نعمت حاصل ہو اور اس کو روک ٹوک کرنے والا کوئی نہ ہو، وہ روایات، ہوشمندی اور دوسروں کی رائے کا تابع ہو سکتا ہے؟ اس بے چارے کی حالت یقیناً قابل رحم ہو گی جو ریاست کا حکمران ہونے کے باوجود اپنی عدالت گستری اور اعتدال پسندی کی شہرت کے سبب، وہ اپنے دشمنوں سے زیادہ حصہ اپنے دوستوں کو نہیں دے سکتا۔ نہیں سقراط ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ کو حق کا علمدار ہونے کا دعویٰ ہے۔ حق یہ ہے کہ عیش و عشرت، بے اعتدالی اور بے لگامی اس صورت میں خوبی اور مسرت ہیں جب ان کے لیے وسائل دستیاب ہوں۔ باقی تمام باتیں محض نمائشی، ہیں، خلاف فطرت

سودابازی لوگوں کی یاوہ گوئی ہے جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

سقراط: کیلی کلس آپ کی دلیلوں کے انداز میں ایک طرح کی شریفانہ آزادی اور جرأت ہے کیونکہ آپ جو کہہ رہے ہیں وہی بات تمام دنیا سوچتی ہے لیکن اسے زبان پر نہیں لاتی۔ میری التماس ہے آپ اسے سنبھال کر رکھیں تا آنکہ حیات انسانی کا حقیقی ضابطہ ظاہر ہو جائے۔ اچھا مجھے یہ بتائیے کہ آپ یہ کہتے ہیں یا نہیں کہتے کہ صحیح خطوط پر تربیت کے لیے انسان کے شہوانی جذبات پر کوئی قدغن نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم انھیں پوری طرح پروان چڑھنے دیں اور کسی نہ کسی طرح انھیں اطمینان بخش طریقے سے برتیں کہ یہی نیکی ہے؟

کیلی: جی ہیں، یہی کہتا ہوں۔

سقراط: گویا جو کسی شے کے تمنائی نہ ہوں وہ صحیح معنوں میں خوش و خرم نہیں ہوتے؟

کیلی: بالکل نہیں ورنہ مُردے اور پتھر سب سے زیادہ خوش مانے جائیں گے۔

سقراط: لیکن یقیناً آپ کی رائے کے مطابق زندگی ایک عذاب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یوری پائڈز نے سچ ہی کہا تھا کہ ''کسے خبر کہ زندگی موت ہو اور موت زندگی''۔ کیا پتا ہم لوگ فی الحقیقت مردہ ہی ہوں۔ میں نے ایک فلسفی کو یہ کہتے سنا ہے کہ اس لمحے ہم واقعی مر چکے ہیں اور ہمارے جسم ہی ہماری قبر ہیں اور روح کا وہ جزو جو خواہشات کا مرکز ہے ہمارے الفاظ ہی اسے اچھال رہے ہیں اور اسے کبھی اچھالتے ہیں اور کبھی نیچے گراتے ہیں۔ غالباً سسلی (Sicilian) یا اطالیہ (Italian) کے کسی صاحب تدبیر انسان نے الفاظ سے کھیلتے ہوئے ایک کہانی بُنی جس میں اس نے روح کو اس کی فطری زود یقینی اور حیلہ جوئی کے پیش نظر ایک کشتی کہا اور بے خبر کو لاعلم اور پیٹ کا ہلکا اور لاعلم کی روح کا وہ حصہ جس میں خواہشات رہتی ہیں وہ شہوت پرستی اور نفس پرستی کا خانہ ہوتا ہے۔ اس نے اسے ایک ایسے جہاز سے تشبیہ دی ہے جس میں سوراخ ہی سوراخ ہوں کیونکہ وہ کبھی سیر نہیں ہو سکتا ہے۔ کیلی کلس اس کی سوچ آپ جیسی نہیں ہے کیونکہ وہ کہتا ہے کہ عالم ارواح یعنی ایک مخفی دنیا میں موجود تمام روحیں جوان اشخاص کی ہوتی ہیں جو بے خبر راز اگل دینے والے ہوتے ہیں، نہایت خستہ حال اور دکھی ہوتے ہیں۔ وہ ایسے برتن میں چھلنی سے پانی ڈالتی رہتی ہیں جس میں خود سوراخ ہوتے ہیں۔ چھلنی جیسا کہ میرے مخبر نے مجھے بتایا ہے، روح ہے اور جس روح کو چھلنی سے تشبیہ دیتا ہے وہ لاعلم فرد کی روح ہے جو اسی کی طرح سرتاپا سوراخوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ کمزور حافظہ اور

ایمان نہ ہونے کے سبب نفس پرست ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ خیالات انوکھے محسوس ہوں لیکن یہ اس اصول کو ظاہر کرتے ہیں جسے میں اگر ممکن ہوا تو آپ کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کروں گا۔ ہو سکتا ہے آپ اپنی رائے بدل کر غیر معتدل اور غیر تسکین بخش زندگی کی بجائے ایک منظم اور تسکین بخش زندگی کا انتخاب کریں، جس میں روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کی صلاحیت ہو۔ کیا میری بات کا آپ پر کوئی اثر ہوا ہے اور کیا آپ اس رائے کے قائل ہو رہے ہیں کہ منظم افراد غیر معتدل افراد سے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ یا میں آپ کو قائل نہیں کر سکا ہوں اور خواہ میں آپ کو کتنی ہی کہانیاں سناؤں آپ پھر بھی اپنی رائے پر ڈٹے رہیں گے؟

کیلی: سقراط مؤخرالذکر بات ہی حقیقت سے قریب تر ہے۔

سقراط: بہتر، میں آپ کے لیے ایک اور تصویر کشی کرتا ہوں جس کا تعلق بھی اسی مکتبہ فکر سے ہے میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ یہ ضرور سوچیں کہ جو بات میں کہنے جا رہا ہوں اسے آپ کس حد تک معتدل اور غیر معتدل زندگیوں کی داستان سمجھیں گے۔ دو شخص ہیں دونوں کے پاس لکڑی کے متعدد پیپے ہیں سب پیپے لبالب بھرے ہوئے ہیں ایک میں شراب ہے، دوسرے میں شہد ہے، تیسرے میں دودھ ہے اور دوسروں میں دیگر سیال ہیں اور جن چشموں سے انھیں بھرا جاتا ہے ان کی تعداد مختصر اور محدود ہے اور اس کے حصول کے لیے اسے بڑی محنت اور مشقت کرنا پڑتی ہے لیکن جب اس کے پیپے پُر ہو جاتے ہیں تو وہ فارغ ہو جاتا ہے۔ اسے کوئی فکر نہیں ہوتی، کوئی تکلیف نہیں ہوتی، دوسرا شخص بھی اسی طرح چشموں تک پہنچ سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے لیے اسے محنت کرنا پڑے گی۔ لیکن اس کے برتن رسنے والے اور ٹوٹے پھوٹے ہیں اور وہ دن رات انھیں بھرتا ہی رہتا ہے اور اگر وہ ذرا بھی توقف کرتا ہے۔ تو وہ درد و کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی ان کا انداز حیات ہے۔ کیا اب بھی آپ کہیں گے کہ بے اعتدال فرد کی زندگی اعتدال پسند کی زندگی سے زیادہ پُرمسرت ہوتی ہے؟ کیا میں آپ کو قائل نہ کر سکا کہ حقیقت اس کے برعکس ہے؟

کیلی: سقراط آپ مجھے قائل نہیں کر سکے کیونکہ جو مطمئن ہو چکا ہے۔ اس کے لیے خوشی بے معنی ہوگی اور یہی، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، ایک پتھر کی زندگی ہوگی۔ وہ جو ایک بار مطمئن ہو جائے تو نہ خوش ہو گا نہ غمگین۔ کیونکہ مسرت کا انحصار ذوق و شوق کے افراط پر ہوتا ہے۔

سقراط: لیکن آپ بھرے برتن میں جتنا بھی سیال ڈالیں گے وہ ضائع ہوگا۔ اس کے سوراخ اتنے بڑے

ہوں گے کہ سارا سال ان سے بآسانی گزر جائے گا۔

کیلی: یقیناً۔

سقراط: جس زندگی کی آپ تصویر کشی کر رہے ہیں وہ کسی مردہ شخص کی زندگی نہیں ہے بلکہ حریص شخص کی زندگی ہے۔ آپ کا مطلب ہے کہ وہ بھوک محسوس کرے اور شکم پُری کرتا رہے گا؟

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: وہ پیاس محسوس کرے اور پیتا چلا جائے؟

کیلی: جی ہاں میں یہی کہہ رہا ہوں اس کی تمام خواہش اور شوق موجود رہیں اور وہ ان کی تکمیل کر کے خوش ہوتا رہے گا۔

سقراط: بہت ہی اعلیٰ بات کی ہے، جس طرح آغاز کیا ہے جاری رکھیے۔ کوئی شرم وحجاب مانع نہ ہو۔ مجھے بھی چاہیے کہ میں بھی شرمندگی کا بار اتار پھینکوں۔ پہلے تو یہ بتائیے کہ کیا آپ خارش کرنے اور اپنی جلد کریدنے کے عمل کو بشرطیکہ آپ کو یہ شدت سے بے چین کر دیتی ہوں تمام زندگی صرف اس لیے جاری رکھیں گے کہ آپ کو اس سے خوشی ہوتی ہے۔

کیلی: سقراط آپ بڑے ہی عجیب انسان ہیں آپ تو منجھے ہوئے مجمع گیر ہیں۔

سقراط: کیلی کلس اسی بنیاد پر میں نے پولس اور جارجیاز کو اس وقت تک کے لیے خوف زدہ کر دیا جب تک انھوں نے وہ کہہ نہیں دیا جو انھیں کہنا چاہیے تھا۔ لیکن آپ نہ تو تکلف کریں گے اور نہ ہی خوف زدہ ہوں گے کیونکہ آپ بڑے حوصلہ مند ہیں۔ اب ذرا میرے سوال کا جواب دیجیے۔

کیلی: میرا جواب ہے کھجانے والا بھی مزے سے زندگی گزارتا ہے۔

سقراط: مزے سے گزارتا ہے تو خوشی بھی حاصل کرتا ہوگا۔

کیلی: اس میں کیا شک ہے۔

سقراط: اس وقت کیا ہوگا جب کھجلی صرف سر تک ہی محدود نہ رہے؟ کیا سوال کو جاری رکھوں؟ کیلی کلس اب میں چاہتا ہوں کہ آپ سوچیں کہ آپ اس صورت میں کیا جواب دیں گے۔ جب حالات کا دباؤ آپ پر پڑے، خصوصاً آخری چارہ کے طور پر آپ سے پوچھا جائے کہ مفعول مرد کی زندگی اذیت ناک، غلیظ اور شکستہ حال نہیں ہوتی یا آپ یہ کہنے کی جسارت کریں گے کہ اگر انھیں جو وہ چاہتے ہیں ملتا رہے تو بھی خوش وخرم رہتے ہیں۔

کیلی: سقراط آپ کو شرم نہیں آتی کہ آپ ایسے موضوعات کو زیر بحث لا رہے ہیں۔

سقراط: میرے اچھے دوست میں ایسے موضوعات کو متعارف کرتا ہوں یا وہ جو غیر مشروط طور پر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جسے کسی طریقے سے بھی لطف حاصل ہو اور وہ بھی جو اچھی بُری مسرت میں تمیز نہیں کرتا، اور خوش وخرم رہتا ہے؟ تاہم میں آپ سے پھر پوچھوں گا کہ کیا آپ کہتے ہیں کہ مسرت اور خوبی دونوں ایک ہی ہیں یا کیا ایسی بھی مسرت ہوتی ہے جو خوبی نہ شمار ہو؟

کیلی: چلیے اپنی بات پر جمے رہتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ وہ دونوں ایک ہی ہیں۔

سقراط: کیلی کلس آپ ہمارے اصل باہمی معاہدے کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اگر آپ اپنی اصلی رائے کے برخلاف باتیں کریں گے تو آپ تلاش حق میں قابل اطمینان ہمراہی نہیں ہو سکتے۔

کیلی: سقراط آخر کیوں؟ آپ بھی تو یہی کچھ کر رہے ہیں۔

سقراط: تب تو ہم دونوں ہی غلط کام کر رہے ہیں۔ پھر بھی میرے دوست میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ آپ ذرا غور کریں کہ کیا مسرت خواہ کسی بھی ذریعے سے حاصل ہو، ہمیشہ ہی اچھی ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر بات سچ ہے تو اس کا انجام نہایت ہی ناخوشگوار ہوگا۔ جس بدخبری کا علم ہمیں پہلے ہی حاصل ہو چکا ہے وہ اور اس جیسی بے شمار برائیاں رونما ہوں گی۔

کیلی: سقراط یہ صرف آپ ہی کی رائے ہے۔

سقراط: چلیے یہ بتایئے کیا جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس پر سنجیدگی سے قائم ہیں؟

کیلی: میں قائم ہوں۔

سقراط: گویا آپ واقعی سنجیدہ ہیں۔ چلیے بحث کو آگے بڑھاتے ہیں۔

کیلی: بخوشی۔

سقراط: اگر آپ بحث آگے بڑھانے پر رضامند ہیں تو میرے لیے اس سوال کا تعین کر دیجیے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی شے ایسی ہے جسے آپ علم کہتے ہیں۔

کیلی: جی ہے۔

سقراط: اور کیا آپ نے ابھی ابھی یہ نہیں کہا تھا کہ علم کے لیے ہمت درکار ہے۔

کیلی: کہا تھا۔

سقراط: اور آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ علم اور ہمت دو علیحدہ علیحدہ شے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں؟

کیلی: یقیناً کہا تھا۔

سقراط: کیا آپ یہ بھی بتائیں گے کہ مسرت اور علم ایک ہی ہیں یا نہیں؟

کیلی: بے عقل آدمی دونوں ایک نہیں ہیں۔

سقراط: کیا آپ یہ کہیں گے کہ ہمت اور مسرت میں فرق ہوتا ہے۔

کیلی: یقیناً۔

سقراط: کیلی کلس چلیے ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ امتیاز کرنے والے کہتے ہیں کہ مسرت اور نیکی دونوں ایک ہی ہیں۔ لیکن علم اور ہمت باہم ایک دوسرے سے اور نیکی سے بھی مختلف ہیں۔

کیلی: اچھا یہ بتائیے کہ فاکسنن (Foxton) کا سقراط کیا کہتا ہے۔ کیا وہ اسے تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔

سقراط: وہ تسلیم نہیں کرتا جب حقیقت کھلے گی تو کیلی کلس بھی تسلیم نہیں کرے گا۔ میرا خیال ہے آپ یہ بات مان لیں گے کہ خوش قسمتی اور بدقسمتی ایک دوسرے کی ضد ہوتی ہیں؟

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: اگر وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں تو صحت اور بیماری کی طرح، ایک آئے گا تو دوسرا رخصت ہو جائے گا۔ کوئی بھی فرد ان دونوں حالتوں میں ایک ساتھ مبتلا نہیں رہ سکتا۔ دونوں حالتیں بیک وقت اس میں نہیں ہوں گی۔ اس میں ایک نہ ایک حالت ضرور موجود رہے گی۔

کیلی: آپ کہہ کیا رہے ہیں۔

سقراط: کسی بھی جسمانی مرض کی مثال لے لیجیے۔ کسی کی آنکھ میں مرض ہے جسے آشوبِ چشم کہتے ہیں۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: لیکن یہ تو ممکن نہیں کہ بیک وقت اس کی آنکھ صحت مند بھی ہو اور بیمار بھی۔

کیلی: ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔

سقراط: اور جب اس نے آشوب چشم سے نجات حاصل کر لی۔ تو کیا وہ آنکھوں کی صحت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ کیا انجام کار یہ ہوگا، کہ وہ صحت اور بیماری ہر دو سے چھٹکارا پائے گا؟

کیلی: یقیناً نہیں۔

سقراط: یہ امر انوکھا بھی ہوگا اور غیر معقول بھی۔

کیلی: بہت زیادہ۔

سقراط: میرا خیال ہے کہ وہ دونوں سے متاثر ہوتا ہے اور باری باری ان سے چھٹکارا پاتا ہے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: اسی طرح اس میں قوت اور کمزوری دونوں موجود ہو سکتی ہیں۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: اور اسی طرح وہ باری باری قوت اور کمزوری کا شکار ہو سکتا ہے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: تیزی اور سستی کا بھی؟

کیلی: یقیناً۔

سقراط: کیا وہ نیکی اور مسرت اور اسی طرح باری باری ان کی ضد یعنی بدی اور کرب کا حامل ہو سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا ہے۔

کیلی: یقیناً ہو سکتا ہے۔

سقراط: اگر کوئی ایسی شے ہے جو ایک فرد میں بیک وقت موجود بھی ہو سکتی ہے اور نہیں بھی، تو ظاہر ہے کہ وہ نیکی اور بدی نہیں ہو سکتی۔ کیا ہم اس بات پر متفق ہیں؟ برائے مہربانی سوچ کر جواب دیجیے گا۔

کیلی: مجھے آپ سے اتفاق ہے۔

سقراط: آیئے ہم اپنی گزشتہ تسلیم شدہ باتوں کی طرف مراجعت کریں۔ بھوک یعنی صرف بھوک کی حالت خوشگوار ہوتی ہے یا تکلیف دہ۔ آپ نے کیا کہا تھا؟

کیلی: میں نے کہا تھا تکلیف دہ۔ لیکن بھوک کی حالت میں کھانا بہت ہی اچھا محسوس ہوتا ہے۔

سقراط: میں جانتا ہوں لیکن بھوک تو تکلیف دہ ہوتی ہے ناں۔ کیا میں صحیح نہیں کہہ رہا ہوں؟

کیلی: جی آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔

سقراط: پیاس بھی اذیت ناک ہوتی ہے۔

کیلی: جی ہاں بہت زیادہ۔

سقراط: کیا ضروری ہے کہ میں مزید مثالیں پیش کروں یا آپ یہ مانتے ہیں کہ تمام خواہشات تکلیف دہ ہوتی ہیں؟

کیلی: میں تسلیم کرتا ہوں اس لیے مزید مثالوں کی ضرورت نہیں ہے۔

سقراط: [illegible] آپ جانتا ہیں کہ پیاس کی صورت میں مشروب پینے سے [illegible] حاصل ہوتی ہے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: اور آپ نے یہ بھی مانا ہے کہ پیاس میں مبتلا ہونا پیاس تکلیف کی نشاندہی کرتا ہے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: اور مبتلا ہونا [illegible] مسرت اور حاجت پوری ہونے کا اطمینان ظاہر ہوتا ہے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: پینے میں مسرت ہے۔

کیلی: یقیناً۔

سقراط: جب آپ پیاسے ہوتے ہیں۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: اور تکلیف میں ہوتے ہیں۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ یہی کہ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ پیاسا ہونے کے بعد آپ مشروب پیتے ہیں تو مسرت اور تکلیف بیک وقت واقع ہوتے ہیں؟ دونوں حالتیں ایک ساتھ ہی وارد نہیں ہوتیں؟ اور ایک ہی عضو کو متاثر کرتی ہیں۔ خواہ وہ روحانی ہو یا جسمانی؟ کون سا عضو متاثر ہوتا ہے۔ اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ کیا یہ بات درست نہیں ہے؟

کیلی: درست ہے۔

سقراط: آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ کوئی ایک شخص بیک وقت خوش بخت اور بد بخت نہیں ہوسکتا؟

کیلی: جی میں نے کہا تھا۔

سقراط: لیکن آپ نے تسلیم کیا تھا کہ جب وہ اذیت میں ہو تو اسے مسرت بھی مل سکتی ہے؟

کیلی: بات صاف ہے۔

سقراط: پھر تو مسرت وہی نہ ہوئی جو خوش بختی ہے یا تکلیف وہی ہے جو بد بختی ہے۔ تو کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ نیکی وہی ہے جو مسرت ہے؟

کیلی: سقراط کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ آپ کی اس نعرہ بازی کا مطلب کیا ہے۔

سقراط: کیلی کلس آپ اچھی طرح جانتے ہیں لیکن انجان ہونے کا بہانہ کر رہے ہیں۔

کیلی: بحث جاری رکھیے۔ احمق نہ بنایئے۔ اسی صورت میں آپ خود سمجھ جائیں گے کہ میری فہمایش کے پیچھے آپ کیسا فلسفہ بگھارتے ہیں۔

سقراط: یہ بتایئے کوئی شخص جب مشروب پی لیتا ہے تو اس کی تکلیف بھی ختم ہو جاتی ہے اور خوشی بھی۔

کیلی: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کہہ کیا رہے ہیں؟

جارجیاز: نہیں نہیں کیلی کلس آپ جواب دیں۔ ہمارے ہی لیے دیں۔ ہم بحث کو اس کے انجام تک سننا چاہتے ہیں۔

کیلی: جارجیاز بحث جاری رہے گی میں تو صرف سقراط کو ان کی پیچ پوچ باتوں پر ٹوکتا ہوں جس کے وہ عادی ہیں۔ وہ ہمیشہ ایسے سوالات پر بحث کرتے ہیں جو فضول اور پوچ ہوتے ہیں۔

جارجیاز: کیا فرق پڑتا ہے کیلی کلس آپ کی حیثیت پر تو آنچ نہیں آتی۔ سقراط کو اپنے انداز سے بحث کرنے دیجیے۔

کیلی: ٹھیک ہے سقراط آپ اپنے چھوٹے چھوٹے فضول سوالات پوچھیے جارجیاز انھیں سننا چاہتے ہیں۔

سقراط: کیلی کلس مجھے آپ پر رشک آتا ہے۔ آپ کو پہلے اعلیٰ رموز واسرار سے آشنا کرایا گیا، بعد میں آپ کو ادنیٰ رموز واسرار کی تعلیم دی گئی۔ میرا خیال تھا کہ اس کی اجازت نہیں تھی۔ چھوڑیئے اس بات کو آیئے اپنی بحث کی طرف پلٹیں۔ کیا کوئی انسان پیاس اور مشروب پینے کی مسرت سے بیک وقت چھٹکارا نہیں پاتا؟

کیلی: درست ہے۔

سقراط: اگر اسے بھوک لگ رہی ہے یا کوئی اور خواہش ستا رہی ہے تو کیا اسے خواہش اور مسرت سے بیک وقت نجات حاصل نہیں ہوتی؟

کیلی: بالکل صحیح ہے۔

سقراط: گویا اس کے لیے درد اور خوشی کا ایک ہی ساتھ خاتمہ ہوتا ہے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: لیکن وہ ایک ہی وقت میں نیکی اور بدی سے دست بردار نہیں ہوتا۔ یہ آپ نے تسلیم کیا تھا۔ آپ اب بھی اس پر قائم ہیں۔

کیلی: جی ہاں میں قائم ہوں لیکن اس سے نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

سقراط: یہ کیا بات ہوئی، میرے دوست نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نیکی وہی شے ہے جو مسرت ہے یا بدی ویسی ہی ہے جیسی اذیت۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ درد اور خوشی کا خاتمہ ساتھ ہی ساتھ ہوتا ہے لیکن نیکی اور بدی کا نہیں۔ کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس صورت میں بھلا مسرت، درد کی طرح یا تکلیف بدی جیسی کس طرح ہو سکتی ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ اب ہم اس بات پر کسی ایسے زاویہ سے غور کریں۔ جس پر میرے خیال میں آپ نے بحث کے آغاز میں کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ جب آپ نے ان کی نشاندہی کی تھی۔ یہ بتائیے کیا نیکی صرف اس لیے نیکی نہیں ہے کہ اس میں نیکی کی خوبیاں موجود ہیں، جس طرح حسین وہی ہے جس میں حسن موجود ہو۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: کیا آپ احمقوں اور بزدلوں کو اچھا آدمی سمجھتے ہیں؟ کیونکہ ابھی کچھ دیر قبل آپ نے کہا تھا کہ جرأت مند اور دانا افراد نیک ہوتے ہیں۔ کیا آپ یہ بات اب نہیں کہیں گے؟

کیلی: یقیناً۔

سقراط: کیا آپ نے کسی احمق بچے کو خوشیاں مناتے نہیں دیکھا؟

کیلی: جی دیکھا ہے۔

سقراط: اور احمق آدمی کو بھی؟

کیلی: جی یقیناً لیکن آپ کا مقصد کیا ہے؟

سقراط: کوئی خاص نہیں آپ صرف اس کا جواب عنایت فرمائیں۔

کیلی: جی میں نے جواب دے دیا ہے۔

سقراط: آپ نے کسی معقول آدمی کو خوشیاں مناتے اور غمگین ہوتے دیکھا ہے؟

کیلی: جی ہاں دیکھا ہے۔

سقراط: اچھا یہ بتائیے کہ دانشمند زیادہ خوش اور غمگین ہوتا ہے یا احمق؟

کیلی: دونوں ہی برابر ہوتے ہیں، اس ضمن میں میری یہی رائے ہے۔

سقراط: چلیے بہت ہو گیا اب یہ بتائیے کہ آپ نے کسی بزدل کو جنگ کرتے دیکھا ہے؟

کیلی: یقین سے نہیں کہہ سکتا۔

سقراط: یہ بھی بتائیے دشمن کی پسپائی پر کسے زیادہ خوشی ہوتی ہے بزدل کو یا بہادر کو؟

کیلی: میں کہہ سکتا ہوں کہ دونوں کی اکثریت کو، بہر حال دونوں یکساں ہی خوشی مناتے ہیں۔

سقراط: کوئی حرج نہیں۔ یہ طے ہے کہ صرف بزدل ہی نہیں بلکہ بہت بہادر بھی خوشی مناتے ہیں۔

کیلی: بہت بڑھ چڑھ کر۔

سقراط: اور احمق بھی، جیسا کہ دکھائی دیتا ہے؟

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: تو کیا دشمن کی آمد پر صرف بزدلوں کو ہی صدمہ پہنچتا ہے یا بہادروں کو بھی؟

کیلی: دونوں ہی کو صدمہ پہنچتا ہے۔

سقراط: کیا دونوں کو برابر صدمہ پہنچتا ہے۔

کیلی: میرا خیال ہے کہ بزدلوں کو نسبتاً زیادہ صدمہ ہوتا ہے۔

سقراط: کیا انھیں دشمن کے جانے پر زیادہ مسرت نہیں ہوتی؟

کیلی: یہ ممکن ہو سکتا ہے۔

سقراط: تو کیا احمق، دانشمند اور بزدل و بہادر، آپ کے قول کے مطابق یکساں طور پر خوش اور غمگین ہوتے ہیں یا کیا احمق کو دانشمندوں سے زیادہ خوشی ہوتی ہے؟

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: لیکن دانا اور بہادر، نیک اور احمق، بزدل اور برے ہوتے ہیں۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: اس طرح گویا نیک اور بد دونوں کو تقریباً تقریباً یکساں ہی خوشی اور رنج ہوتا ہے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: تو کیا نیک اور ایسے جو اچھے بھی اور برے بھی ایک ہی معیار کے ہوتے ہیں یا کیا نیکی اور برائی دونوں میں برے آدمی کا پلہ بھاری ہوتا ہے؟ (یعنی زیادہ مسرت اور رنج کے حصول میں)

کیلی: مجھے کچھ پتا نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

سقراط: بھلا یہ کیا بات ہوئی! آپ کو یاد نہیں کہ آپ نے کہا تھا کہ نیک اس لیے نیک ہے کہ نیکی اس میں شامل ہے، بد اس لیے کہ بدی اس میں شامل ہے۔ مزید یہ بھی کہ خوشیاں نیکی نہیں اور رنج

بری نہیں۔

کیلی: مجھے یاد ہے۔

سقراط: تو کیا یہ خوشیاں یا نیکیاں ان میں موجود نہیں ہوتیں جو خوشیاں مناتے ہیں، اگر مناتے ہیں؟

کیلی: یقیناً۔

سقراط: اس طرح گویا وہ اس وقت خوشیاں مناتے ہیں جب ان میں نیکی موجود ہوتی ہے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: اور جو تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں، بدی یا رنج ان کے شامل حال ہوتے ہیں۔

کیلی: جی ہاں

سقراط: تو کیا آپ پھر بھی کہیں گے کہ بدی صرف اس لیے بدی ہے کہ اس میں بدی موجود ہوتی ہے۔

کیلی: یہی کہوں گا۔

سقراط: یعنی جو خوشی مناتے ہیں وہ نیک ہوتے ہیں اور جو غم میں مبتلا ہوتے ہیں وہ برے ہوتے ہیں۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: نیکی اور بدی کی مقدار مسرت اور رنج کی مقدار کے لحاظ سے بدلتی رہے گی۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: کیا دانش منداور احمق، بہادر اور بزدل ایک ہی مقدار میں خوشی اور رنج میں مبتلا ہوتے ہیں یا آپ یہ کہیں گے بزدل کے یہاں یہ مقدار زیادہ ہوتی ہے۔

کیلی: میں کہوں گا کہ بزدل کے یہاں اس کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔

سقراط: چلیے آپ ذرا ہماری تسلیم شدہ باتوں سے نتیجہ اخذ کرنے میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ کیونکہ داناؤں کے قول کے مطابق اچھی بات کا دو تین بار دہرانا اور اس پر نظر ڈالنا بہتر ہوتا ہے۔ کیا ہم دانشمند اور بہادر آدمی کو نیک قرار دیتے ہیں؟

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: احمق اور بزدل کو برا سمجھتے ہیں۔

کیلی: یقیناً۔

سقراط: جسے خوشی میسر ہوتی ہے وہ نیک ہے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: جسے رنج ہو وہ برا ہے۔

کیلی: یقیناً۔

سقراط: نیک اور بد دونوں ہی کو خوشی بھی میسر ہے اور رنج بھی لیکن غالباً برے آدمی کو رنج زیادہ ہوتا ہے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: اس طرح ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ برا آدمی بھی اتنا برا یا اچھا ہوتا ہے جتنا نیک آدمی۔ یا شاید اس سے بھی بہتر؟ کیا گزشتہ بحث سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکلتا۔ کیونکہ ہم پہلے یہ کہہ چکے ہیں کہ نیک اور پرمسرت دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے؟ کیلی کلس آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں۔

کیلی: سقراط میں آپ کی باتیں سنتا اور ہاں میں ہاں ملاتا رہا ہوں۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص آپ کو کھیل ہی کھیل میں کوئی شے پکڑا دے تو آپ ایک بچے کی طرح اسے دبوچ رکھیں گے۔ اور واپس نہیں دیں گے لیکن کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ میں یا کوئی دوسرا آدمی اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ کچھ خوشیاں اچھی ہوتی ہیں اور کچھ بُری؟

سقراط: کیلی کلس افسوس ہے آپ کتنے ناانصاف ہیں۔ آپ مجھے بچہ سمجھ کر میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں کہ میں کبھی ایک بات کہتا ہوں کبھی دوسری۔ گویا آپ مجھے فریب میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں باوجودیکہ میں نے شروع سے ہی یہ مان لیا تھا کہ آپ میرے دوست ہیں اور اگر آپ میری مدد پر آتے تو اس طرح فریب تو نہ دیتے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے اور اب مجھے قدیم محاورے کے مطابق جو کچھ سر پڑا ہے، نبھانا ہی پڑے گا اور آپ سے حتیٰ المقدور استفادہ کر لوں۔ چلیے جہاں تک آپ کی بات میری سمجھ میں آتی ہے وہ میرے خیال میں یہی ہے کہ چند مسرتیں اچھی ہوتی ہیں اور چند بُری؟

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: مفید اچھی ہوتی ہیں اور مُضر بُری۔

کیلی: بے شک۔

سقراط: مفید وہ ہوتی ہیں جن سے کچھ نہ کچھ اچھائی اور مضر وہ جن سے کوئی نہ کوئی برائی حاصل ہوتی ہے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: مثال کے طور پر کھانے پینے کی مسرتوں کو لے لیتے ہیں ابھی ہم نے ان کا ہی ذکر کیا تھا۔ آپ کا خیال ہے کہ ایسی خوشی جس سے صحت یا کسی اور جسمانی خوبی کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اچھی ہوتی ہے اور اس کی ضد بری۔

کیلی: یقیناً۔

سقراط: اس طرح اچھے درد بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔

کیلی: اس میں کیا شک ہے۔

سقراط: کیا ہمارے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اچھے یا برے درد ہی کا انتخاب کریں؟

کیلی: کیوں نہیں۔

سقراط: لیکن برے کا انتخاب نہ کریں۔

کیلی: ظاہر ہے۔

سقراط: کیونکہ آپ کو یاد ہوگا کہ پولس اور میں اس بات پر متفق ہوئے تھے کہ ہمارے تمام عمل نیکی کے حصول ہی کے لیے ہوتے ہیں۔ کیا آپ بھی ہمارے ساتھ اس بات پر اتفاق کریں گے کہ نیکی ہی ہمارے تمام عمل کی غایت ہے۔ اور ہمارے تمام عمل نیک مقصد کے تحت ہونا چاہیں۔ نہ کہ نیک مقصد عمل کے لیے ہو۔ کیا آپ ہم دونوں کی رائے میں تیسری رائے کا اضافہ کریں گے؟

کیلی: کروں گا۔

سقراط: چلیے آپ کا مطلب یہ ہوا کہ دیگر باتوں کی طرح ہمیں مسرت کو بھی نیکی کے لیے تلاش کرنا چاہیے اور نیکی کو مسرت کے لیے نہیں۔

کیلی: اس میں کیا شک ہے۔

سقراط: لیکن یہ ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ اچھی اور بری مسرتوں میں تمیز کر سکے اور کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ اسے دونوں کا تفصیلی علم یا ہنر آتا ہو۔

کیلی: جی ہاں اسے انتخاب کا ہنر آنا چاہیے۔

سقراط: اس مرحلے پر میں آپ کو وہ باتیں یاد دلانا چاہوں گا جو میں نے جارجیاز اور پولس سے کہی تھیں۔ یقیناً آپ بھولے نہیں ہوں گے کہ میں نے کہا تھا کہ چند طریق کار ایسے ہوتے ہیں جن کا ہدف ہی مسرت ہوتا ہے وہ اس کے بہتر اور بدتر ہونے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ وہ یہ جانتے ہیں

کہ ایسے طریقے بھی ہیں جو نیک و بد کی شناخت سے واقف ہیں اور اس سلسلے میں، میں نے کھانا پکانے کی مثال دی تھی جسے میں ہنر نہیں بلکہ تجربہ سمجھتا ہوں اور جسے میں اول الذکر زمرے میں شمار کرتا ہوں جس کا تعلق مسرت سے ہے۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ بلاغت کے فن کا تعلق اس طبقے سے ہے جو نیکی سے وابستہ ہے۔ مجھے روشنی کے دیوتا کی قسم کیلی کلس آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ نہ تو میرا مذاق اڑائیں اور نہ ہی یہ سمجھیں کہ میں آپ سے مذاق کر رہا ہوں۔ آپ خواہ مخواہ ایسے جواب نہ دیں جو آپ کی رائے کے خلاف ہوں۔ کیونکہ آپ کو یہ احساس ہو چکا ہوگا کہ ہم حیات انسانی کی روش کے بارے میں بحث کر رہے ہیں اور جس شخص میں ذرا سی بھی سمجھ ہے اسے احساس ہوگا یہ موضوع کتنا نازک اور اہم ہے۔ کیا اسے وہی طریق زندگی اپنانا چاہیے جس کے آپ داعی ہیں اور اس بات پر عمل پیرا ہونا چاہیے جسے آپ مجمع میں گفتگو کا مردانہ جزو قرار دیتے ہیں، اسے بلاغت کا ذوق پیدا کرنا چاہیے۔ عمومی معاملات میں مروجہ اصولوں کے مطابق مصروف ہونا چاہیے یا اسے فلسفہ کی رو سے زندگی بسر کرنا چاہیے۔ یہ بھی بتائیے کہ اول الذکر، موخر الذکر سے کس قدر مختلف ہے لیکن ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ پہلے دونوں کی شناخت کر لیں۔ جیسا کہ میں پہلے کر چکا ہوں اور جب ہم ان کو تمیز کرنے پر متفق ہو جائیں تو پھر یہ معلوم کرتے جائیں کہ وہ ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں اور ہمیں ان میں سے کس کا انتخاب کرنا چاہیے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ غالباً ابھی تک آپ میرا مفہوم نہیں سمجھے۔

کیلی: جی ہاں، نہیں سمجھا۔

سقراط: چلیے میں اپنی بات زیادہ وضاحت سے بیان کر دیتا ہوں۔ اس امر کے پیش نظر کہ میں اور آپ دونوں ہی اس بات پر متفق ہیں کہ ایک ایسی شے ہے جسے نیکی اور ایک دوسری ایسی شے بھی ہے جسے مسرت کہا جاتا ہے۔ مزید برآں یہ بھی کہ مسرت وہی شے نہیں ہے جو نیکی ہے اور ایک یعنی مسرت کے حصول کا طریقہ اور عمل دوسرے یعنی نیکی کے حصول کے طریقہ اور عمل سے مختلف ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ بتا دیں کہ آپ یہاں تک تو مجھ سے متفق ہیں نا۔ کیا آپ متفق ہیں؟

کیلی: جی ہوں۔

سقراط: چلیے اب میں آگے بڑھتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ کیا آپ مجھ سے متفق ہیں۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں

کہ میں نے سچ بولا تھا، جب میں نے جارجیاز اور پولس سے کہا تھا کہ کھانا پکانا ایک تجربہ ہے
بالکل ہی نہیں اور یہ بھی کہ بلاغت ایک فن ہے جو مریض کی جسمانی ساخت اور مزاج پر توجہ دیتا ہے
اور ہر مریض کے لیے تاثر پیدا کرنے کے اصول اور دلائل ہیں۔ کھانا پکانے کا عمل اپنا پیدا کردہ
مسرت کے لیے اس کی ساخت اور مزاج کے لیے کسی اصول اور دلائل کا پابند نہیں ہے۔ وہ
براہ راست نتیجہ پیدا کرنے پر اپنی توجہ مبذول کرتا ہے اور کسی اور پہلو پر نہ تو غور کرتا ہے اور نہ ہی
اس کے بارے میں کوئی تخمینہ لگاتا ہے۔ وہ محض تجربہ اور لگا بندھا عمل ہے اور اس مسرت کو پیدا
کرنے کے لیے جو طریقہ وہ خاتون اپناتی ہے اسی کی یاد دلاتا ہے۔ آپ سے پہلے میں یہ کہوں گا
کہ آپ غور کریں کہ کیا میں نے جو کہا ہے اسے ثابت کر دیا ہے یا نہیں۔ سوچنے کی دوسری بات یہ
بھی ہے کہ کیا ایسے دیگر طریقے بھی ہیں جن کا تعلق روح سے ہے۔ ان میں سے چند ایک فنی
طریقے ہیں جس میں روح کے اعلیٰ ترین مفادات کی گنجائش رکھی جاتی ہے اور دوسرے ایسے ہیں
جن میں اس مفاد کی تحقیر کی جاتی ہے اور گزشتہ معاملہ کی طرف روحانی مسرت کا لحاظ رکھا جاتا ہے
اور یہ کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن حصول مسرت میں اس کے نیک و بد ہونے پر کوئی
توجہ نہیں دی جاتی۔ اس کی اور کوئی غایت نہیں ہوتی کہ اطمینان حاصل ہو۔ خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔
کیلی کلس میرے خیال سے ایسے طریقے مروج ہیں اور اسی قبیل کے طریقوں کو میں خوشامد کہتا
ہوں۔ خواہ وہ طریقے جسمانی ہوں یا روحانی اور جسے بغیر یہ سوچے سمجھے کہ وہ اچھے ہیں یا برے،
صرف حصول مسرت کے لیے برتا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ بتائیں کہ آپ ہمارے ان
خیالات سے متفق ہیں یا اختلاف رکھتے ہیں۔

کیلی: مجھے اختلاف نہیں ہے، برخلاف اس کے میں متفق ہوں۔ کیونکہ اس بحث کو سمیٹنے کا یہی طریقہ ہے
اس طرح میں اپنے دوست جارجیاز کی خواہش پوری کر دوں گا۔

سقراط: یہ بھی بتائیے کہ یہ تصور ایک روح پر صادق آتا ہے یا دو اور اس سے زیادہ پر۔

کیلی: وہ دو یا اس سے زیادہ پر یکساں طور پر صادق آتا ہے۔

سقراط: اس طرح آدمی اس کے اصل مفادات کو نظر انداز کرتے ہوئے پورے مجمع کو خوش کر سکتا ہے؟

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: کیا آپ مجھے ایسے کسی شغل کا نام بتا سکتے ہیں جو پوری انسانیت کو خوش کرتا ہو۔ چلیے چھوڑیے اگر

ہوتا ہے۔

سقراط: تو کیلی کلس یہی وہ باتیں نہیں ہیں جنھیں ہم نے ابھی ابھی خوشامد کے زمرے میں شمار کیا تھا۔

کیلی: بالکل درست ہے۔

سقراط: فرض کیجیے ہم تمام منظومات سے نغمگی، تال، اور وزن خارج کر دیں تو کیا محض تقریر باقی نہیں بچے گی؟

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: اس طرح گویا نظم بھی بلاغت ہی کی ایک قسم ہے۔

کیلی: درست ہے۔

سقراط: کیا تھیٹر میں فن کی نمائش کرنے والے شعرا آپ کو بلاغت کے ماہر نہیں نظر آتے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: چلیے ہمیں ایک ایسی قسم کی بلاغت کا پتا چلا ہے جس کا رخ مردوں، عورتوں، بچوں، آزاد افراد اور غلاموں کی طرف ہوتا ہے۔ لیکن یہ ہمارے ذوق اور پسند پر پوری نہیں اترتی کیونکہ ہم اسے خوشامدی (Flattery) سے ملوث کہہ چکے ہیں۔

کیلی: بالکل درست ہے۔

سقراط: بہت خوب اب ذرا یہ بتائیے کہ آپ کا اس دوسری قسم کی بلاغت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ جس کا مخاطب اہل ایتھنز یا دوسری ریاستوں کے آزاد افراد کے اجتماعات ہوتے ہیں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بلاغت کے ماہرین کا مقصد بہترین کا حصول ہوتا ہے یا اور کیا وہ اپنی تصاویر کے ذریعے شہریوں کی بہتری کے لیے کوشاں ہوتے ہیں یا وہ بھی دیگر انسانوں کی طرح خودغرضی کے سبب عوامی مفادات کو پس پشت ڈال کر عوام الناس سے بچوں کی طرح اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے انھیں تفریح مہیا کرتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں سوچتے کہ ان کی حالت بہتر ہو رہی ہے یا بدتر۔

کیلی: مجھے امتیاز کرنا چاہیے۔ کچھ ایسے ضرور ہوتے ہیں جنھیں اپنی تقریر میں عوامی مفاد کی فکر ہوتی ہے۔ ہاں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں آپ نے ابھی بیان کیا ہے۔

سقراط: آپ کے اس اقرار سے کہ بلاغت دو قسم کی ہوتی ہے مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔ ایک وہ ہے جو محض ''خوشامد'' اور شرمناک لفاظی ہوتی ہے۔ دوسری جو برتر ہوتی ہے اور اس کا ہدف شہریوں کی روحانی

اصلاح اور ترقی ہوتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہی کچھ پیش کرے جو بہترین ہوتا ہے۔ خواہ سامعین اسے پسند کریں یا نہ پسند، لیکن کیا آپ کا ایسی بلاغت سے کبھی سابقہ پڑا ہے یا کسی ایسے ماہر کی نشاندہی کر سکتے ہیں یا جانتے ہیں جو اس طرح کا ہو۔ بتائیے نا وہ کون ہے۔

کیلی: سچ سچ بتادوں جو ماہرین بلاغت اس وقت حیات ہیں ان میں میری رائے میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے۔

سقراط: بہت خوب، چلیے پھر گزشتہ ادوار کے کسی ایسے ماہر کا نام بتا دیجیے۔ جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اس نے اہل ایتھنز کی اصلاح کی ہو، جس نے ان کی بدتر حالت کو دیکھ کر اسے بہتر بنا دیا ہو اور اس نے یہ کام اپنی بلاغت کے آغاز سے اختتام تک انجام دیا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے ایسی کسی شخصیت کا علم نہیں ہے۔

کیلی: تعجب ہے آپ نے یہ نہیں سنا ہے کہ تھیمسٹوکلس (Themistocles) ایک اچھا آدمی تھا۔ ایسے ہی انسان سیمون (Cimon) اور ملٹیاڈیس (Miltiades) بھی تھے۔ پیریکلس کا شمار بھی ایسے لوگوں میں ہوتا ہے جس کا ابھی انتقال ہوا ہے۔ اس کی بلاغت تو آپ نے خود سنی ہے۔

سقراط: کیلی کلس میں نے سنا ہے۔ وہ سب کے سب نیک لوگ تھے۔ آپ نے جو بات شروع میں کہی تھی کہ اگر یہ درست ہے کہ حقیقی نیکی صرف ہماری اپنی اور دوسروں کی خواہشات کی تکمیل میں ہے لیکن اگر یوں نہ ہو اور اگر یوں ہو کہ۔ جیسا کہ بعد میں ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ چند خواہشات ایسی ہیں جن کی تکمیل ہمیں بہتر انسان بناتی ہے اور چند کی تکمیل ہمیں بدتر انسان بناتی ہے۔ ہمیں اول الذکر کی تکمیل نہیں بہتر انسان اور دیگر کی تکمیل ہمیں بدتر انسان بناتی ہے۔ اول الذکر کی تکمیل کرنا چاہیے دوسری قسم کی نہیں اور ان میں امتیاز کرنا ایک فن ہے۔ کیا آپ کے مذکورہ مدبروں میں سے کس نے یہ امتیاز برتا ہے؟

کیلی: واقعی میں نہیں بتا سکتا۔

سقراط: جی کیلی کلس یقیناً آپ نہیں بتا سکتے۔ آپ ذرا غور کریں تو ایک ایسا آدمی مل ہی جائے گا۔ چلیے اگر ہم ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں کہ ایسا کوئی شخص گزرا ہے جو ہماری بیان کردہ صفات کا حامل ہو۔ کیا وہ ایسا آدمی نہیں ہوگا۔ جس کے ہر قول کا ہدف بہترین ہی کا حصول ہو۔ وہ کسی نہ کسی معیار کے حوالے سے گفتگو کرے، ادھر اُدھر کی نہ ہانکے، بالکل اسی طرح جس طرح مصور، معمار، جہاز

بنانے والے، یا کسی اور فن کے ماہر اپنے کام ہی پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ وہ خواہ مخواہ کی چیزیں منتخب نہیں کرتے، بالکل وہ اسے ایک مخصوص شکل دینے کی کوشش کرتے ہیں؟ یہ ماہر ہر چیز نہایت سلیقے سے کام میں لاتے ہیں اور ایک جزو کو اس طرح تیار کرتے ہیں کہ وہ دوسرے جزو سے مکمل ہم آہنگ ہوتا ہے۔ وہ اپنے کام کو اس وقت تک جاری رکھتا ہے جب تک ایک باقاعدہ، متناسب کل وجود میں نہیں آ جائے۔ یہ بات ہر اہل ہنر پر صادق آتی ہے۔ اسی طرح تربیت دینے والے اور معالجین جن کا ہم اس سے قبل ذکر کر چکے ہیں وہ جسم کو باقاعدہ اور متناسب بناتے ہیں۔ کیا آپ اس سے انکار کریں گے؟

کیلی: جی نہیں میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔

سقراط: گویا جس مکان میں سلیقہ اور باقاعدگی کا دور دورہ ہو وہ اچھا ہوتا ہے اور جس میں افراتفری ہو وہ برا ہوتا ہے؟

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: یہی بات بحری جہاز پر بھی صادق آتی ہے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: یہی بات انسانی جسم کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: اب بتائیے روح کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ کیا نیک روح وہ ہو سکتی ہے جو افراتفری کا شکار ہو یا وہ جس میں تناسب اور آہنگ ہو؟

کیلی: ہماری گزشتہ بحث کی رو سے مجھے موخرالذکر کے حق میں کہنا پڑے گا۔

سقراط: جسم میں توازن اور تناسب کو کیا کہا جاتا ہے؟

کیلی: میں سمجھ گیا۔ غالباً آپ کا اشارہ صحت اور توانائی کی جانب ہے۔

سقراط: جی ہاں میرا یہ مطلب ہے کہ چلیے اب یہ بتائیے کہ آپ روحانی توازن اور تناسب کو کیا نام دیں گے۔ ذرا کوشش کر کے اس کے اور دوسروں کے لیے کوئی نام تجویز کیجیے۔

کیلی: سقراط آپ خود کیوں نہیں تجویز کر دیتے۔

سقراط: اگر آپ کا یہ خیال ہے تو میں نام تجویز کر دیتا ہوں۔ آپ کو یہ بتانا پڑے گا کہ آپ مجھ سے متفق ہیں

اور اگر ہیں تو آپ اپنے جواب میں اس کی تردید کریں۔ میری رائے میں متناسب جسمانی تربیت کو صحت مندی کہا جاتا ہے۔ اسی سے صحت اور دیگر تمام جسمانی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ بات سچ ہے یا نہیں؟

کیلی: سچ ہے۔

سقراط: اور "قانون" اور "جائز" نام ہے روح کے متناسب عمل اور تربیت کا، جو انسان کو قانون کا پابند اور باقاعدہ بناتا ہے۔ اس طرح ہم میں اعتدال ذات اور انصاف پیدا ہوتا ہے۔ پیدا ہوتا ہے ناں؟

کیلی: میں مانتا ہوں۔

سقراط: تو کیا ایسا ماہر بلاغت جو دیانتدار ہے اور اپنے فن کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اپنے الفاظ میں جسے وہ لوگوں کی روح سے خطاب اور اپنے کل اعمال میں استعمال کرتا ہے۔ جو کچھ وہ دیتا ہے یا لیتا ہے ہمیشہ ان دونوں باتوں پر توجہ دے گا؟ کیا اس کی یہ غایت نہیں ہوگی کہ وہ لوگوں کی روح میں انصاف سمودے اور ناانصافی باہر نکال دے۔ ہر نیکی جاگزیں کر کے ہر بدی سے پاک کر دے۔ مانتے ہیں یا نہیں۔

کیلی: مانتا ہوں۔

سقراط: کیلی کلس بتاؤ بھلا ایک ایسے مریض کو جس کی جسمانی حالت ابتر ہے اسے مزیدار کھانا اور مشروب وغیرہ کھلانے پلانے سے کیا حاصل ہوگا۔ ایسی چیزیں تو یقیناً اس کے لیے ایسے ہی مضر ہوں گی جیسے آپ نے اسے فاقہ کرایا یا اور درست انداز کے مطابق کوئی اور زیادہ نقصان دہ بات کی ہے۔ کیا یہ بات درست نہیں ہے؟

کیلی: میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا۔

سقراط: میرے رائے میں اگر کسی کی جسمانی حالت بدتر ہے تو اس کی زندگی میں کوئی افادیت باقی نہیں رہتی۔ اس صورت میں اس کی زندگی بذات خود بدتر ہے۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں ناں؟

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: آدمی صحت مند ہوگا تو طبیب بھی اسے بھوک میں کھانے اور پیاس میں پینے کا مشورہ دے گا اور اسے اپنی مرضی کے مطابق خواہشات کی تکمیل کی زحمت دے گا۔ آپ بھی اسے تسلیم کریں گے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: عالی جناب کیا یہی بات روحانی امور پر بھی صادق نہیں آتی؟ جب اس کی حالت بدتر ہو۔ وہ اعتدال واحساس سے عاری ہو، وہ ناانصافی اور ناپاکی میں ملوث ہو تو اس کو لگام دینا ضروری ہوتا ہے اور اسے ہر اس کام سے روکا جانا چاہیے جو اس کی اصلاح میں معاون نہ ہو۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: ایسا علاج خود روح کے لیے بہتر ہوگا؟

کیلی: یقیناً۔

سقراط: اور اس کی خواہشوں سے اسے منع کرنے کا مطلب اس کی سرزنش کرنا ہے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: گویا بے اعتدالی اور ضبطِ نفس سے محرومی کے مقابلے میں پابندی اور سرزنش روح کے لیے کہیں مفید ہے اور ہم ابھی اسی بات کو ترجیح دے رہے تھے۔

کیلی: سقراط آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مہربانی فرما کر یہ سوال کسی ایسے شخص سے پوچھیے جس نے اسے سمجھا ہو۔

سقراط: دیکھیے یہ وہ شخص ہے جو اصلاح سے گریزاں ہے اور اس کی سرزنش کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں جس کا ابھی بحث کے دوران ذکر کیا گیا تھا۔

کیلی: میں آپ کے الفاظ بھی سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اور میں صرف جارجیاز کی مروت میں آپ کے سوالوں کا جواب دیتا رہا ہوں۔

سقراط: بتائیے اب کیا کیا جائے۔ بحث کو درمیان میں ختم کر دیں۔

کیلی: آپ خود فیصلہ کر لیں۔

سقراط: بہت خوب لیکن لوگ کہتے ہیں کہ کہانی کا سرا ہونا چاہیے درمیان میں ختم نہیں ہونی چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری بحث بغیر سرے، ہی کے ختم ہو جائے۔ میں اسے ذرا دیر اور چلا کر اس کے جسم پر سر لگانا چاہتا ہوں۔

کیلی: سقراط آپ کتنے ظالم ہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ اور آپ کی دلیلیں قدرے آرام کریں یا آپ اس بحث میں کسی اور کو شامل کر لیں۔

سقراط: لیکن اس کے لیے کون راضی ہوگا؟ میں اس بحث کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

کیلی: یہ آپ میرے بغیر اسے ختم نہیں کر سکتے یا تو آپ سیدھی سی تقریر کریں یا خود ہی سوال کریں خود ہی جواب دیں۔

سقراط: یہ میں اپی کارمس (Epicharmus) کے یہ الفاظ دہراؤں کہ "پہلے دو آدمیوں نے باتیں کیں لیکن اب ایک ہی کافی ہوگا۔" میرا خیال ہے کہ مجھے کوئی مدد نہیں ملے گی۔ اور اگر یہ تلاش مجھے تنہا ہی جاری رکھنا ہے تو میں سب سے پہلے یہ کہوں گا کہ نہ صرف مجھے بلکہ تمام حاضرین محفل کو حق و باطل کی شناخت کی آرزو ہونی چاہیے کیونکہ حق کی شناخت ہم سب کے مشترکہ مفاد میں ہے۔ اور اب میں بحث کو اپنے خیالات کے مطابق جاری رکھوں گا۔ لیکن اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ ایسے نتائج اخذ کر رہا ہوں جو غلط ہیں تو وہ فوراً مجھے ٹوکیں اور میری تردید کریں۔ کیونکہ میں کوئی ایسی بات نہیں کہتا جس کا مجھے قطعی علم ہو میں بھی آپ لوگوں کی طرح حق کا متلاشی ہوں۔ اس لیے اگر کوئی مخالف رائے رکھنے والا دوست مضبوط دلیلیں دے گا تو میں فوراً ہی اسے قبول کر لوں گا۔ میں اس مفروضے پر بات آگے بڑھا رہا ہوں کہ ہمیں اسے اختتام تک پہنچانا ہے لیکن اگر آپ کی رائے یہ نہیں ہے تو آیئے بحث کو یہیں لپیٹ کر اپنی اپنی راہ لیں۔

جارجیاز: سقراط میرا خیال ہے کہ ہم اس وقت تک یہاں سے نہ جائیں جب تک آپ اپنی بحث کو ختم نہ کر لیں۔ مجھے نظر آتا ہے کہ اہل محفل کی بھی یہی خواہش ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، اسے مکمل طور پر سنوں۔

سقراط: جارجیاز میں بھی چاہتا تھا کہ یہ بحث کیلی کلس کی مدد سے آگے بڑھاؤں۔ اس وقت میں اسے (یوری پائڈز کے ڈرامے کے کردار) ایمفیون (Amphion) (غیر محتاط) کی جگہ زیتھس (Zethus) (محتاط) کا کردار دے دیتا۔ لیکن کیلی کلس آپ بحث جاری نہیں رکھنا چاہتے۔ تاہم مجھے امید ہے کہ آپ سنیں گے اور جہاں مجھ سے غلطی اس کی نشاندہی کر دیں گے۔ اگر آپ میری تردید کریں گے تو میں اس طرح ناراض نہیں ہوں گا جس طرح آپ مجھ سے ہیں، بدلہ میں آپ کے نام کو اپنی روح کی تختی پر بطور عظیم محسن کے کندہ کر لوں گا۔

کیلی: میرے اچھے دوست آپ فکر نہ کریں سلسلہ گفتگو جاری رکھیں۔

سقراط: میں اب تک جو بحث ہوئی ہے، اس کا خلاصہ بیان کر دیتا ہوں۔ آپ ذرا توجہ سے سنیں۔ کیا خوش مزاجی کا دوسرا نام نیکی ہے؟ کیلی کلس اور میں دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ کیا نیکی

سے حصول کے لیے خوش حالی یا عمل درآمد کیا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ خوش حالی ہے جس کی موجودگی اور اس کے لیے باعث مسرت ہوتی ہے اور نیکی وہی ہے جس کی موجودگی ہمیں نیک بناتی ہے۔ اس بات ہم تسلیم کرتے ہیں۔ ہم کیا بلکہ تمام چیزیں اسی وقت نیک ہوتی ہیں جب ہم میں اور ان میں بھی کوئی خوبی موجود ہو۔ کیلی کلس یہی میرا یقین بھی ہے۔ لیکن ہر شے کی خوبی خواہ وہ جسمانی ہو یا روحانی تخلیق کا ذریعہ ہو یا خود تخلیق ہو، انھیں بہترین طریقے سے عطا کی جاتی ہے تو وہ انھیں اتفاقاً نصیب نہیں ہو جاتی بلکہ وہ اس ترتیب، سچائی اور فن کا ثمر ہوتی ہے جو اسے سکھائی جاتی ہیں۔ کیا میں سچ نہیں کہہ رہا ہوں؟ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ میں سچ کہہ رہا ہوں اور کیا ہر شے کی خوبی اس کی تنظیم و ترتیب پہ مبنی نہیں ہوتی؟ میں کہتا ہوں، ہوتی ہے اور وہ جو بات کسی شے کو اچھا بناتی ہے وہ اس کی مناسب و موزوں ترتیب ہے جو فطری ہوتی ہے۔ میری بھی رائے ہے تو کیا وہ روح جو اپنے لحاظ سے ایک ترتیب کی حامل ہے اس سے بہتر نہیں ہے جس میں کوئی قرینہ نہ ہو؟ یقیناً بہتر ہے جس روح میں ترتیب ہو وہ سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں کیا شک ہے اور جس میں ترتیب ہو وہ اعتدال کی حامل ہوتی ہے۔ اور بلاشک اعتدال کی حامل روح نیک ہوتی ہے۔ میرے عزیز کیلی کلس اس کے علاوہ میرا جواب کیا ہو سکتا ہے۔ آپ کے پاس؟

کیلی: محترم آپ بحث جاری رکھیے۔

سقراط: چلیے میں بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کہوں گا کہ اعتدال کی حامل روح نیک ہوتی ہے اور جو روح اس کی ضد یعنی نادان اور بے اعتدالی کی حامل ہوتی ہے وہ بُری ہوتی ہے۔ بالکل درست ہے۔

مزید برآں کیا اعتدال پسند انسان وہی عمل نہیں کرے گا جو دیوتاؤں اور انسانوں کے حوالے سے مناسب ہوگا کیونکہ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ اعتدال پسند تو نہ ہوا۔ یقیناً وہ وہی کچھ کرے گا جو جائز ہوگا جس کا عمل مبنی بر انصاف اور مقدس ہوگا وہ خود منصف مزاج اور مقدس ہوگا۔ بالکل درست ہے، تو کیا وہ حوصلہ مند نہیں ہوگا؟ کیونکہ کسی اعتدال پسند شخص کا یہی فریضہ نہیں ہے کہ وہ ہر اس بات سے اجتناب کرے اور اس پر عمل نہ کرے جس پر اس کو عمل نہیں کرنا چاہیے۔ یہ چیزیں خواہ انسان ہوں یا خوشی ہو یا غم، اسے چاہیے کہ وہ موقع کی مناسبت سے اسے صبر کے ساتھ برداشت کرے۔ کیلی کلس یہی سبب ہے کہ اعتدال پسند شخص ہماری تشریح کے مطابق منصف مزاج، حوصلہ مند اور مقدس ہوگا۔ وہ نیک انسان کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اور نہ ہی نیک آدمی کوئی ایسا کام اس

طریقے سے کرے گا جو نہ اچھا ہو اور نہ مکمل اور جو شخص کسی کام کو سلیقے سے انجام دے وہ یقیناً خوش و خرم اور برکتوں کا حامل ہوگا۔ اور ہر انسان جو بدی کا مرتکب ہو بدنصیب ہوگا۔ موخر الذکر وہی آدمی ہے جس کی آپ توصیف کر رہے تھے۔ وہ بے اعتدال یعنی اعتدال پسند کی ضد تھا۔ میرا یہی خیال ہے اور میں ان باتوں کو سچ مانتا ہوں۔ اور اگر یہ سچ ہیں تو مزید یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ جس کسی کو خوش رہنے کی آرزو ہو تو اسے چاہیے کہ اعتدال پسندی پر عمل کرے۔ اسے بے اعتدالی سے حتی المقدور دور بھاگ جانا چاہیے۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنی زندگی میں ترتیب اور سلیقہ پیدا کرے تاکہ وہ کسی سزا کا حقدار نہ بنے۔ تاکہ ہمیشہ خوش و خرم رہے۔ میری رائے میں ہر انسان کا یہی مقصدِ حیات ہونا چاہیے اور اسے چاہیے کہ اس کے حصول کے لیے وہ اپنی اور ریاست کی تمام تر توانائیاں کام میں لائے تاکہ وہ اعتدال اور انصاف کا حامل ہو اور خوش رہے۔ اسے چاہیے کہ اپنی بے لگام خواہشوں کا کرب برداشت نہ کرے اور ان کے حصول کی نہ ختم ہونے والی حرص کے سبب ڈاکا مارنا شروع کر دے گا۔ ایسا شخص نہ دیوتاؤں کا دوست ہو سکتا ہے اور نہ ہی انسانوں کا کیونکہ وہ رفاقت کا اہل نہیں ہوتا ہے اور جو رفاقت کا اہل نہیں ہوتا وہ کسی کو اپنا رفیق بھی نہیں بنا سکتا۔ کیلی کلس یاد رکھو فلسفیوں کا قول ہے کہ رفاقت، دوستی، ترتیب، اعتدال اور انصاف ہی زمین و آسمان اور دیوتاؤں اور انسانوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتے ہیں۔ میرے دوست اسی لیے اس کائنات کو نظام عالم یا نظام کہا جاتا ہے، افراتفری یا بدنظمی نہیں۔ اگرچہ آپ فلسفی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ آپ نے یہ مشاہدہ نہیں کیا ہے کہ دیوتاؤں اور انسانوں کے لیے ہندسی مساوات کس قدر بھرپور ہوتی ہے۔ آپ کو کوئی پروا نہیں ہے۔ چلیے تو پھر آپ کے اصول یعنی جو خوش ہیں وہ اس لیے خوش ہیں کہ وہ انصاف و اعتدال ذات کے حامل ہوتے ہیں اور ناشاد اس لیے ناشاد ہیں کہ وہ بدی میں گرفتار ہوتے ہیں، کا بطلان ضروری ہے۔ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو سوچیے کہ اس کا انجام کیا ہو گا؟ کیلی کلس وہ تمام نتائج جو میں اس سے قبل اخذ کر چکا ہوں وہ تمام کے تمام درست ہوں گے جن کے بارے میں آپ نے پوچھا تھا کہ یہ باتیں میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں یا نہیں۔ اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی ذات، اپنی اولاد اور اپنے احباب کو موردِ الزام گردانے اور صرف اسی مقصد کے لیے اسے بلاغت کے فن کو استعمال کرنا چاہیے۔ اور وہ تمام باتیں جن کے بارے میں آپ نے کہا تھا کہ پولس نے ازراہ مروت تسلیم کر لی تھیں۔ فی الواقع

درست ہیں۔ اگر ناانصافی کا ارتکاب اسے برداشت کرنے سے زیادہ شرمناک ہے تو وہ اسی تناسب سے بدتر ہے اور دوسرا موقف جو پولس کے قول کے مطابق جارجیاز نے مروتاً تسلیم کرلیا تھا جیسے ادعائے بلاغت ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے منصف مزاج اور انصاف سے آشنا ہونا چاہیے۔ بات بھی سچ ثابت ہوئی ہے۔

اب جبکہ یہ تمام باتیں جو میں کہہ چکا ہوں آپ کے ذہن میں تازہ ہو چکی ہیں۔ آیئے بحث کو آگے بڑھاتے ہیں۔ آپ نے بڑی ڈھٹائی سے یہ کہا ہے اور اسے سچ مانتے ہیں کہ میں اس لائق نہیں ہوں کہ انتہائی خطرے کے عالم میں اپنی یا اپنے احباب اور اعزا کی کوئی امداد کر کے انھیں بچا سکوں اور میں ایسے ڈاکو کے قابو میں ہوں جو جس طرح چاہے میرے ساتھ سلوک کرے۔ وہ کان پر گھونسا مار سکتا ہے۔ یہ آپ کا کرم تھا کہ آپ نے میرے ساتھ نرمی برتی۔ وہ مجھے میرے مال واسباب سے محروم کرسکتا ہے۔ مجھے جلاوطن کرسکتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ میری جان لے سکتا ہے۔ یہ صورت حال آپ کی رائے میں بدترین ہے۔ میرا جواب وہی ہے جسے بار بار دہرایا جا چکا ہے۔ تاہم بہتر ہوگا کہ اس کا اس موقع پر بھی اعادہ کرلیا جائے۔ کیلی کلس میں آپ سے پھر کہتا ہوں کہ کان پر کسی کا گھونسا کھانا اور میری جیب یا جسم کا کوئی حصہ کٹ جانا انتہائی برا عمل نہیں ہے بلکہ مجھے جان ومال سے محروم کر دینا مجھ سے زیادہ اس کے لیے جو اس گناہ کا مرتکب ہوتا ہے کہیں زیادہ شرمناک اور بدتر ہے۔ میں تو اسے برداشت کر رہا ہوں۔ یہ تمام حقائق جنھیں میں بیان کر چکا ہوں اسی صورت میں پہلے تسلیم کیے جا چکے ہیں۔ اور اب انھیں ہم نے دماغ میں اچھی طرح بٹھا دیا ہے۔ یعنی اب میں اسے زیادہ بے باک انداز میں یوں ادا کروں گا کہ انھیں اصرار کے ساتھ الفاظ کے فولادی شکنجے میں جکڑ دیا گیا ہے۔ اور آپ یا آپ جیسا کوئی جرأت مند سورما جب تک اسے نہ توڑے میری بات سے انکار ممکن نہیں۔ آغاز سے ہی میرا یہی موقف رہا ہے کہ مجھے ان باتوں کی حقیقت کا کوئی علم نہیں ہے لیکن مجھے کوئی ایسا نہیں ملا جو ان باتوں کے خلاف اس سے زیادہ غیر سنجیدہ ہوئے بغیر اس طرح کہہ سکے جیسے آپ نے کہا ہے۔ اب بھی میرا یہی موقف ہے اور اگر میری بات درست ہے اور ناانصافی، اس کا ارتکاب کرنے والے کے لیے بدترین گناہ ہے، تاہم اس سے بڑھ کر ایک گناہ ہوسکتا ہے کہ ناانصافی کے مرتکب سزا سے بچ جائے۔ آخر وہ کونسا دفاعی عمل ہے جس کی کمی سے انسان صحیح معنوں میں معقولیت سے دور ہو جاتا ہے۔ کیا یہ دفاع ایسا نہیں

ہونا چاہیے جو بدترین گناہ سے انسان کو دور رکھ سکے؟ اور کیا بدترین دفاع یہ نہیں ہوگا کہ جس میں انسان اپنی ذات، اپنے خاندان یا احباب کو بچا نہ سکے۔ اس کے بعد اس کی باری آتی ہے جو اس کے بعد والی بدترین برائی کو دفع نہ کر سکے۔ تیسری بات سب سے بڑی برائی اور دیگر برائیوں سے مختلف درجوں میں اجتناب نہ برتنا اور ان سے نہ بچنے کی شرمندگی ہے۔ کیلی کلس کیا میں درست نہیں کہہ رہا ہوں؟

کیلی: آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔

سقراط: اس امر کے پیش نظر کہ ناانصافی کا ارتکاب اور ناانصافی کو برداشت کرنا ہی دو غلط کام ہیں۔ اور ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ناانصافی کا ارتکاب ان دونوں میں سے زیادہ بڑی اور ناانصافی برداشت کرنا، اس سے کمتر درجے کی برائی ہے۔ آخر وہ کیا ترکیبیں ہیں جن کے ذریعے انسان ان دونوں کے شر سے بچ سکتا ہے۔ اوّل یہ ہے وہ ناانصافی کا مرتکب نہ ہو اور دوسرے یہ کہ وہ ناانصافی برداشت نہ کرے۔ کیا اس کے حصول کے لیے اسے صرف قابو پانے کی قوت یا قوتِ ارادی ضروری ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا کوئی شخص ناانصافی سے گریز صرف قوتِ ارادی کی بنیاد پر کر سکتا ہے یا اسے اس کے لیے عملی طاقت بھی درکار ہوگی۔

کیلی: ظاہر ہے اسے اس کے لیے عملی طاقت بھی پیدا کرنی ہوگی۔

سقراط: ناانصافی کے ارتکاب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کیا صرف قوتِ ارادی ہی کافی ہوگی جس سے وہ ناانصافی کرنے سے بچ جائے گا یا اسے اس کے لیے مقدور اور ہنر بھی حاصل کرنا ہو گا؟ کیلی کلس آپ بڑے وثوق سے یہ بتائیں کہ پولس اور میں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ کوئی آدمی بھی گناہ اپنی مرضی سے نہیں کرتا بلکہ اپنی مرضی کے خلاف یہ کام کرتا ہے۔ کیا آپ اس بات کو درست تسلیم کرتے ہیں۔

کیلی: سقراط چلیے مان لیتا ہوں بشرطیکہ آپ نے بھی تسلیم کیا ہو۔

سقراط: اس لیے ظاہر ہے کہ ناانصافی کا مرتکب نہ ہونے کے لیے مقدور اور ہنر دونوں ہی کا موجود ہونا ضروری ہوگا۔

کیلی: یقیناً۔

سقراط: چلیے مکمل طور سے نہ سہی، جزوی طور سے ہی ہمیں ناانصافی سے امکانی طور پر بچانے والا کون سا ہنر

ہو جاتا ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے متفق ہیں یا نہیں۔ یہ اختیار جس کا
وہی ہوتا ہے جسے حاکم خواہ وہ مطلق العنان حکمران خود ہو یا حاکم کا ہم مرتبہ اور حکمرانی میں شریک
شخص استعمال کرتا ہو۔

کیلی: بہت خوب سقراط، دیکھیے جب آپ معقول بات کہتے ہیں تو میں کتنی جلدی اسے تسلیم کر لیتا ہوں۔

سقراط: اب ذرا میرے اس نظریہ پر سوچ کر رائے زنی کیجیے۔ میرا خیال ہے عموماً ہر شخص زیادہ تر اسی کو پسند کرتا ہے جو اسی جیسا ہو۔ داناؤں کا قول ہے۔ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔ آپ اس بات سے متفق ہیں یا نہیں۔

کیلی: متفق ہوں۔

سقراط: لیکن جب ظالم حکمران بدلحاظ بھی ہو اور تعلیم سے بے بہرہ بھی تو توقع ہے کہ وہ ہر اس شخص سے خوف زدہ رہے گا جو نیکی میں اس سے بڑھ کر ہو اور وہ مکمل طور پر اس کا دوست نہیں بن سکے گا۔

کیلی: یہ بات بھی درست ہے۔

سقراط: کسی ایسے آدمی کا بھی دوست نہیں بنے گا جو اس سے کمتر ہو کیونکہ وہ اس سے نفرت کرے گا اور اسے سنجیدگی سے کبھی اپنا دوست تسلیم نہیں کرے گا۔

کیلی: یہ بات بھی درست ہے۔

سقراط: اس طرح اسی جابر حکمران کا دوست صرف وہی ہو سکتا ہے جس کا کردار اسی جیسا ہو جس کی پسند و ناپسند اسی جیسی ہو اور اسی کے ساتھ وہ اس کا فرمانبردار اور ماتحت رہنے پر رضامند بھی ہو۔ ایسا شخص وہی ہو سکتا ہے جسے ریاستی امور میں اختیار حاصل ہو اور کوئی دوسرا شخص بے باکی سے اس کے امور کی چھان بین کر سکتا ہو۔ کیا یہ بات درست نہیں ہے۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: اگر کوئی نوجوان یہ پوچھنا شروع کر دے کہ وہ جلیل القدر اور مضبوط کس طرح بن سکتا ہے تو آپ محسوس کریں گے کہ یہی راہ ہے جس پر چل کر وہ نوجوانی سے ہی ان امور کا عادی ہو جائے گا اور آقا کے ساتھ ہنسے گا، اسی کے ساتھ روئے گا اور جہاں تک ہو سکے گا اسی جیسا بننے کے لیے کوشاں رہے گا۔

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: اور یہی وہ طریقہ ہوگا جس پر عمل کر کے آپ اور آپ کے احباب کے قول کے مطابق وہ بلا کوئی تکلیف اٹھائے بڑا آدمی بن جائے گا۔

کیلی: بالکل درست ہے۔

سقراط: لیکن کیا وہ دوسروں کو نقصان پہنچانے سے بچ جائے گا؟ اور اگر وہ ناانصاف ظالم حکمران ہی جیسا بننا اور اس کے مزاج میں دخیل ہونا چاہتا ہو تو کیا اس کی یہ متضاد صورت حال درست ہوگی۔ تو کیا وہ حتیٰ المقدور زیادہ سے زیادہ غلط کام سزا پائے بغیر انجام نہیں دے گا۔

کیلی: سچ ہے۔

سقراط: تو کیا اپنے آقا کی نقل کرنے اور اس طرح جو قوت حاصل ہوگی اس سے اس کی روح گناہ آلودہ اور ناپاک نہیں ہو جائے گی اور یہ اس کے لیے بدترین عمل بن جائے گا یا نہیں؟

کیلی: سقراط آپ کوئی نہ کوئی ایسی ترکیب نکال لیتے ہیں جس پر شے الٹی نظر آنے لگتی ہے۔ آپ کو یہ پتا نہیں جو شخص بھی کسی ظالم و جابر حکمران کی نقل کرے گا اگر اسے تھوڑی سی بھی عقل ہو تو وہ پہلے اس کو ختم کر دے گا جو اس کی نقل نہیں کرے گا اور اس کا مال و اسباب بھی لوٹ لے گا؟

سقراط: کیلی کلس بہت خوب، میں بہرا نہیں ہوں۔ میں بارہا آپ سے اور پولس سے اور شہر کے ہر شخص سے یہی بات سن چکا ہوں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ میری بھی سن لیں۔ میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ اگر عقل ہے تو وہ اسے قتل کر دے گا برا آدمی اچھے اور سچے آدمی کو مار ڈالے گا۔

کیلی: تو کیا یہ اشتعال انگیز بات نہیں ہوگی۔

سقراط: جی نہیں، بحث کی رو سے کوئی دانشمند شخص ایسا نہیں کرے گا۔ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ ہم اسی بات کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہیں کہ زندگی کو کس طرح طویل کر سکتے ہیں اور ان فنون کو سیکھتے رہیں جو اس کی حفاظت کے ضامن ہوں، مثلاً بلاغت کا فن جو عدالت میں اس کی ڈھال بن جاتا ہے جسے سیکھنے کا آپ مجھے مشورہ دیتے ہیں۔

کیلی: جی ہاں میرا یہ بہت صائب مشورہ ہے۔

سقراط: چلیے مان لیا لیکن پیراکی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کیا یہ محض نمائشی ہنر ہے؟

کیلی: واقعی نہیں۔

سقراط: یہ حقیقت ہے کہ پیراکی موت سے بچاتی ہے اور ایسے بھی مواقع آتے ہیں جب اس کے لیے

ضروری ہے کہ وہ تیراکی کا فن جانتا ہو اور اگر آپ چاہیں تو میں تمھیں سمجھانے کو تم سے ایک
اور بڑے ہنر کا ذکر کروں گا۔ وہ ہے جہاز رانی کا فن جو نہ صرف ان کی روحوں کو بلکہ
بچاتا ہے بلکہ بلاغت کی طرح ان کے جسم اور مال و اسباب کو بھی خطروں سے بچاتا ہے۔ یہ
فن سیدھا سادہ ہے اس میں انکسار پایا جاتا ہے۔ نہ وہ فخر کرتا ہے اور نہ ڈینگ مارتا ہے کہ اس نے
کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ اس نجات کے عوض جو اسے وہاں دینے والے دیتے
ہیں۔ وہ ایجینا (Aegina) سے ایتھنز لے جانے کا کرایہ صرف چاندی کے دو سکے لیتا ہے یا پونٹس (Pontus) سے
مصر کی طویل مسافت کے لیے صرف سونے کے دو سکے وصول کرتا ہے۔ وہ مسافر کی بیوی
کے بچوں اور مال و اسباب کو بحفاظت پیرس کی بندرگاہ پر اتار دیتا ہے۔ اتنی بڑی نیکی کے بدلے وہ
یہی اجرت طلب کرتا ہے اور جو فن جہاز رانی کا ماہر ہے اور یہ کام انجام دیتا ہے وہ جہاز سے اتر کر
ساحل پر بڑی انکساری سے چہل قدمی کرتا ہے کیونکہ وہ سوچنے سمجھنے کا عادی ہے اور اسے یہ احساس
ہوتا ہے کہ اس نے بحفاظت منزل مقصود پر پہنچا کر نہ جانے کس کس مسافر کو فائدہ پہنچایا ہے
اور کسے کسے ڈوبنے سے بچا کر نقصان پہنچایا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جیسے وہ جہاز پر سوار ہوئے تھے
اس نے انھیں ویسا ہی ساحل پر اتار دیا۔ نہ ان کے جسم میں شمہ برابر کوئی خوبی پیدا ہوئی اور نہ روح
میں۔ وہ یہی خیال کرتا ہے کہ اگر کسی کو کوئی بہت بری اور لاعلاج جسمانی بیماری لاحق ہے، اس کا بچ
کر آنا قابل رحم ہے۔ انھیں ڈوبنے سے بچا کر اس نے ان کے ساتھ کوئی خاص نیکی نہیں کی۔ اسی
طرح روحانی امراض میں مبتلا افراد کی حالت بھی اس صورت حال سے کمتر نہیں ہے جب کہ روح
اس کے وجود کا قیمتی جزو ہے۔ بری حالت والے انسان کی زندگی نہ اس کے لیے مفید ہوتی ہے نہ
ہی گزارنے کے لائق ہوتی ہے۔ خواہ اسے آپ سمندر سے یا عدالت سے یا کسی اور تنگ بیابان
بلا سے سلامتی سے بچا لیں۔ اسی لیے وہ سوچتا ہے کہ ایسے انسان کا زندہ رہنا بہتر نہیں ہوگا۔ وہ
زندگی کو اچھی طرح گزار ہی نہیں سکتا۔

جہاز راں جو اگرچہ ہماری جان بچانے والا ہوتا ہے کبھی غرور نہیں کرتا۔ اسی طرح انجینئر بھی
دوسروں کی حفاظت کی قوت کے سبب کسی صورت جہاز راں یا فوجی سالار سے کمتر درجے کا نہیں
ہوتا۔ وہ اکثر و بیشتر پورے پورے شہروں کو بچا لیتا ہے۔ کیا اس کا اور دلیل دینے والے کا کوئی
مقابلہ ہو سکتا ہے؟ اور کیلی کلس اگر وہ تمہاری طرح لفاظی کرنے پر آ جائے تو وہ تمہیں الفاظ کے

پہاڑ تلے دبا دے گا۔ وہ یہی اعلان کرے گا اور اصرار کرے گا کہ ہم سب کو صرف مشین بنانا چاہیے کوئی اور پیشہ لائق توجہ نہیں ہے۔ کہنے کو اس کے پاس بہت کچھ ہوگا پھر بھی آپ اسے پسند نہیں کرتے۔ اس کے ہنر سے متنفر ہیں، اس کا مذاق اڑاتے ہوئے اسے مشین بنانے والا کہتے ہیں۔ اس کے بیٹے سے اپنی بیٹی کی شادی پر کبھی رضامند نہیں ہوں گے اور نہ ہی اپنے بیٹے کو اس کی بیٹی سے شادی کی اجازت دیں گے۔ آپ ہی کے اصول کی رو سے آخر آپ کے اس انکار کا سبب کیا ہے؟ مشین بنانے والے سے یا دیگر لوگوں سے جن کا ذکر ابھی میں نے کیا ہے آپ کو نفرت کا کیا حق ہے؟ میں جانتا ہوں آپ یہی کہیں گے کہ میں بہتر ہوں میرا خاندان بہتر ہے۔ لیکن بہتر وہ ہیں جسے میں کہتا ہوں اور انسان کی نیکی صرف اپنی ذات اور اپنے جیسے تیسے کردار کو بچانے ہی سے عبارت ہے تو پھر آپ مشین بنانے والے، طبیب، لوگوں کی جان بچانے والے دیگر ہنرمندوں سے جو نفرت کرتے ہیں وہ مضحکہ خیز ہے۔ میرے دوست میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ یہ دیکھیں کہ نجات اور نیکی بچانے اور بچ نکلنے سے مختلف ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ایسا انسان اپنی زندگی سے لاپروائی بھی برتے! اسے علم ہے کہ عورتوں کے قول کے مطابق تقدیر کا لکھا کوئی نہیں مٹا سکتا۔ اس لیے وہ زندگی کا گرویدہ نہیں ہوتا۔ وہ تمام کام خدا پر چھوڑ دیتا ہے اور اسے یہی فکر لگی رہتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کی مقررہ ذمہ داریاں کس طرح نبھائے۔ کیا وہ اس دستور میں مکمل طور پر ضم ہو جائے جس کے تحت وہ زندگی گزار رہا ہے۔ جیسے آپ اس وقت سوچ رہے ہیں۔ آپ اہل ایتھنز کے ساتھ حتیٰ المقدور مربوط ہو جائیں تاکہ آپ کو ان کی خوشنودی حاصل ہو جائے، اور آپ کو ریاستی امور میں عمل دخل حاصل ہو جائے۔ جبکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ یہ دیکھیں اور سوچیں کہ کیا یہ بات ہم دونوں کے مفاد میں ہے۔ میں یہ بالکل نہیں چاہوں گا کہ اختیار کے حصول کے لیے ہم اپنی عزیز ترین متاع قربان کر دیں اور ہمارا وہی حال ہو جو تھیسالی کی جادوگرنیوں کا ہوتا ہے۔ عوام کے عقیدے کے مطابق جو اپنی مکمل تباہی کا خطرہ مول لے کر چاند کو آسمان سے زمین پر لاتی ہیں۔ لیکن اگر آپ یہ سمجھیں کہ شہر کا ہر آدمی اس شہر کے طور طریقوں پر عمل پیرا ہوئے بغیر ہی عظیم بننے کا فن، خواہ وہ برائی میں ہو یا بھلائی میں سکھا سکتا ہے، تو کیلی کلس یہ آپ کی غلطی ہوگی کیونکہ وہی شخص ایتھنز کی جمہوریہ کا دوست یا پائیری لیمپس (Pyrilampes) کی آنکھ کا تارا اور اس کا نام لیوا ہوگا اور اسے فطری طور پر ان ہی جیسا بننا پڑے گا۔ ان کی محض نقل کرنے والا نہیں جو شخص آپ کو ان

جیسا بنائے گا وہ آپ کی مرضی کے مطابق سیاستدان اور بلاغت کا ماہر بنا دے گا کیونکہ جب کسی سے اسی کی زبان اور انداز میں بات کی جائے وہ خوش ہوتا ہے جبکہ بصورت دیگر ناراض ہوتا ہے۔ میرے عزیز کیلی کلس ہو سکتا ہے اس ضمن میں آپ کے خیالات مختلف ہوں۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

کیلی: سقراط میں کیا کروں خواہ مخواہ آپ کے الفاظ مجھے ہمیشہ بہت اچھے لگتے ہیں تاہم دوسروں کی طرح میں ان کا قائل نہیں ہوتا۔

سقراط: کیلی کلس اس کا سبب یہ ہے کہ ڈیمس (Demus) کی جو محبت تمہاری روح میں گھر کر چکی ہے وہی میری دشمن ہے لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم ان ہی امور سے بار بار رجوع کریں۔ ان پر غور و خوص کریں تو آپ میری باتوں کے قائل ہو جائیں گے۔ براہ کرم یاد رکھیے کہ ہر شے کے سیکھنے کے دو طریقے ہیں خواہ وہ جسمانی ہوں یا روحانی۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم اسے حصول مسرت کے لیے اختیار کریں، دوسرا یہ ہے کہ ہم اسے اعلیٰ ترین خیر حاصل کرنے کے لیے کام میں لائیں۔ اس صورت میں ہم اس میں ملوث نہیں ہوتے بلکہ اس میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ کیا یہی وہ فرق نہیں تھا جس پر ہم راضی ہوئے تھے؟

کیلی: درست ہے۔

سقراط: جس کا مقصد صرف حصولِ مسرت تھا۔ وہ عامیانہ قسم کی خوشامد تھی۔ کیا یہ دوسرا نتیجہ نہیں تھا جس تک ہم پہنچے تھے؟

کیلی: ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ آپ جاری رکھیں۔

سقراط: اور دوسرے کا مقصد جو کچھ سیکھا ہے اس کی بہت زیادہ ترقی تھی خواہ وہ جسمانی ہو یا روحانی؟

کیلی: بالکل درست۔

سقراط: کیا ہمیں اپنے شہر اور شہریوں سے سلوک میں بھی اسی مقصد کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہیے؟ کیا ہمیں انھیں حتیٰ المقدور بہتر نہیں بنانا چاہیے؟ ہم تو یہ پہلے ہی معلوم کر چکے ہیں کہ ان میں کوئی اور خوبی اس وقت تک پیدا نہیں کی جا سکتی ہے جب تک اس خوبی کو جس کا تعلق دولت، عہدہ، یا کسی اور قسم کے اختیار سے ہو حاصل کرنے والے ذہنی طور پر حلیم اور نیک نہ ہوں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟

کیلی: آپ چاہیں تو ضرور کہہ لیں۔

سقراط: کیلی کلس اگر میں اور آپ دونوں عوام کے لیے کسی کام کا، مثلاً کسی عمارت کی دیواریں، بندرگاہ کی

گودی یا کوئی بہت بڑی عبادت گاہ کی تعمیر کا منصوبہ بنانے لگیں تو کیا پہلے ہمیں خود اپنا جائزہ نہیں لینا ہوگا کہ آیا ہمیں فن تعمیر سے واقفیت بھی ہے؟ ہم نے یہ فن کس سے سیکھا ہے؟ کیلی کلس کیا یہ ضروری نہیں ہوگا؟

کیلی: یقیناً۔

سقراط: اس کے بعد ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ کیا ہم نے کوئی نجی عمارت تعمیر کی ہے خواہ وہ ہماری ہو یا کسی غیر کی یا کسی دوست کی کیا اس عمارت کی تعمیر میں ہم کامیاب ہوئے تھے یا نہیں؟ اور اگر ان باتوں پر غور کر کے ہم یہ سمجھیں ہمارے پاس نہایت عمدہ اور ماہر معمار ہیں اور ہم نے متعدد اعلیٰ درجے کی عمارتیں ان کی مدد سے یا صلاحیتوں سے تعمیر کی ہیں۔ اس صورت میں عقل کا یہی تقاضا ہوگا کہ ہم سرکاری عمارت کی تعمیر کا کام ہاتھ میں لیں لیکن اگر ہمارے پاس کوئی ماہر نہ ہو یا دکھلانے کو صرف چند ناکارہ عمارتیں ہوں یا وہ بھی نہ ہوں تو ایسے سرکاری کام میں ہاتھ ڈال کر یا اس کام کا ایک دوسرے کو مشورہ دے کر دوسروں کو خود پر ہنسنے کا سامان فراہم کریں گے۔ کیا یہ بات درست نہیں ہے؟

کیلی: یقیناً۔

سقراط: کیا یہ بات دیگر امور پر صادق نہیں آتی؟ اگر ہم دونوں طبیب ہوں اور سرکاری طبیب بن جانے کا ایک دوسرے کو مشورہ دیں تو کیا میں آپ کے بارے میں اور آپ میرے بارے میں ضروری معلومات حاصل نہیں کریں گے؟ اچھا یہ بتایئے خود سقراط کا کیا حال ہے۔ کیا وہ صحت مند ہے؟ کیا اس نے کسی آزاد شہری یا غلام کا کبھی علاج کیا ہے؟ اور میں بھی یقیناً آپ کے بارے میں ایسی ہی تحقیق کروں گا۔ اور اگر ہم اس نتیجے پر پہنچیں کہ ہم میں سے کسی کے بھی علاج سے کبھی کوئی شہری، یا غیر ملکی، مرد یا عورت، کبھی صحت یاب نہیں ہوا ہے تو کیلی کلس قسم ہے عالم قدس کی کہ ہم دونوں بلکہ کوئی دوسرا کسی صورت میں ہمارے سرکاری طبیب بننے کی حمایت نہیں کرے گا۔ اور نہ ہی وہ ہمارے جیسے کسی دوسرے کو ایسا مشورہ دے گا کہ وہ کامیابی سے یا ناکامی سے نجی مطب کھولے یا فن بلاغت کا تجربہ حاصل کیے بغیر ہی سرکاری طبیب کی اسامی کا امیدوار بن جائے۔ کیا یہ وہی بات نہ ہوئی کہ برتن بنانے کے فن سیکھنے کے آغاز ہی میں بڑا مٹکا بنانے کی کوشش سے کی جائے۔ کیا یہ حماقت نہیں ہوگی؟

کیلی: کیوں نہیں۔

سقراط۔ میرے دوست چونکہ آپ آہستہ آہستہ ایک عوامی شخصیت بنتے جارہے ہیں اور مجھے بھی اس کا مشورہ دے رہے ہیں بلکہ سرزنش بھی کر رہے ہیں کہ میں آپ کے نقش قدم پر کیوں نہیں چل رہا ہوں۔ چلیے ہم ایک دوسرے سے چند سوالات پوچھ لیں۔ کیلی کلس یہ بتائیں کہ ہم کسی شہری کو بہتر کس طرح بنا سکتے ہیں کیا آپ کسی ایسے شخص کی مثال دے سکتے ہیں جو بے کردار، بے انصاف، بدنفس یا ناسمجھ ہو اور وہ کیلی کلس کی مدد سے نیک اور شریف بن گیا ہو؟ کیا کبھی ایسا شہری غیر ملکی آزاد یا غلام شخص موجود رہا ہے۔ کیلی کلس مجھے بتاؤ اگر آپ سے کوئی یہ سوال کرے تو آپ کا کیا جواب ہوگا؟ آپ اسے کب یہ کہہ سکیں گے کہ آپ نے اپنی باتوں سے اس کی اصلاح کی ہے؟ ہو سکتا ہے آپ نے اپنی نجی حیثیت میں ایسے کارنامے عوامی شخصیت بننے سے پہلے انجام دیئے ہوں۔ کیا آپ اس کا جواب نہیں دیں گے؟

کیلی: سقراط آپ تو محبت کرنا چاہتے ہیں۔

سقراط: جی نہیں میں آپ سے سوال محبت کے شوق میں نہیں پوچھ رہا ہوں بلکہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کس طرح ہمارے باہمی معاملات کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ آپ جب انتظامی امور سنبھالتے ہیں تو کیا آپ کی غرض شہریوں کی اصلاح کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوتی؟ کیا ہم اس سے قبل بار بار یہ تسلیم نہیں کر چکے ہیں کہ عوامی شخصیت کے فرائض میں اس طرح کی باتیں شامل ہوتی ہیں؟ بلکہ ہم یقینی طور پر یہ کہہ چکے ہیں۔ اس لیے اگر آپ خود جواب نہ دیں گے تو میں آپ کی طرف سے جواب دوں گا۔ لیکن اگر ایک اچھے آدمی کے لیے ضروری ہو کہ وہ اپنی ریاست کے مفاد میں کام سرانجام دے تو میں آپ کو ایسے اشخاص کے نام یاد دلاؤں گا۔ ابھی ابھی خود آپ نے جن کا ذکر کیا تھا مثلاً پیریکلس اور سیمون (Cimon)، ملتیاڈیس اور تھیمسٹوکلس۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا آپ اب بھی ان لوگوں کو اچھا شہری مانتے ہیں۔

کیلی: میں مانتا ہوں۔

سقراط: لیکن اگر وہ اچھے تھے تو انھوں نے ہر شہری کی حالت بگاڑنے کی بجائے سدھاری ہوگی؟

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: اس لیے جب پیریکلس نے اسمبلی میں پہلی تقریر کی اس وقت اہل ایتھنز اتنے اچھے نہیں تھے جتنے آخری تقریر کے وقت تھے؟

کیلی: اس کا بہت امکان ہے۔

سقراط: لیکن میرے دوست ''امکان'' درست لفظ نہیں ہے کیونکہ اگر وہ اچھا شہری تھا تو اس کا نتیجہ واضح ہونا چاہیے۔

کیلی: اس سے فرق کیا پڑے گا۔

سقراط: کوئی نہیں۔ میں صرف اتنا مزید جاننا چاہوں گا کہ پیریکلس کی کوششوں سے اہل ایتھنز کی اصلاح ہوئی یا نہیں؟ یا اس کے برعکس وہ بدتر ہو گئے کیونکہ میں نے سنا ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے لوگوں کو تنخواہ دی اور انھیں کاہل اور بزدل بنا دیا اور انھیں باتوں اور دولت کا چسکا لگا دیا۔

کیلی: آپ نے بات ان مختصر کلام کرنے والوں سے سنی ہے جو ان کے کان کھا لیتے ہیں۔

سقراط: لیکن اب جو کچھ میں کہنے جا رہا ہوں وہ سنی سنائی بات نہیں بلکہ ایسی ہے جس سے ہم اور آپ دونوں اچھی طرح واقف ہیں کہ شروع میں پیریکلس کا کام شاندار تھا۔ اس کا کردار ایسا بے داغ تھا کہ ایتھنز کی ہر عدالت اس کے حق میں فیصلہ دیتی لیکن آخر میں جب اس نے انھیں شریف اور نیک بنا دیا تو انھوں نے اس کی زندگی کے آخری ایام میں اسے چوری میں ماخوذ کیا۔ وہ اسے اس خیال سے مار ڈالنا چاہتا تھا کہ اس نے ان کا برا چاہا تھا۔

کیلی: بہت خوب لیکن اس سے پیریکلس کی بدخواہی کس طرح ثابت ہوتی ہے۔

سقراط: کیوں نہیں آپ یہ کہیں گے کہ وہ گدھوں، گھوڑوں اور بیلوں کا اچھا نگران نہیں تھا۔ یہ ریوڑ جب اس کے حوالے کیا گیا تو وہ نہ لاتیں مارتا تھا، نہ کھر مارتا تھا اور نہ ہی کاٹتا تھا لیکن اس نے ان میں تمام وحشیانہ خصائل پیدا کر دیے۔ کیا اسے آپ برا منتظم تسلیم نہیں کریں گے جبکہ اس نے سیدھے سادے مویشیوں کا انتظام سنبھالا اور انھیں پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک بنا دیا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

کیلی: میں آپ پر نوازش کر کے ''ہاں'' کہے دیتا ہوں۔

سقراط: کیا آپ مجھ پر کرم فرما کر اتنا بتا دیں گے کہ کیا انسان جانور ہے؟

کیلی: یقیناً ہے۔

سقراط: اور کیا پیریکلس انسانوں کا گڈریا نہیں تھا؟

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: اگر وہ اچھا سیاسی گذر یا ہوتا جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی تسلیم کیا ہے تو وہ جانور جو اس کی رعایا تھے، کیا وہ زیادہ ناانصاف ہونے کی بجائے زیادہ منصف مزاج نہ ہوتے؟

کیلی: بالکل درست ہے۔

سقراط: کیا ہومر کے قول کے مطابق عادل لوگ شریف نہیں ہوتے؟ آپ کی رائے اس سے مختلف ہے کیا؟

کیلی: میں مانتا ہوں۔

سقراط: لیکن اس نے ان کا انتظام سنبھال کر انھیں پہلے سے کہیں زیادہ وحشی بنا دیا تھا۔ جس کا ثبوت اس کے ساتھ ان کا وحشیانہ سلوک ہے، جس کا اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔

کیلی: اچھا تو آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ سے متفق ہو جاؤں؟

سقراط: جی ہاں اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں سچ بول رہا ہوں۔

کیلی: چلیے مان لیا۔

سقراط: اس نقطہ نظر سے پیرکلس ایک اچھا سیاستدان نہیں تھا۔

کیلی: یہ تو آپ کی رائے ہے۔

سقراط: جی نہیں یہ آپ کی رائے ہے۔ آپ اسے تسلیم کر چکے ہیں آیئے سیمون کے معاملہ کو ایک بار پھر دیکھتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جن لوگوں کی وہ خدمت کر رہا تھا انھوں نے ہی اسے ریاست بدر کر دیا تھا تا کہ وہ دس برس تک اس کی آواز نہ سن سکیں۔ انھوں نے یہی سلوک تھیمسٹوکلس کے ساتھ بھی کیا اور اس میں ریاست بدری کی سزا کا اضافہ کر دیا۔ انھوں نے یہ بھی رائے دی تھی کہ ملٹیاڈیس کو جو میراتھون (Marathon) کا ہیرو تھا موت کے کنویں میں ڈال دیا جائے اسے پرائی ٹینز (Prytanes) نے بچایا تھا۔ تاہم اگر وہ آپ کے قول کے مطابق حقیقتاً اچھے آدمی ہوتے، ان کے ساتھ کبھی ایسا سلوک نہ ہوتا کیونکہ بہترین رتھ چلانے والے وہ نہیں ہوتے جو ابتدا میں اپنی راہ پر دوڑانے کے پابند ہوتے ہیں۔ بلکہ جب ان کے گھوڑوں کی رفتار تیز ہو جاتی ہے تو وہ پہلے سے بہتر رتھ بان بن جاتے ہیں تو انھیں باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ ایسا نہ تو رتھ دوڑ کے مقابلوں میں ہوتا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے پیشے میں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

کیلی: جی ایسا نہیں ہوتا۔

سقراط: بہت خوب۔ اگر حقیقت حال وہی ہے جو میں نے بیان کی ہے کہ ایتھنز کی ریاست میں کوئی بھی ایسا فرد نہیں تھا جس نے اپنے بہتر سیاستدان ہونے کا ثبوت دیا ہو۔ آپ نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ہمارے موجودہ سیاستدانوں کا بھی یہی حال ہے لیکن گزشتہ سیاستدانوں کا نہیں اور آپ نے انھیں دوسروں سے بہتر سمجھا ہے۔ تاہم وہ موجودہ سیاستدانوں سے بہتر ثابت نہیں ہوئے۔ اگر وہ بلاغت کے ماہر تھے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے فن بلاغت "Flattery" کا درست استعمال نہیں کیا۔ ورنہ عوام کی نظروں سے کبھی نہ گرتے۔

کیلی: لیکن سقراط یہ بھی تو دیکھیے کہ کوئی شخص بھی ان کے کارناموں کے سبب ان کے قریب نہیں پھٹکتا۔

سقراط: میں ان لوگوں کے خلاف کچھ نہیں کہتا جنھیں حالیہ ریاست کا کارندہ سمجھا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی خدمات ایسے لوگوں سے کمتر نہیں ہیں جو زندہ ہیں اور ریاست کے مقاصد کی تکمیل کی بہتر اہلیت رکھتے ہیں لیکن جہاں تک سوال ہے ان مقاصد کو تبدیل کرنے اور اس ضمن میں من مانی کرنے اور اپنے اختیارات کے استعمال کا، خواہ وہ ترغیبی ہوں یا تادیبی، اپنے شہریوں کی اصلاح کا جو کسی بھی اچھے شہری کا اعلیٰ مقصد ہوتا ہے۔ میں انھیں موجودہ سیاستدانوں سے بہتر نہیں سمجھتا اگرچہ وہ جہازوں کی فراہمی حفاظتی پشتوں اور بندرگاہ کی گودیاں تعمیر کرنے میں طاق تھے۔ ہمارے اور آپ کے انداز بڑے مضحکہ خیز ہیں کیونکہ اپنی بحث کے دوران تمام وقت ایک دائرے میں ایک ہی نقطہ کے گرد گھومتے اور ایک دوسرے کو غلط سمجھتے رہے ہیں۔

اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو آپ نے بارہا یہ تسلیم کیا ہے کہ دو قسم کے اعمال ایسے ہیں جن کا تعلق جسم سے اور دو ایسے ہیں، جن کا تعلق روح سے ہے۔ ان میں ایک انتظامی عمل ہے۔ جو جسم کو جب بھوک لگتی ہے تو کھانا پیاس لگتی ہے تو پانی، سردی لگتی ہے تو کپڑے، کمبل، جوتے اور ہر وہ شے جس کی وہ تمنا کرتے ہیں فراہم کرتا ہے۔ میں نے وہی تصورات جان بوجھ کر دہرائے ہیں تاکہ آپ میری بات کو بہتر طور پر ذہن نشین کر لیں، اس سامان کی فراہمی کے ذمہ دار یا تو یہ اشیا تھوک کے بھاؤ یا خردہ فروشی کے ذریعے فراہم کرتے ہیں یا ہو سکتا ہے وہ ان میں کسی کو خود بھی تیار کرتا ہو۔ نانبائی یا باورچی، پارچہ باف یا جفت ساز یا چرم ساز جو کوئی بھی ہو وہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ اپنے فن کے ذریعہ جسم کی ضرورت پوری کر رہا ہے کیونکہ ان میں سے کسی کو یہ علم نہیں ہوتا کہ فن سازی اور بلاغت جیسے دوسرے فنون بھی موجود ہیں۔ جسم کی صحیح معنوں میں دیکھ بھال کرتے ہیں اور تمام دیگر

فنون کی زمام کاران کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔اس لیے وہ ان سے حاصل شدہ نتائج کو اپنے علم کے مطابق کام میں لائیں اور دوسروں کو یہ معلومات نہیں ہوتیں کہ گوشت اور شراب کا جسم پر اچھا یا برا اثر ہوتا ہے؟ جسم سے متعلق دیگر تمام فنون کم رتبہ، گھٹیا اور اوچھے ہوتے ہیں اور تن سازی اور بلاغت جیسا کہ ہونا چاہیے سب کے منتظم ہوتے ہیں۔

اس موقع پر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ یہی بات روح پر بھی صادق آتی ہے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آغاز میں آپ کے الفاظ جو جانتے، سمجھتے اور ان سے اتفاق کرتے ہیں لیکن کچھ وقفہ کے بعد آپ یہ رٹ لگانے لگتے ہیں کہ کیا ریاست میں نیک اور صالح شہری نہیں ہوتے اور جب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ وہ کون ہوتے ہیں تو آپ بظاہر نہایت سنجیدگی سے اس طرح جواب دیتے ہیں کہ گویا میں نے یہ پوچھا تھا کہ کون سے لوگ بہتر عطا کرنے والے ہوتے ہیں یا نہیں۔

اور آپ نے جواب میں کہا تھا نانبائی تھیریون (Thearion)، سسلی کے کھانوں کی ترکیب کے مصنف میتھوایکس (Mithoecus) اور شراب کشید کرنے والے سارامبس (Sarambus) کا نام لیا تھا جو سب کے اپنے اس فن کے امام تھے۔ جن کا تعلق جسم سے تھا۔ اول الذکر بہترین روٹیاں، دوسرا لذیذ کھانے اور تیسرا اول درجے کی شراب تیار کرتا تھا۔ میری نظر میں یہ ان سیاستدانوں کے ہم پایہ تھے جن کا آپ نے ذکر کیا تھا۔ میرے دوست آپ بالکل ہی ناپسند کریں گے، اگر میں یہ کہوں کہ آپ تن سازی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے جن کا ذکر آپ نے مجھ سے کیا ہے۔ وہ تو محض تعیشات کے انتظام اور فراہمی کے فرائض ادا کرتے رہے۔ جنھیں فن کا کوئی عمدہ اور شریفانہ تصور ہی نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے وہ صرف انسانی جسم کو تروتازہ اور فربہ بنا کر ان کی خوشنودی حاصل کر رہے ہوں۔ حالانکہ انجام کار کے طور پر ان کے عضلات لٹک جاتے ہیں اور پہلے کی نسبت کہیں دبلے ہو جاتے ہیں۔ تاہم وہ اپنی سادگی میں عضلات کے ڈھیلے پن اور امراض کی تفریح بہم پہنچانے والوں کو ذمہ دار نہیں سمجھتے۔ لیکن بعد کے عرصہ میں جب یہ غیر صحت مند زیادتی انھیں امراض کی لعنت میں گرفتار کر دیتی ہے تو اس کے اقارب واحباب یا جو کوئی بھی اس کے ساتھ ہوتے ہیں اسے مشورے دیتے ہیں۔ ان ہی کو وہ اس کا ذمہ دار اور ملزم قرار دیتے ہیں اور اگر ان کا بس چلے تو انھیں نقصان پہنچانے سے گریز نہ کریں۔ وہ ان لوگوں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں جو دراصل بنائے فساد ہوتے ہیں۔

کیلی کلس آپ یہی کام خود بھی کر رہے ہیں۔ آپ ان لوگوں کی توصیف کر رہے ہیں جنھوں نے شہریوں کو پرخوری اور ہرالٹی سیدھی خواہشوں کی تکمیل میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ عوام کہتے ہیں کہ انھوں نے شہر کو عظیم بنا دیا۔ انھیں یہ نظر نہیں آتا کہ ان ہی بزرگ سیاستدانوں نے ریاست کو زخموں سے چور چور کر دیا تھا۔ انھوں نے شہر کو بندرگاہوں، گودیوں اور پشتوں اور افراط آمدنی وغیرہ سے اس طرح بھر دیا کہ انصاف اور اعتدال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی اور جب بدنظمی کا بحران سر اٹھاتا ہے تو لوگ حال کے مشیروں کو الزام دیں گے اور تھیمسٹوکلس، سیمون اور پیریکلس کی تعریف کریں گے جو ان کی مصیبت کے اصل مصنف ہیں۔ اور جب وہ دیکھیں گے کہ نہ صرف ان کی حاصل شدہ نئی ریاست بلکہ اصل تاثر بھی ہاتھ سے جا رہا ہے تو وہ مجھ پر اور میرے دوست السی بیاڈس (Alcibiades) پر برس پڑیں گے۔ اس لیے بھی کہ ان کی موجودہ ابتلا آپ نے پیدا کی ہے خواہ آپ نے ان کو بچانے میں ان کی دستگیری کیوں نہ کی ہو۔ میں نے دیکھا بھی ہے اور مجھے بتایا بھی گیا ہے کہ گزرے ہوئے سیاستدانوں کے کارنامے نہایت شاندار ہوتے ہیں۔ جب ریاست ان میں سے کسی کو بھی بدخواہ سمجھنے لگتی ہے تو میرا مشاہدہ ہے کہ اس کے ساتھ مفروضہ زیادتی پر لوگ ہنگامہ کرتے ہیں۔ شور مچاتے ہیں۔ احتجاج کرتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انھوں نے ملک کی جو زبردست خدمت کی ہے اسے بھلا کر انھیں بلا جواز نیست و نابود کر دیا جائے۔ یہ داستان یوں ہی جاری رہتی ہے۔ لیکن یہ شور باطل ہوتا ہے کیونکہ کسی سیاستدان کو اس ریاست جس کا وہ سربراہ تھا بلا کسی جواز کے سزائے موت نہیں دے سکتی۔ مستند سیاستدانوں کا معاملہ بالکل ہی مستند سوفسطائیوں جیسا ہے کیونکہ اگرچہ سوفسطائیوں کی دانشمندی شک سے بالاتر ہوتی ہے۔ تاہم ان سے ایک انوکھی حماقت سرزد ہو جاتی ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ نیکی سکھاتے ہیں۔ وہ اکثر اپنے شاگردوں پر غلط کاری ان کی تنخواہ میں ہیرا پھیری اور ان کی خدمات کی بنیاد پر ان کی تعظیم نہ کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ تاہم اس سے بڑھ کر نامعقولیت اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو لوگ نیک اور انصاف پسند ہو گئے ہوں اور ان کے مزاج سے ناانصافی خارج کر دی گئی ہو۔ جن کے خمیر میں ان کے استادوں نے انصاف جما دیا ہو وہ اس ناانصافی پر عمل پیرا ہوں جس سے ان کا خمیر عاری ہو۔ میرے دوستو کیا اس سے زیادہ کوئی اور نامعقول بات ہو سکتی ہے۔ کیلی کلس تم نے جواب نہ دے کر مجھے مجمع گیر خطاب پر مجبور کر دیا ہے۔

کیلی: آپ ایسے ہیں کہ جب تک کوئی جواب دینے والا نہ ہو آپ کچھ بول ہی نہیں سکتے؟

سقراط: میں بات کر سکتا ہوں۔ اس وقت جو میں لمبی تقریر کر رہا ہوں اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ میری باتوں کا جواب نہیں دے رہے ہیں۔ میں آپ سے دوستی کے دیوتاؤں کا واسطہ دے کر التجا کرتا ہوں کہ میرے عزیز ضرور بتائیے کہ کسی کو نیک بنانا، پھر اس پر برے ہونے کا الزام لگانا، کیا بے اصولی نہیں ہے؟

کیلی: جی ہاں مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

سقراط: کیا آپ نے کبھی ماہرین تعلیم کو ایسی بے ربط بات کہتے نہیں سنا ہے؟

کیلی: جی ہاں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ہم خواہ مخواہ نیک لوگوں کو اس معاملے میں گھسیٹیں۔

سقراط: میں تو یہ کہوں گا پھر ایسے لوگوں کا ذکر کیوں کرتے ہیں جو حکمران ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ ریاست کی ترقی کے دل سے خواہاں ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں؟ میرے دوست میں پولس سے یہ کہہ چکا ہوں کہ سوفسطائی اور ماہرین بلاغت ایک ہی ہیں بلکہ تھوڑے بہت یکساں ہیں لیکن آپ لاعلمی کے سبب یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ فن بلاغت ایک مکمل فن ہے اور سوفسطائیت قابل نفرت ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے سوفسطائیت فن بلاغت سے اسی طرح برتر ہے جس طرح قانون سازی، قانون دانی سے یا تن سازی فن طب سے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ ماہر بلاغت اور سوفسطائی دو ایسی شخصیتیں ہیں جو ان خرابیوں کا جو ان کی تربیت کے سبب پیدا ہوتی ہیں اس وقت تک شکوہ نہیں کر سکتے جب تک وہ اسی سانس میں خود کو اس بات کا ذمہ دار نہ ٹھہرائیں کہ انھوں نے جن کو فائدہ پہنچانے کا دعویٰ کیا تھا انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟

کیلی: یقیناً ہے۔

سقراط: اگر وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ انسانوں کی اصلاح کرتے ہیں تو پھر صرف وہی لوگ ہوں گے جنھیں چاہیے کہ وہ اپنا معاوضہ ان لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیں جنھوں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ حالانکہ اگر کسی شخص نے کسی اور طریقے سے استفادہ کیا ہو، مثلاً اسے کسی ماہر نے دوڑنے کی تربیت دی ہو تو ہو سکتا ہے کہ ماہر نے تنخواہ کا معاملہ اس پر چھوڑ دیا ہو۔ ایسا کوئی معاہدہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ معاوضہ کی رقم میں ہیرا پھیری کر لے۔ کیونکہ لوگ رفتار میں کسی نقص کے سبب نہیں بلکہ

ناانصافی کے باعث ایسے عمل کے مرتکب ہوتے ہیں۔

کیلی: بالکل درست ہے۔

سقراط: اور جو ناانصافی کا ازالہ کرے، اسے کسی بے انصافی کا نشانہ بننے کا خطرہ نہیں ہوگا۔ صرف ایسا ہی شخص حق محنت کا معاملہ اپنے شاگرد کی صوابدید پر چھوڑ سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس نے اسے صحیح معنوں میں انصاف پسند بنادیا ہو۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

کیلی: جی ہاں۔

سقراط: اب ہمیں معلوم ہوگیا ہے کہ جس شخص کو کسی عمارت یا فن کے بارے میں مشاورت کے لیے مقرر کر کے اسے تنخواہ دی جاتی ہے تو اسے احساس ننگ کیوں نہیں ہوتا؟

کیلی: جی ہاں ہمیں سب معلوم ہوگیا۔

سقراط: لیکن جب صورت یہ ہو کہ کوئی شخص خود کو بہترین کیسے بنا سکتا ہے؟ اپنے خاندان اور ریاست کو کس طرح بہترین انداز میں چلا سکتا ہے تو کیا تمہارے خیال میں اس سلسلے میں مفت مشورہ توہین آمیز نہ ہوگا؟

کیلی: درست ہے۔

سقراط: آخر کیوں؟ کیونکہ ایسی ہی خوبیوں کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کی درخواست کی جائے۔ یہ بات ثابت ہے کہ جب کسی محسن کو معاوضہ ادا کیا جاتا ہے تو وہ مفید کام کرتا ہے ورنہ نہیں۔ یہ درست ہے ناں؟

کیلی: درست ہے۔

سقراط: اچھا یہ بتائیے کہ ریاست کے کس کام کے لیے آپ مجھے مدعو کرتے ہیں؟ یا میرے لیے متعین کرتے ہیں۔ کیا آپ بھی مجھے ریاست کا ایسا معالج مقرر کریں گے جو کوشش کر کے اہل ایتھنز کی اصلاح کرے یا میں سرکار کا ملازم اور خوشامدی بن کر رہوں گا۔ میرے عزیز دوست کچھ تو بولیں۔ اسی آزادی اور انصاف سے جیسے آغاز میں بولتے تھے۔ اپنے تمام خیالات کا ایک بار پھر اظہار کردیں۔

کیلی: میں یہی کہوں گا کہ آپ ریاست کے ملازم بن کر رہیں گے۔

سقراط: خوشامدی نہیں؟ چلیے جناب یہ تو بڑا باعزت دعوت نامہ ہے۔

کیلی: مائی سیان(Mysian) کا عہدہ یا جو کوئی آپ کو پسند ہو کیونکہ آپ کے انکار کے نتائج.........

سقراط: چھوڑیے پرانی کہانی نہ دہرایئے کہ جو چاہے گا مجھے قتل کر کے میری دولت چھین لے گا۔اس صورت میں مجھے اپنی گزشتہ دلیل کا اعادہ کرنا ہوگا کہ ایسا آدمی برا اور نیکی کا قاتل ہوگا اور مزید برآں دولت اس کے کسی کام نہ آئے گی۔اور اس نے جس دولت کو غلط طریقے سے حاصل کیا اسے غلط طریقے سے ہی خرچ کرے گا۔مال حرام بود بجائے حرام رفت۔غلط کا مطلب ہے گھٹیا طریقے سے اور غلط طریقہ ضرر رساں ہوتا ہے۔

کیلی: سقراط آپ کو اس بات پر کتنا یقین ہے کہ آپ کبھی نقصان نہیں اٹھائیں گے۔یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آپ کسی دوسری ریاست میں رہ رہے ہیں اور آپ کو کبھی عدالتی کارروائی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا کیونکہ یہ کام صرف کوئی کمینہ اور بدفطرت انسان ہی کر سکتا ہے۔

سقراط: کیلی کلس اس صورت میں تو میں نہایت احمق ہوں گا اگر مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ ایتھنز میں کسی کو بھی کسی قسم کا نقصان پہنچ سکتا ہے۔اگر مجھے عدالت میں لایا جاتا ہے اور ان تمام مراحل سے گزارا جاتا ہے جس کا آپ نے تذکرہ کیا ہے تو جو مجھ پر مقدمہ چلائے گا، وہ نہایت بدکردار ہوگا۔اس کا تو مجھے مکمل یقین ہے کیونکہ نیک آدمی کبھی کسی بے گناہ کو ماخوذ نہیں کرے گا۔اگر مجھے قتل کر دیا جائے تو کوئی جرأت کی بات نہیں ہوگی۔میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے اس کی کیوں توقع ہے؟

کیلی: بسرو چشم۔

سقراط: میں سمجھتا ہوں کہ اہل ایتھنز میں سے صرف میں ہی ایسا انسان زندہ ہوں جو سیاست کے فن پر صحیح معنوں میں کاربند ہے۔میں اپنے عہد کا اکلوتا سیاستدان ہوں دیکھیے ناجب میں بات کرتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرے الفاظ کی ادائیگی کا مقصد کسی قسم کی رعایت کا حصول نہیں ہوتا۔میری نظر میں صرف بہترین ہوتا ہے دلکش ترین نہیں۔میں ان تمام ہنر اور کرم نوازیوں پر عمل کرنے کا سوچتا بھی نہیں آپ جنھیں تجویز کرتے ہیں۔میں عدالت انصاف میں کچھ نہیں کہوں گا اور جس طرح میں پولس سے بحث کر رہا تھا آپ مجھ سے محبت کر سکتے ہیں۔مجھ پر جو مقدمہ عدالت میں چلے گا اس کی حیثیت ایسی ہی ہوگی جیسے چھوٹے بچوں کی عدالت میں کسی معالج کو باورچی کی الزام تراشی پر پیش کیا جائے۔اس پر یہ الزام لگائے کہ میرے بچو! اس آدمی نے آپ کے ساتھ برا سلوک کیا ہے۔یہ آپ میں سے بہت افراد خصوصاً نہایت چھوٹے بچوں کا قاتل ہے۔یہ آپ کو

کوشنا، جلاتا، فاقہ کراتا اور آپ کا گلا گھونٹتا رہا ہے۔ آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ آپ اس سے کس طرح بچیں۔ وہ آپ کو انتہائی تلخ دوائیں پلاتا تھا اور آپ کا کھانا پینا بند کر دیتا تھا جبکہ میں آپ کو طرح طرح کے گوشت کے پکوان اور مٹھائیاں کھلاتا تھا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جب معالج کو اس عذاب میں مبتلا کر دیا جائے تو اس کا جواب کیا ہوگا؟ سچ بولنے کی صورت میں وہ صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہے کہ یہ ناپسندیدہ کام میں نے آپ کی صحت کے لیے کیے۔ کیا اس کے بعد پنچائیت کے اراکین میں اضطراب نہیں پیدا ہوگا۔ وہ کیسے کیسے چیخ چلائیں گے۔

کیلی: غالباً۔

سقراط: کیا وہ اس کا کوئی اطمینان بخش جواب دینے سے قاصر نہیں ہوگا؟

کیلی: یقیناً۔

سقراط: میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگر مجھے بھی عدالت میں پیش کیا گیا تو میرے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے گا کیونکہ میں عوام کے سامنے ان تعیشات کو پیش نہیں کر سکتا جو میں نے انھیں فراہم کی تھیں۔ اگرچہ ان کو فراہم کرنے والوں یا ان سے لطف اندوز ہونے والوں پر مجھے رشک نہیں آتا جنھیں وہ اچھا اور مفید سمجھتے ہیں اور اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ میں نوجوانوں کو بہکاتا ہوں انھیں ذہنی الجھن میں مبتلا کرتا ہوں یا یہ بھی کہ میں بزرگوں کی اہانت کرتا ہوں اور انھیں نجی اور عوامی محفلوں میں تلخ الفاظ سے یاد کرتا ہوں۔ انھیں جواب دینا بے سود ہوگا۔ میں تو یہ حقیقت بیان کرنا چاہوں گا کہ یہ تمام باتیں از روئے انصاف کرتا ہوں۔ میرے منصوبے تو آپ کی بھلائی کے لیے ہے اور اس کا کوئی دوسرا مقصد نہیں ہے اس کے بعد جو کچھ مجھ پر گزرے گی وہ ناقابل بیان ہے۔

کیلی: سقراط اچھا یہ بتائیے کہ ایسا شخص جو اپنا دفاع کرنے میں اس قدر کمزور ہو، کیا اس کی حالت بہتر ہوگی؟

سقراط: کیلی کلس کیوں نہیں بشرطیکہ کہ اس کا دفاع ویسا ہی ہو جیسا کہ آپ بار بار تسلیم کر چکے ہیں۔ وہ اپنا دفاع خود ہے۔ اس نے نہ کسی انسان اور نہ ہی دیوتاؤں کے بارے میں، کوئی غلط کام کیا ہے اور نہ ہی کوئی غلط بات منہ سے نکالی ہے۔ اس بات کو ہم بار بار بہترین دفاع تسلیم کر چکے ہیں اور اگر مجھے اس بنا پر سزا دی جاتی ہے کہ میں تو اپنا اور نہ ہی دوسروں کا دفاع کرنے کے لائق ہوں خواہ یہ سزا مجھے مجمع میں دی جائے، چند لوگوں کی موجودگی میں دی جائے یا تنہائی میں۔ ہر طرح میں شرم سے

پانی پانی ہو جاؤں گا۔ اور اگر اسی دفاع کی خامی کے سبب مجھے سزائے موت ملتی ہے تو مجھے سخت رنج ہوگا۔ لیکن اگر مجھے صرف اس لیے موت کی سزا ملتی ہے کہ مجھ میں بلاغت کی اہلیت نہیں تھی تو آپ دیکھیں گے کہ اپنی موت پر مجھے کوئی تاسف نہیں ہوگا کیونکہ وہ احمق اور بزدل ہی ہوگا جو موت سے ڈرے۔ اسے تو صرف غلط کام کرنے سے خوف آتا ہے کیونکہ عالم اسفل میں اس صورت میں داخل ہونا کہ روح پر ناانصافیوں کا پشتارہ ہو آخری اور بدترین غلط کاری ہوگی۔ لیکن اپنی اس بات کے ثبوت میں اگر اعتراض نہ ہو ایک قصہ سناتا ہوں۔

کیلی: بہت خوب سنا ڈالیئے، لیکن اس کے بعد بحث کا انجام ہو جائے گا۔

سقراط: تو سنو قصہ کو جس طرح کسی خوبصورت قصے کا آغاز یوں ہی کرتے ہیں میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ آپ اسے صرف ایک داستان سمجھیں گے۔ لیکن یہ سچی کہانی ہے کیونکہ میں سچ سچ بات بتانا چاہتا ہوں کہ ہومر ہمیں بتاتا ہے کہ زیوس(Zeus)، پوزیڈان(Poseidon) اور پلوٹو(Pluto) نے کس طرح وہ اپنے والد سے ورثہ میں ملی ہوئی سلطنت کو آپس میں بانٹ لیا۔ کرونوس کے دور کا یہ قانون تھا کہ جو آج بھی عالم بالا میں رائج ہے، جس کا تعلق انسان کی تقدیر سے ہے کہ جس نے اپنی تمام زندگی عدل و انصاف سے گزاری ہے وہ مرنے کے بعد متبرک جزیرے میں جا کر ہمیشہ کے لیے آرام وچین سے رہے گا۔ کسی قسم کی بدی سے سابقہ نہیں پڑے گا لیکن جس نے ناانصافیاں کیں ہیں اور گناہوں میں ملوث رہا ہے وہ اس مکان میں جائے گا جس میں اسے عذاب دیا جائے گا۔ جسے ٹارٹارس(Tartarus) کہا جاتا ہے اور کرونوس(Cronos) کے عہد میں بلکہ اس سے قریب بھی بعد میں زیوس کے دور حکومت میں فیصلہ اسی روز سنایا جاتا تھا جس دن اسے موت کی سزا ملنا ہوتی۔ منصف بھی زندہ ہوتے اور مجرم بھی۔ انجام یہ ہوتا کہ فیصلے منصفانہ نہ ہوتے۔ اس کے بعد پلوٹو اور متبرک جزیرے کے کارپرداز زیوس کے پاس آئے اور کہا کہ ارواح غلط مقامات پر جا رہی ہیں۔ زیوس نے کہا میں اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں۔ فیصلے اچھی طرح نہیں دیے جا رہے ہیں کیونکہ جن لوگوں کے بارے میں فیصلہ دیا جاتا ہے وہ ملبوس ہوتے ہیں کیونکہ زندہ ہوتے ہیں اور متعدد ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی تمام روحیں بدصورت ہوتی ہیں لیکن خود وہ اپنا جسم قیمتی لباسوں سے ڈھانپے رہتے ہیں ان پر دولت اور عہدے کا خول چڑھا ہوتا ہے اور جب فیصلے کا دن آتا ہے تو متعدد گواہ ان کی نیکی اور پاکیزگی کی شہادت دیتے ہیں۔ منصف ان سے مرغوب ہو جاتے ہیں۔

وہ خود بھی فیصلے کے وقت لباس پہنے ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھیں، ان کے کان بلکہ سارا وجود ہی ان کی روح پر نقاب ڈال دیتا ہے۔ صورت حال ان کے لیے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ ایک لباس منصفوں کا اور ایک ان کا جو اس کے روبرو فیصلے کے لیے پیش ہوتے ہیں۔ اس کا مداوا کیا ہے، میں بتاتا ہوں۔ اول یہ کہ انسانوں کو موت کے پیشگی علم سے محروم کر دیا جائے۔ جو انھیں اس وقت حاصل ہے۔ میں نے پرومیتھیوس (Preometheus) کو فرمان جاری کر دیا ہے کہ انسان سے اس جیسی خوبی کو چھین لیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انصاف کا عمل شروع ہونے سے قبل ان کے کپڑے اتار دیے جائیں اور ان کے اعمال کا حساب کتاب موت کے بعد ہو۔ انصاف کرنے والا خود بھی مادرزاد برہنہ یعنی مردہ ہوگا تا کہ وہ صرف روح ہی روح رہ کر دوسری ارواح کے باطن میں اچھی طرح حلول کر سکے۔ ان کی موت اچانک واقعہ ہوگی اس طرح وہ سب اپنے عزیز و اقارب سے یکسر محروم ہو جائیں گے اور ان کے قیمتی لباس روئے زمین ہی پر بکھرے رہیں گے۔ اس طرح کارروائی کے نتیجے میں عدل بے داغ ہوگا۔ مجھے آپ تمام لوگوں سے قبل ہی ان امور کا علم ہو چکا تھا اسی لیے میں نے اپنے فرزندوں مینوس (Minos) اور رادامنتھس (Rhadamanthus) کو ایشیا اور آئیکس (Aeacus) کو یورپ کے لیے منصف مقرر کر دیا تھا۔ اور یہ تینوں اپنی اپنی موت کے بعد اُس دوراہے کے قریب والے میدان میں فیصلے دیں گے جہاں سے ایک راستہ متبرک جزیرے کو اور دوسرا ٹارٹارس (Tartarus) کو جاتا ہے۔ رادامنتھس ایشیا والوں کے اور آئیکس اہل یورپ کے بارے میں فیصلے سنائیں گے۔ اور مینوس ان کا سربراہ ہوگا جو ان کے فیصلوں پر نظر ثانی کی درخواستوں پر اس وقت غور کرے گا جب وہ کسی فیصلے میں شک وشبے کا شکار ہوں گے۔ اسی صورت میں انسان کے سفر آخرت کا فیصلہ منصفانہ ہوگا۔

کیلی کلس اس کہانی سے جو میں نے سنی ہے اور جس پر میرا ایمان ہے میں نے درج ذیل نتائج اخذ کیے ہیں۔ موت دراصل جسم اور روح کی علیحدگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس علیحدگی کے بعد بھی ان میں ان کی خصوصیات اور خصلتیں موجود رہتی ہیں جس طرح وہ زندگی میں تھیں۔ جسمانی عادات اسی طرح قائم رہتی ہیں یعنی صورتیں اور ان کے علاج کی علامتیں جوں کی توں موجود رہتی ہیں، مثلاً جو شخص دنیاوی زندگی میں ضرورت سے زیادہ کھانے پینے بڑی طویل باتیں کرتا تھا۔ وہ ویسا ہی رہے گا موٹا آدمی موٹا رہے گا وغیرہ وغیرہ اور جسے زندگی میں زلفیں رکھنے کا شوق تھا اور اس کی زلفیں اس طرح لہرائیں گی اور اگر اسے کوڑوں کی سزا ملی تھی اور

اس کے نشان اس کے جسم پر تھے تو اس روز بھی یہ سارے نشان صاف صاف نظر آئیں گے۔ اور اگر اس کا کوئی عضو ٹوٹ گیا تھا یا کوئی حادثہ پیش آیا تھا تو یہ جسمانی خرابی بھی دنیاوی زندگی کی طرح موجود رہے گی مختصر یہ کہ زندگی میں اس کی جو عادات واطوار تھے وہ موت کے بعد بھی مکمل یا جزوی طور پر یا بڑی حد تک خاص مدت تک نمایاں رہیں گے۔ میرا خیال ہے کہ یہی حالت روح کی بھی ہوگی۔ کیلی کلس جب کسی کو جرم کی پاداش میں کوڑے مارے گئے ہوں گے تو روح کی فطری یا کسی کیفیت نگاہوں کے سامنے آجائے گی اور جب وہ منصف کے سامنے مثلاً ایشیا والے رادامینتھس کے حضور پیش ہوں گے تو وہ ان کا بغور اور غیر جانبداری سے معائنہ کرے گا۔ اسے یہ اندازہ ہی نہیں ہوگا یہ روح کس کی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ کسی عظیم فرمانروا، کسی راجا، مہاراجا یا سردار کی ایسی روح پر ہاتھ ڈال دے جو بے داغ نہ ہو جس پر کوڑے کھانے کے نشانات ہوں وہ جھوٹی گواہی دینے، غلط کاریوں کے زخم اور دھبوں کے عکس سے بھری ہوئی ہو اور جھوٹ اور جعل سازیوں کے طفیل خمیدہ ہو چکی ہو اور چونکہ اس کی زندگی سچ سے عاری تھی۔ اس لیے وہ سیدھی نہیں ہوگی جب رادامینتھس اس کی سرتاپا بدہیئتی اور عدم تناسب پر نظر ڈالے گا جو اس کی بے لگام عیاشی، بدتمیزی اور نفس پرستی کا ثمر ہے تو اسے نہایت ذلت سے قید خانے بھیج دے گا اور وہاں اسے قرار واقعی سزا ملے گی۔ سزا دینے کے انجام دوگونہ ہوتے ہیں جسے درست سزا ملتی ہے یا تو اس کی اصلاح ہو جانا چاہیے۔ اسے اس کا فائدہ پہنچنا چاہیے یا وہ اپنے ہم جسموں کے لیے ایک مثال بن جاتا ہے وہ دیکھیں گے کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ خوف زدہ ہو کر بہتری کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور جو لوگ دیوتاؤں اور انسانوں کی سزا کے بعد اصلاح پذیر ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسے ہوتے ہیں جن کے گناہ قابلِ علاج ہوتے ہیں اور وہ جس طرح دکھ درد کے سبب راہ راست پر آجاتے ہیں۔ اسی طرح دوسری دنیا میں بھی ان کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان کو گناہوں سے نجات دلانے کا اور کوئی طریق کار نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور لاعلاج قسم کی بداعمالیوں میں ملوث ہوتے ہیں انھیں نشانِ عزت بنا دیا جاتا ہے چونکہ وہ لاعلاج ہوتے ہیں اور ہر قسم کی اصلاح کا وقت گزر چکا ہوتا ہے تو انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ لیکن انھیں دیکھ کر دوسرے عبرت پکڑ کر اپنی اصلاح کر لیتے ہیں۔ وہ یہ دیکھ کر کانپ کانپ جاتے ہیں کہ وہ اپنے گناہوں کی پاداش میں کس طرح ہمیشہ کے لیے دردناک عذاب میں مبتلا کر دیے جاتے ہیں۔ وہ عالم اسفل کے قید خانے میں نشانِ عبرت سے لٹکے رہتے ہیں اور وہاں پہنچنے والے تمام گناہ گاروں کے لیے ایک عبرت ناک منظر اور عبرت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اگر پولس نے صحیح صحیح بتایا ہے تو ایسے ہی لوگوں میں آرکیلاس (Archelaus) اور اس جیسے دیگر جابر حکمرانوں کا بھی شمار ہوگا۔ ان عبرت ناک افراد میں سے

بیشتر ظالم و جابر، بے لگام حکمران، سردار اور سیاستدان ہوں گے۔ یہ میرا یقین ہے کیونکہ وہی لوگ بڑے بڑے گناہوں اور خطاؤں کے ارتکاب اور فروغ کے ذمہ دار اس لیے ہوتے ہیں کہ وہ بااختیار ہوتے ہیں۔ اس کی صداقت کی شہادت ہومر بھی دیتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ حکمرانوں اور سرداروں ہی کو عالم اسفل میں دردناک سزائیں پاتے ہوئے بیان کرتا ہے۔ ٹینٹالس (Tantalus)، سیسی فس (Sisyphus) اور ٹی اس (Tityus) ایسے ہی لوگ تھے لیکن کسی نے تھرسائٹس (Thersites) یا اور کسی عام آدمی کا حال بیان نہیں کیا۔ جو بدقماش تھا اور جسے ہمیشہ کے لیے دردناک عذاب دیا گیا کیونکہ وہ ان ہی کی طرح لاعلاج تھا۔ میرے خیال میں بڑے بڑے گناہ کے ارتکاب کے لیے اس کے پاس اختیار نہیں تھا۔ کیلی کلس یہ بات نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ عظیم گناہ ان ہی سے سرزد ہوتے ہیں جو بااختیار ہوں۔ تاہم ہوسکتا ہے اسی زمرے میں چند ایک نیک افراد بھی پیدا ہوئے ہوں۔ یہی لوگ تحسین و آفرین کے واقعی مستحق ہیں کہ انھوں نے قوت اور اختیار ہونے کے باوجود غلط کاری سے پرہیز کر کے نیکی کی راہ اختیار کی۔ یہ کام بہت دشوار ہے۔ اسی لیے تعریف و توصیف کا مستحق ہے۔ لیکن ایسے افراد خال خال ہی ہوتے ہیں۔ ایسے نیک اور صالح لوگ ماضی میں گزرے ہیں اور آئندہ بھی ایتھنز اور دیگر ریاستوں میں پیدا ہوں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی ذمہ داری نہایت دیانت داری سے نبھائی ہے۔ ایسا ہی ایک شخص ارسٹیڈس (Arsteides) ولد لائیسی میکس (Lysimachus) ہے جس کی شہرت پورے ہیلاز (Hellas) کے علاقے میں پھیلی ہوئی ہے۔ میرے دوست عموماً بڑے لوگ بُرے لوگ ہوتے ہیں۔

ابھی جیسا کہ میں کہہ رہا تھا کہ رادامینتھس کے حضور جب کوئی بری روح پیش ہوتی ہے تو اسے یہ علم بالکل ہی نہیں ہوتا کہ وہ کون ہے۔ اس کے والدین کون ہیں۔ اسے صرف یہ پتا ہوتا ہے ایک بدقماش روح اس کے حوالے کی گئی ہے۔ اس کا معائنہ کرنے کے بعد وہ اس پر لاعلاج یا قابلِ علاج ہونے کی مہر لگا دیتا ہے۔ اور وہ اسے تارتارس بھیج دیتا ہے۔ جہاں اسے اس کے اعمال کا مناسب بدلہ مل جاتا ہے اور جب کوئی ایسی روح اس کے حضور پیش ہوتی ہے جو نیک، پارسا اور عادل ہو تو وہ اسے بنظرِ استحسان دیکھتا ہے۔ وہ عامی بھی ہوسکتا ہے اور نہیں بھی۔ کیلی کلس میرا تو خیال ہے کہ وہ کسی فلسفی ہی کی روح ہوسکتی ہے جس نے زندگی میں اپنے کام سے کام رکھا۔ دوسروں کے کام میں دخل دینے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ اسے رادامینتھس متبرک جزیرے میں بھیج دیتا ہے۔ آئیکس بھی یہی کچھ کرتا ہے۔ وہ دونوں صاحب عصا اور منصف ہوتے ہیں۔ صرف مینوس (Minos) کا عصا طلائی ہوتا ہے اور وہ اپنی نشست پر ویسا ہی نظر آتا ہے جیسا کہ ہومر نے اوڈیسس

[illegible] ہے

"طلائی عصا ہاتھ میں پکڑے وہ مُردوں کو احکام دے رہا تھا"۔

[illegible] میں ان تمام باتوں پر کامل یقین رکھتا ہوں اور میں سوچتا ہوں کہ میں اپنی روح کو مکمل اور
[illegible] منصف کے حضور کس طرح پیش کروں گا۔ دنیا جو اعزازات دینا چاہتی ہے ان کو
[illegible] میں تو صرف حق کی شناخت کرنا اور زندگی کو اپنے امکان بھر نیک طریقے سے بسر کرنا چاہتا
ہوں [illegible] جیسے انسان کی طرح موت کو گلے لگانا چاہتا ہوں اور جہاں تک میرے بس میں ہے
[illegible] دوسروں کو بھی نیک زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہوں اور آپ مجھے جس طرح پندونصائح دے رہے
[illegible] میں میری یہ وصیت یاد رکھیے کہ آپ بھی بدی کے خلاف اس جنگ میں شامل ہو جائیں جو
[illegible] حیثیت ہے جو دنیا کی تمام کشمکشوں سے بالاتر ہے۔ آپ نے مجھ پر جو نکتہ چینی کی ہے اس
[illegible] میں یہی کہوں گا کہ جب وہ دن آئے گا جس کا میں نے ابھی تذکرہ کیا ہے اور حساب کتاب ہوگا تو
آپ [illegible] ضمن میں بھی جوابدہی کرنا ہوگی۔ آپ منصف ایجینا (Aegina) کے بیٹے کے حضور پیش ہوں گے
اور آپ بھی [illegible] اس کی گرفت میں آجائیں گے۔ وہ آپ پر حاوی ہوگا آپ کی سانس تیز ہو جائے گی سر
چکرانے لگے گا۔ جس طرح میرا دماغ اس دنیاوی عدالتوں میں چکرا جاتا ہے اور ہو سکتا ہے کوئی گستاخ آپ
[illegible] دھکے بھی لگا دے اور آپ کی ہر ممکن تذلیل کرے۔

ہوسکتا ہے آپ کو یہ محض بے سروپا داستان پارینہ نظر آئے اور آپ اسے حقارت سے دیکھیں ممکن
[illegible] کو حقیر سمجھنے کا ایسا جواز آپ کے پاس ہو جس میں غور اور تحقیق کے بعد ایسی کوئی چیز دریافت ہو
[illegible] اور بہتر ہو۔ آپ پولس اور جارجیاز فی زمانہ یونان کے دانا ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔
[illegible] تینوں یہ بات ثابت کرنے سے قاصر ہیں کہ ہمیں ایسی زندگی بسر کرنا چاہیے جو نہ تو دوسری دنیا کے
[illegible] اس دنیا کے لیے اور اب تک جتنی بھی باتیں ہوئیں ان میں مستحکم ترین یہی ہے کہ ناانصافی
[illegible] بہتر اس کا برداشت کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہ ہمیں اپنی نجی اور عوامی زندگی میں اصل نیکی
[illegible] پر نہیں۔ مزید یہ کہ جب کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کی سرزنش کی جائے
[illegible] صورت یہی ہے کہ انسان کو عادل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود عادل بن
[illegible] برداشت کرے۔ یہ بھی کہ وہ ہر طرح کی اپنی اور دوسروں کی خوشامد سے
[illegible] نہ اس میں اکثریت کا خیال رکھے نہ اقلیت کا اور فن بلاغت اور دیگر فنون کو وہ صرف اور

صرف حصولِ انصاف کے لیے استعمال کرے۔

ہماری بحث سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ زندگی میں موت کے بعد پُر مسرت زندگی گزارنا ہو تو میری پیروی کرو۔ اگر آپ کو کوئی سادہ لوح سمجھے یا نفرت کرے تو آپ اسے خاطر میں نہ لائیں۔ زیوس دیوتا کی قسم ہے آپ اس کی ضرب ہنسی خوشی برداشت کر لیں۔ آپ اس پُر حقارت ضربات کی بھی پروانہ کریں کیونکہ صداقت کے راستے میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ آپ صحیح معنوں میں نیک اور صالح رہیں۔ آپ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ جب ہم باہمی تعاون سے نیکی کا راستہ اختیار کر لیں پھر اگر ضروری سمجھیں تو سیاسی میدان میں اتریں۔ اور ہم اپنی اصلاح کے لیے باہمی مشاورت سے کام لیں کیونکہ اس صورت میں ہم معاملات کا اچھی طرح فیصلہ کر سکتے ہیں۔ موجودہ صورت میں ہمیں غرور نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اہم ترین موضوعات پر بھی ہماری رائے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ سوچیے کتنے نادان ہیں؟ آیئے اس بحث کو ہم اپنے لیے ہدایت بنا لیں جو ہمیں القا ہوئی ہے کہ زندگی کو بہترین طریقہ سے بسر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم زندگی اور موت میں نیکی اور عدل پر عمل پیرا رہیں۔ آیئے اس راستہ کو اپنائیں اور تمام لوگوں کو اسی کی تلقین کریں وہ راستہ جس پر آپ کا ایمان ہے بلکہ جس پر چلنے کا آپ مجھے مشورہ دیتے ہیں۔ کیلی کلس وہ راستہ اس لائق نہیں ہے۔

☆☆☆
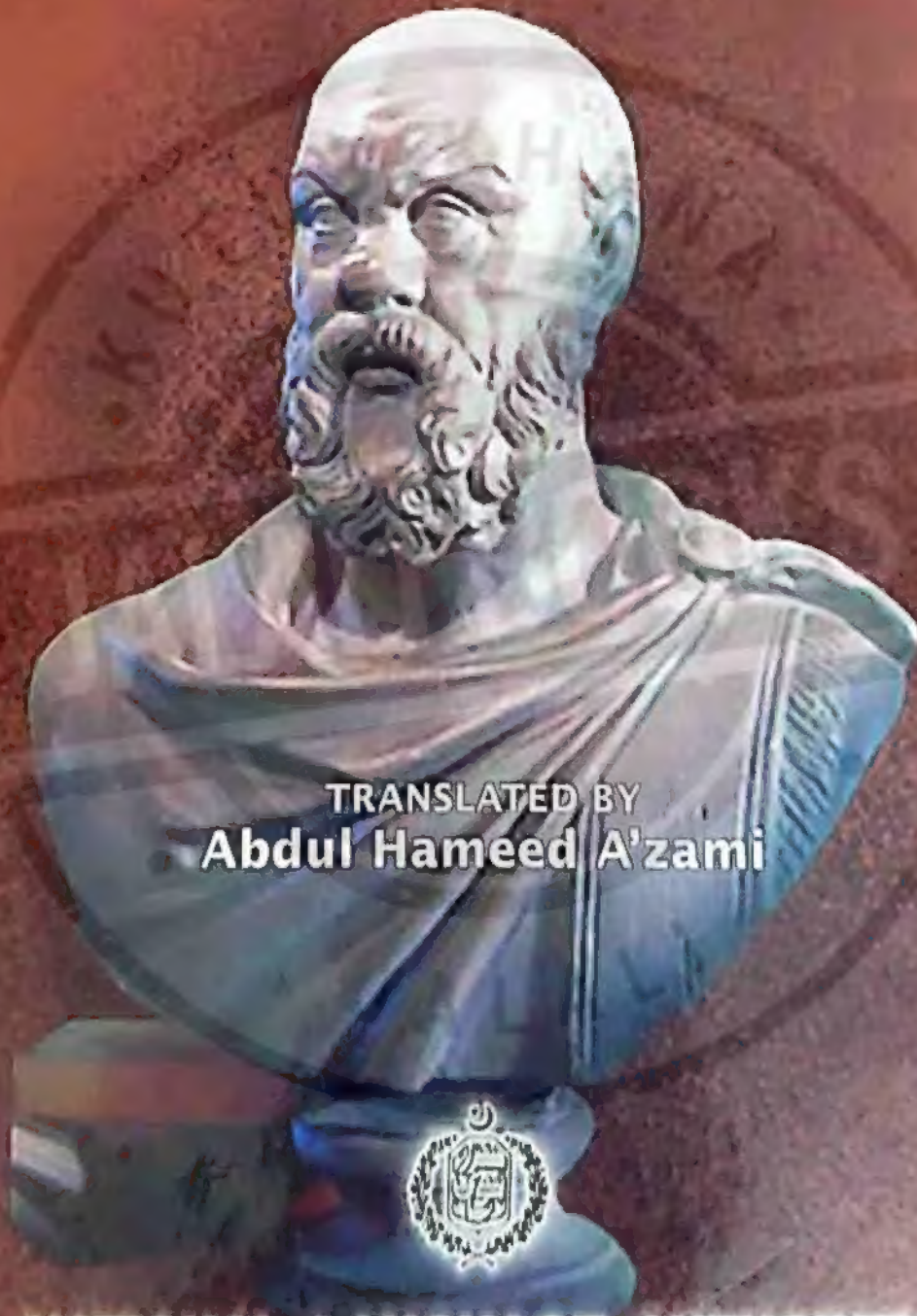
Makalmat-e-Aflatoon
(JILD DOVM)
TRANSLATED BY
Abdul Hameed A'zami
NATIONAL LANGUAGE AUTHORITY
PAKISTAN